واصف علی واصفؒ

شخصیّت و فن: چند نئے گوشے

ڈاکٹر محمد عارفؔ

اوکاسا پبلیکیشنز

واصف علی واصفؒ

شخصیّت و فن: چند نئے گوشے

مرتّبہ

ڈاکٹر محمد عارفؔ

اوکاسا پبلیکیشنز

All Rights Reserved in the Name of OQASA Publications

نام کتاب: واصف علی واصف شخصیت و فن: چند نئے گوشے

ترتیب و تدوین: ڈاکٹر محمد عارف/ باباجی انائت اللہ

ناشر: اوکاسا پبلیکیشنز

اہتمام: شوکت محمود اعوان

اشاعت: 2025ء

فون نمبرز: 03345559251/03009847582

ای میل: oqasaorg@gmail.com

ویب سارٹ: www.oqasa.org

فہرست مضامین

نمبر شمار	تفصیل	صفحہ نمبر
1۔	پیش رخ	

گوشۂ واصف علی واصفؒ سوانح و فکریات		
☆	واصف علی واصفؒ کی زندگی پر ایک نئی تحقیق : شاہد محمود قاسمی صدر مریدِ اقبال فاؤنڈیشن (انٹرنیشنل) پاکستان	
☆	مقام واصف سے ناآشنائی، کتاب فرمائش، مرتّبہ اعجاز الحق، سماوات پبلی کیشنز لاہور سے اقتباس	
☆	واصف علی واصفؒ کی سوانح حیات، روزنِ دیوار سے، عطاالحق قاسمی	
فصل نمبر 1۔	واصف علی واصفؒ۔ سوانح حیات	
☆	بِسم اللہ سے آستانۂ بِسم اللہ تک : انجینئر منور علی قریشی	
فصل نمبر 2۔	سوانحی واقعات تحریر ڈاکٹر تصدق حسین	
فصل نمبر 3۔	واصف علی واصفؒ کی پنجابی شاعری میں صوفیانہ روایت	
فصل نمبر 4۔	واصف علی واصفؒ کا فنِ نعت گوئی	
فصل نمبر 5۔	واصف علی واصفؒ اور شب راز	
فصل نمبر 6۔	پروفیسر واصف علی واصفؒ کے بارے میں کچھ یادیں اور نادوقت : ڈاکٹر تصدق حسین	
فصل نمبر 7۔	متاعِ فقیر''۔ تعارف و تجزیہ، تحریر: ڈاکٹر محمد عارف	
فصل نمبر 8۔	واصف علی واصفؒ نے کب بولنا شروع کیا	
فصل نمبر 9۔	باباجی عنایت اللہ اور واصف علی واصفؒ کی سائیں محمد حسین کی خدمت میں حاضری	
فصل نمبر 10۔	الٰہی بخش وجدانی	
فصل نمبر 11۔	سائیں اختر	
فصل نمبر 12۔	شیخ وزیر علی	
فصل نمبر 13۔	واصف علی واصفؒ ایک صاحب حال، تحریر سید زین العابدین علوی	
فصل نمبر 14۔	واصف علی واصفؒ روحِ عصر کے نمائندہ ہیں، تحریر ڈاکٹر رشید نثار	
فصل نمبر 15۔	''چراغِ راہ''، تحریر: ڈاکٹر محمد عارف	
فصل نمبر 16۔	بھرے بھڑولے تحریر ڈاکٹر محمد عارف	
فصل نمبر 17۔	سرچشمہ اسرار و رموز حضرت سید واصف علی واصفؒ، تحریر غنی سکندر شیخ	
گوشۂ عنایت		
فصل نمبر 1۔	باباجی عنایت اللہ کی سوانح حیات	
فصل نمبر 2۔	واصف علی واصف عنایت اللہ کی نظر میں	

فصل نمبر 3۔	چوہدری عنایت اللہ سے باباجی عنایت اللہ تک	
فصل نمبر 4۔	کوافطرت اور روحانیت کی درسگاہ	
فصل نمبر 5۔	ہم نہیں جانتے	
فصل نمبر 6۔	فلیب برائے نادوقت	
فصل نمبر 7۔	انسانی ارتقا تبدیلی کے بغیر ممکن نہیں بانو قدسیہ	
فصل نمبر 8۔	کرنل غلام سرور ستارہ امتیاز ملٹری	
فصل نمبر 9۔	چراغ وقت احترام آدمیت سے عبارت ہے۔ فتح محمد ملک کا تبصرہ	
فصل نمبر 0 1۔	سلسلہءِ واصفیہ (واصف علی واصفؒ) کے رکنِ اعظم عنایت اللہ اور انقلابِ وقت، تحریر احسان اکبر	
فصل نمبر 1 1۔	قادری اور چشتی سلسلہ کے بزرگان کی خدمات۔ بشیر الدین محمود	
فصل نمبر 2 1۔	باباعنایت اللہ تحریک تحفظ واستحکام پاکستان کے خاموش مجاہد۔ ڈاکٹر محمد عارف	
فصل نمبر 3 1۔	قوم کا سچا رہنما۔ تحریر ملک فدا الرحمن	
فصل نمبر 4 1۔	آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں۔ ڈاکٹر محمد عارف	
فصل نمبر 5 1۔	فلسفہ جمہوریت کے فتنہ طراز خالق کا احتساب وقت کی ضرورت ہے۔ محمد الیاس وادی سون سکیسر	
فصل نمبر 6 1۔	دہشت گرد کون۔ ڈاکٹر محمد عارف	
فصل نمبر 7 1۔	مسیحائے وقت'' کے بارے میں صدائے زمان لاہور کا کالم، تحریر ڈاکٹر محمد عارف	
فصل نمبر 8 1۔	حضرت واصف علی واصفؒ کے شاگردِ خاص، مردِ خدا آگاہ، درویشِ خدا مست، عنایت اللہ اور ان کا پیغام نادِ وقت، پیش لفظ نادِ وقت، کرنل (ر) غلام سرور ستارۂ امتیاز	

فصل نمبر 9 1۔	چراغِ وقت نوعِ انسانی کے موجودہ تصوّرات کو بدلنے کا ایک جامع پروگرام اور ایک انقلابی فکر ہے، جنرل حمید گل	
فصل نمبر 20۔	''آئینہِ وقت'' دعوتِ فکر و عمل، تحریر: جنرل (ر) حمید گل	
فصل نمبر 21۔	''آئینہِ وقت'' دیکھا ہے جو میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے، تحریر: ڈاکٹر تصدق حسین	
فصل نمبر 22۔	''آئینہِ وقت۔ فیضِ نگاہ مردِ درویش'' تحریر پروفیسر شوکت محمود	
فصل نمبر 23۔	آئینہِ وقت، تعمیرِ انسانیت کا ذریعہ، تحریر اشفاق احمد	
فصل نمبر 24۔	مجھے ہے حکمِ اذاں، تحریر ڈاکٹر تصدق حسین	
فصل نمبر 25۔	آئینہِ وقت اور عصری تقاضے، تحریر: ڈاکٹر محمد عارف	
فصل نمبر 26۔	صدائے وقت، پروفیسر شوکت محمود کنڈان	
فصل نمبر 27۔	باباعنایت اللہ کی آواز صدائے وقت تحریر علامہ محمد یوسف جبریل	
فصل نمبر 28۔	پسِ آئینہ کوئی اور ہے، ڈاکٹر تصدق حسین	
فصل نمبر 29۔	چراغِ وقت کے مطالعہ کے بعد مصنف کے فکر و احساس اور کائناتی وسعت کا احساس ہوتا ہے، تحریر ڈاکٹر رشید نثار	
فصل نمبر 30۔	ہم نہیں جانتے، تحریر اشفاق احمد	
فصل نمبر 31۔	آئینہِ وقت'' ملی اور قومی دردمندی سے عبارت ہے تحریر پروفیسر احسان اکبر	
فصل نمبر 32۔	''آئینہِ وقت'' مضطرب روح کی پکار تحریر شورش ملک	
فصل نمبر 33۔	باباجی عنایت اللہ اور جمہوری نظامِ مملکت تحریر ڈاکٹر محمد عارف	
فصل نمبر 34۔	یومِ حساب قریب ہے تحریر ڈاکٹر تصدق حسین	
فصل نمبر 35۔	پیغمبرِ خدا ﷺ اور انکادین کثرت رائے کا محتاج نہیں تحریر باباجی عنایت اللہ	
فصل نمبر 36۔	مجرم عدلیہ کا کیس عوام الناس کی عدالت میں تحریر باباجی عنایت اللہ	
گوشۂ جبریل		
فصل نمبر 1۔	حضرت علامہ یوسف جبریلؒ اور حضرت واصف علی واصفؒ کی ملاقاتیں، ڈاکٹر تصدق حسین کی گفتگو	
فصل نمبر 2۔	علامہ یوسف جبریلؒ کی زندگی کے بارے میں، تحریر اکرام اللہ	
فصل نمبر 3۔	حضرت علامہ یوسف جبریلؒ اور حضرت واصف علی واصف رحمتہ اللہ علیہ کی ملاقاتیں	
فصل نمبر 4۔	حضرت واصف علی واصفؒ تحریر علامہ محمد یوسف جبریلؒ	
فصل نمبر 5۔	واصف علی واصفؒ سے ملاقاتیں مضمون نمبر 2، تحریر علامہ محمد یوسف جبریلؒ	
فصل نمبر 6۔	ایک درویش دانشور علامہ محمد یوسف جبریل۔ شاکر کنڈان	

فصل نمبر7۔	WASIF ALI WASIF, By ALLAMA MUHAMMAD YOUSUF GABRIEL	
فصل نمبر8۔	WASIF ALI WASIF, By ALLAMA MUHAMMAD YOUSUF GABRIEL	
فصل نمبر9۔	کرن کرن سورج، تحریر علامہ محمد یوسف جبریلؒ	
گوشۂ شوکت محمود اعوان		
فصل نمبر1۔	شوکت اعوان شخصیت اور خدمات	
فصل نمبر2۔	علامہ محمد یوسف جبریل کا شوکت محمود اعوان کے نام ایک خط	
فصل نمبر3۔	علامہ صاحب کا مفصل خط اپنے بیٹے شوکت محمود اعوان کے نام	
فصل نمبر4۔	علامہ محمد یوسف جبریلؒ میرے والدِ محترم	
گوشۂ مصنف		
فصل نمبر1۔	واہ کا ادبی منظر نامہ	
فصل نمبر2۔	کوائف نامہ مصنف	
☆	تعلیمی کوائف	
☆	ملازمت	
☆	تصانیف	
☆	ادبی مضامین (منتخاب)	
☆	ادبی خدمات	
فصل نمبر3۔	منظر ترے غم کا۔ایک مطالعہ تحریر راجہ گل حسن بدر (خوشاب)	
فصل نمبر4۔	اپنی موج میں، اپنی دھن میں، بہتا بولتا رہتا ہے۔ تحریر شمشیر حیدر (شہر سنگ)	
فصل نمبر5۔	اعزازات	
فصل نمبر6۔	محمد عارف کا شخصی خاکہ	
فصل نمبر7۔	محمد عارف اور تصّوف	
فصل نمبر8۔	محمد عارف اور دیباچہ نگاری	
فصل نمبر9۔	ماحصل کلام	
☆	حوالہ جات	
تمت بالخیر		

پیشِ رُخ

بابا جی عنایت اللہ نے پاکستان میں مغربی جمہوریت کے خاتمے اور اسلامی جمہوری نظام کے قیام کے لئے کام کیا ہے انہوں نے گیارہ کتب قلمبند کیں جن کا موضوع یہی فکر و فلسفہ ہے۔ علامہ محمد یوسف جبریل کے فرزند ارجمند ملک شوکت محمود اعوان نے اس مشن میں ان کا بھرپور ساتھ دیا ہے۔ علامہ محمد یوسف جبریل بھی ان کے اس علمی مشن کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ میں اور ملک شوکت محمود اعوان اکثر بابا جی سے ملنے کے لئے چلے جاتے جہاں ان کے جمہوری فلسفے سے آشنائی ہوئی۔ بابا جی عنایت اللہ ایک خاموش طبع سنجیدہ، بردبار، متحمل مزاج، معاملہ فہم اور وژنری انسان ہیں۔ ان کی زندگی کا حقیقی نصب العین معاشرے سے مغربی جمہوریت کا خاتمہ اور اسلامی جمہوری نظام کا فروغ ہے۔ وہ ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتے ہیں جہاں عدل و انصاف، مساوات، قانون کی حکمرانی اور عدلیہ کی آزادی ہو۔ وہ سفارش، رشوت، چور بازاری، اقربا پروری کا خاتمہ چاہتے ہیں۔ بابا جی عنایت اللہ ایک متحرک اور فعال شخصیت ہیں جو علمی و ادبی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ معاشرے کی فلاح و بہبود کے لئے بھی سرگرمِ عمل رہتے ہیں۔ انہوں نے جہاں اپنے وقت کے جیّد بزرگانِ دین اور فقراء سے فیض پایا ہے وہاں ان کے مشن کو بھی آگے بڑھایا ہے۔ وہ مخلوق کو خالق سے ملانے کے بھی خواہش مند ہیں۔ اسی مقصد کے لئے اپنے گھر میں ایک تعلیمی ادارے اور دینی مدرسے کا قیام عمل میں لائے۔ انکے باطن میں کچھ غیر معمولی کر گزرنے کی خواہش انہیں آرام سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ جمہوریت، جمہوریت اور جمہوریت بس یہی ان کی زندگی ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو کہ خود حضورِ اکرم ﷺ نے مدینے میں پہلی اسلامی ریاست کی بنیاد رکھ کر اس شہرِ نور کو دنیا بھر کے معاشروں کے لئے نمونۂ عمل بنایا۔ حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے دور میں روم و ایران جیسی وسیع سلطنتیں بھی مدینے کی ریاست کا عکس تھیں۔

بابا جی عنایت اللہ کی باطنی شخصیت کے ان گنت ایسے پہلو موجود ہیں جو ابھی تک پردۂ اخفاء میں ہیں۔ بابا جی عنایت اللہ کی شخصیت میں تہذیب جھلکتی ہے۔ وہ پرانی وضع کے کشادہ رو، بااخلاق، ملنسار اور حلیم الطبع بزرگ ہیں۔ ان کے حلقہء اثر میں عام طبقے کے افراد ہی نہیں بلکہ وزرا، سفرا، فوجی افسران، دانش ور، صحافی، اور اہلِ قلم بھی شامل ہیں۔ ''واصف علی واصف شخصیت و فن: چند نئے گوشے'' کا مقصد جہاں عنایت اللہ صاحب کی سوانح حیات اور ان کے علمی کارناموں کو سامنے لانا ہے، وہاں واصف علی واصفؒ کے حوالے سے ان کی یاداشتوں کو بھی سمیٹنا ہے تاکہ تاریخِ ادب کے وہ گوشے سامنے آسکیں جو ابھی تک پردہءاخفا میں ہیں۔ ہمارا مقصدِ تحقیق یہ بھی ہے کہ واصف علی واصفؒ کے قریبی ساتھیوں علامہ یوسف جبریلؒ اور عنایت اللہ کی یادداشتوں، مضامین اور تحریروں کو بھی یکجا کیا جائے تاکہ واصفیات کے مطالعہ میں ایک نیا اضافہ کیا جاسکے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ علم و ادب کی دنیا میں سستی شہرت یا نام و نمود کے خواہاں لوگ چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہم خواہ مخواہ کسی کی بدنامی یا رسوائی نہیں چاہتے اور نہ ہی ہمارا مقصد اپنی علمیت کا سکہ جمانا ہے بلکہ ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ لوگوں کو تاریخ کا صحیح رخ متعین کرنے میں آسانی ہو سکے۔ پچھلے دنوں "فرمائش" کے نام سے ایک مصنف کی کتاب نظر سے گزری، جس میں ان کے مطالعاتی حاصلات شامل ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ واصفیات کے سلسلے میں یہ ایک عمدہ کتاب ہے۔ اس کتاب کے ذریعے واصف علی واصفؒ کی زندگی کے بہت سارے پہلو سامنے آگئے ہیں اور ان کے عقیدت

مندوں کے لئے بھی یہ کتاب ایک نادر و نایاب تحفہ ہے۔اس کتاب میں جہاں مصنف نے اپنی عقیدت کا والہانہ اظہار کیا ہے وہاں ان کے طرزِ تحریر میں بعض گنجلک یا ابہام زدہ پہلو بھی در آئے ہیں۔انہوں نے جلد بازی میں یا مصروفیات کے سبب بعض تاریخی حقیقتوں کو سمجھنے میں دانستہ یا نادانستہ بہت قابلِ گرفت اغلاط کر دی ہیں جن کی اصلاح کرنا بھی ہمارا مقصد ہے۔ہم واصف علی واصفؒ کے مخالفین یا مدافعین دونوں کی صف میں سے نہیں ہیں اور نہ ہی ہم واصفؒ کے مریدین میں شامل ہیں کہ ہم ان کی اندھی عقیدت میں ہفت افلاک کو چھو آئیں بلکہ ہم تو واصفؒ کے ادنیٰ سے قارئین ہیں کہ جو اُن کے افکار و نظریات کو سمجھنا چاہتے ہیں اور ہماری یہ خواہش ہے کہ ان کی زندگی کے وہ گوشے بھی مرتب ہو جائیں جو ابھی تک کسی کی نگاہ میں نہیں آسکے،"فرمائش" میں مصنف کا اسلوبِ تحریر جاذبِ نظر،پر کشش اور عقیدت مندانہ ہے،ایسا کیوں نہ ہو کہ فقراء اور اولیاء اللہ کے اثر میں آنے والے اچھے برے سب انمول نگینے بن جاتے ہیں۔اہلِ باطن سب کو محبت اور پیار کی دولت عطا کرتے ہیں۔ان کا مقصد تزکیہءِ باطن یا اصلاحِ نفس ہوتا ہے۔وہ دوسروں کی برائیوں کو نگاہ، توجہ اور فیض سے دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔وہ کسی کی عیب جوئی نہیں کرتے اور نہ ہی کسی کی ذات پر نکتہ چینی ان کا مقصود ہوتا ہے۔ان کے مریدین یا عقیدت مند دوسروں کی خامیوں کو تلاش نہیں کرتے بلکہ ہر انسان کو اپنے سے افضل سمجھتے ہیں۔ملایا صوفی میں واضح فرق ہی یہی ہے کہ ملا جنت کا لالچ اور دوزخ کا خوف پیدا کرتا ہے جب کہ صوفی ہر دو سے بے نیاز صرف رجوع الی اللہ کی تعلیم دیتا ہے۔ اگر اہلِ علم و دانش ان تاریخی حقائق پر غور کریں تو معلوم ہو گا کہ دنیا بھر کے گناہگار انہی کے دروازے پر پڑے نظر آتے ہیں۔واصف علی واصفؒ ایک ادیب، شاعر یا صوفی دانش ور ہی نہیں بلکہ ایک عام انسان بھی تھے۔ان سے بحیثیتِ انسان بہت سی کوتاہیاں بھی یقیناً سرزد ہوئی ہوں گی جنہیں جتانا یا ان کا ذکر کرنا بھی ہمارے نزدیک غیر اخلاقی فعل ہے۔ بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام کی زندگیاں ان کے مریدین کے لئے ہمیشہ سے عقیدت و احترام کا منبع رہی ہیں۔یہی وجہ ہے کہ ان بزرگانِ دین کی سوانح عمریاں اور تذکرے وافر مقدار میں ملتے ہیں۔ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کتب میں جہاں ان عظیم ہستیوں کی زندگی کے حالات و واقعات کا تذکرہ موجود ہو وہاں ان کے حوالے سے بعض ایسے پہلو بھی شامل کرنے ضروری ہیں جو تاریخِ ادب میں نئے اضافوں کا باعث ثابت ہوں۔اہل اللہ اپنوں اور غیروں سب کے ہوتے ہیں۔ان کی زندگی کا بنیادی تصور ہی یہی ہوتا ہے کہ وہ مخلوق کو خالق سے ملانے کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ایک مبتدی یا طالب علم کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ محض سنی سنائی یا گھڑی گھڑائی چند تاریخی صداقتوں کو دہرا دے اور یہ خواہش کرے کہ وہ ملک کا بڑا ادیب یا دانش ور قرار پائے گا، کیوں کہ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں کہ جن کا پیغام آفاقی اور ان کی شخصیت زمان و مکان کی قیود سے ماورا ہوتی ہے،انہیں سمجھنے کے لئے کم از کم اس پائے کا دانش ور ہونا ضروری ہے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم اس کے قریب قریب کی سطح پر موجود ہونا بھی اہم ہے۔یہ بھی ضروری ہے کہ ملکوں اور قوموں کی قیادت کرنے والے ان نابغہ روزگار افراد سے ایک گوناں محبت بھی ہو ۔روحانی شخصیات یا سلاسلِ تصّوف پر قلم اٹھانے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ آپ باقاعدہ طور پر تصّوف کے طالب علم رہے ہوں یا کم از کم اتنا تو ہو کہ آپ نے اس موضوع پر سیر حاصل مطالعہ کیا ہو،آپ کے قریبی احباب یا دوست بھی آپ کے بارے میں اچھی طرح جانتے ہوں کہ آپ کا ماضی کس قسم کے مشاغل میں صرف ہوا اور آپ حال میں کون کون سے مطالعات میں مصروف پائے گئے ہیں۔کیا آپ واقعی صاحبِ حال ہیں؟ کہ صاحبِ سرور و حال پر قلم اٹھا سکیں؟ کیا آپ یہ جانتے ہیں کہ تصّوف کی ارتقائی تاریخ کیا ہے؟ اور تصّوف کی اہم کتب کون کون سی ہیں؟ کیا آپ نے اس سے پہلے

تصّوف پر کوئی عملی کام بھی کیا ہے یا کہ نہیں؟ یہ سب امور آپ کی عزت و شہرت اور ناموری کے لئے ضروری ہیں۔ صاحبِ تصّوف کا مطالعہ صاحبِ تصّوف ہی کر سکتا ہے۔ ہم جیسے لوگ تو علم سمندر کے ساحل پر بیٹھے ہوئے وہ لوگ ہیں جو کنکریوں سے کھیل رہے ہیں۔ واصف علی واصفؒ پر بلاشک و شبہ سینکڑوں کام ہو چکے ہیں اور مزید بھی ہوں گے مگر زیرِ بحث کتاب میں بعض طالب علمانہ سطح کے مسائل بھی در آئے ہیں، جن کی درستگی ضروری ہے تاکہ کل کا محقق یہ نہ کہہ سکے کہ ہم نے علمی فریضہ ادا نہیں کیا۔ واصف علی واصفؒ کے قریبی احباب میں باباجی عنایت اللہ کا نام کسی سے بھی ڈھکا چھپا نہیں ہے مگر حیرت ہے کہ ان کے حوالے سے عقیدت مندانہ طرزِ اظہار کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ باباجی عنایت اللہ کا واصف علی واصفؒ سے انتہائی گہرا تعلق ہے۔ وہ پچاس کی دہائی میں آپ کے حلقہ ءارادت میں شامل ہوئے اور پچیس سال سے زائد عرصہ ان کی صحبت میں گزارا۔ باباجی عنایت اللہ ان کے سفر و حضر کے ساتھی ہیں۔ وہ ان کی زندگی کے کم و بیش ہر واقعے میں شریک رہے ہیں اور خود بھی سلسلۂ واصفیہ کے پاکستان بھر میں سب سے اہم اور بنیادی رکن ہیں۔ باباجی عنایت اللہ کے لئے فاضل مصنف کا نرم گوشہ کہیں بھی نظر نہیں آتا بلکہ اس پوری کتاب میں ان کے تعارف یا واصف علی واصفؒ کے تعلق کو سرے سے موضوع ہی نہیں بنایا گیا جو کہ سخت قابلِ گرفت امر ہے۔ حیرت ہے کہ واصف علی واصفؒ کی شخصیت اور افکار سے متعلق بنیادی ماخذ ہی کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ آخر ہم کس قسم کی تحقیق کر رہے ہیں اور کتابوں کی اشاعت سے ہمارا کیا مقصد ہے۔ واصف علی واصفؒ کی تمام کتابیں باباجی عنایت اللہ ہی نے شائع کروائیں اور وہی یہ مسودے خود پریس میں بھی دے کر آئے۔ یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بابا جی عنایت اللہ واصف علی واصفؒ سے اس حد تک قربت رکھتے تھے کہ نجی امور میں بھی ان سے مشورہ جاری رہتا تھا۔ انگلش کالج کے قیام سے لے کر ان کے وصال تک زندگی کا کوئی ایسا موقع نہیں ملتا کہ جس میں باباجی عنایت اللہ ان کے ساتھ شریکِ کار نہ رہے ہوں۔ حتیٰ کہ باباجی عنایت اللہ کو لاہور سے اسلام آباد گولڑہ موڑ پر منتقل ہونے کا مشورہ بھی واصف علی واصفؒ نے دیا تھا۔ آپ جس مکان میں رہائش پذیر ہیں اس کی جگہ دیکھنے کے لئے بھی واصف علی واصفؒ خود تشریف لائے تھے اور مکان کی تعمیر کے لئے رقم بھی انہوں نے ہی فراہم کی تھی۔ کیا ہمارے فاضل محقق ان تاریخی حقائق سے انکار کر سکتے ہیں؟ شاید ہر گز نہیں۔

حیرت ہے کہ کیا جمہوریت کے موضوع پر گیارہ کتابوں کے شہرۂ آفاق مصنف اور واصف علی واصفؒ کے قریبی ساتھی کا اتنا بھی استحقاق نہیں تھا کہ اس کی شخصیت اور اس کے علمی کارناموں پر تفصیل سے قلم اٹھایا جاتا۔ باباجی عنایت اللہ کی شخصیت اور ان کے کارناموں پر اشفاق احمد، بانو قدسیہ، کرنل غلام سرور، ڈاکٹر تصدق حسین، پروفیسر احسان اکبر، شورش ملک، علامہ محمد یوسف جبریل، ریاض حسین نقوی، رشید نثار، جنرل حمید گل، ملک فداءالرحمن اور بشیر الدین محمود جیسے لوگ قلم اٹھا چکے ہیں۔ باباجی عنایت اللہ واصف علی واصفؒ کے افکار و نظریات ہی کا تسلسل ہیں، کیوں کہ انہوں نے واصف علی واصفؒ کے ملی نکتۂ نظر کو اجتماعیت عطا کی ہے۔ وہ واصف علی واصفؒ سے اخذ و اکتساب کرتے ہوئے اسلامی اقدار و روایات اور نظریۂ پاکستان کے لئے کام کرتے رہے۔ ان کی زندگی کا مطمۂ نظر ہی دراصل اسلامی شورائی نظام کا قیام ہے۔ وہ الحاد و بے دینی اور فحاشی و عریانی کے خاتمے کے لئے عمر بھر کوشاں رہے۔ ان کی تحریروں کا علم و ادب میں کوئی مقام ہو یا نہ ہو ان کی اسلامیت اور انسانیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ باباجی عنایت اللہ نے قرطاس و قلم سے اپنا رشتہ استوار نہیں کیا بلکہ وہ اپنی انقلابی تحریروں اور باغیانہ طرزِ فکر کے ذریعے جداگانہ شناخت

رکھتے ہیں۔ باباجی عنایت اللہ سے کئے گئے ذاتی انٹرویوز اور ان کی واصف علی واصفؒ کی زندگی کے حوالے سے کی گئی گفتگو بھی شاملِ کتاب کی گئی ہے تاکہ تاریخِ ادب کے حوالے سے نئے گوشے ابھر کر سامنے آسکیں۔

واصف علی واصفؒ کرن کرن سورج میں رقم طراز ہیں:

1۔ غیر یقینی حالات پر تقریریں کرنے والے کتنے یقین سے اپنے مکانوں کی تعمیر میں مصروف ہیں۔

2۔ ہر فرد کے دل میں قوم کی خدمت کا جذبہ ہونا چاہیئے۔ جذبہ نیت سے ہے۔ نیت ایک علم ہے اور علم کے لئے ایک عمل ہے۔ عمل کے لئے میدانِ عمل ہے اور میدانِ عمل میں شریکِ عمل نیک نیت ہوں تو انجامِ عمل صحیح ہوگا۔ ہم سفر، ہم خیال نہ ہوں تو کامیابی نہیں ہوگی۔

3۔ مسلمان کے لئے اہلِ قرآن ہی ہونا کافی نہیں، حاملِ قرآنِ مبین کے ساتھ نسبت کا مضبوط ہونا بہت ہی ضروری ہے۔ قرآن کا اصول حضور اکرم ﷺ کی زندگی ہے یا یہ کہ حضور ﷺ کی زندگی اور قرآن کے اصولِ زندگی میں فرق نہیں۔ یہاں تک کہ نزولِ قرآن سے پہلے بھی حضور اکرم ﷺ کی زندگی اصولِ قرآن کے مطابق تھی۔

4۔ اللہ نے جس ملک، جس دور اور جس زبان میں آپ کو پیدا فرمایا ہے۔ اسی ملک، اسی دور اور اسی زبان میں آپ کو عرفان مل سکتا ہے۔

5 ۔ انسان لائحہء عمل یا نظریہ سے محبت نہیں کر سکتا۔ انسان صرف انسان سے محبت کر سکتا ہے۔

6۔ جو لیڈر نا اہل ہو، وہ اپنے رفقاء کا گلہ کرتا ہے۔ سورج کہلانے کا شوق ہو تو روشنی پیدا کرو۔

7۔ اپنی رعایا کے حال سے بے خبر بادشاہ سے بہتر ہے وہ گڈریا جو اپنی بھیڑوں کے حال سے باخبر ہو۔

8۔ اسلامی معاشرہ مسلمانوں کے طرزِ حیات کا نام ہے۔

9۔ قوم میں وحدت کا شعور پیدا کرنے کے لئے ہر سکول میں سندھی، پشتو اور پنجابی زبانیں لازمی کر دی جائیں۔ انگریزی سکولوں اور دینی مدرسوں کا نصاب یکساں کر دیا جائے ورنہ وہی کچھ ہوتا رہے گا جو ہو رہا ہے۔

10۔ زمان و مکان سے بے نیاز ہو کر خالقِ کون و مکاں کی تسبیح کرنے والے ہی حقیقی معنوں میں خلافتِ الہیٰہ کے حق دار کہلا سکتے ہیں۔

باباجی عنایت اللہ نے واصف علی واصف کے انہی افکار و نظریات کو اپنے تحت الشعور کا جزوِ لازمہ بنایا اور اپنی کتب میں اسی تسلسلِ فکر کو اجتماعیت بخشنے میں اپنا کردار ادا کرتے رہے۔

باباجی عنایت اللہ کی یادداشتوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔ شوکت محمود کنڈان کا ایک غیر مطبوعہ مضمون "فرمائش۔ دروغ گوئی کا پلندہ" بھی شاملِ کتاب کیا گیا ہے جو کہ سلسلہء واصفیات کے سلسلے میں ایک اہم دستاویز ہے۔ اس تاریخی دستاویز سے بھی تاریخِ ادب کے صحیح رخ متعین کرنے میں مدد ملے گی۔ "فرمائش" میں موجود طالب علمانہ حقائق کو دلائل و براہین سے رد کیا گیا ہے تاکہ واصف علی واصفؒ جیسے اپنے عہد کے معتبر صوفی شاعر اور دانش ور کی سوانح حیات اور ان کے افکار کو صداقتِ کلی کے آئینے میں سمجھا جا سکے۔

محترم جناب ڈاکٹر تصدق حسین کی کتاب "واصف علی واصفؒ، سوانح وافکار اور ظہیر بدر کا مقالہ بھی زیرِ مطالعہ رہا ہے۔ ہر دو کے تجزیاتی مطالعے کے ذریعے اس حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے کہ کیا ڈاکٹر تصدق حسین کا مقالہ ظہیر بدر کے مقالے کا چربہ ہے؟ مجھے حیرت ہوئی کہ فاضل مصنف اس دور کے معروف ترین اہلِ قلم، مترجم، مصنف، ادیب اور روحانی شخصیت ڈاکٹر تصدق حسین تک کے مقام و مرتبے سے مکمل طور پر ناشناسا ہیں۔ ڈاکٹر تصدق حسین نے کولمبیاء کی پیسیفک یونیورسٹی سے Nasim Hijazi life and works. کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی ہے۔ وہ اسی (۸۰) کے قریب کتب کے مصنف ہیں اور مقتدرہ قومی زبان کے ناظم دارالترجمہ رہے ہیں۔ مجھے یہ سمجھ نہیں آتی کیا ڈاکٹر تصدق حسین اور ظہیر بدر کے مقالے کا کوئی رشتہ ہے یا نہیں ہے؟ ڈاکٹر تصدق حسین کے بارے میں یہ سوچنا بھی غلط ہے کہ وہ علم و دانش اور شہرت و مقبولیت کی آخری منزل پر پہنچ کر ایسا بھی کر سکتے ہیں؟ یقیناً اس کا جواب نفی میں ہے کیوں کہ انہوں نے واصف علی واصفؒ سوانح وافکار خود اپنی ذاتی تحقیق و جستجو سے قلم بند کی ہے۔

واصف علی واصفؒ کی شاعری اور ان کے اخباری کالم اردو ادب میں زندہ جاوید حیثیت کے حامل ہیں۔ عصرِ حاضر کے پیچیدہ مسائل کی روشنی میں ان کی تحریروں کا فکری و فنی جائزہ بھی ہمارا موضوع ہو گا۔

علامہ محمد یوسف جبریل کا نام محمد یوسف اور تخلص جبریل تھا۔ آپ اعوانِ قطب شاہی تھے اور آپ نے نصف صدی سے زائد عرصہ علم و ادب کی بے لوث خدمت کی ہے۔ چوہدری عنایت اللہ ایک انٹرویو میں فرماتے ہیں کہ جب لاہور میں علامہ صاحب حضرت واصف علی واصفؒ کے پاس تشریف لاتے تھے تو محفل سج جاتی تھی۔ حضرت واصف علی واصفؒ روزانہ دروازے پر کھڑے ہو کر علامہ صاحب کا انتظار فرمایا کرتے تھے اور جب وہ تشریف لاتے تو بعض دفعہ اپنے ہاتھوں سے ان کو اور ان کے ساتھ ان کے بیٹے شوکت محمود اعوان کو چائے پلاتے۔ ان کے بیٹے شوکت محمود اعوان ان دنوں ایم اے او کالج لاہور میں ایف ایس سی کے طالب علم تھے۔ اس چائے میں اس قدر خلوص ہوتا تھا کہ جس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ جب علامہ صاحب روحانی شخصیات پر بولتے بالخصوص حضرت رومی، حضرت سلطان باہوؒ، حضرت اقبالؒ، ان کے چہرے پر ایک نئی روشنی نمودار ہوتی اور اس طرح وہ وقت بھی آگیا کہ حضرت واصف علی واصفؒ انگریزی لٹریچر کا راستہ بدل کر روحانیت کے دائرے میں آگئے۔ علامہ صاحب فرماتے تھے کہ "حضرت واصف علی واصفؒ ایک دن دنیائے روحانیت کا درخشاں ستارہ ہوں گے جو کبھی غروب نہیں ہو گا"۔ حالات نے وہی کچھ کر دکھایا۔ نعرۂ جبریل کی شاعری نے حضرت واصف علی واصفؒ پر گہرا اثر چھوڑا اور انہوں نے بھی شاعری کی جس میں روحانیت اعلیٰ درجے کی موجود ہے"۔

علامہ محمد یوسف جبریلؒ نے واصف علی واصفؒ کے حوالے سے چار مضامین قلم بند فرمائے ہیں، جن سے ان کے واصف علی واصفؒ کے ساتھ تعلقِ خاطر کا پتہ چلتا ہے۔ واضح ہو کہ دو مضمون اردو میں اور دو انگریزی میں ہیں۔ ہم نے گوشۂ جبریل میں ان چار مضامین کی شمولیت کر دی ہے تاکہ واصف علی واصفؒ اور علامہ محمد یوسف جبریلؒ کے حوالے سے علمی مباحث کھل کر سامنے آسکیں۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہر دو اہم مفکرینِ اسلام نے اپنے عہد کی نفسی و عصبی پیچیدگیوں کا حل تلاش کرنے کے لئے تلاش و جستجو کی۔ دونوں کا ذریعۂ اظہار مختلف ضرور ہے مگر فلسفہ یا نظامِ فکر ایک ہی ہے۔ دونوں مادیت، استحصال اور جبر و استبداد کو موضوع بناتے ہیں۔ دونوں ہی مادی آلائشات کا خاتمہ چاہتے ہیں اور دونوں ہی اس خطہ ءارضی پر محبت و

خلوص، اتحاد و یکجہتی اور پیار و یگانگت کے اصولوں کے فروغ کے خواہاں ہیں۔ ہم نے محض اندھی جذباتیت یا عقیدت کو بالائے طاق رکھتے ہوئے سائنٹفک حقائق کی روشنی میں دونوں مفکرین کا تقابل و تطابق بھی شامل مطالعہ کیا ہے تاکہ یہ پتہ چل سکے کہ ہر دور کے منتخبینِ خدا مخلوقِ خدا کے لئے کس قدر نرم گوشے رکھتے ہیں۔ میری دانست میں علامہ یوسف جبریل اور واصف علی واصفؒ کے حوالے سے یہ گوشہ جہاں تاریخِ ادب میں ایک نیا اضافہ ثابت ہوگا وہاں ہر دو مفکرینِ اسلام کی قرابت داری، بے لوث محبت واخوت کو بھی سامنے لانے کا باعث بنے گا۔

ڈاکٹر محمد عارف ٹیکسلا

گوشۂ واصف علی واصفؒ

سوانح و فکریات

اک حسنِ خُلق کا دلکش ہے آئینہ واصف
شعورِ منزلِ عرفاں کا راستہ واصف
وہ جبریل ہوں فیضان ہوں تصدق ہوں
یہ جانتے ہیں کہ روشن ہے اک دیا واصف
یہ کون لوگ تِری قبر کے مجاور ہیں
یہ کون ہیں کہ ہُوا جن سے تُو خفا واصف
عطا ہوئی ہے تجھے علم کی متاعِ کل!
اِسی لئے تو تیرا نام ہے بڑا واصف
جو اذن ہو تو نظر بھی ملے ہدایت بھی
نہ آشنا ہوئے کیوں لوگ یہ بتا واصف
وہ سر پہ سایہ فگن ہے شجر گھنا عارف
کڑکتی دھوپ میں تنہا کھڑا ہوا واصف
نہ آشنا ہوئے کیوں لوگ یہ بتا واصف

واصف علی واصفؒ کی زندگی پر ایک نئی تحقیق، شاہد محمود قاسمی صدر مریدِ اقبال فاؤنڈیشن (انٹرنیشنل) پاکستان:

یہ انتہائی اہم تحقیقی وادبی دستاویز، ''واصف علی واصف شخصیت وفن: چند نئے گوشے''، ایک معروف ترین صوفی دانشور حضرت واصف علی واصفؒ مرحوم کی صوفیانہ اور ادبی زندگی کے کچھ نہاں گوشوں، جن پر حالات اور زمانہ کی گرد پڑ چکی تھی، کو سامنے لانے کے لیے اور کچھ تاریخی مغالطوں کو دُور کرنے کے لیے ترتیب دی گئی ہے۔ بلاشبہ یہ موضوع کوئی آسان موضوع نہیں تھا بلکہ انتہائی کٹھن، صبر آزما اور ہنر آزما تحقیقی وعلمی سرگرمی کا متقاضی تھا کیونکہ اس سے قبل واصف علی واصفؒ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، ملک کے بڑے بڑے اور نامور لوگ اُن کی علمی بساط، متصّوفانہ حیثیت، روحانی مقام اور سوانحی پہلوؤں پر تنقید و تحقیق کے ڈول ڈال چکے ہیں۔ ایسے میں یہ کوئی آسان عمل نہ تھا کہ اس قدر معروف اور نابغۂ روزگار ہستی کے سوانحی حالات اور علمی وادبی بساط پر قلم اُٹھایا جائے، نہ صرف قلم اُٹھایا جائے بلکہ اس کاوش کا ماحصل ادبی دُنیا میں اپنا کوئی مقام بھی پیدا کر سکے۔ میں سمجھتا ہوں کہ فاضل محقق، انتہائی داد و تحسین کے بجا طور پر مستحق ہیں کہ بلاشک وشبہ اُن کی یہ کتاب علمی وادبی حلقوں میں اپنی جگہ ضرور بنائے گی اور تاریخِ ادب میں تادیر زندہ رہے گی۔

واصف علی واصف (15 جنوری 1929ء تا 18 جنوری 1993ء) گزشتہ صدی کے ایک معروف و ممتاز شاعر، کالم نویس، مصنف اور صوفی دانشور تھے۔ واصف صاحبؒ بریلی، بھارت میں واقع شاہ نیاز احمد چشتی قادری کے آستانہ عالیہ سے بیعت ہوئے، یوں واصفؒ صاحب کا تعلق بھی

سلاسلِ تصّوف کے ایک اہم ترین سلسلے، سلسلۂ چشتیہ سے بنتا ہے۔ یہ 1962ء کا واقعہ ہے کہ واصف صاحبؒ کے کالج میں طلباء اور دیگر آنے والوں کے لیے باقاعدہ لنگر کا اہتمام کیا جاتا تھا اور مہمانانِ گرامی کو باقاعدگی سے چائے بھی پیش کی جاتی تھی، جو صوفیائے کرام کا ہی شیوہ ہے اور کم و بیش ہر صوفی درگاہ پر آنے والوں کے لیے قیام وطعام کا بندوبست کیا جاتا ہے۔ کالج میں ہر شعبۂ زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد جن میں شاعر، ادیب، بیوروکریٹ، وکیل، سیاستدان، فقیر، ملنگ، مجذوب، درویش اور طالب علم اپنی اپنی بساط کے مطابق فیضانِ واصفیہ سے بہرہ مند ہوتے تھے۔

1978ء میں احباب کے پرزور اصرار پر واصف صاحبؒ کا پہلا مجموعہ کلام ''شبِ چراغ'' کے نام سے منظرِ عام پر آیا، جس کی تقریبِ رونمائی میں معتقدین و مقلدینِ واصف علی واصفؒ کی بڑی تعداد نے شرکت کی۔ اس کے بعد رشد و ہدایت اور وعظ و ارشاد کا باقاعدہ سلسلہ شروع ہو گیا کیونکہ لوگ واصف صاحبؒ کے ملفوظات سننا چاہتے تھے۔ یہ گفتگو ایک ''محفل'' کا روپ دھار گئی۔ یہ محفل ابتداء میں لکشمی چوک لاہور میں، پھر قذافی سٹیڈیم میں واقع جسمانی تربیت کے ادارے کے ہال میں منعقد ہونے لگی۔ واصف صاحبؒ نے ایک ہزار ایک راتیں مسلسل اس محفل میں روحانی لیکچرز دیے، جو اُن پر القاء ہوتے تھے۔ لوگ سوال کیا کرتے تھے اور واصف صاحب فی البدیہہ ان کے جوابات دیا کرتے تھے۔ واصف علی واصفؒ مرحوم کی رشحاتِ قلم میں ''کرن کرن سورج، قطرہ قطرہ قلزم، حرف حرف حقیقت، دل دریا سمندر، بات سے بات، گمنام ادیب، مکالمہ، ذکرِ حبیب ﷺ، دریچے، شبِ چراغ، بھرے بھڑولے، گفتگو'' وغیرہ وہ شاہکار ہیں جن میں انہوں نے بنی نوعِ انسان کے لیے نفسی اور عصبی پیچیدگیوں کا حل پیش کرنے کے ساتھ ساتھ تصّوف و معرفت اور حقیقت و آگہی کی کئی گنجلک اور پیچیدہ گتھیوں کو سلجھایا ہے۔

'' واصف علی واصفؒ شخصیت و فن: چند نئے گوشے ''بنیادی طور پر کچھ ایسی شخصیات کے بارے میں پیدا کیے جانے والے ابہام اور مغالطے دُور کرتی ہے، جو غالباً معلومات کی کمی یا پھر کسی تعصّب کی بنا پر سامنے لائے گئے تھے اور آج تک تاریخ کے ماتھے پر ایک بدنما داغ کی حیثیت سے نمایاں ہیں۔ ان شخصیات میں پروفیسر شوکت محمود کنڈان (برادرِ حقیقی واصف علی واصفؒ مرحوم)، حضرت علامہ محمد یوسف جبریلؒ، شوکت محمود اعوان، چوہدری عنایت اللہ المعروف باباجی عنایت اللہ، ڈاکٹر تصدق حسین (بسم اللہ سرکار) اور فیضان احمد وغیرہ شامل ہیں۔ ان سب شخصیات کا واصف صاحبؒ سے نہایت گہرا اور قریبی رشتہ و پیوند تھا۔ مصنفِ کتابِ ھذا، فاضل محقق جناب ڈاکٹر محمد عارف آن سب شخصیات سے قریبی روابط اور قرابت داری رکھتے ہیں، چنانچہ اس تحقیقی دستاویز میں اُن کی نگارشات کے درست اور مبنی بر حقیقت ہونے میں کوئی شائبہ باقی نہیں رہ جاتا۔ انہوں نے معلومات کے حصول کی خاطر مذکورہ تمام شخصیات سے متعدد بالمشافہ ملاقاتیں کیں، چوہدری عنایت اللہ المعروف باباجی عنایت اللہ سے اس موضوع پر کئی ایک طویل انٹرویوز کیے۔ یاد رہے باباجی عنایت اللہ صاحب وہ شخصیت ہیں، جو واصفؒ صاحب مرحوم کے سب سے زیادہ قریب رہے ہیں۔ وہ کم و بیش 30 برس تک واصفؒ صاحب کی رفاقتوں اور صحبتوں سے سرفراز ہوئے ہیں۔ وہ واصفؒ صاحب کے خادمِ خاص، محرمِ راز، ہم سفر، جلوتوں اور خلوتوں کے امین، اور نجی و ذاتی معاملاتِ زندگی میں بھی شریکِ کار رہے ہیں۔ وہ واصفؒ صاحب کی نجی و اجتماعی زندگی سے اس قدر آگاہ ہیں کہ جیسے علی بخش مرحوم، علامہ اقبالؒ کی نجی و اجتماعی زندگی سے آشنا تھے۔

میں سمجھتا ہوں ''واصف علی واصفؒ شخصیت و فن: چند نئے گوشے''، اعجاز الحق کی نیشنل بک فاؤنڈیشن سے شائع ہونے والی کتاب ''فرمائش'' کا مناسب ترین، مدلل ترین اور نہایت تسلی بخش جواب ہے۔ ''فرمائش'' میں واصف علی واصفؒ اور اُن کے نہایت قریبی کچھ لوگوں کے بارے میں اور واصف علی واصفؒ سے ان شخصیات کے تعلق و قرابت پر نہ صرف سوال اُٹھائے گئے ہیں بلکہ باقاعدہ غلط فہمیاں اور مغالطے پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر علامہ محمد یوسف جبریلؒ، شوکت کنڈان، ڈاکٹر الٰہی بخش وجدانی، سائیں اختر، شیخ وزیر علی، ڈاکٹر تصدق حسین اور بابا جی عنایت اللہ کے حوالے سے انتہائی سخت، غیر ادبی اور ناشائستہ الفاظ استعمال کرتے ہوئے بے جا تنقید کی گئی ہے اور حقائق کو مسخ کیا گیا ہے۔ حالانکہ علامہ محمد یوسف جبریلؒ اور واصفؒ صاحب کے درمیان نہایت عقیدت و احترام کا تعلق تھا۔ واصفؒ صاحب، علامہ صاحبؒ سے ملنے کی غرض سے خود لاہور سے چل کر نواب آباد، واہ کینٹ، اُن کی رہائش گاہ پر تشریف لائے۔ علامہؒ صاحب نے واصفؒ کی شاعری پر کئی مضامین لکھے، جو اخبارات و رسائل میں شائع بھی ہوئے ہیں۔ واصفؒ صاحب کی علامہ جبریلؒ سے عقیدت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے علامہ صاحب کو اپنے حق میں زندگی کی آخری خصوصی دعا (اس عارضی دنیا سے الوداع ہونے سے قبل) کرنے کی درخواست کی اور علامہؒ صاحب نے انتہائی طویل دعا فرمائی۔ اسی طرح ڈاکٹر تصدق حسین کی واصف صاحبؒ کی رُوحانی، علمی اور ادبی حیثیت پر کئی ایک تحاریر موجود ہیں اور نہایت محبت اور احترام کے رشتے کی شہادتیں بھی ملتی ہیں۔ خاص طور پر باباجی عنایت اللہ کی واصفؒ صاحب سے دیرینہ قرابت داری کا اس سے بڑھ کے اور کیا ثبوت ہوگا کہ باباجی عنایت اللہ حقیقی معنوں میں واصف علی واصفؒ کے جانشین ہیں اور واصف علی واصفؒ کی زندگی کے کم و بیش سبھی پہلوؤں پر اس قدر جانکاری رکھتے ہیں کہ اُن کو واصف علی واصفؒ پر اتھارٹی کہا جاسکتا ہے۔ پروفیسر شوکت محمود کنڈان، واصف صاحبؒ کے سگے چھوٹے بھائی تھے اور انہوں نے بھی ''فرمائش'' میں فراہم کردہ معلومات اور بیان کردہ واقعات کو طباعتی ادارے نیشنل بک فاؤنڈیشن، پاکستان کے نام ایک خط میں غلط اور بے بنیاد قرار دیا ہے۔

اُردو کی ادبی تاریخ میں ایسے ادیبوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے، جن کی تخلیقی، تنقیدی اور تحقیقی، سب انواع کی صلاحیتوں نے اُردو ادب کو نہ صرف متاثر کیا ہو بلکہ اُردو زبان کے ادبی امکانات میں وسعتیں بھی پیدا کی ہوں۔ ''واصف علی واصف علی واصفؒ شخصیت و فن: چند نئے گوشے'' کے مصنف ڈاکٹر محمد عارف آکا شمار بھی ایسے ہی محدود سے چند اد باء میں ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسے کثیر جہتی شاعر ہیں جو اپنے انتہائی بلند تخیل اور خداداد تخلیقی اُپج کے باعث اُردو شاعری کی ہر مروّجہ جہت میں تاثیر، دلکشی، حسنِ اداء، ندرت اور تروتازگی پیدا کر دینے کی قدرت رکھتے ہیں۔ اگر ڈاکٹر محمد عارف آکے تنقیدی شعور کی بات کی جائے تو وہ فن پارے کے نفسیاتی امکانات و محرکات کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے، فن کار کے عصری و ادبی شعور کی روشنی میں اُس کی تخلیق کے جمالیاتی پہلوؤں کا حد درجہ غیر جانبداری سے محاکمہ کرتے ہوئے کوئی فیصلہ صادر کرتے ہیں۔ گویا اُن کی تنقید نگاری میں نفسیاتی، عمرانی، جمالیاتی اور تاثراتی دبستانوں کے اثرات واضح طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے محققانہ رجحانات بھی نہایت عمدہ اور مثالی ہیں۔ وہ اُردو کے اُن چند محققین میں سے ہیں جو اپنے حد سے بڑھے ہوئے جنون اور جذب و شوق کے ہاتھوں مجبور ہو کر نظر انداز کیے جانے والے یا فراموش کردہ ادبی آثار و امکانات کو منظرِ عام پر لانے کی خاطر انتہائی جاں سوز و جاں گداز عملِ تحقیق کو بخوشی اپنا لیتے ہیں۔ ''واصف علی واصف شخصیت و فن: چند نئے گوشے''، اس کی ایک روشن ترین مثال ہے۔ یہ ایک ایسا نادر و نایاب موضوع ہے کہ شاید عام قدکاٹھ کا کوئی تساہل پسند محقق

اس کو کبھی اختیار نہ کرتا لیکن ڈاکٹر محمد عارف نے اس بظاہر غیر اہم دکھائی دینے والے موضوع پر انتہائی باریک بینی اور سنجیدگی سے کام کر کے نہ صرف مسخ شدہ تاریخی حقائق کے حقیقی خدوخال کو اجاگر کیا ہے بلکہ واصف علی واصفؒ جیسے نابغۂ روزگار شخصیت پر مزید تحقیق کی نئی راہیں بھی کھول دی ہیں۔

'' واصف علی واصف شخصیت و فن: چند نئے گوشے'' میں دراصل حقائق کی تحقیق کی گئی ہے، جو تحقیقی سرگرمیوں میں سب سے مشکل سرگرمی ہوتی ہے۔ فاضل محقق نے اپنے وسیع تر مطالعات، موضوع پر گرفت، محققانہ مزاج اور ذوقِ تحقیق کی تنوع پسندی کے باعث اس تحقیقی منصوبے کو ایک الگ سی علمی شناخت عطا کی ہے۔ انہوں نے نہایت متوازن اسلوب اختیار کرتے ہوئے بڑی سلیقہ مندی اور ہنر مندی سے ایک عظیم صوفی دانشور اور اُس کے متعلقین و متوسلین کے چہروں پر پڑی ہوئی گرد کو یوں صاف کیا ہے کہ تمام روشن چہرے مزید منور ہو گئے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں واصف علی واصفؒ جیسی عظیم روحانی شخصیت پر اس قدر گراں مایہ کام کرنے کی توفیقات فاضل محقق کو اُن کی تصّوف و روحانیت سے ذاتی دلچسپیوں اور میلانات کے باعث عطا ہوئیں کیونکہ شروع سے ہی وہ متصّوفانہ موضوعات سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اُنہوں نے اپنا ڈاکٹریٹ کا انتہائی جامع اور وقیع مقالہ ''اُردو زبان وادب کے فروغ میں صوفیائے چشت کا کردار'' جیسے منفرد موضوع پر لکھا ہے۔

فاضل محقق نے زیرِ نظر کتاب میں اپنے محققانہ جوہر دکھانے کے ساتھ ساتھ اپنی ناقدانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ بھی واصف کی پنجابی شاعری پر ایک نہایت جامع اور شاندار تنقیدی مضمون لکھ کر کیا ہے۔ یہ مضمون پنجابی شاعری پر واصف کے متصّوفانہ نقوش کو بڑی خوبصورتی سے اجاگر کرتا ہے۔ ''واصف علی واصف شخصیت و فن: چند نئے گوشے'' اپنے موضوع، مواد اور پیش کش کے اعتبار سے ایک منفرد ادبی دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے، جس سے اُردو ادب کے طالب علموں پر واصف علی واصفؒ کی ہمہ جہت شخصیت کے کچھ ایسے گوشے اور پہلو آشکار ہوتے ہیں، جو اس سے قبل پردۂ اخفاء میں پڑے ہوئے تھے۔ میں ڈاکٹر محمد عارف کی اس گراں مایہ علمی و تحقیقی کاوش کا خیر مقدم کرتے ہوئے دعا گو ہوں کہ اللہ کریم اُن کی علمی و فکری دسترس میں ڈھیروں برکتیں عطا فرمائے آمین ثم آمین رب العالمین۔ (شاہد محمود قاسمی)

مقامِ واصف سے ناآشنائی، کتاب فرمائش، مرتّبہ اعجاز الحق، سماوات پبلی کیشنز لاہور سے اقتباس:

ہم سفر واصف علی گرد سفر رہ گئے
مجھ کو احساسِ ندامت یوں سرِ منزل رہا

واصف صاحب پر لکھی جانے والی کتب میں سے ایک میں الٰہی بخش وجدانی صاحب کے حوالے سے حضرت بختیار کاکیؒ سے فیض کا ذکر موجود ہے۔ وجدانی صاحب کا بیان اس طرح رقم ہے، ''جب ہم بختیار کاکیؒ کے مزار پر پہنچے تو یہاں بھی واصف نے مراقبہ کیا۔۔۔۔۔ چنانچہ میں سمجھ گیا کہ خواجہ صاحب کی توجہ واصف پر ہو گئی ہے۔''

اس واقعہ کے مستند ہونے کے بارے میں مجھے قدرے اختلاف ہے، میں بڑے وثوق سے کہتا ہوں کہ اس واقعہ کی صحت مشکوک ہے۔ ہوا یوں کہ ایک روز میں واصف صاحب کی خدمت میں حاضر تھا۔ آپ نے مجھے الماری سے فوٹو البم نکالنے کا کہا۔ میں نے وہ فوٹو البم الماری سے نکال کر

آپ کے سامنے رکھ دی اور خود اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔ آپ اس البم کو کھول کر دیکھنے لگ گئے۔ تصاویر دیکھتے ہوئے ایک تصویر پر رک گئے۔ میں سامنے کی کرسی پر بیٹھا تھا، مجھے اپنے پاس بلا کر وہ تصویر دکھائی جو کسی مزار پر اتاری گئی ایک گروپ فوٹو تھی۔ اس تصویر میں کسی مزار پر تعویذ لحد کے سامنے واصف صاحب لوگوں کے درمیان میں دستار باندھے کھڑے ہیں۔ چہرے پر کسی سنجیدہ کیفیت کے آثار ہیں۔ وجدانی صاحب اس تصویر میں واصف صاحب کے بائیں جانب رکوع کی حد تک جھکے ہوئے، کیمرے کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وجدانی صاحب کی مسکراہٹ سے بظاہر ایسا اندازہ ہوتا ہے جیسے اُن کو کوئی شرارت سوجھ رہی ہو۔ ممکن ہے تصویر بنواتے وقت وجدانی صاحب تاخیر سے پہنچے ہوں اور جلد بازی میں اس طرح کا پوز بن گیا ہو۔ یہ گروپ فوٹو دکھاتے ہوئے آپ نے فرمایا، ''میری دستار بندی کے وقت یہ تصویر لی گئی [1] (آپ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے عرس کے موقع پر وفد کی صورت میں دہلی گئے۔ اس وفد کے امیر آپ مقرر ہوئے۔ حضرت نظام الدین اولیاء کے مزار پر آپ کی دستار بندی ہوئی۔ اس تقریب کی تصویریں بنائی گئیں)۔۔۔۔۔۔ اس طرح مجھے اجمیر شریف سے فیض ملا اور یہ بات کسی اور کو نہ بتانا۔''

مجھے جن رموز کا بیان کرنا منع فرمایا ان ہی کے حوالے سے 1986ء سے لے کر آخر تک مجھ سے یہ فرمائش کیا کرتے تھے کہ چلو اجمیر شریف زیارت کر آئیں اور ہم لوگ پروگرام بناتے رہتے تھے۔ زیارات کے حوالے سے ایک پروگرام عمرہ کرنے کا بھی تھا کہ ایران، عراق سے ہوتے ہوئے عمرہ کریں۔ بہر حال اجمیر شریف کی حاضری کے لئے متعدد مرتبہ خواہش کا اظہار فرمایا۔

حضرت بختیار کاکیؒ کے حوالے سے جو سب سے قوی دلیل ہے وہ یہ کہ واصف صاحب کے معتقدِ خاص جہانگیر صاحب نے میری توجہ اس جانب مبذول کرائی کہ واصف صاحب نے شبِ چراغ میں حضرت بختیار کاکیؒ پر کچھ نہیں لکھا۔ ترتیب اس طرح سے ہے کہ حمد سے شروع کیا ہے۔ اس کے بعد نبی کریم ﷺ کے حضور نعت پیش کی ہے، پھر حضرت علیؓ کی منقبت لکھی ہے۔ اس کے بعد جناب امام حسینؓ کی عظمت اور تعریف بیان فرمائی ہے۔ آپؓ کے بعد حضرت عثمان بن جلابیؒ گنج بخش کی عظمت بیان کی گئی ہے اور پھر حضرت معین الدین چشتیؒ کی شان میں ہدیۂ عقیدت پیش کیا گیا ہے اور حضرت فرید الدین گنج شکرؒ کی تعظیم بیان کی گئی ہے۔ اس ترتیب سے آخر میں حضرت امیر خسروؒ سے نسبت ظاہر کی گئی ہے۔ یہ کتاب واصف صاحب نے خود مرتب کی اور دوبارہ اس میں ترمیم اور اضافہ بھی آپ نے خود ہی کیا۔ اسی طرح اپنا پنجابی کلام ''بھرے بھڑولے'' بھی آپ نے خود ترتیب دیا۔ اس میں تازہ اشعار بھی شامل کیے۔ پنجابی کلام میں بھی حضرت بختیار کاکیؒ کا تذکرہ نہیں ہے۔ حتٰی کہ ''کرن کرن سورج''، ''دل دریا سمندر''، ''قطرہ قطرہ قلزم'' اور ''حرف حرف حقیقت'' میں بھی کہیں ذکر موجود نہیں جو الٰہی بخش وجدانی صاحب کے بیان پر دال ہو۔ وجدانی صاحب جس فیض کا ذکر حضرت بختیار کاکیؒ کے حوالے سے کرتے ہیں، واصف صاحب کے کلام و بیان میں اس کا اظہار کہیں نہیں ملتا۔ ایسا ممکن ہے کہ انٹرویو کے دوران کہنے سننے میں کوئی فرق آگیا ہو۔

حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے عرس کی تقریبات میں شرکت کی غرض سے پاکستان سے جو وفد گیا واصف صاحب اس کے امیر مقرر ہوئے۔ حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے آستانے پر ہی ان کی ملاقات حضرت سید محمد تقی عرف عزیز میاںؒ سے ہوئی اور وہیں ان سے بیعت کر لی۔ اگر حضرت بختیار کاکیؒ سے فیض کی بات ہے تو پھر اس نئی بیعت کے کیا معنی ہوئے؟ ممکن ہے یہ حکایت ''چراغ تلے اندھیرا'' کے مصداق ہو۔

مجھے احوال اکٹھا کرنے اور ان کی جانچ پرکھ کے لئے بہت دشواری کا سامنا رہا۔ داستان گوئی کے شوقین حضرات نے اپنی مرضی سے کئی باتیں گھڑ لیں۔ ایسی اختراعات کے پسِ پردہ ان غرض مندوں کے اپنے مقاصد ہیں۔ ان کا شمار ''تھوڑے سے دنیاوی فائدے کے لئے دین بیچنے والے'' لوگوں میں ہوتا ہے۔ قرآن میں واضح فرمان ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یَکۡتُمُوۡنَ مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ مِنَ الۡکِتٰبِ وَ یَشۡتَرُوۡنَ بِہٖ ثَمَنًا قَلِیۡلًا ۙ اُولٰٓئِکَ مَا یَاۡکُلُوۡنَ فِیۡ بُطُوۡنِہِمۡ اِلَّا النَّارَ وَ لَا یُکَلِّمُہُمُ اللّٰہُ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ وَ لَا یُزَکِّیۡہِمۡ صلے ۚ وَ لَہُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ ۝ ترجمہ :۔ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی اُتاری ہوئی کتاب چھپاتے ہیں اور اُسے تھوڑی تھوڑی سی قیمت پر بیچتے ہیں۔ یقین مانو کہ یہ اپنے پیٹ میں آگ بھر رہے ہیں قیامت کے دن ان سے اللہ تعالیٰ بات بھی نہ کرے گا، نہ انہیں پاک کرے گا، بلکہ ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ (2-البقرہ-174)

اس امر کی وضاحت کے واسطے چند اصحاب کی کارستانیاں یہاں درج کرتا ہوں تاکہ پڑھنے والوں اور تحقیق نگاروں کو واقعات کی جانچ پرکھ میں سہولت ہو۔

الٰہی بخش وجدانی صاحب نے کریڈٹ کیش کرانے کی کوشش کی مگر خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھا سکے۔ واصف صاحب کی طبعی زندگی میں وجدانی صاحب نے انہیں محترم نہیں جانا، پس از وصال بہت سی من گھڑت باتیں کہہ ڈالیں۔ واصف صاحب کے ساتھ سلوک میں ہمیشہ انہیں نیچا دکھانے کی کوشش کرتے رہے اور وہ لحاظ کرتے رہے۔ موصوف کا رویہ ہمیشہ تضحیک آمیز رہا واصف صاحب کے انتقال کے بعد جو بیانات دیئے ہیں، ان میں اپنی اہمیت اجاگر کرنے کی سعی کی ہے۔ ایک ملاقات کا تو میں خود گواہ ہوں کہ کس طرح طنزیہ انداز میں باتیں کرتے رہے۔

جن دنوں آپ علیل تھے تو الٰہی بخش وجدانی صاحب آپ کی عیادت کی غرض سے تشریف لائے۔ وہ جب کمرے میں داخل ہوئے تو آپ اپنے گھر کے بڑے ہال کمرے میں پلنگ پر تشریف فرما تھے۔ حاضرین آپ کے سامنے قالین پر مؤدب ہو کر بیٹھے ہوئے تھے۔ وجدانی صاحب کے لئے چائے منگوائی گئی۔ ایک نوجوان نے چائے پیش کی تو دوسرے نے مٹھائی اور بسکٹ حاضر کر دیئے۔ وہاں پر موجود نوجوانوں کی کارکردگی سے خصوصی تقدس کا عنصر خاصا نمایاں تھا۔ وجدانی صاحب نے اس ماحول کو محسوس کر کے سوال کے انداز میں طنزیہ طور پر یہ بات کہی کہ واصف صاحب نے آسودگی کا کافی سامان اکٹھا کر لیا ہے۔ یعنی دنیاوی سہولتوں کے لئے بہت محنت کر رکھی ہے۔ اس پر واصف صاحب نے یہ جواب دیا۔ ''تم یہ سمجھتے ہو کہ میں نے اس طریقے پر مالی فوائد حاصل کیے ہیں۔ ایسی بات نہیں ہے، میں تو جنازے کے لئے لوگ اکٹھے کر رہا ہوں۔''

سائیں اختر لاہور انگلش کالج نابھہ روڈ کے دور سے واصف صاحب کا شناسا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ واصف صاحب کو پیر صاحب دیول شریف سے بیعت ہونے کے لئے اس نے راہ دکھلائی تھی۔ اس شخص کا واصف صاحب کے ساتھ تعلقات کا بھی عجب معاملہ ہے۔ یہ شخص گجرات کے علاقے کا ڈوم ہے۔ اس کے آباؤاجداد ٹونے ٹوٹکے اور دیگر عملیات کیا کرتے تھے۔ کہیں سے اس کو واصف صاحب کے بارے میں پتہ چل گیا اور یہ آپ کے پاس آگیا۔۔۔ بعد میں اس نے آپ کے خاندان کے دوسرے لوگوں سے اور آپ کے پاس آنے جانے والوں سے بھی تعلقات استوار کر لئے۔ اپنے آپ کو قلندر کہتا ہے، مزید یہ کہ سلسلہ قادریہ سے فیض کا داعی ہے۔ یہ شخص حرص وہوس کا مارا ہوا روایات کو مسخ کر کے اور اپنی بڑائی ثابت کرنے کی

کوشش میں حقائق سے پہلو تہی کرتا رہا۔ واصف صاحب کا کوئی جاننے والا اپنی کسی عزیزہ کی شادی آپ سے کرنے کا خواہش مند ہوا۔ آپ نے واضح انکار کر دیا۔ وہ اس تحقیق میں پڑ گیا کہ انکار کا باعث کیا ہے۔ بہت پیچھا کیا مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔ آخر کار اس نے اسی ڈوم سے کہا، قلندر بادشاہ! ذرا پتہ تو لگاؤ کہ واصف صاحب کا کسی اور لڑکی سے کوئی تعلق تو نہیں۔ اس راز کو پانے کے لئے اس نام نہاد قلندر نے بڑے جتن کیے مگر کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ اپنی ناکامی کی وجہ سے چڑ کر بعض اوقات بھری محفل میں واصف صاحب کو تنگ کرتا کہ میرا علم کہتا ہے آپ نے خفیہ شادی کر رکھی ہے۔ واصف صاحب اس کوئی جواب نہ دیتے۔ نوبت یہاں تک آئی کہ وہ آپ کے شاگردوں سے بھی اس بارے میں دریافت کرتا رہا بلکہ یوں کہنا زیادہ موزوں ہے کہ تفتیش کرتا رہا۔

ایک دن ایک شاگرد (جو خود متگار بھی تھا) کی خاطر تواضع کر کے راز معلوم کرنے کی سعی کر رہا تھا کہ اس شاگرد کو شرارت سوجھی۔ اس نے ایسا انداز اپنایا جیسے وہ یہ راز جانتا ہو۔ نقلی قلندر کا شک یقین میں بدلنا شروع ہو گیا۔ اس نے شاگرد کی خوشامد بھی کی اور لالچ بھی دیا۔۔۔۔۔۔ شاگرد نے واصف صاحب کو ساری صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ واصف صاحب اس وقت نہ جانے کس کیفیت میں تھے، شاگرد سے کہنے لگے، ''اسے جا کر کہو! واصف نے فلاں نام کی عورت سے نکاح کر رکھا ہے اور اس کے بطن سے تین بیٹیاں ہیں۔'' شاگرد نے ایسا ہی کیا۔ اب کیا تھا، وہ ڈوم پھولے نہیں سماتا تھا۔ اپنی دانست میں وہ راز پا گیا جس کے لئے مارا مارا پھرتا تھا۔ جن لوگوں نے اس کو واصف صاحب کے پیچھے لگایا تھا، انہیں بھی جا کر اس بات سے آگاہ کیا اور پھر اس کا معمول بن گیا کہ ہر محفل میں یہ قصہ بیان کر کے اپنے علم کی بڑائی یوں جتاتا، '' میرے علم کا زور دیکھو، میں نے اپنی مخفی طاقت سے واصف کی چوری پکڑ لی ہے۔ اس نے کسی عورت سے نکاح کر رکھا ہے اور اب تک یہ تین لڑکیوں کا باپ بن چکا ہے۔ '' واصف صاحب اس زمانے میں باوجود یکہ جلالی طبیعت کے تھے انتہائی تحمل سے اس کو بات مکمل کرنے دیتے اور کسی قسم کا جواب نہ دیتے اور پھر اسی طرح سال بھر کا عرصہ گزر گیا۔

واصف صاحب کے وصال کے بعد ایک دن میں نے ان کے ایک صحبت نشیں سے سنا کہ واصف صاحب قرآن پاک کی تجوید سیکھنے شیخ وزیر علی صاحب کے پاس قصور جاتے رہے ہیں۔ مجھے اس بات پر حیرت ہوئی کیونکہ میں جانتا تھا کہ واصف صاحب نے قرآن پاک اپنے والد ماجد سے پڑھا ہے اور قرأت و تلفظ سے بخوبی آگاہ ہیں۔ قرآن خوانی کے حوالے سے میں نے آپ کی زبانی کئی واقعات سن رکھے ہیں۔ راجہ تصدق حسین نے واصف صاحب کے حوالے سے ایک کتاب مرتب کی۔ اس کتاب میں متعدد قسم کی ضعیف حکایات درج تھیں اور پھر یہ بیان بھی درج تھا کہ واصف صاحب قرآن پاک سیکھنے اور سمجھنے وزیر علی کے پاس قصور جاتے رہے ہیں۔ اس خرابی کی وجہ یہ تھی کہ موصوف نے ایک ایسے شخص پر انحصار کیا جو واصف صاحب کے ساتھ تو رہا لیکن روایات کے بیان کے لحاظ سے انتہائی غیر معتبر ہے۔ اس کا جب جی چاہے واقعے کا رخ بدل دیتا ہے۔ سکینڈل بنانے میں یدِ طولیٰ رکھتا ہے۔ شیخ وزیر علی کو پس از مرگ پیر بنانے میں ان کے بیٹے اور اس شخص کا بہت ہاتھ ہے۔ ان لوگوں کے اپنے مقاصد ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ واصف صاحب مرتبے میں ہیں اور ان کا نام استعمال کر کے آسانی سے شہرت حاصل کی جا سکتی ہے۔

ایک روز واصف صاحب نے میرے ساتھ شیخ وزیر علی صاحب کا ذکر خیر کیا، ''شیخ وزیر علی بہت نیک سیرت انسان ہیں۔ وہ بہت بڑے خوش الحان تھے اور میں ان سے تلاوت قرآنِ پاک سننے قصور جاتا رہا ہوں۔ وہ بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ قرآنِ مجید پڑھتے تھے اور ان کا پڑھنا پُرتاثیر تھا۔'' شیخ وزیر علی صاحب کی واصف صاحب سے عقیدت کا یہ حال تھا کہ لاہور انگلش کالج نابھہ روڈ میں واصف صاحب نے جو کتیا پال رکھی تھی اس کے لئے وہ بطور خاص حلوائی کی دکان سے برفی لاتے اور اس کتیا کو اپنے ہاتھ سے کھلاتے۔ ایک مرتبہ واصف صاحب مجھے ان سے ملانے کے لیے ان کی ورکشاپ میں لے گئے جو مال روڈ پر واقع تھی۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے بڑے ہی خلیق صفت انسان تھے۔

ٹیکسلا میں علامہ محمد یوسف جبریلؒ صاحب ہوتے ہیں۔ انہوں نے کریڈٹ حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ واصف صاحب کی رحلت کے چند ماہ بعد میں عنایت صاحب کے گھر گیا تو وہاں میری ملاقات علامہ صاحب کے بڑے بیٹے سے پہلی بار ہوئی۔ واصف صاحب کا ذکرِ خیر ہوا تو موصوف نے بیان کیا، ''میرے والد صاحب فرماتے ہیں، واصف کو میں نے جس کام پر لگایا وہ اس نے مکمل کر لیا جبکہ میرے ذمہ جو کام تھا، میں ابھی اس سے فارغ نہیں ہوا۔ میرا کام مکمل ہونا ابھی باقی ہے۔'' مجھے یہ بیان سن کر حیرت تو ہوئی مگر میں خاموش رہا۔ دل میں سوچ رہا تھا کہ مجھے واصف صاحب نے علامہ صاحب کے بارے میں ایک قصہ سنایا تھا، جو علامہ صاحب کی صداقتِ فکر کے حوالے سے سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ واصف صاحب نے میری تربیت کے دوران Commitment پر قائم رہنے کی مثال دیتے ہوئے یہ قصہ سنایا تھا۔ اس قصے کا ذکر بھی ہو جائے۔ واصف صاحب نے بتایا:

''ایک روز یوسف جبریل صاحبؒ میرے پاس آئے اور بتایا کہ وہ بے روزگار ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ان کی ضرورت تیس روپے ماہانہ ہے۔ اگر اتنے مشاہرے میں کہیں انتظام ہو جائے تو بہت کافی ہو گا۔ میں نے انہیں تسلی دی اور کہا کہ تھوڑی مہلت دیں، انشاءاللہ انتظام ہو جائے گا۔ چند دن بعد ایک متمول گھرانے سے ان کے بچے کو ٹیوشن پڑھانے کا سندیسہ آیا۔ میں نے یوسف جبریل صاحبؒ کو اطلاع کی اور وہ وہاں پڑھانے لگے۔ ایک ماہ بعد انہیں اس ٹیوشن کے عوض ایک سو بیس روپے ملے۔ وہ پیسے ہاتھ میں لیے میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ کل سے وہاں ایسا آدمی بھیج دیجئے گا جس کی ضرورت ایک سو بیس روپے کی ہو۔ میں نے پوچھا، کیا ہوا؟ بولے کہ انہوں نے مجھے ایک ماہ ٹیوشن پڑھانے کے ایک صد بیس روپے عنایت کیے ہیں جو میرے لئے زیادہ ہیں۔ میری ضرورت تو صرف تیس روپے ہے لہٰذا کل سے میں وہاں نہیں جاؤں گا اور پھر تیس روپے نکال کر باقی رقم مجھے دے دی۔ میں نے پوچھا کہ میں اس کا کیا کروں تو کہنے لگے کہ اسے آپ ہی رکھیں، میں نے اپنی ضرورت کے پیسے لے لئے ہیں۔ وہ پیسے میرے حوالے کر کے چلے گئے اور پھر اس کے بعد وہاں ٹیوشن پڑھانے نہیں گئے۔''

میں ان کے بیٹے کی زبانی علامہ یوسف صاحب کا بیان سن کر متعجب ہوا کہ علامہ صاحب جوانی میں کیسے تھے اور اب پیرانہ سالی میں کیسے ہو گئے ہیں۔ معاشرے میں جب واصف صاحب کی بڑائی ثابت ہو گئی تو اسے اپنے حق میں استعمال کرنے سے ذرہ برابر نہیں چوکے۔ کچھ مدت بعد جب ظہیر بدر کو انٹرویو دیا تو اس میں ایک بیان یہ بھی تھا، '' واصف کو میں نے شاعری پر لگایا تھا۔'' یعنی واصف صاحب نے یوسف جبریل صاحب کے کہنے پر شاعری میں طبع آزمائی کی۔

میری ملاقات اہلِ قلم میں سے ایک شخصیت سے ہوئی۔ موصوف تیس کتابوں کے مصنف تھے۔ میں نے ان سے واصف صاحب کا ذکر کیا۔ میں نے پوچھا، آپکا واصف صاحب کے بارے میں کیا خیال ہے؟ وہ بولے، چھوڑو یار! کسی Priest کے بارے میں بات کرو، کسی پنڈت کا قصہ کرو، کسی ملاں کی بابت کہو، کسی کاہن کو دیکھو۔ یہ واصف صاحب اسی قبیل کے ہیں۔ بزرگ لوگ اور طرح کے ہوتے ہیں اور پھر داتا صاحب کی مثال دی اس کے بعد علامہ اقبال صاحب کے بارے میں سیر حاصل بحث کی مگر واصف صاحب کو حلقۂ درویشاں سے خارج کیا۔

اپنے روحانی احوال کی بابت واصف صاحب اپنے والد صاحب کے بارے میں بتاتے ہیں کہ انہوں نے راہ سلوک میں آپ سے تعاون کیا۔ آپ فرماتے ہیں:

''باباجی مجھ سے مطمئن تھے۔ میں اگر رات گھر سے باہر بھی گزار دیتا تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ وہ اس بات سے باخبر تھے کہ میں درست سمت سفر کر رہا ہوں۔ میری دلجوئی فرماتے۔ میرے مشاغل کو کبھی شک کی نگاہ سے نہ دیکھا۔''

رشتہ داروں میں آپ کے والد صاحب کے علاوہ کسی دوسرے کو آپ کے بارے میں کچھ علم نہ تھا۔ تمام رشتہ دار کیا چھوٹے کیا بڑے سب آپ کو بھائی جان کہہ کر پکارتے تھے، سبھی آپ کے دیگر فضائل اور صفات سے نابلد تھے بلکہ اکثر تو منکر بھی تھے۔ ایک روز آپ کے بہنوئی آپ کے گھر فردوس کالونی آئے تو آپ نے اپنے شاگرد سے کہا:

''یہ لوگ میرے اس شعبے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ ان کے لئے میں صرف بھائی جان ہوں۔ آپ احتیاط کرنا!''

اسی طرح کسی موقع پر فرمایا:

'' میرے گھر والے مجھے استاد سمجھتے ہیں، انہیں میرے روحانی احوال کا مطلقاً علم نہیں۔ ان کے لئے میں ایک ٹیوشن پڑھانے والا ٹیچر ہوں۔''

واصف صاحب کا ایک عقیدت مند ان کے کہنے پر ان کے رشتہ دار ڈاکٹر کے پاس گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے پوچھا کہ اسے مرض کا علم کیسے ہوا؟ عقیدت مند نے جواب دیا کہ واصف صاحب نے اس مرض کی نشاندہی کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس بات پر چونکے۔ چند ایک سوالات کیے اور پھر اس عقیدت مند کو اپنے بزرگوں کے بارے میں چیدہ چیدہ معلومات فراہم کیں مگر واصف صاحب کو صاحب ولایت نہ مانا بلکہ تصّوف میں دیگر اعزہ کی فوقیت آپ پر ثابت کرتے رہے۔

ایک روز آپ اپنے شاگرد کو ساتھ لے کر اپنے ماموں جان سے ملنے ان کے گھر گئے۔ شاگرد کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر آپ دوسرے اہلِ خانہ سے ملنے اندر تشریف لئے گئے۔ تھوڑی دیر بعد آپ کے ماموں جان اس شاگرد کے پاس آئے اور کہا، ''واصف تمہارا دوست ہے، اچھا شریف آدمی ہے۔ نیک اخلاق ہے، نماز بھی پڑھتا ہے۔ اگلی منزل بڑی کٹھن ہے، اس کے لئے پوری تیاری کرے۔ تم اس کے دوست ہو، اس سے کہو کہ نماز باجماعت پڑھا کرے اور شرع کے مطابق داڑھی رکھے۔''

رحلت سے دو روز قبل آپ نے کاشف محمود کے رشتے کا فیصلہ کیا۔ آپ کے قریبی رشتہ دار نے کہا کہ بھائی جان کا دماغ چل گیا ہے۔ انہوں نے یہ رشتہ کسی اور سے طے کرنا تھا، دماغی حالت ٹھیک نہ ہونے کے باعث کچھ اور فیصلہ کر بیٹھے ہیں۔

واصف صاحب کا مؤقف:

جن صاحبان کو واصف صاحب سے دوستی کا دعویٰ تھا دراصل وہ لوگ واصف صاحب کی اس زمانے میں شعوری حالت اور باطنی کیفیت سے ناآشنا رہے۔ اگر کسی نے دوست سمجھا تو اس کا بھرم رکھا۔ لوگوں کو تو دوستی کا گمان تھا مگر واصف صاحب کا مؤقف ان حضرات کے بارے میں مختلف ہے۔ واصف صاحب اپنی ذات کی حد تک دوستی اور برابری کے تعلق کی نفی کرتے ہیں۔ اس موضوع پر بات کرتے ہوئے انہوں نے اپنے بچپن کا واقعہ سنایا:

''ایک روز میرے ساتھ کھیلنے والے دوستوں میں سے ایک نے راہ چلتے ہوئے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھا جو مجھے ناگوار گزرا۔ میں نے فوراً اس لڑکے کا ہاتھ جھٹک دیا۔ جھٹکا اتنا شدید تھا کہ وہ گر پڑا۔''

آپ نے برملا نجی گفتگو میں اس بات کا اظہار فرمایا: ''میرا کسی سے بھی برابری کا تعلق نہیں ہے۔''

(کتاب فرمائش، مرتّبہ اعجاز الحق، سماوات پبلی کیشنز لاہور سے اقتباس۔ صفحہ نمبر 45 تا صفحہ نمبر 53)

واصف علی واصفؒ کی سوانح حیات، روزنِ دیوار سے، عطاالحق قاسمی:

واصف علی واصفؒ ہمارے دور کی ایک صاحبِ کمال شخصیت تھے۔ مجھے ان کی محفل میں بیٹھنے کا صرف دو دفعہ اتفاق ہوا۔ ایک مرتبہ اشفاق احمد کے گھر پر اور دوسری مرتبہ ایم اے او کالج میں اور یہ دوسری محفل خود میں نے سجائی تھی۔ اس کے علاوہ دسیوں مرتبہ ان سے ملاقات ہوئی، وہ 1970ء کی دہائی کی ابتداء میں ایم اے او کالج میں اپنے دوستوں سے ملنے آیا کرتے اور یوں ان سے ملاقات ہو جاتی تھی، مگر اس وقت تک ان کی باطنی کیفیت کے چرچے عام نہیں ہوئے تھے۔ متذکرہ ملاقاتوں کے دوران بے تکلفی پیدا نہیں ہوئی، کیونکہ وہ اکثر خاموش بیٹھے رہتے تھے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ انہی دنوں ایک اور بڑی روحانی شخصیت پروفیسر رفیق اختر بھی ایم اے او کالج میں میرے کولیگ تھے، مگر واصف علی واصفؒ اور رفیق اختر (رفیق اختر کو ہم جوگی کہتے تھے) دونوں اس امر سے ناواقف تھے کہ چند گز کے فاصلے پر ایک ایسی شخصیت تشریف فرما ہے جو آنے والے دنوں میں مرجع خلائق بننے والی ہے، بہرحال اشفاق صاحب کی محفل میں ملاقات کے بعد واصفؒ صاحب سے میرا حقیقی رابطہ استوار ہوا جس کی تفصیلات میں اپنے ایک کالم میں بیان کر چکا ہوں۔

میں واصفؒ صاحب کے علم و دانش اور ان کی بے پناہ خوبصورت گفتگو کے اسیروں میں سے ہوں۔ میں نے اپنی زندگی میں طریقت اور شریعت کے حوالے سے اتنے تخلیقی جملے واصفؒ صاحب کے سوا کسی اور سے نہیں سنے۔ ان کی شخصیت دلوں کو موہ لینے والی تھی۔ ان کے حلقہ ارادت میں بہت نامور دانشور بھی شامل تھے جس میں اشفاق احمد سرِ فہرست ہیں۔ اسی طرح حنیف رامے، منو بھائی اور اکرام چغتائی بھی ان کی دانش سے فیض اٹھاتے رہے ہیں۔ اکرام چغتائی سے میری دوستی بہت پرانی ہے۔ ادبی تحقیق میں انہیں ایک ممتاز مقام حاصل ہے، چنانچہ گزشتہ ہفتے انہوں نے اعجاز الحق صاحب کی تصنیف ''فرمائش'' مجھے عطا کی اور ساتھ ہی اس کی تقریبِ رونمائی میں اظہارِ خیال کی فرمائش بھی کر ڈالی۔ اس طرح کی

فرمائشوں سے میری جان جاتی ہے لیکن کتاب پڑھی تو میرا اپنا دل بھی اس پر اظہارِ خیال کے لئے مائل ہوا کہ یہ کتاب اپنے اندر بہت سے سوال اور بہت سے جواب رکھتی ہے۔ ''فرمائش'' واصف علی واصف ؒ کی سوانح حیات ہے۔ اپنے دوست مرزا عبدالقیوم کی طرح مجھے بھی سوانحی ادب سے بہت دلچسپی ہے، کیونکہ آپ اس کتاب کی وساطت سے بیٹھے بٹھائے وہ زندگی بھی گزار لیتے ہیں جو صاحبِ سوانح نے گزاری ہوتی ہے۔ آپ خود کو اس کے ساتھ چلتے پھرتے محسوس کرتے ہیں۔ اس کی باتیں سنتے ہیں اور اس کی خوشیوں اور غموں میں شریک ہوتے ہیں، تاہم یہ سوانح ایک ایسے شخص کی تھی جو ایک صوفی کے طور پر جانے جاتے ہیں، چنانچہ مجھے خدشہ تھا کہ کہیں اس میں بھی واصف ؒ صاحب کو ایک مافوق الفطرت شخصیت کے طور پر نہ پیش کیا گیا ہو، کیونکہ میں نے ایسی کچھ سوانح پڑھی ہیں جن میں صاحبِ سوانح کرامتوں کے بوجھ تلے دب کر رہ گئے تھے لیکن اعجاز الحق صاحب نے واصف ؒ صاحب کو اپنی اس تصنیف میں ویسا ہی پیش کیا ہے جیسے وہ تھے۔ علم و دانش کے پیکر، انسانوں سے محبت کرنے والے، ان کی رہنمائی کرنے والے اور اس کے ساتھ ساتھ پاکستان سے عشق کرنے والے۔ مجھے یاد ہے جب میں نے ایم اے او کالج میں انہیں مدعو کیا تو وہاں انہوں نے جو گفتگو کی اس میں دو باتیں مجھے خصوصاً بہت خوبصورت لگیں۔ پہلی بات یہ کہ پاکستان نور ہے اور نور کو زوال نہیں، دوسری بات بھی بے پناہ خوبصورت تھی ''خوش نصیب وہ ہے جو اپنے نصیب پر خوش ہے'' میں نے اپنے اخبار کے کلر ڈایڈیشن میں یہ گفتگو شائع کی جس کی شہ سرخی پاکستان کے نور ہونے کے حوالے ہی سے تھی۔

اعجاز الحق صاحب نے اپنی زیرِ نظر کتاب میں روایات کے حوالے سے کافی حد تک احتیاط برتی ہے، چنانچہ انہوں نے سنی سنائی باتیں نہیں کہیں، اگر کہیں ان کا ذکر بھی کیا ہے تو اس کے ساتھ اپنا وضاحتی نوٹ لکھ دیا ہے، تاہم اس کتاب میں مجھے دو تین باتیں کھٹکی ہیں جو دو واقعات کے حوالے سے ہیں، چونکہ اعجاز صاحب نے ان واقعات کا راوی خود واصف ؒ صاحب کو قرار دیا ہے لہٰذا ضروری ہے کہ اعجاز صاحب اپنے ذہن پر زور دیتے ہوئے یاد کرنے کی کوشش کریں کہ آیا وہ واقعہ ویسا ہی تھا جیسے انہوں نے بیان کیا ہے یا انہیں سننے یا سمجھنے میں غلطی لگی ہے۔ ان میں سے ایک واقعہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی ؒ سے واصف صاحب کی ''ملاقات'' کا ہے اور دوسرے کا تعلق حضرت داتا گنج بخش ؒ سے ہے۔ ان واقعات کی تفصیل میں جانا مناسب نہیں، کیونکہ بزرگانِ دین کی بابت کچھ لکھتے ہوئے بے حد احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ امید ہے اعجاز صاحب ان دو واقعات کے ضمن میں اپنی یادداشت کو از سرِ نو بروئے کار لائیں گے۔ اسی طرح ایک قول اعجاز صاحب نے قبلہ واصف صاحب سے منسوب کیا ہے جو کچھ یوں ہے کہ ''میرے لئے کما کر کھانا حرام ہے اور تمہارے لئے مانگ کر کھانا جائز نہیں'' یہ قول دوسری وجوہات کے علاوہ اس لئے بھی محلِ نظر ہے کہ میں واصف ؒ صاحب کی اس جدوجہد کا چشم دید گواہ ہوں جو انہوں نے ایک طویل عرصے تک رزقِ حلال کے حصول کے لئے جاری رکھی بلکہ اعجاز صاحب نے خود بھی اس کی تفصیل بیان کی ہے۔ اسی طرح کی ایک دو روایات اور بھی مجھے کھٹکی تھیں جو اس وقت یاد نہیں آ رہی، تاہم ان باتوں کی نشاندہی ضروری تھی کہ اعجاز الحق صاحب نے زیرِ نظر کتاب کی تصنیف پر بے حد محنت کی ہے اور تحقیق کے اصولوں کو حتی الامکان نظرانداز نہیں کیا۔ وہ ان بے شمار لوگوں میں سے ایک ہیں جو اپنے مرشد واصف علی واصف ؒ سے محبت نہیں عشق کرتے ہیں اور یہ عشق لہو کی طرح ''فرمائش'' کی رگ رگ میں بھی رواں دواں نظر آتا ہے جس سے اس کتاب کی حیثیت ایک زندہ وجود کی مانند ہو گئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ واصف علی واصف ؒ کے سدا بہار ذکر کر کے ساتھ ساتھ یہ کتاب خود بھی سدا بہار ہو گئی ہے اور یوں آنے والے محققین واصف صاحب کے بارے میں کچھ لکھتے ہوئے اسے نظرانداز نہیں کر سکیں گے۔

فصل 1۔ واصف علی واصفؒ، سوانح حیات:

واصف علی واصفؒ کی سوانح حیات پر متعدد کتب تحریر کی جا چکی ہیں۔ سینکڑوں مضامین زیورِ اشاعت سے آراستہ و پیراستہ ہو کر ان کے مریدین کے پاس محفوظ ہیں۔ جوں جوں واصف علی واصفؒ کی شخصیت اور ان کے علمی کارناموں کا سحر عامتہ الناس کے اذہان و قلوب میں راسخ ہوتا جا رہا ہے، ان کی ذات میں لوگوں کی دلچسپیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ واصف علی واصفؒ صاحبِ کرامت بزرگ ہوں یا نہ ہوں ان کی زندگی ایک مشن کے تحت ضرور گزری ہے۔ انہیں ایک مبلغِ اسلام، واعظ، دانش ور یا فلسفی ضرور قرار دیا جا سکتا ہے۔ واصف علی واصفؒ کی سوانح حیات کے بارے میں اعجاز الحق کی مرتّبہ کتاب ''فرمائش''، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد کے زیر اہتمام 2009ء میں چھپی۔ اعجاز الحق علمی و ادبی دنیا میں اس سے پہلے نہ دیکھے نہ سنے، نہ ہی ان کی کوئی کتاب نظر سے گزری اور نہ ہی ان کا کوئی مضمون پڑھنے کو ملا ہے، نہ ہی وہ کوئی ایسے غیر معمولی محقق ہیں اور نہ ہی نقاد ہیں کہ ان کے افکارِ زرین سے علم و ادب کو کوئی خاص فائدہ ہو رہا ہو، اعجاز الحق ایک نوآموز اہلِ قلم ہیں۔ نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد کے پلیٹ فارم سے شائع ہونے والی یہ کتاب مجموعہ تضادات ہے، کیوں کہ اس میں گنجلک پیرایہء اظہار، بے جا تفاخر و تکبر، ذاتی فضیلت و علمیت، روحانی شخصیات کی کردار کشی، علمِ تصّوف سے عدمِ واقفیت، روحانیت اور فیوض و برکات سے محرومی صاف نظر آتی ہے۔ "فرمائش" اس حوالے سے تو شاید اہمیت کی حامل ہو کہ اس میں واصف علی واصفؒ کی سوانح حیات کا تذکرہ موجود ہے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ یہ سوانح حیات واصف علی واصفؒ کی حیاتِ مبارکہ کو الجھا دینے کی ایک سازش نظر آتی ہے۔ واصف علی واصفؒ کی زندگی ایک صاف، شفاف، آئینے کی طرح روشن شب و روز پر مشتمل ہے۔ ان کے خاندان کے قریبی افراد ابھی تک بقیدِ حیات ہیں اور وہ ان کے متعلق بہ احسن و خوبی جانتے ہیں۔ اس کتاب کی اشاعت کے فوراً بعد واصف علی واصفؒ کے حقیقی چھوٹے بھائی پروفیسر شوکت محمود کنڈان نے چیئرمین نیشنل بک فاؤنڈیشن کو ایک خط لکھ کر اس کتاب کے مندرجات پر روشنی ڈالتے ہوئے تحریر کیا:۔

محترم جناب چیئرمین نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد

السلام علیکم! مزاجِ گرامی! گذشتہ دنوں انٹرنیٹ پر مختلف احباب کو ایک ای میل موصول ہوئی ہے جس میں آپ کے موقّر ادارے کا حوالہ دے کر اعجاز الحق نے اپنی کتاب "فرمائش" کا تعارف اور سرورق منسلک کیا ہے۔

محترمی! یہ کتاب 2002ء میں منظر عام پر آئی تھی اور اب غالباً اس کتاب کے دوسرے ایڈیشن کی اشاعت آپ کے ادارے کے توسط سے کروائی جا رہی ہے۔ درحقیقت یہ سوانح نگاری کے پیرائے میں لکھی ہوئی ایک متنازعہ نوعیت کی کتاب ہے۔ اس میں شامل بیشتر مواد، علم و ادب اور روحانیت کے حوالے سے معتبر شخصیات پر تہمت، بہتان طرازی اور کردار کشی کے زمرے میں آتا ہے۔ اس کتاب کے مندرجات میں قبلہ واصف علی واصفؒ کے معتقدین و محبین سمیت آپ کے اہلِ خاندان کے جذبات کو شدید مجروح کیا گیا ہے۔ اس کے پہلے ایڈیشن کے منظر عام پر آتے ہی 2002ء میں آپ کے دسویں سالانہ عرس کے موقع پر میں نے ایک تفصیلی مضمون لکھ کر اعجاز الحق کی دروغ گوئی کو آشکار کیا تھا۔ اس ضمن میں حقائق سے آگاہی کے لئے منسلک صفحات میں متذکرہ مضمون کی تلخیص پیشِ خدمت ہے۔ قبلہ واصف علی واصفؒ کا بھائی ہونے کی حیثیت سے یہ میرا خاندانی فریضہ ہے کہ میں حقائق کے منافی واقعات کی فی الفور تردید کروں تاکہ مستقبل کے مورخین کسی کنفیوژن کا شکار نہ ہو پائیں اور یہ فریضہ مجھ پر دو طریقے سے عائد

ہوتا ہے کیوں کہ قبلہ واصف علی واصفؒ کی شخصیت ایک ملکی سرمایہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بین الاقوامی حیثیت بھی رکھتی ہے۔ بنا بریں، گذارش ہے کہ اس کتاب کی اشاعت و ترسیل کا کام فوری طور پر منجمند کر دیا جائے کیوں کہ اہلِ خانہ مصنف کے خلاف قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتے ہیں۔

والسلام، مخلص ،پروفیسر شوکت محمود کنڈان (برادرِ خورد حضرت واصف علی واصفؒ)

پروفیسر شوکت محمود کنڈان واصف علی واصفؒ کے حقیقی بھائی ہیں۔آپ نے انہیں کے زیر سایہ رہ کر تعلیم و تربیت کے مراحل طے کئے ہیں۔پروفیسر شوکت محمود کنڈان نے کبھی اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی واصف علی واصفؒ کے نام و مقام سے کسی قسم کا کوئی فائدہ اٹھایا ہے بلکہ وہ ایک ایسے درویش ہیں جو گوشہ گمنامی میں پڑے ہوئے زندگی کے دن بسر کر رہے تھے۔پروفیسر شوکت محمود کنڈان نے ایم اے کرنے کے بعد محکمہ تعلیم میں بحیثیتِ لیکچرار اردو اپنی ملازمت کا آغاز کیا اور گورنمنٹ ڈگری کالج سیٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی سے ریٹائر ہوئے۔پروفیسر شوکت محمود کنڈان اپنے بڑے بھائی واصف علی واصفؒ کے عمر بھر قریب رہے ہیں۔واصف علی واصفؒ راولپنڈی آتے تو وہ ہمیشہ انہی کے ہاں قیام پذیر ہوتے۔ واصف علی واصفؒ نے شوکت محمود کنڈان کی علمی و ادبی تربیت میں اہم کردار ادا کیا ہے۔شوکت محمود کنڈان خود بھی ایک اچھے مقالہ نگار تھے۔واصف علی واصفؒ کی شخصیت و فن پر ان کے کئی مضامین چھپ چکے ہیں۔وہ واصف علی واصفؒ کے برادرِ خورد ہی نہیں بلکہ ان کے روحانی فرزند بھی ہیں۔ واصف علی واصفؒ نے انہیں روحانی مقام حاصل کرنے میں بھی رہنمائی فراہم کی۔وہ انہیں ایک ایسا نابغہ ءروزگار اور کامل فرد دیکھنا چاہتے تھے جو خاص بنے اور عام رہے۔واصف علی واصفؒ خود بھی تو لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہی رہے ہیں۔یہ تو سرکاری ڈیوٹی تھی جو انہوں نے وعظ و ارشاد کی صورت میں انجام دی ہے۔پروفیسر شوکت محمود کنڈان کی زندگی میں واصف علی واصفؒ کا عکس نظر آتا ہے۔وہ محبت اور اخلاص کا ایک ایسا پیکر ہیں کہ دور دور تک ان کا کوئی ثانی نہیں ملتا۔پروفیسر شوکت محمود کنڈان نے واصف علی واصفؒ کی زندگی پر لکھی گئی اس مضحکہ خیز کتاب پر چیں بہ جبیں ہو کر خامہ فرسائی کی، شور برپا کیا، مگر ایوانِ اقتدار میں ان کی شنوائی نہ ہوئی۔ طویل عرصہ گزر جانے کے باوجود پروفیسر شوکت محمود کنڈان کا مضمون "فرمائش۔دروغ گوئی کا پلندہ" ابھی تک نہیں چھپ سکا۔ حیرت ہے کہ ہم لوگ سچ لکھنے اور سچ بولنے کی عادت سے کتنے دور ہیں؟ مجھے اس موقع پر ضلع اٹک کے سلطان محمود بسمل کا ایک قطعہ یاد آرہا ہے جو میں آپ کی نظر کرتا ہوں:۔

بڑا عجیب سا منظر دکھائی دیتا تھا
ہر ایک شخص اسی کی دہائی دیتا تھا
محل کے سامنے اک شور تھا قیامت کا
امیر شہر کو اونچا سنائی دیتا تھا

پروفیسر شوکت محمود کنڈان کا مضمون ''فرمائش: دروغ گوئی کا پلندہ'' پڑھنے کے بعد محترم اعجاز الحق صاحب کی علمیت و استدلالیت کی حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ محترم اعجاز الحق صاحب نہ تو کوئی شاعر، نہ ادیب نہ دانش ور، ان کی یہ کتاب قلم برداشتہ اور دل برداشتہ کی گئی تحریر نظر آتی ہے۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے انہوں نے یہ عظیم کارنامہ بہ جبر و اکراہ یا کسی کے کہنے پر انجام دیا ہے۔کتاب میں تحقیق و جستجو کی شدید کمی پائی جاتی ہے۔ محض

چند روایات یا واقعات کو منتخب کر لینے یا بعض شخصیات کی شہرت، عزت اور نیک نامی سے خائف ہو کر ان کی کردار کشی پر اتر آنے سے علم و ادب کی دنیا میں نہ تو نام کمایا جا سکتا ہے اور نہ ہی عزت حاصل ہو سکتی ہے۔

اگر ہم اردو کی علمی و ادبی تاریخ پر نظر ڈالیں تو بے شمار ایسی کتب نظر آتی ہیں جو بعض کتابوں کے جواب میں تحریر کی گئی ہیں یا نئے حقائق کو سامنے لاتی ہیں۔ یہ انتہائی ضروری ہے کہ کتاب کے اسلوب میں شائستگی، تہذیب، سنجیدگی اور وقار پایا جائے۔ اب یہ تو کسی طرح بھی درست نہیں ہے کہ آپ تلواریں سونت کر کھڑے ہو جائیں اور دوسروں کو بے جا تنقید کا نشانہ بنانا شروع کر دیں یا بلند پایہ روحانی شخصیات کی کردار کشی آپ کا شیوہ بن جائے۔ واصف علی واصفؒ کے حوالے سے سب سے پائیدار اور معتبر رائے ان کے چھوٹے بھائی شوکت محمود کنڈان کی ہے۔ پروفیسر شوکت محمود کنڈان اپنے مضمون "فرمائش۔ دروغ گوئی کا پلندہ" میں لکھتے ہیں کہ :۔

جن پتھروں کو ہم نے عطا کی تھیں دھڑکنیں
ان کو زباں ملی تو ہمیں پر برس پڑے

میں ادب کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں اور کم و بیش پینتیس سال کالج میں درس و تدریس کے شعبے سے منسلک رہا ہوں۔ مجھے ادیب ہونے کا دعویٰ نہیں مگر سچے اور جھوٹے ادیب کو بے نقاب کرنے کی استعداد ضرور رکھتا ہوں۔ حق و باطل میں تمیز کرنے کی یہ صلاحیت قبلہ واصف علی واصفؒ (بھائی جان) کی تربیت کا فیض ہے۔ ایک طرفہ ستم یہ ہے کہ اعجاز الحق نہ کوئی شاعر ہے نہ ادیب اور نہ کوئی دانش ور، یہ اس کی زندگی کی پہلی (اور شاید آخری بھی) کتاب ہے۔ جو سوانح نگاری کے پیرائے میں لکھی گئی ہے مگر یہ سوانح نگاری کی مبادیات سے بھی کوسوں دور ہے۔ "فرمائش" پڑھ کر فوری احساس یہ ہوتا ہے کہ اس کا مصنف محض ایک سستی شہرت حاصل کرنے کا متمنی ہے۔ قبلہ واصف علی واصفؒ کے ساتھ یہ شخص 1983ء کے بعد منسلک ہوا تھا۔ اس سے پہلے کے واقعات کی تفصیلات محض لوگوں سے سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہیں جن کی کوئی سند یا حوالہ نہیں۔ سوانح نگاری میں کسی راوی کی سند تحریر کئے بغیر کسی واقعے کا ذکر کرنا ایک جرم سے کم تصور نہیں کیا جاتا۔ اعجاز الحق کی کتاب "فرمائش" میں کچھ ایسے بے سر و پا واقعات سامنے آئے ہیں جن کے متعلق عوام الناس کو آگاہ کرنا قبلہ واصف علی واصفؒ کے برادرِ خورد ہونے کی حیثیت سے میرا فرضِ اوّلین ہے۔ درحقیقت کسی شخصیت پر قلم اٹھا کر اور اپنے تعلق کو بنیاد بنا کر اس کی کردار کشی کرنے سے انسان کا قد بلند نہیں ہو جاتا۔ قد کی بلندی انسان کے اپنے کردار سے وابستہ ہے۔ اعجاز الحق نے "فرمائش" لکھ کر ایک پیشہ ور کتاب فروش کا حق ادا کر دیا ہے مگر آپ کی صحبت کے فیض سے یکسر محرومی کا اعلان بھی کیا ہے۔ دراصل یہ شخص اردو بازار میں "کشمیر کتاب گھر" کے نام سے درسی کتب کے ٹیسٹ پیپر اور گیس پیپرز بیچنے کا کاروبار کرتا تھا۔ نہ جانے اس کے جی میں کیا آئی کہ یکایک اپنے آپ کو ادیب سمجھ بیٹھا اور اٹھ کر "سوانح نگاری" کی طرف چل پڑا۔ قبلہ واصف علی واصفؒ کا ایک قول ہے :۔ "خاموشی دانا کا زیور ہے اور احمق کا بھرم"۔ اگر اعجاز الحق "فرمائش" نہ لکھتا تو اس کے تعلق کا بھرم قائم رہتا لیکن اس نے سستی شہرت حاصل کرنے کے شوق میں اپنا بھانڈہ خود ہی پھوڑ دیا، دراصل اس شخص نے یہ کتاب لکھ کر واصفؒ صاحب کے ساتھ اپنے تعلق کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے حالانکہ قبلہ

واصف صاحبؒ کی محفل میں ایسے لوگ بھی شامل ہوتے تھے جن کے بارے میں آپ فرمایا کرتے کہ "ان کو جتنی دیر میں اپنے پاس بٹھائے رکھتا ہوں مخلوقِ خدا ان کے شر سے محفوظ رہتی ہے، میرا منصب یہی ہے"۔

صفحہ نمبر 12 میں اعجاز الحق کو اپنے آپ کو ایک گواہ کے طور پر پیش کیا ہے اور لکھا ہے کہ "میں نے جو کچھ دیکھا من و عن بیان کر دیا"۔ اعجاز الحق سے کوئی پوچھے کہ تیری گواہی تو 1983ء کے بعد کی ہے اس سے پہلے کے واقعات پر بغیر کسی ثبوت اور سند کے قلم اٹھانے کی جرأت کرنا سمجھ سے بالاتر ہے۔ صفحہ نمبر 15 پر "ولادت" کے عنوان سے مضمون میں ایک عجیب تضاد موجود ہے۔ پیدائش کے بارے میں حقائق کا بیان اور شجرہ کی فراہمی مجھ سے منسوب کی گئی ہے جو بالکل غلط ہے۔ اس بارے میں مستند رائے کوئی اور ہے۔ اسی طرح صفحہ نمبر 16 پر "جشنِ ولادت" کے حوالے سے ایک نوٹ دیا گیا ہے جس میں خاندان کی مالی حیثیت کو بھی چیلنج کیا گیا ہے کہ واصف صاحب کا خاندان مالی لحاظ سے اتنا خوش حال نہ تھا کہ تین دن تک جشن برپا رہتا۔ یہاں اعجاز الحق کے لئے اور عام قاری کے لئے عرض ہے کہ قبلہ والد صاحب "میو سکول آف آرٹس"، (موجود این سی اے) سے فارغ التحصیل تھے اور انٹر کے بعد آپ نے گورنمنٹ ہائی سکول میں ملازمت اختیار کی۔ یہ 1924ء کی بات ہے اور اس وقت آپ کا مشاہرہ ایک صد (100 روپے) ماہانہ تھا۔ 1920ء کی دہائی میں ایک صد روپے ماہانہ کی قدر و قیمت سے لوگ بخوبی آگاہ ہیں۔ زندگی بڑی خوش حال تھی اور گھر میں دودھ دینے والے جانور بھی موجود تھے۔ ہمارے خاندان کی روایات میں شامل ہے کہ خوشی ہو یا غمی اس کا اختتام قوالی پر ہوتا ہے۔ کیوں کہ ہمارا خانوادہ سلسلہء چشتیہ سے وابستہ ہے اور قوالی ہمارے لئے ایک مذہبی حیثیت رکھتی ہے۔ لہذا واصف صاحب کی پیدائش پر بھی قوالی کا اہتمام کیا گیا۔ خوشی کا موقع تھا اس لئے اسے "جشن ولادت" کا نام دینا بے جا نہ ہوگا۔ اعجاز لحق کے پراگندہ ذہن میں جشن کا مفہوم ہی غلط ہوگا، اس لئے اس کو غلط رنگ دینا اس سے کچھ بعید نہیں۔ اعجاز الحق کا "جشن" صرف دولت کا مرہونِ منت ہے۔ اعجاز الحق نے ایک اور غلط بیانی بھی کی ہے کہ عارف صاحب (قبلہ والد صاحب) کے فرزندِ اول محمد آصف تھے۔ یہ غلط ہے۔ محمد آصف کا درجہ چوتھا درجہ آتا ہے۔ ترتیب یوں ہے:۔ پہلے بڑی ہمشیرہ پھر واصف صاحب، اس کے بعد ایک اور ہمشیرہ اور پھر محمد آصف، جن کا بچپن میں وصال ہو گیا تھا۔ اسی صفحہ پر نانا مرحوم مولوی محمد امین صاحب کا ذکر ہے۔ آپ بہت بڑے معلمِ قرآن، حافظ اور واعظ تھے۔ آپ اس زمانے میں ایم اے بی ایڈ تھے۔ آپ کا وعظ سننے کے لئے بہت لوگ آیا کرتے تھے۔ آپ نے نیلا گنبد والی مسجد میں بھی وعظ فرمایا۔ آپ بہت بڑے عالم و شاعر تھے۔ آپ کا کلام محفوظ ہے۔ آپ نے 1938ء میں بمقام چھوٹا شملہ بطورِ صدر مسلم لیگ قائدِ اعظم کی خدمت میں منظوم سپاس نامہ پیش کیا جو میرے پاس محفوظ ہے۔

صفحہ 17 میں چند سالوں کا ذکر ہے جن کے بارے میں لکھا گیا کہ "نامعلوم حالات سے دوچار رہے"۔ اس طرح اکیس سالوں کو گوشہء گمنامی میں ڈال دیا، حالانکہ یہی سال ان کی شخصیت سازی کا دور ہے۔ واصف صاحب کی شخصیت ایک کھلی کتاب کی مانند تھی۔ میں نے ان کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو دیکھا ہے، ان کے شب و روز بھی دیکھے ہیں، ان کا حال بھی دیکھا، ان کا قال بھی دیکھا۔ یہ کہنا کہ ان کی شخصیت کے پہلو مخفی بھی ہیں سراسر غلط ہے۔ اگر وقت نے مہلت دی تو اس پر قلم اٹھاؤں گا انشاءاللہ۔ اعجاز الحق کا المیّہ یہ ہے کہ وہ جو بات بھی کرتا ہے ساتھ ہی اس کی نفی بھی خود ہی کر دیتا ہے۔ مثلاً ایم اے کی بات کی اور پھر صفحہ 20 پر نفی کر دی۔ اسی طرح روزگار اور لاہور انگلش کالج کے قیام کے بارے میں بہت تضاد ہے۔

اعجاز الحق نے کہیں بھی کوئی بات وثوق کے ساتھ نہیں کی اور وہ کر بھی نہیں سکتا تھا کیوں کہ سوانح نگاری میں واقعات کا حوالہ سند کے بغیر نہیں ہوتا۔ لاہور انگلش کالج آپ کے جلال و جمال کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں واصف علی واصفؒ کی تربیت کا خاص بندوبست اس ذات نے کیا تھا جس کا انتخاب واصف صاحب تھے۔ آپ کی طبیعت پابندیوں سے آزاد تھی، اسی لئے آپ نوکری کی بندش سے آزاد تھے۔

صفحہ 26 میں اعجاز الحق لکھتا ہے۔ "نابھہ روڈ کے زمانے سے جاننے والے ایک صاحب کا کہنا ہے کہ واصف صاحب سیاسی میدان میں کھل کر سامنے آنے کے خواہش مند تھے اور وہ اس قسم کے عزائم رکھتے تھے کہ اقتدار میں آکر یا شامل ہو کر اصلاحِ احوال کیا جائے"، پھر صفحہ 27 میں اس بات کی خود ہی نفی کر دی کہ آپ کو ضیاء الحق دور میں مجلسِ شوریٰ کی شمولیت کی پیش کش ہوئی جو آپ نے قبول نہ کی۔ پیپلز پارٹی کی ٹکٹ کی پیش کش ہوئی جو قبول نہ کی"۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ واصف صاحب کو کھل کر سیاسی میدان میں آنے کے لئے اس سے بہتر کیا موقع تھا جو آپ نے ٹھکرا دیا۔ ان دونوں پیرا گراف میں اتنا تضاد ہے۔۔۔ پہلی بات ''جاننے والے صاحب'' کی انہوں نے کی اور ان کا نام لینا پسند نہیں کیا۔ اگر انہوں نے ان کی زبانی سنی تھی تو ذکر نہ کرنا سوانح نگاری کے اصولوں کے خلاف ہے۔ قاری کے دل میں یہ شک پختہ ہو جاتا ہے کہ ان صاحب کا وجود بھی ہے کہ نہیں ہے۔ اعجاز الحق کی ساری تحریر ایسے ہی تضاد اور دروغ گوئی کا پلندہ ہے۔

میری ذات کے حوالے سے بھی اعجاز الحق نے صفحہ 135 پر ایک عجیب واقعہ بیان کیا ہے، جو انتہائی لغو اور بے سروپا ہے۔ لکھتا ہے "ایک دفعہ واصف صاحب کے برادرِ خورد شوکت محمود راولپنڈی سے آئے ہوئے تھے۔ شام کے وقت ہم اکٹھے بیٹھے ہوئے تھے کہ میں نے انہیں کوئی بات کہی، جس سے وہ ناخوش ہوئے اور ردِّ عمل ظاہر کرنا چاہا، اس بات کو واصف صاحب نے فوراً محسوس کیا اور گویا ہوئے۔۔۔ "شوکت کے ملنے والوں کو جب پتہ چلتا ہے کہ میں اس کا بھائی ہوں تو وہ کہتے ہیں واہ شوکت تیری قسمت اور جب میرے ملنے والوں کو پتہ چلتا ہے کہ شوکت میرا بھائی ہے تو وہ کہتے ہیں واہ جی واصف صاحب آپ کی قسمت"۔

ان چند سطور نے اعجاز الحق کی قلعی کھول دی ہے کہ وہ کس قدر دروغ گو آدمی ہے۔ ان جملوں میں اس نے نہ صرف قبلہ واصف صاحب کی حیثیت کو چیلنج کیا ہے بلکہ میری شخصیت کو بھی مسخ کیا ہے۔ حلقہ کے تمام احباب اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ قبلہ بھائی جان نے ہمیں والد کی طرح پالا ہے اور اسی طرح تربیت دی ہے۔ آپ قبلہ جب بھی پنڈی تشریف لائے میرے ہی گھر قیام کیا اور میرے لئے بھی لاہور میں واحد ٹھکانہ آپ کی قیام گاہ فردوس کالونی ہی تھا۔ اب غور طلب بات یہ ہے کہ اعجاز الحق کے بقول اس نے کوئی بات کی جس کا میں نے ردِّ عمل کرنا چاہا۔۔۔ یعنی وہ بات جو میرے لئے منفی حیثیت رکھتی تھی قبلہ بھائی جان نے سن لی اور خاموش ہو گئے۔۔۔ گویا ان کی ایما پر اعجاز الحق نے میرے بارے میں بات کی، اور پھر اعجاز الحق نے اس بات کا ذکر بھی نہیں کیا ہے۔ یہ سراسر جھوٹ اور بہتان ہے کہ قبلہ بھائی جان میرے بارے میں کوئی بات سنیں اور وہ برداشت کر جائیں، اور نہ صرف یہ کہ برداشت کر جائیں بلکہ اعجاز کی دلجوئی کے لئے اگلی بات کریں۔ زندگی میں شاید ہی کوئی دن ایسا طلوع ہوا ہو جب میں نے آپ سے رابطہ نہ کیا ہو، میرے اور ان کے فون کے بل گواہ ہیں۔ اعجاز الحق کو یہ کیا خوش فہمی پیدا ہوئی کہ میں نے "ردِّ عمل ظاہر کرنا چاہا"۔۔۔ اور پھر ظاہر نہ کرنے کے باوجود واصف صاحب نے اعجاز الحق کی دلجوئی کر دی۔ یہ کیا بات ہے۔؟ ساری زندگی میرا معمول رہا ہے کہ جہاں قبلہ واصف

صاحب کے عقیدت مند موجود ہوں میں وہاں نہیں بیٹھتا تھا چہ جائے کہ ردِّ عمل کا اظہار کروں۔۔۔اور پھر یہ فقرے قبلہ بھائی جان میرے سامنے کہیں یہ ناممکن ہے۔ کیوں کہ میں تو ان کا بھائی ہی نہیں بلکہ بیٹا ہونے کی حیثیت سے تمام عمر انکے زیرِ سایہ اور زیرِ تربیت رہا۔ دوسری یہ بات کہ میں ان کی موجودگی میں گستاخی کروں۔۔ یہ دونوں باتیں ناممکنات کا درجہ رکھتی ہیں۔ عقیدت مند جانتے ہیں کہ میرا تعلق قبلہ واصف صاحب سے کیسا تھا۔ انہوں نے نہ صرف مجھے دنیاوی علم سے روشناس کیا بلکہ روحانی علم سے بھی آشنائی کروائی اور خاموشی کا بھی درس دیا۔ اس طرح کے لغو اور بے سروپا واقعات درج کر کے اعجاز الحق کا قد بلند نہیں ہو گیا اور نہ آپ کے ساتھ میرے تعلق میں کوئی کمی واقع ہوئی ہے کیونکہ جو تعلق اللہ تعالیٰ نے بنا دیا ہے اسے کوئی دروغ گو نہیں مٹا سکتا۔ میری رگوں میں بھی وہی خون ہے جو بھائی ہونے کے ناطے واصف صاحب کی رگوں میں دوڑتا تھا۔ میں یہ حق ضرور رکھتا ہوں کہ ان تمام واقعات کی نفی کر سکوں جو سراسر غلط ہیں۔ میری حیثیت تمام واقعات کے عینی شاہد جیسی ہے لہذا میں تمام واقعات کی تصدیق کرنے کی سند رکھتا ہوں۔

''ماسوا سے ماوراتک'' کے عنوان میں 1964ء میں کالج کے عروج کے زمانے میں طالبہ سے بغیر اجازت نکاح اور پھر شبِ وصل میں فاصلوں کے قائم رہنے کے متعلق لکھا گیا ہے۔ یہ بھی ایسا بہتان ہے جس کی جتنی بھی مذمت کی جائے کم ہے۔ یہ تمام واقعہ من گھڑت ہے اور اعجاز الحق کے پراگندہ ذہن کی پیداوار ہے۔ 1964ء کے زمانے میں واصف صاحب سے ایسی غلطی کا سرزد ہونا بعید از قیاس ہے۔ کیوں کہ یہی وہ زمانہ ہے کہ آپ ہر شب باقاعدگی کے ساتھ داتا صاحبؒ کے مزار پر حاضری دیتے تھے۔ یہ آپ کی شخصیت کے عروج کا زمانہ تھا۔ اسی زمانے میں آپ کی ملاقات باقاعدگی سے درویشوں اور ولیوں سے رہی ہے۔ اس سے پہلے آپ 1955ء میں پیر صاحب دیول شریف کے سحر کے اسیر ہو چکے تھے۔ لہذا ان سے ایسا واقعہ منسوب کرنا سوائے بہتان طرازی کے اور کچھ نہیں۔ اصل بات سے انحراف اعجاز الحق کی فطرتِ ثانیہ ہے۔ شبِ وصل کی بات، نکاح کی بات اور پھر فاصلے کی بات۔۔۔ کیا خوبصورت تضاد ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب آپ صاحبِ حال ہو چکے تھے، جس کا نہ صرف میں خود گواہ ہوں بلکہ کئی ایسے اصحاب ابھی زندہ ہیں جو اسکی گواہی دے سکتے ہیں۔ اسی زمانے میں شب بیداری سے آشنا ہوئے اور آنکھوں میں حقیقی مستی اور سرور اس آشنائی کا ثمر تھا۔

رات کیسے بسر ہوئی واصف
دن کو ہے کیوں خمار آنکھوں میں

یہ خمار عطائے ربانی ہے جس کو کوئی صاحبِ حال ہی سمجھ سکتا ہے۔ یہ بات اعجاز الحق کی سمجھ سے باہر ہے۔

اسی طرح محمد خان ڈاکو کے ساتھی کا ذکر کیا گیا ہے یہ بھی حقائق کے منافی ہے۔ وہ ساتھ ضرور تھا اس کا نام مجھے یاد ہے لیکن یہاں لکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔ واقعہ کچھ اور ہے اور اسے کچھ اور بنا دیا گیا ہے۔

ہندوستان جانے کا واقعہ بھی اپنی اصلی شکل میں نہیں لکھا گیا۔ آپ نے کس کس مزار سے خوشہ چینی کی اور فیض حاصل کیا اور بعد میں کیا اثرات مرتّب ہوئے۔ یہ شخص کچھ نہیں جانتا۔ پیر صاحب دیول شریف سے نسبت ٹھیک ہے۔ سائیں فضل شاہؒ کی حاضری بھی سچ ہے۔ موہڑہ شریف میں بھی حاضری دی۔ سائیں محمد حسینؒ کے ہاں بھی حاضری دی۔

یوں تو واصف اک زمانے کے فقیروں سے ملا
آنکھ نے تازہ کیا آ کر یہاں اپنا وضو

صوفی ابوانیس برکت صاحبؒ سالار والے کے ہاں بھی حاضری دی، دریا شریف میں بھی حاضری دی جس کا ذکر اعجاز الحق نے کہیں نہیں کیا، اعجاز الحق کو چاہیئے تھا کہ واقعات کو درست انداز میں لکھتا اور سنسنی اور تہلکہ کے سے عامیانہ انداز میں واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش نہ کرتا تاکہ قاری کی اصلاح بھی ہوتی اور صاحبِ حال سے شناسائی بھی ہوتی لیکن یہاں تو الٹا حساب ہوا کہ صاحبِ حال کے متعلق سنی ہوئی باتوں کو اپنا بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس کا مقصد سوائے خود نمائی کے اور کچھ نہیں ہے۔ ساغر صدیقی سے ملاقات رہی ہے۔ واصف صاحب نے ہر چاہِ معرفت سے پانی پیا ہے اور اپنی پیاس بجھائی ہے اور اپنا حصہ وصول کیا ہے۔ در حقیقت لکھنے والی باتوں کو اعجاز الحق گول کر گیا ہے اور سنی سنائی باتوں کو افسانوی انداز میں بالتفصیل بیان کر گیا ہے۔

داتا صاحبؒ کے مزار کے حوالے سے جو واقعہ درج کیا گیا ہے اس سے صاحبِ حال کا قد بلند نہیں ہوتا بلکہ صاحبِ مزار کی شان میں گستاخی کا پہلو نکلتا ہے۔ صاحبِ مزار ایک صاحبِ حال کو مانگے تو کسی مجذوب کی کیا مجال کہ وہ انکار کر دے۔ اسی طرح حضرت سلطان باہوؒ کے مزار کا واقعہ درج کیا گیا ہے جو سراسر دروغ گوئی ہے۔ اس کی تصدیق جب عنایت اللہ چوہدری سے کی گئی تو اس نے برملا کہا کہ یہ جھوٹ ہے۔ عنایت اللہ چوہدری پچاس کی دہائی سے آپ کے ساتھ منسلک رہے، یعنی پچیس سال سے زائد عرصہ آپ کی شاگردی میں رہے اور وہ خود گیارہ کتابوں کے مصنف ہیں۔

اسی طرح صفحہ 45 پر جناب الٰہی بخش وجدانی کے حوالے سے واقعہ درج کیا گیا ہے اور پھر اس واقعے کی بلاوجہ تکذیب کی گئی ہے۔ جناب الٰہی بخش وجدانی صاحب چونکہ سفرِ ہندوستان میں آپ کے ساتھ تھے اور وہ مراقبہ کے عینی شاہد تھے، انہوں نے یہی لکھا ہے کہ "جب ہم خواجہ بختیار کاکیؒ کے مزار پر پہنچے تو یہاں بھی واصف صاحب نے مراقبہ کیا۔۔۔ چنانچہ میں سمجھ گیا کہ خواجہ صاحب کی توجہ واصفؒ پر ہو گئی"۔ اس واقعے کی صحت پر شک کرنے کا اختیار اعجاز الحق کے پاس نہیں ہے کیوں کہ انہوں نے فیض کی بات کی ہے، واصف صاحب کی شان میں گستاخی نہیں کی ہے۔ قبلہ بھائی جان اور وجدانی صاحب کے تعلق سے میں بخوبی آگاہ ہوں، ان میں ہر درجہ کی بے تکلفی تھی، وجدانی صاحب بہت اچھے انگریزی کے کالم نگار تھے، سول اور ملٹری گزٹ سے وابستہ رہے اور بہت خوب صورت فیچر اور کالم لکھے۔ جب اخبار بند ہوا تو وکالت کی طرف آ گئے۔ اسی صفحہ کے آخر میں اعجاز الحق لکھتا ہے کہ "واصف صاحب نے مجھے بتایا کہ مجھے اجمیر شریف سے فیض ملا اور یہ بات کسی اور کو نہ بتانا"۔ یہاں اس جملے کی صحت مشکوک ہے۔ کیوں کہ واصف صاحب جب اجمیر شریف گئے ہی نہیں تو فیض ملنے کا ذکر انہوں نے کیسے کر دیا اور پھر فیض ملنے کی بات اتنی خفیہ تو ہر گز نہیں ہوتی کہ اسے خفیہ رکھنے کی تلقین کی جائے اور بالفرض اگر کسی کو نہ بتانے کی تلقین کی گئی ہے تو مصنف علی الاعلان کتاب میں لکھ کر کیوں شائع کر رہا ہے۔۔۔ ایں چہ ابوالعجیبست وجدانی صاحب کی بات کی تکذیب کرنے کے لئے یہ دلیل انتہائی بودی اور بھونڈی ہے کہ آپ نے حضرت خواجہ بختیار کاکیؒ کی شان میں کوئی منقبت کیوں نہ لکھی۔ آپ بے شمار مزارات پر گئے مگر منقبت نہیں لکھی۔ یہ کب ضروری ہے کہ صاحبِ حال جس مزار پر حاضری دے اس کی شان میں منقبت بھی ضرور کہے۔ بلاوجہ وجدانی صاحب کی بات کی۔ تکذیب کرنے کا مقصد سمجھ نہیں آیا۔ وجدانی

صاحب جیسی محترم شخصیت پر بہتان طرازی کرتے ہوئے یہ شخص لکھتا ہے کہ "وجدانی صاحب نے واصف صاحب کی طبعی زندگی میں انہیں محترم نہیں جانا اور پسِ مرگ بہت سی غلط باتیں کہہ دیں"۔ بندہء خدا جب تمہیں علم ہی نہیں وجدانی صاحب کون تھے، ان کا واصف صاحب کے ساتھ کیا تعلق تھا، تو ان پر بہتان طرازی سے تمہیں کیا ملے گا۔ میں اس بات کا گواہ ہوں کہ آپ نہایت بے تکلف دوست تھے، جس طرح بریگیڈیئر (ر) سعید کھوکھر تھے، لیکن آپ کے ساتھ وجدانی صاحب کے احترام کا عالم یہ تھا کہ آپ کے نام کے ساتھ ہمیشہ صاحب کہہ کر بلاتے تھے۔ اول تو کبھی نام لے کر نہیں پکارا، ہمیشہ ملک صاحب کہتے تھے۔ اسی طرح اعجاز الحق نے وجدانی صاحب کی طنز کا جو ذکر کیا ہے۔۔ یہ بھی سراسر غلط ہے۔ دراصل اس ایک فقرے میں دو صاحبِ حال لوگوں کی گفتگو کا حال ہے، جس کو صاحبِ قال نہیں سمجھ سکتا۔ وجدانی صاحب کا کہنا کہ "آسودگی کا کافی سامان اکٹھا کر لیا ہے"۔ یہ کسی اور زندگی کے بارے میں بات ہے جسے میں بخوبی سمجھ سکتا ہوں اور صاحبِ مجلس نے اہلِ مجلس کو سمجھانے کے لئے بہت خوب صورت بات کی ہے کہ ۔۔۔ "میں تو جنازے کے لئے بندے اکٹھے کر رہا ہوں"۔ ان دو جملوں میں معنی کا ایک دریا پوشیدہ ہے۔ صاحبِ حال جب کسی صاحبِ حال سے ملتا ہے تو دنیادار ان کی گفتگو نہیں سمجھ سکتے اور اعجاز الحق جیسا آدمی تو ایسی گفتگو سے بالکل ہی نابلد ہے۔ وجدانی صاحب نے آئندہ کی زندگی کی بات کی کہ آسودہ ہو گی اور آپ نے جانے کا ذکر کر دیا کہ جنازہ تیار ہے۔ واہ کیا خوب صورت بات تھی مگر اعجاز الحق نے اپنی کم بصری کے سبب اسے کچھ اور رنگ دے دیا۔ میں ذاتی طور پر ان دو اصحاب کے تعلقات کی نوعیت سے بخوبی آگاہ ہوں اور میں یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ وجدانی صاحب آپ کے متعلق کوئی طنزیہ بات نہیں کر سکتے۔

اسی طرح سائیں اختر صاحب جیسی قابلِ احترام شخصیت کے بارے میں بھی اعجاز الحق نے سنی سنائی باتوں پر اکتفا کر لیا اور ایک بزرگ ہستی کی شان میں گستاخی کا مرتکب ہوا۔ میں نے وہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ سائیں اختر کے ساتھ قبلہ واصف صاحب گھنٹوں اکیلے بیٹھے رہتے تھے اور راز و نیاز کی باتیں کرتے رہتے تھے۔ ہماری ڈیوٹی وقت پر چائے اور کھانا دینا ہوا کرتی تھی۔ ایسے بزرگ کے بارے میں ایسی نازیبا باتیں کہنا کفر کا درجہ رکھتا ہے۔ اس شخص کو قطعاً معلوم نہیں کہ سائیں اختر کون تھے اور وہ کیا ڈیوٹی دے رہے تھے اور کس کی ڈیوٹی دے رہے تھے۔ غالباً اعجاز الحق نے سائیں اختر کو دیکھا ہی نہیں ہو گا۔ میں عینی شاہد ہوں کہ اس صاحبِ حال نے عرفان کی کیسی کیسی منزلیں طے کیں اور اس کو کس کس بھٹی میں جھونکا گیا۔ کبھی اس کو زنجیروں سے جکڑا گیا، کبھی چپ کا روزہ رکھوایا گیا، کبھی ننگے پاؤں گرمیوں میں تپتی سڑک پر چلایا گیا، ایسی ہستی کے بارے میں ایسی باتیں کرنا انتہائی دکھ اور تکلیف کی بات ہے۔ یہی وہ لوگ تھے جو واصف صاحب کی ڈیوٹی پر لگے ہوئے تھے اور انہوں نے آپ کے اندر ایسی جوت لگائی جو آج تک نہیں بجھی اور نہ کبھی بجھے گی۔

ایک اور ہستی شیخ وزیر علی صاحب کی ہے ان کے بارے میں بھی اعجاز الحق انتہائی درجے کی گستاخی کا مرتکب ہوا ہے۔ شیخ وزیر علی صاحب انتہائی خوب صورت اور خوب سیرت شخص تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں قرآنِ کریم کے مطالب و معانی کا شعور دے رکھا تھا۔ یہی وہ مشترک بات تھی جو اِن دونوں ہستیوں کو قریب لے آئی تھی۔ آپ نے شیخ وزیر علی صاحب کی بہت پزیرائی کی اور ان کی صحبت سے لطف لیا اور ان کے قرآنی علم سے خوشہ چینی بھی کی۔ شیخ وزیر علی صاحبِ ثروت آدمی تھے۔ انہوں نے آپ کی کتاب شبِ چراغ کی اشاعت کے لئے خصوصی تعاون بھی کیا، جس کا ذکر

بھی شبِ چراغ کے پہلے ایڈیشن میں موجود ہے۔ شیخ وزیر علی صاحب میائیؒ صاحب ہی میں مدفون ہیں اور صاحبِ مزار ہیں۔ ہر سال جمادی الثانی میں بڑی دھوم دھام سے ان کا عرس منایا جاتا ہے۔

علامہ یوسف جبریلؒ کے متعلق بھی یہ شخص غلط بیانی کا مرتکب ہوا ہے۔ علامہ یوسف جبریلؒ بہت بڑے عالم تھے، اور صاحبِ کشف و کرامات تھے۔ بڑے بڑے صاحبِ علم لوگ ان کے سامنے خاموش ہو جاتے تھے۔ جیسا میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ واصف صاحبؒ کی تربیت کا بندوبست قدرت نے خود ہی کر رکھا تھا۔ ہر فن اور شعبے کے صاحبانِ کشف و کمال لوگ آپ کے پاس آئے اور اپنی ڈیوٹی دے کر چلے گئے۔ وہ واصف صاحبؒ کی ڈیوٹی پر تھے انہوں نے صحیح ہی کہا تھا۔ ''واصف صاحب نے وہ کام کر دیا''۔ یہاں واصف صاحب کا رتبہ چھوٹا کرنے کی بات نہیں ہے۔ ہر آدمی نے اپنے اپنے فن کے چشمے سے واصف صاحبؒ کو سیراب کیا ہے۔ اس جملے میں علامہ صاحبؒ نے کہیں اپنی بڑائی ثابت نہیں کی ہے۔ جو شخص اتنا قناعت پسند ہو کہ اجرت اگر اپنی ضرورت سے زیادہ ملے تو کام چھوڑ دے، اس سے بڑا درویش اور صاحبِ حال کون ہو سکتا ہے۔ کاش اعجاز الحق ان لوگوں کے رتبے کا احساس کر لیتا اور یوں ان کی تضحیک نہ کرتا۔ جتنے لوگ واصف صاحبؒ سے ملنے والے ہوتے تھے ان میں کوئی نہ کوئی خوبی ضرور ہوتی تھی۔ یہ لوگ ڈیوٹی والے ہوتے ہیں، دنیادار کو ان کے رتبے کا احساس نہیں ہوتا۔ دراصل بات یہ ہے کہ جس رنگ کی عینک لگائی ہوتی ہے ویسا ہی دکھائی دیتا ہے۔ اعجاز الحق نے کالے رنگ کی عینک لگائی ہوئی ہے اس لئے اسے چیزیں اصل رنگ میں دکھائی نہیں دیتیں۔

صفحہ 51 پر اعجاز الحق لکھتا ہے کہ ''رشتہ داروں میں آپ کے والد صاحب کے علاوہ کسی دوسرے کو آپ کے بارے میں کچھ علم نہ تھا۔'' یہ بات خلافِ حقیقت ہے، میں نے ساری عمر، اُن کے ساتھ کالج میں قیام کیا اور جب رات کے وقت بلکہ اکثر تہجد کے وقت آپ کالج واپس آتے تو میں نے ان کے لئے ہمیشہ دروازہ کھولا اور کبھی یہ نہیں کہا کہ اپ چابی لے جائیں اور دروازہ کھول کر سکوٹر اندر رکھ دیں۔

صفحہ 52 پر کاشف کی منگنی کا ذکر ہے، اس محفل میں میں خود موجود تھا، بڑی ہمشیرہ تھیں بھابھی تھیں اور بقول اعجاز الحق کہ وہ موجود تھا، یہ سارا واقعہ میرے سامنے پیش ہوا اور اسکا یہ کہنا کہ ایک عزیز نے کہا کہ ''بھائی جان کا دماغ چل گیا ہے''، یہ انتہائی گستاخی کی بات ہے۔ یہ جملہ اگر مجھ سے منسوب کرتا ہے تو بہتان ہے، ہمشیرہ سے کر نہیں سکتا کہ ان کی بیٹی سے رشتہ طے ہو رہا تھا اور کوئی آدمی اس محفل میں ایسا موجود نہ تھا، بھائی جان نے مجھ سے کہا کہ پانچ سو روپے ہمشیرہ کے ہاتھ پر رکھ دیں اور صبح کے وقت مجھے بھابھی جان سے وہ پیسے واپس دلائے کہ یہ کام کاشف کی ماں کا ہے۔ میں نے اسی نوٹ پر آپ کے دستخط کروائے اور محفوظ کر لیا جو ابھی تک میرے پاس محفوظ ہے۔ وہ واقعہ سراسر بہتان طرازی اور دروغ گوئی ہے۔

شادی کا واقعہ بھی سنی سنائی بات کے طور پر نقل کیا، نہ کوئی حوالہ، نہ کوئی تاریخ، نہ آدمیوں کا پتہ، نہ بارات اور باراتیوں کا پتہ، اس سے پہلے کس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا اور ماموں زاد کے ساتھ منگنی اور تاریخ کا طے ہونا، دعوت نامے لکھے جانا، یہ شخص تمام واقعات سے نابلد ہے۔ میں خود اس بات کا گواہ ہوں، یہ داستان بھی طوالت کی محتاج ہے۔ فقیروں کی شادی کا بندوبست قدرت خود کرتی ہے۔ صفحہ 117 پر اعجاز الحق کی کاروباری ذہنیت کھل کر سامنے آجاتی ہے جب وہ اعلان کرتا ہے ''واصف صاحبؒ نے کاشف پبلی کیشنز کی ملکیت مجھے سونپ دی تھی''۔ اس جملے میں اعجاز الحق کے عزائم سامنے آجاتے ہیں۔ اگر واصف صاحبؒ نے ملکیت دی ہوتی تو اس کو تحریری شکل میں دے دیتے اور اگر خدانخواستہ ایسا ہوتا تو اعجاز الحق سے یہ

قطعاً بعید نہ تھا کہ وہ دعویٰ کے بعد قبضہ کر لیتا اور اس کی ساری کی ساری عقیدت دھری کی دھری رہ جاتی۔ واصف آئیڈیل پبلک سکول کے لئے ڈاکٹر غلام علی چوہدری کا رقم فراہم کرنا غلط ہے۔ اسکول کے لئے فرنیچر یوسف نے دیا تھا، اس میں بچوں کے جھولے اور دوسرا سامان بھی تھا۔ واصف صاحب کے ملاقاتیوں کے بارے میں تفصیلات میں بھی بہت تضاد پایا جاتا ہے۔ شبِ چراغ کی تقریبِ رونمائی کا ذکر بھی نامکمل ہے اور کچھ واقعات کو دانستہ ادھورا چھوڑا گیا ہے۔ میں نے خود جب اشفاق صاحب کا شکریہ ادا کیا کہ آپ نے اپنی گوناگوں مصروفیات سے وقت نکال کر اس تقریب کو رونق بخشی تو اشفاق صاحب کے الفاظ تھے۔ ''آپ نے شاعر ہی ایسا پیدا کیا کہ اس کی شاعری نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں حاضر ہوں''۔ اعجاز الحق نے ایک طویل تحریر اشفاق احمد کے بارے میں لکھی ہے اور اشفاق صاحب کے علم اور عرفان کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کی تحریروں کو واصف صاحب سے منسوب کر دیا۔ گویا ''طوطا کہانی'' اور ''اور ڈرامے'' کسی سرقہ کے مرہونِ منت ہیں۔ اس بندۂ خدا سے کوئی پوچھے کہ تمہیں اشفاق احمد کے بارے میں علم ہے کہ وہ تلاش کی کس منزل میں تھے اور کن کن بابوں سے ملے ہیں۔ آج کی دنیا میں بابے مخفی ہیں اور اشفاق صاحب کو بابوں کا ملنا اور ان سے فیض حاصل کرنا اور ان کی خدمت میں جانا کیا اس میں اللہ کی رضا کے ساتھ ساتھ اشفاق صاحب کی تشنگی اور تلاش کا کہیں دخل نہیں ہے؟ اگر اشفاق صاحب نے قبلہ واصف صاحبؒ کے چند فقرے کہیں بول دیئے یا لکھ دیئے تو شخصیت کے سحر کا دخل ہے کہ اشفاق صاحب اس شخصیت کے سحر میں گم ہو کر اس کو اپنے اوپر طاری کرتے ہوئے چند جملے مستعار بھی لے لیتے تھے۔ اس میں واویلا کرنے کی کیا بات ہے۔ سب کو پتہ ہے کہ یہ جملے کس شخصیت سے ادا ہوئے جیسا کہ خود اعجاز الحق نے لکھا کہ جنگ کے دفتر کا ٹیلی فون ایکسچینج میدانِ جنگ کا منظر پیش کر رہا تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ اشفاق صاحب کے دفتر کے ایک اہلکار نے اعجاز الحق کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ منو بھائی سے اشفاق صاحب کے حوالے سے کالم لکھوائے اور پھر وہ کالم لکھا گیا۔ جس میں اس اہل کار کی بھی تشفی ہوئی اور اشفاق صاحب اور واصف صاحبؒ کے درمیان بھی خلیج ڈال دی گئی۔ یہ چند لوگوں کے مذموم عزائم تھے جن کا آلہ کار اعجاز الحق تھا۔ اسی طرح اعجاز الحق نے قتیل شفائی جیسی معزز اور معتبر ہستی کی تضحیک کی ہے اور ان کی شاعری کو ساغر صدیقی کا مرہونِ منت قرار دیا ہے۔ اس قدر دروغ گوئی اور اتنی بڑی ہمت؟۔۔ اس بات پر ہتکِ عزت کا دعویٰ ہو سکتا ہے۔ اسی طرح صفحہ 174 پر ایک واقعہ مجھ سے غلط منسوب کیا گیا کہ میرے گھر میں ڈپٹی سیکرٹری آیا اور آدابِ محفل کا خیال نہ رکھا۔ دراصل یہ تمام واقعہ اعجاز الحق کے گھر اسلام آباد میں رونما ہوا تھا اور محفل کے لئے باقاعدہ اسی کی طرف سے دعوت نامہ بھی جاری کیا گیا تھا۔ اعجاز الحق نے ہی اس شخص کو مدعو کیا تھا اور پھر محفل میں تلخی پیدا ہوئی۔ میں اس واقع کا عینی شاہد ہوں۔ اس محفل میں عنایت اللہ بھی موجود تھا اور اس ڈپٹی سیکرٹری کا نام چوہدری نذر حسین تھا اور اس محفل کا انعقاد بھی اعجاز الحق نے کیا تھا اور اسی نے چوہدری نذر کو اور بشیر بھٹی کو مدعو کیا تھا۔ واصف صاحبؒ نے اعجاز الحق کو بہت بری طرح سے ڈانٹا تھا کہ اس قسم کے بندے محفل میں کیوں لاتے ہو۔ یہ اعجاز الحق کے گھر میں واصف صاحبؒ کی آخری محفل اور آخری نشست تھی۔ اس دروغ گو نے تمام واقعہ مجھ سے اور میرے گھر سے منسوب کیا ہے۔ جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔۔ وہ اس پیراگراف کا آغاز یوں کر رہا ہے کہ ''اس طرح ایک واقعہ اسلام آباد میں ہوا''۔ (حالانکہ میرا گھر راولپنڈی میں ہے)۔ میرے حوالے سے لندن جانے کے متعلق واقعہ بھی جھوٹ کا ایک طومار ہے۔ پہلے میں جانے کے لئے تیار ہوا اور مجھے حکم ملا کہ میں سامان تیار کر لوں، میں نے راولپنڈی سے پاسپورٹ بھی منگوا لیا اچانک آپ کا چہرہ متفکر ہوا ''شوکت گھر پر بچوں

کے پاس کون ہو گا"۔ میں نے فوراً حامی بھری اور کہا کہ آپ مطمئن ہو کر جائیں میں گھر پر ہوں۔ آپ خوش ہو گئے اور جاتے ہوئے پانچ سو کا نوٹ مجھے دے گئے۔ میں نے اس نوٹ پر بھی آپ کے دستخط کروائے اور بٹوے میں رکھ لیا اور یوں میرے پاس آپ کے دستخط شدہ دو نوٹ پانچ سو کے ہو گئے جو آج تک محفوظ ہیں اور اعجاز الحق جیسے دروغ گو کے منہ پر طمانچہ ہیں۔ کرامات کے بارے میں بھی اعجاز الحق نے بغیر کسی راوی اور بغیر کسی حوالے کے باتیں کی ہیں۔ اسی طرح 193 صفحے پر ڈاکٹر کی بات کی ہے۔ ڈاکٹر کے پاس واصف صاحبؒ نے اعجاز الحق کو بھیجا تھا اور میرے سامنے بھیجا تھا اور فون بھی کیا تھا، ڈاکٹر کا نام ڈاکٹر اسلم ہے۔ اسی طرح تاج کمپنی کی بابت بھی جھوٹ بات لکھی گئی ہے۔ صفحہ 216 میں ایک اور انتہائی جھوٹ اور دروغ گوئی سے کام لیا جس میں لکھا ہے کہ دونوں بھائیوں میں سے کوئی بھی اعجاز الحق کے ساتھ پیر صاحب کے پاس نہیں گیا۔ اس سفر میں اعجاز الحق کے ساتھ میں خود گیا۔ یہ جگہ گوندل پشاور روڈ پر موجود ہے۔ یہاں بادشاہ صاحب لوگوں کے مسائل حل کرتے ہیں، ان کو تمام علاقائی زبانوں پر عبور حاصل ہے۔ ہم نے ان کے حجرے میں قیام کیا، چائے بھی پی اور کھانا بھی کھایا۔ ابھی تو میں موجود ہوں نہ جانے اس جھوٹ سے اعجاز الحق کا کیا مقصد ہے۔ اسی طرح گوجر خان میں بھی میں ساتھ تھا اور عنایت اللہ بھی ساتھ تھا۔ سائیں محمد حسین صاحب سے آخری ملاقات تھی۔ میں نے دعا بھی کرائی ان کی گفتگو بھی سنی لیکن جب وہ گفتگو فرماتے، اعجاز الحق درمیان میں حسبِ عادت بول پڑتا اور سارا سلسلہ منقطع ہو جاتا۔ سائیں صاحب نے اس پر خفگی کا اظہار بھی کیا لیکن اس نے منع کرنے کے باوجود خاموشی اختیار نہ کی۔ رات ہم واپس پنڈی آ گئے۔ چند دنوں کے بعد سائیں صاحب انتقال فرما گئے اور ان کا جنازہ بڑے دھوم دھام سے اٹھا۔ ڈھولوں کی تھاپ پر عقیدت مند دھمال ڈالتے جاتے تھے۔

اعجاز الحق نے ہر شخص کی ہر طرح سے کردار کشی کرنے کی کوشش کی ہے۔ واصف صاحبؒ کی فوری صحت کی خرابی وہ حکیم صاحب بنے جن کو اعجاز الحق فردوس کالونی میں لایا۔ اس حکیم نے ایک کشتہ اعجاز الحق کے کہنے پر قبلہ واصف صاحبؒ کو کھلانا چاہا جس کی میں نے بہت مخالفت کی لیکن آخر کار حکیم صاحب کی دوائی بطورِ علاج واصف صاحبؒ کو کھلائی گئی۔ جس کی وجہ سے بلند فشار خوں ہوا اور حالت غیر ہو گئی اور یہی دوا میو ہسپتال میں داخلے کا سبب بنی۔ اعجاز الحق کی عقیدت اور مہربانی کا نتیجہ الٹا ہوا۔ اس حکیم صاحب کی دوا کے میرے علاوہ اور بھی کئی گواہ ہیں۔ جن میں عنایت اللہ اور ڈاکٹر خوشی صاحب شامل ہیں۔ اس شخص کا حال اس شعر جیسا ہے:۔

ہر نقل میں ہے اصل میں غازہ ملا ہوا
بہروپیوں سے شہر ہے سارا بھرا ہوا

اعجاز الحق نے ساری کتاب مفروضوں اور سنی سنائی باتوں پر لکھی ہے اور جو بات بھی لکھی بغیر حوالہ اور تصدیق کے لکھی، اپنا واقعہ دوسرے کے سر تھونپا۔ اس کذاب کو شرم نہ آئی کہ مجھ سے ایسے واقعات منسوب کئے جن کا مجھ سے کوئی تعلق نہ تھا اور تھا تو مثبت تھا۔ اس نے نہ تو واصف صاحبؒ کی قربت کا حق ادا کیا اور نہ ان کے چاہنے والوں کا، جس شخص نے اپنے بھائیوں کو معاف نہ کیا اور رشتوں کے تقدس کو پامال کیا، وہ بھلا واصف صاحبؒ کی محبت اور فیض کیسے پا سکتا ہے؟ (دسویں عرس مبارک کے موقع پر 2002ء میں تحریر کیا گیا)۔

بسم اللہ سے آستانۂ بسم اللہ تک: انجینئر منور علی قریشی

چند روز ہوئے، ڈاکٹر محمد عارف صاحب کا ڈاک سے ایک رقعہ ملا کہ وہ جناب تصدق حسین پر کتاب مرتب کر رہے ہیں اور مجھے ان کے بارے میں لکھنے کی دعوت دی گئی تھی۔ میں نے سوچا ایک گمنام، بے علم اور ادنیٰ طالب علم کا اپنے نامور، صاحبِ علم اور اعلیٰ مرتبت استاد کے بارے میں لکھنا کیا معنیٰ؟ لیکن تعمیلِ حکم ضروری خیال کر کے یہ حروف لکھے۔

استاد دانائے راز کرتا ہے۔ شمس تبریزؒ کے فیض سے مولانا رومؒ بنتے ہیں۔ حضرت جعفر صادقؒ کا فیض ہو تو نتیجہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کی صورت میں نکلتا ہے۔ یہ عمل تو فقط عطاءِ ربانی ہے۔ یہ رحمتوں، خوش بختیوں، عزتوں، راحتوں، اعلیٰ ظرفیوں، چار گریوں کی نوید ہے۔

ارشادِ ربانی ہے کہ ''میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا، مجھے خواہش ہوئی کہ میں پہچانا جاؤں۔'' پھر ربِ کائنات نے کائنات تخلیق فرمائی۔ مخلوق میں نوری، ناری اور خاکی مخلوق بھی تخلیق فرمائی۔ خاکی کو مسجودِ نوری بنایا اور اس کو ایک ایسا معلمِ اعظم ﷺ بخشا جن کو اللہ تعالیٰ نے ''رحمت اللعالمین'' کا خطاب دیا۔ اللہ رب العزت نے خود اُن ﷺ کے بارے میں کہا ''ورفعنا لك ذِكرك''۔ اس معلم برحق ﷺ کو بڑی عظمت اور شان عطا فرمائی۔ اس ہادیٔ برحق ﷺ سے جنہوں نے تعلیم پائی وہ اصحابِ رسول ﷺ اور اصحابیاتِ رسول ﷺ کہلائے۔ ان پر آپ ﷺ کی براہِ راست تعلیمات تھیں اور فیضانِ نظر تھا۔ ان کی کلاس ہی علیحدہ تھی۔ پھر انہوں نے جن کو تعلیم دی وہ تابعین کہلائے۔ پھر تابع تابعین ہوئے۔ یہ سب کمال لوگ تھے۔

میں جب جناب تصدق حسین کے بارے میں یہ لکھوں گا کہ تمام تعریفیں اللہ کیلئے ہیں اور اس کا بے حد شکر ہے کہ اس نے مجھے ایسے محترم شخص کا شاگرد بنایا جو صاحبِ علم، انتہائی وضع دار، ایمان دار، بااخلاق، باکردار اور باعمل شخص ہے جس نے ذاتی مثالوں سے اپنے شاگردوں کی مشکل گھڑیوں کو آسان بنانے کا حل دیا۔

سود کے خلاف بیشمار صفحات لکھے گئے اور چشمِ فلک نے دیکھا کہ ان ہی لکھاریوں کی اگلی نسل نے ہی سود پر کاروبار کیا۔ عریانی اور فحاشی کے خلاف سب نفرتیں اپنی جگہ اور عریان لباس پہننے پر عمل اپنی جگہ پہ، آج کے دور میں الفاظ اپنی وقعت کھو گئے ہیں۔ تعلیم کچھ اور عمل کچھ اور۔ نصیب والوں نے ہی علم اور علم میں یگانگت دیکھی۔

تصدق حسین جب مقتدرہ قومی زبان سے ریٹائرڈ ہوئے تو ان کو کوئی پنشن نہ ملی۔ گھر کا کرایہ ادا کرنے کیلئے ترجمے کیے۔ آپ صبح فجر کی نماز ادا کر کے ترجمہ کرنا شروع کرتے جو عشاء کے قریب ختم ہو جاتا اس سے مہینہ بھر میں اتنی رقم کما سکے کہ گھر کا کرایہ ادا ہو۔ یہ حالات میں نے خود دیکھے۔ وضعداری کا حال یہ کہ کسی سے ذکر کرنا بھی مناسب نہ خیال کیا۔ کئی کتب کے مصنف، صاحبِ قلم اور صاحبِ بیاں اگر ''رزقِ حلال'' پر ہی چند لیکچر دے دیتے تو اس سے زیادہ ہی کما لیتے لیکن آپ نے وہی راہ اختیار کی جسے بالکل جائز اور حلال سمجھا۔

یادوں کے دریچوں سے کچھ اور واقعات امڈ آئے۔ ایک دفعہ میں نے تصدق صاحب سے پوچھا کہ یہ جو آپ نے کتاب لکھی ہے ''واصف علی واصفؒ سوانح عمری اور افکار'' تو کیا آپ کی واصف علی واصف سے ملاقات تھی؟ کہنے لگے کہ ملاقات تو بس ایک دفعہ ہوئی تھی لیکن وہ کافی نہ تھی۔ میں نے آپ کے ایک دوست عنایت اللہ چوہدری صاحب سے مواد جمع کیا ہے۔ عنایت اللہ صاحب اسلام آباد میں ڈسٹرکٹ فوڈ کنٹرولر تھے۔ ان کا حوالہ تصدق صاحب کو اشفاق احمد مرحوم نے دیا تھا۔ میں نے عنایت اللہ صاحب سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ تصدق صاحب نے اتوار کی صبح کا ان سے وقت لے لیا۔ اسلام آباد سے جی ٹی روڈ کی طرف آئیں تو گولڑہ شریف کو جو موڑ مڑتا ہے اس کے قریب عنایت اللہ صاحب رہائش رکھتے ہیں۔

میں تصدق صاحب کے ہمراہ جب گولڑہ شریف موڑ پر پہنچا تو خواہش پیدا ہوئی کہ پہلے گولڑہ شریف جا کر فاتحہ پڑھی جائے پھر ادھر جایا جائے لیکن احتراماً اظہار نہ کیا کہ عنایت اللہ صاحب کے ساتھ طے تھا۔ ادھر پہنچے تو پتہ چلا کہ عنایت اللہ صاحب کہیں چلے گئے ہیں۔ تصدق صاحب کہنے لگے کہ ہم گولڑہ شریف حاضری دے آتے ہیں واپسی پر عنایت اللہ صاحب آ گئے ہوں گے تو ان کو مل لیں گے۔ گولڑہ شریف سے واپسی پر پھر جب گولڑہ موڑ پر پہنچا تو خیال آیا کہ بری امام کے مزار پر حاضری دی جائے۔ پھر خاموش رہا۔ واپس پہنچے تو بھی عنایت اللہ صاحب گھر نہ لوٹے تھے۔ میں نے عرض کی کہ تصدق حسین صاحب چلیں امام بریؒ کے مزار پر حاضری دے آئیں۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد میں اور تصدق حسین صاحب امام بریؒ کے مزار پر فاتحہ پڑھ رہے تھے۔ تصدق صاحب مجھ سے پہلے مزار سے باہر آ گئے۔ جب میں باہر آیا تو ایک نوعمر شخص تصدق صاحب سے لپٹا ہوا رو رہا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام کر علیحدہ کیا اور ماجرہ پوچھا۔ اس نے بتایا کہ اس کی جیب کٹ گئی ہے اور اسے علی پور چٹھہ واپس جانا ہے۔ آپ نے کہا کہ چلو ہم تمہیں بس پر چڑھا دیتے ہیں۔ وہ شخص ہماری گاڑی میں ہمارے ہمراہ آ گیا۔ گاڑی میں بیٹھے تو میں نے اس شخص سے پوچھا کہ صاحبِ مزار سے آخری التجا تم نے کب اور کیا تھی؟ اس نے بتایا تقریباً چالیس پچاس منٹ قبل کی تھی اور کہا تھا ''بابا اگر بھیجنا نہیں تھا تو بلوایا کیوں تھا'' یہ وہی وقت تھا جب ہم اس طرف چلے تھے۔ شاید ''صاحبِ مزار'' نے اسی کام کے لیے بلوایا تھا۔ یہ زعم بہت دن رہا۔ ''متاعِ فقیر'' آئی تو پتہ چلا کہ تصدق صاحب بچپن سے دونوں مزارات پر جاتے ہیں اور صاحبِ مزار نے مجھے بھی اگر بلایا تو ان کی وجہ سے۔ ورنہ لاہور میں کبھی ایسا واقعہ کیوں نہ رونما ہوا؟

پھر اسی شام عنایت اللہ صاحب اور واصف علی واصف کے چھوٹے بھائی شوکت محمود صاحب (جو بغیر اطلاع عنایت صاحب کو ملنے آئے تھے) سے عنایت اللہ صاحب کے گھر میں ہی ملاقات ہوئی۔ واصف صاحب کے بارے میں بہت دیر تک سیر حاصل باتیں ہوتی رہیں۔

تصدق صاحب سے شاگردی کا تعلق 1968ء میں ہوا۔ جب میرے والد صاحب، جو آرمی میں میجر تھے، کا نوشہرہ میں تبادلہ ہوا اور میں گورنمنٹ کالج نوشہرہ میں داخل ہوا۔ میں تقریری مقابلوں میں حصہ لیا کرتا تھا۔ آپ وہاں انگریزی کے لیکچرار تھے۔ حضرت صاحب ان دنوں مجھے تقریر لکھ دیا کرتے تھے اور اس کو سن بھی لیتے تھے۔ تلفظ کی غلطیاں بھی درست کروا دیتے تھے۔ بعد ازاں میں انجینئرنگ کالج میں چلا گیا اور راجہ صاحب ان دنوں میں وہاں سے مردان پوسٹ ہو گئے۔ میں نے انجینئرنگ کر لی۔ کچھ دیر پاکستان میں کام کرنے کے بعد میں ابو ظہبی چلا گیا اور پھر سعودی عرب میں رہا۔ 1985ء میں ملک واپسی ہوئی۔ ان کے بارے میں گورنمنٹ کالج نوشہرہ سے پتہ کروایا۔ وہاں سے پوسٹنگ کا پتہ چلا لیکن کوئی بھی خاطر خواہ حوالہ نہ مل سکا جس سے کوئی ملاقات کی سبیل بنتی۔ غالباً 1988ء کی بات ہے میں بلیو ایریا اسلام آباد سے گزر رہا تھا کہ اچانک تصدق صاحب نظر آئے۔ آپ اپنے ساتھیوں کے ساتھ پیدل جا رہے تھے۔ میں نے گاڑی جلدی سے پارک کی اور اس سمت دوڑنے لگا۔ پریشانی یہ تھی کہ کہیں اچانک کسی بلڈنگ میں نہ چلے جائیں اور پھر پتہ ہی نہ چلے اور بیس سال اسی لمحے کے انتظار میں اور گزر جائیں۔ آواز دینا خلافِ ادب تھا۔ جب قریب پہنچا تو تصدق صاحب ہی نے پلٹ کر دیکھا۔ مسکرائے اور مجھے میرے پہلے نام سے مخاطب کیا۔ ہمراہ لے کر اپنے دفتر (مقتدرہ قومی زبان) میں آئے۔ فرمانے لگے کہ عرصہ بیس سال سے تلاش کر رہا ہوں۔ تم کہاں تھے؟ میں نے سوچا مجھ غریب کی عزت افزائی فرما رہے ہیں، میرے جیسے ہزاروں طالبعلم آپ کے شاگرد ہوں گے۔ مجھ میں ایسی کونسی خاص بات ہے کہ آپ مجھے تلاش کرتے رہے؟ تصدق صاحب شاید میرے خیالات بھانپ گئے اور ایک کتاب ''جادۂ حیات'' دکھائی۔ یہ مختصر سی آپ کی آپ بیتی تھی جو بعد ازاں ''داستاں میری'' کے نام سے اضافوں کے ساتھ شائع

ہوئی۔ جس میں کچھ اس طرح تحریر تھا''عارف حسین نقوی، مُنور علی قریشی اور رخسانہ شہناز میرے پورے درس وتدریس کے دور کے وہ شاگرد ہیں جن پر مجھے ہمیشہ ناز رہااور جنہیں میں کبھی فراموش نہ کر سکوں گا۔''(ان میں پھر دو ناموں کا اور اضافہ ہؤا عبدالعزیز نیازی اور عبدالرحیم)۔

تصدق صاحب اسلام آباد میں ہوتے تھے اور میں لاہور میں۔ جب بھی اسلام آباد جانا ہوتا تو نیاز ضرور حاصل کرتا۔ آپ لاہور تشریف لاتے تو ضرور ملتے۔ جب ملاقات ہوتی۔ تصدق صاحب ان دنوں جو تحریری کام کر رہے ہوتے اس سے آگہی دیتے۔ سرِ تسلیم خم ہے جو ڈاکٹر جیفرے لینگ کی شہرۂ آفاق کتاب''Struggling to Surrender''کا اُردو ترجمہ فرما رہے تھے تو آپ نے جیفرے لینگ کے خواب کو جس طرح مجھے بیان کیا ایسے لگتا تھا کہ یہ خواب جیفرے لینگ نے نہیں خود حضرت نے دیکھا ہو۔ جب یہ کتاب طبع ہو کر آئی اور میں یہ کتاب پڑھ رہا تھا تو میری ملاقات ایک عیسائی مبلّغ سے ہوئی اور اس کتاب کا ذکر ہوا۔ اس عیسائی مبلّغ نے اس کتاب کی ایک جلد مانگ لی۔ اس کتاب میں قرآنِ مجید کی آیات کے ترجمے ہیں۔ میں یہ سوچنے لگا کہ یہ کتاب اس مبلّغ کو دی بھی جا سکتی ہے کہ نہیں؟ حضرت سے ٹیلی فون پر بات ہوئی آپ نے فرمایا اگر ہم ایسے لوگوں کو دینِ اسلام پڑھنے ہی نہیں دیں گے تو یہ اس دین کی طرف کیسے آئیں گے۔ آپ پریشانی میں نہ جائیں اور کتاب دے دیں۔ میں نے اتباعِ حکم کیا۔

فصل2۔ سوانحی واقعات تحریر ڈاکٹر تصدق حسین:

واصف علی واصفؒ نے میٹرک کا امتحان 1944ء میں گورنمنٹ ہائی سکول خوشاب سے پاس کیا تھا۔ اس زمانے میں ان کے نانا مولوی محمد امین، گورنمنٹ جامع ہائی سکول جھنگ کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ واصف میٹرک پاس کرنے کے بعد اپنے نانا کے پاس چلے گئے اور پھر گورنمنٹ انٹر کالج جھنگ سے ایف ایس سی کرنے کے بعد 1949ء میں گورنمنٹ ڈگری کالج جھنگ سے بی اے کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا۔ ان کے والدِ محترم محمد عارف چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا اعلیٰ تعلیم حاصل کرے اور پھر کسی بڑے عہدے پر فائز ہو چنانچہ بیٹے کو اسلامیہ کالج، لاہور میں داخل کرایا جہاں وہ ایم اے ریاضی میں ناکام ہو گئے اور پھر گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے انگریزی کا امتحان دیا مگر انہیں اس بار بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ واصف کے ایک ہم جماعت بریگیڈیئر سعید زمانہ طالب علمی کے حوالے سے کالج کے دور کے بارے میں فرماتے ہیں:

''ہم اکثر انگریزی کے شعراء و حکماء کا مطالعہ کر کے آپس میں بحث مباحثہ کرتے تھے۔ دورانِ بحث واصف کا نقطۂ نظر بڑا جاندار ہوتا تھا وہ اپنے مؤقف کے حق میں بڑے ٹھوس دلائل دیتا مگر دوسرے کے مؤقف کے بارے میں کوئی حتمی رائے دینے سے گریز کرتا تھا۔ وہ ہر بات اور ہر پہلو کو مذہب اور انسانیت کے حوالے سے دیکھتا جبکہ میرا اندازِ فکر اس کے برعکس تھا۔ چنانچہ بعض اوقات اس کی گفتگو سے چڑ کر میں کچھ ایسی باتیں کہہ دیتا جن کا وہ کسی طور پر حقدار نہ تھا مگر وہ ہمیشہ مسکرا کر میری باتیں سن لیتا اور چپ رہتا تھا۔ وہ بڑا ہونہار اور ذمہ دار طالب علم تھا۔''

(واصف علی واصف احوال و آثار۔ تحقیقی مقالہ ایم فل (غیر مطبوعہ) ص 19، 1996ء علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد۔ مقالہ نگار محمد ظہیر بدر، لیکچرار ایف سی کالج لاہور۔)

ایم اے ریاضی اور ایم اے انگریزی میں ناکامی کے بعد واصف نے لاہور میں نابھہ روڈ پر لاہور انگلش کالج کے نام سے 1962ء میں ایک پرائیویٹ کالج قائم کیا جو 1976ء میں بند ہو گیا تھا۔ اب فردوس کالونی والے گھر میں واصف پبلک سکول کے نام سے ایک مدرسہ کام کرنے لگا تھا۔

واصف اس کالج کے قیام سے قبل اینگلو پنجابی کالج کے بی اے کے طلبہ کو انگریزی پڑھاتے تھے، پھر ملازمت چھوڑ کر اپنا کالج کھول لیا تھا۔ اس کالج میں صبح کے وقت میٹرک اور شام کو ایف اے اور بی اے کی کلاسیں ہوتی تھیں۔

ایم اے انگریزی کے امتحان میں فیل ہونے کے بعد انہوں نے تحصیلداری کا امتحان پاس کر لیا تھا لیکن تحصیلداری ان کی منزل نہ تھی۔ گزٹ نوٹیفیکشن بھی ہو گیا تھا مگر واصف نے تحصیلداری ٹھکرا دی تھی۔ کالج کے انتظام میں کچھ عرصہ تک ان کے بھائی ملک شوکت محمود کنڈان، غیاث امجد اور بہن شمیم عزیز بھی ان کی مدد کرتے رہے تھے۔ ایک اور شخصیت جو واصف علی واصف کے سب سے زیادہ قریب رہی مگر ان کی زندگی میں بھی اور بعد میں بھی ہمیشہ گمنام رہنے کی آرزو مند رہی وہ ہیں چوہدری عنایت اللہ صاحب جو، اِن دنوں ڈسٹرکٹ فوڈ کنٹرولر اسلام آباد ہیں۔ 1958ء میں فاضل پنجابی کا امتحان پاس کرنے کے بعد ایف اے کی تیاری کے لیے واصف کے شاگرد ہوئے پھر عمر بھر ساتھ رہا۔ چوہدری صاحب اس کالج کے منتظم بھی تھے، خزانہ دار بھی، نائب قاصد بھی اور چوکیدار بھی۔ ذکر و فکر کی محفلوں میں بھی ساتھ رہے، اولیائے کرام کے مزارات پر حاضری کے وقت بھی۔ واصف صاحب کے لمبریٹا اسکوٹر پر جو دوسری سواری نظر آتی وہ چوہدری صاحب ہوتے تھے۔ لاہور میں داتا دربار سے شروع کر کے، قصور میں بابا بلھے شاہؒ اور ٹبے والے مزار کے علاوہ پاک پتن شریف میں بابا فرید گنج شکرؒ کے ہاں حاضری دینے کے بعد گڑھ مہاراجہ (جھنگ) میں حضرت سلطان باہوؒ اور پھر ملتان کے کم و بیش سبھی مزارات سے ہوتے ہوئے ایک بار سات دن کے بعد اسی موٹر سائیکل پر سوار جب چوہدری عنایت اللہ اور واصف علی واصف گھر پہنچے تھے تو پہچانے نہیں جاتے تھے۔ چوہدری عنایت اللہ کو 24 دسمبر 1983ء کو لاہور چھوڑنے اور اسلام آباد پہنچنے کی ہدایات مل چکی تھیں۔ واصف صاحب خود بھی اسلام آباد منتقل ہونا چاہتے تھے۔ چوہدری عنایت اللہ نے تو بطور ڈسٹرکٹ فوڈ کنٹرولر اسلام آباد اپنی ذمہ داریاں سنبھال لی تھیں لیکن واصف صاحب کا بلاوا مالکِ حقیقی کی طرف سے آ چکا تھا۔ وہ بجائے اسلام آباد کے اگلے جہان کی جانب کوچ کر چکے تھے۔ یوں لاہور میں آخری دنوں میں کالج آف فزیکل ایجوکیشن کی 1001 (ایک ہزار ایک) راتوں کی نہ باتیں رہیں نہ وہ شخص رہا جو شمع کی مانند روشنی دے رہا تھا اور پروانے تھے کہ نہ جانے کہاں کہاں سے امڈے چلے آتے تھے اور اس شمع کے گرد جمع رہتے تھے۔ ان 1001 راتوں میں واصف صاحب کی ایک شب کی بھی غیر حاضری نہ تھی۔

چوہدری عنایت اللہ صاحب نے اور کئی دلچسپ واقعات بھی سنائے جن میں ایک واقعہ یہ بھی شامل تھا کہ ایک بار وہ واصف کو گجرات میں کانواں والی سرکار کے دربار میں لے کر آئے تو سائیں محمد حسینؒ نے جو سرکار کے بالکے تھے واصف کو دیکھ کر اشاروں سے بتایا کہ انہیں واصف علی واصف کے سر اس طرح کی ٹوپی نظر آتی ہے جو علامہ اقبالؒ پہنتے تھے اور یہ کہ ایک وقت آئے گا جب چوہدری عنایت اللہ کے ہمراہی (یعنی واصف کا) ڈنکا بہت دور تک بجتا سنائی دے گا۔ سائیں صاحب کی بات درست نکلی اور واصف کا ڈنکا بجتا رہا اور بج رہا ہے۔

لاہور انگلش کالج کے کسی کمرہ میں جہاں دن کو شیکسپیئر، ورڈزورتھ، کیٹس، شیلے اور لارڈ بائرن پڑھائے جاتے تھے۔ وہاں رات کو ذکر و فکر کی محفلیں جم جاتیں اور دنیائے تصوّف کے کچھ جانے پہچانے اور بیشمار اجنبی افراد جمع ہو جاتے تھے۔ واصف کی راتیں شبِ بیداری سے عنوان تھیں۔ وہ فجر کی نماز اکثر داتا دربار کی مسجد میں ادا کرتے تھے۔ بہن بھائیوں کی تعلیم اور شادیوں سے فارغ ہونے کے بعد خود 26 اکتوبر 1970ء میں شادی

کی۔ داتادربار کے علاوہ میاں میرؒ کے مزار پر بھی باقاعدہ حاضری دیتے تھے۔ اکثر راتیں یہیں گزرتی تھیں، پھر بابابلھے شاہؒ کے ہاں حاضری کے دوران شہر قصور کے ایک بزرگ شیخ وزیر علی صاحب سے واصف کی ملاقات ہوئی۔ آپ پرہیزگار اور صاحبِ طریقت تھے۔ شیخ صاحب بہت خوش الحان تھے اس لیے واصف صاحب ان سے قرآنِ پاک کی تلاوت سنا کرتے تھے۔ یہ بزرگ 1965ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد لاہور آ گئے تھے۔ حضرت واصف علی واصفؒ نے قرآنِ پاک حفظ نہیں کیا تھا لیکن ایک بار حنیف رامے نے اور دو بار شیخ وزیر اعلیٰ صاحب نے قرآنی آیات کا حوالہ کسی گفتگو کے دوران دیتے ہوئے غلط تلاوت کی تو واصف نے ٹوک دیا تھا کہ صحیح آیات اس طرح ہیں۔ دونوں حضرات کو اصرار تھا کہ انہوں نے صحیح تلاوت کی ہے مگر آڈیو کیسٹ کو پیچھے لے جا کر دوبارہ سنایا گیا تو تصدیق ہو گئی کہ واصف نے جہاں آیت غلط پڑھنے پر روکا تھا وہاں واقعی رامے صاحب اور شیخ صاحب نے ٹھوکر کھائی تھی۔ یہ واقعات اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ واصف کی تحریروں کا ایک بڑا حصہ قرآنی آیات کے اُردو ترجمے پر مشتمل ہے۔ ایسا اسی شخص سے متوقع ہو سکتا ہے جس کے سینے میں قرآنِ حکیم محفوظ ہو اور جو باقاعدگی سے کلامِ پاک کا مطالعہ کر رہا ہو۔ واصف علی واصف نے چوہدری عنایت اللہ کے ہمراہ مزارات پر حاضری کے ایک موقع پر جب بابابلھے شاہؒ، بابا فرید گنج شکرؒ، اولیائے ملتان، تونسہ شریف، اوچ شریف، دائرہ دین پناہ میں واقع مزارات پر حاضری کے بعد حضرت سلطان باہوؒ کے مزار پر حاضری دی تو دورانِ سفر کھانا تین آدمیوں کا منگواتے تھے حالانکہ کھانے والے وہ دو ہی افراد تھے۔ واصف خود اور چوہدری عنایت اللہ، چوہدری عنایت اللہ کے لیے یہ معمہ تھا اور معمہ ہی رہا۔ واصف علی واصف کئی بزرگوں سے بیعت تھے جن میں کچھ عرصہ تک پیر صاحب دیول شریف بھی شامل تھے، پھر پیر صاحب دیول شریف سے یہ سلسلہ پیری مریدی بعض وجوہ کی بنا پر منقطع ہو گیا تھا تاہم آنا جانا لگا رہا۔

واصف علی واصفؒ نے ایک اصلاحی تنظیم بھی ''تحریکِ خدمتِ ملت'' 1973ء میں تشکیل دی تھی جس کے مقاصد میں اسلامی ثقافتی انقلاب، پاکستان کے استحکام اور علاقائی سالمیت کے لیے کام کرنا اور نظریۂ پاکستان کا تحفظ شامل تھا مگر یہ تنظیم کچھ عرصے بعد بوجوہ ختم ہو گئی تھی، اس بارے میں تفصیلات معلوم نہیں ہو سکیں۔

واصف علی واصف کے حلقۂ احباب میں اب دانشور، سیاستدان، تاجر بڑے چھوٹے افسر، استاد، شاگرد سبھی شامل تھے مگر امیر غریب کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ محفل کا سلسلہ داستاں سرائے میں اشفاق احمد صاحب کے ہاں بھی کچھ عرصے تک جاری رہا۔ جمعرات کو البتہ واصف کے گھر پر ہی محفل آراستہ ہوتی تھی۔ ان محفلوں میں لیکچر یا وعظ کا کوئی روایتی انداز نہیں اپنایا جاتا تھا بلکہ گفتگو کا سلسلہ شروع کرنے کے لیے وہ حاضرین سے کہتے ''کوئی سوال؟''، ''کوئی مسئلہ؟'' اور یوں گفتگو کا آغاز ہو جاتا تھا۔ پھر یہ سلسلہ کئی گھنٹوں کی بات چیت پر پھیل جاتا تھا۔ واصف ایک بات کو اکثر دہرایا کرتے تھے۔ ''آج اللہ کو حاضر ناظر جان کر ان سب کو معاف کر دو جنہوں نے تم سے زیادتی کی ہے اور ان سے جا کر معافی مانگ لو جن کے ساتھ تم نے کوئی زیادتی کی ہے۔''

واصف علی واصف اور اقبال دونوں میں ایک قدرِ مشترک یہ ہے کہ اقبال کی شاعری اور فکرِ اقبال دونوں کا منبع و مآخذ قرآنِ حکیم ہے۔ اسی طرح واصف کی تحریروں کا ایک بڑا مآخذ بھی قرآنِ پاک ہے جس طرح اقبال کو سمجھنے کے لیے اس حصار میں داخل ہونا ضروری ہے جس میں آئے بغیر

اقبال شناسی کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا اسی طرح کا معاملہ واصف کے ہاں ملتا ہے۔ فکرِ اقبالؒ بھی فکرِ واصف میں اس طرح پیوست ہے، جس طرح دریا کی لہریں بحر بیکراں کی لہروں میں باہم پیوست ہوتی ہیں۔ واصف کی تحریروں سے قاری کے ذہین کی گرہیں کھلتی چلی جاتی ہیں۔ نئی راہیں، نئے انکشافات سامنے آتے ہیں۔ واصف کے ہاں جگہ جگہ قرآنی آیات کا مفہوم نہایت خوبصورت اسلوب میں سامنے آتا ہے اور یہ بھی ان کی ایک نمایاں انفرادیت ہے۔

واصف علی واصفؒ بتایا کرتے تھے کہ وہ ایک بار جب کھڑی شریف، میاں محمد صاحب کے مزار پر حاضر ہوئے تو دُعا کی کہ انہیں آواز عطا ہو جائے جس میں وہ سیف الملوک گا سکیں۔ دُعا کو قبولیت حاصل ہوئی اس لیے کہ اس سے قبل وہ ترنم کے ساتھ سیف الملوک یا کوئی اور صوفیانہ کلام نہیں گا سکتے تھے مگر اب وہ عارفانہ کلام اچھی آواز میں گا سکتے تھے۔

واصف علی واصفؒ حافظ عطا محمد صاحب سے درودِ تاج اکثر سنا کرتے تھے۔ اس لیے کہ حافظ صاحب بڑی خوش الحانی کے ساتھ درودِ تاج پڑھتے تھے واصفؒ کے مزار پر بھی درودِ تاج کندہ ہے۔

واصف اپنا نعتیہ کلام بھی اچھی آواز میں سننے کے رسیا تھے اور حافظ عطا محمد ان کی یہ خواہش پوری کیا کرتے تھے۔ ایک بار نصرت فتح علی خان آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کچھ لکھ کر دینے کی درخواست کی۔ واصفؒ نے سات مصرعے لکھ کر دیے۔ ایک محفلِ سماع میں یہ کلام نصرت فتح علی خان نے پیش کیا تو روپوں کی تھیلی بھر کر لائے اور واصفؒ کے سامنے رکھ دی۔ انہوں نے پانچ سو روپے لے لیے اور کہا: ''یہ ساری رقم آپ کی اپنی ہے اسے گھر لے جایئے''۔

واصف علی واصفؒ کو علامہ اقبالؒ کے علاوہ ابوالاعلیٰ سید مودودی سے بھی ایک خاص ارادت تھی۔ وہ سید مودودی کے مداح تھے اور احیائے دین کے لیے آپ کی اسلامی خدمات کے معترف تھے۔ سید صاحب کی وفات پر انہوں نے ایک درخواست پر قطعہ بھی لکھا تھا جو چند اصحاب کو بھی سنایا تھا لیکن یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ کہیں شائع بھی ہوا تھا یا نہیں۔ واصفؒ نے چند بار جنرل حمید گل کے بارے میں یہ جملہ دہرایا ''یہ ایک اچھے انسان ہیں اور کوئی بڑا اور اہم کام سرانجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔'' (اس بات کا ذکر چوہدری عنایت اللہ صاحب نے کیا۔ گو برادرم اعجاز الحق کو اس سے اتفاق نہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ جو بات ایک شخص سے کی گئی ہو وہ دوسرے ساتھی کے علم میں بھی ہو)۔

اُردو نثر میں تصّوف کی روایت عربی، فارسی کی کتب کے تراجم کی شکل میں آگے بڑھی مثلاً ہشت بہشت، غنیۃ الطالبین (شیخ عبدالقادر جیلانیؒ)، کشف المحجوب (سید علی ہجویریؒ)، نفحات الانس (عبدالرحمن جامی)، بوستان سعدی (سعدی شیرازی) وغیرہ۔ شہاب، ممتاز مفتی، اشفاق احمد، بانو قدسیہ کی تحریروں میں تصّوف کو مختلف شکلوں میں پیش کیا گیا ہے۔ واصف علی واصفؒ کے نثر پاروں میں تصّوف کو ایک اور ہی طرح سے شامل کیا گیا ہے۔ اس تصّوف کے ڈانڈے قرآنِ حکیم اور سیرت نبی کریم ﷺ سے جا کر ملتے ہیں۔ خلیل جبران کے جملے وقتی تحیر پیدا کرتے ہیں جبکہ واصفؒ کے جملے قاری کے من کی دنیا میں ہلچل پیدا کر دیتے ہیں اور اس کو ایک خاص سمت میں آمادہ سفر کر دیتے ہیں۔ خلیل جبران کی تحریر جو کیف و

مستی پیدا کرتی ہے وہ عارضی اور سطحی ہوتی ہے جبکہ واصفؒ کی نثر کی کیف و مستی مستقل اور دائمی ہوتی ہے اور ان کے اختصاریے دعوتِ عمل دیتے ہیں۔

واصف علی واصفؒ کو پاکستان سے، قائد سے اور مفکرِ پاکستان حضرت اقبالؒ سے محبت تھی۔ وہ ارضِ پاکستان سے اس لیے محبت کرتے تھے کہ ان کے خیال میں قائد اور ان کے ساتھیوں نے پاکستان حاصل ہی اس لیے کیا تھا کہ اسے اسلام کا ناقابلِ تسخیر قلعہ بنایا جائے گا۔ جہاں اللہ کی زمین پر اللہ کے دینِ مبین کی حکمرانی ہو گی مگر وطنِ عزیز میں بسنے والے ان انسانوں سے انہیں گلہ ہے کہ جو سیٹلائیٹ سے پیغام تو وصول کر رہے ہیں مگر اپنے قریب سے گزرتے ہوئے دوسرے انسان کے چہرے سے مترشح پیغام کے لیے انہوں نے اپنے کان بند کر رکھے ہیں۔ بھائی بھائی کے دکھ درد سے بیگانہ ہو گیا ہے۔ قابیل کے ہاتھوں ہابیل کے قتل کا جو خونی منظر آج پاکستان میں قدم قدم پر پیش کیا جا رہا تھا اس پر واصف کا دل خون کے آنسو روتا تھا۔ فرقہ واریت سے ملت کو پارہ پارہ کرنے کے جو روح فرسا منظر دیکھنے میں آتے تھے ان پر واصف علی واصف بے حد فکر مند تھے۔ اس کا ذکر کئی بار کیا، اسلام+فرقہ=صفر ان کا ایسا مضمون ہے جس میں اس پر مفصل گفتگو کی ہے۔

واصف علی واصف اپنے آس پاس سے کبھی بے خبر نہ رہے۔ دین کے نام پر محبوبِ کبریاؐ کے نام پر، تصّوف اور روحانیّت کے نام پر جو لوگ فتنے برپا کر رہے تھے ان کو بھی اپنی تحریروں کا موضوع بنایا۔ نام نہیں لیے لیکن ان کے اشارے اتنے واضح اور بلیغ ہوتے ہیں کہ ہر صورت، ہر چہرہ نکھر کر، بے نقاب ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ وہ دراصل ان فتنوں سے سادہ لوح انسانوں کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔

واصف روحانیت میں موروثیت کے قائل نہیں تھے، فرمایا کرتے تھے ''جب نبی کی وراثت موروثی نہیں تو اولیاء کی وراثت کس طرح موروثی ہو گئی؟ گدی نشینی کا تصور غورِ طلب ہے۔''

اُردو میں جدید نثر نگاری کے حوالے سے کئی معروف نام سامنے آتے ہیں جن میں ایم آر کیانی، مختار مسعود، مشفق خواجہ، قدرت اللہ شہاب، صدیق سالک، احمد ندیم قاسمی، نذیر ناجی، عطاالحق قاسمی وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں، زیادہ تر نثری سرمایہ سفر ناموں، آپ بیتیوں، شخصی خاکوں، یادداشتوں اور کالموں کی شکل میں سامنے آیا لیکن ان سب سے ہٹ کر واصف کی نثری تحریروں کو پڑھتے ہوئے ایک نام ضرور ذہن میں اُبھرتا ہے اور وہ ہے خلیل جبران کا بڑے عرصے تک اس خاص اسلوب میں ترجمہ شدہ نثر پاروں کا موجد و مختتم خلیل جبران ہی رہا۔ حبیب اشعر کے تراجم نے زیادہ مقبولیت حاصل کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ واصف اور خلیل جبران دونوں نے زندگی کے موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے، دونوں کا اسلوب اپنی اپنی جگہ منفرد، بے حد دلکش اور پر تاثیر ہے مگر دونوں میں ایک نمایاں فرق یہ ہے کہ خلیل جبران صرف فطرت آشنا تھے جبکہ واصف مقامِ حضوری پر فائز تھے ایسا ہونا اس لئے لازمی تھا کہ واصف کا منبع و مآخذ قرآن، حدیث، اولیائے کرام کے ملفوظات اور افکارِ اقبال ہیں۔ دونوں کے رنگ و آہنگ میں بھی امتیازی فرق دکھائی دیتا ہے۔ قطرہ قطرہ قلزم ہو کہ کرن کرن سورج یا دل دریا سمندر، ایک ایک سطر بظاہر ایک کرن، روشنی کی ایک لہر، محض ایک چمک، ایک ٹمٹماتا ہوا چھوٹا سا مٹی کا دیا، چراغ کی جھلملاتی لو نظر آتی ہے مگر ان کے اندر اتر کر دیکھا جائے تو یہی نشانِ منزل کا پتہ دے بلکہ کشاں کشاں منزل تک بھی پہنچادے۔ ڈاکٹر اجمل نیازی کے خیال میں خلیل جبران حکایت کہتے تھے واصف حقیقت کہتے ہیں اور اس حقیقت

میں حکایت چھپی ہوتی ہے۔ دراصل خلیل جبران کی تحریروں کو Aphorism کا نام دیا جاتا ہے یعنی فلسفیانہ اصولوں کو اختصار کے ساتھ اور جامع شکل میں لکھا جانا۔

علامہ یوسف جبریلؒ نے واصف علی واصف کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا:

''واصف نے جو تحریریں چھوڑی ہیں وہ نہایت ہی قابلِ تعریف ہیں۔ موجودہ انسانیت کے حالات و مصائب کے لیے واصف کی تحریریں ایک شافی علاج کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان انقلابی مصنفین کی فہرست میں جو انسانیت کو موجودہ مصائب سے نجات دلانے والے ہیں واصف کا نام ایک خصوصی مقام کا حامل ہوگا۔ واصف اخلاقی اور صفاتی لحاظ سے ایک عظیم انسان تھا۔ وہ مخلص اور ملنسار تھا وہ نہایت سادہ دل تھا گو کہ اس کی عزتِ نفس نہایت تیز تھی۔ وہ دیانتدار تھا، سچا تھا اور شان والا تھا۔ شستہ مزاج، صاحبِ شرف اور اعلیٰ درجہ کا انسان تھا۔ سنجیدگی کے ساتھ خوش مزاجی بھی اس کے مزاج کا حصہ تھی۔ عداوت، حسد، غیبت جیسے سفلی عوامل کا اس کے دل میں شائبہ تک نہ تھا، وہ خالص سونا تھا اور جو مقامِ قدرت نے اس کو دیا ہے وہ اس کا مستحق ہے۔ اس کی ظاہری شان و شوکت کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اس شخص کے اندر درویش بیٹھا ہے۔ آج کے دور کی خرابیوں کی نسبت سے واصف کی تحریریں نہایت بر محل اور موزوں ہیں اور حدِ کمال کو پہنچی ہوئی ہیں۔ جوں جوں زمانہ آگے بڑھے گا واصف کی تحریروں کی ضرورت اور قدر و قیمت بڑھتی جائے گی۔''

علامہ یوسف جبریلؒ صاحب کا اندازہ سو فیصد درست نکل رہا ہے۔ واصف صاحب اب جسمانی طور پر ہم میں موجود نہیں مگر ان کی کتابوں کی مانگ دن بدن بڑھ رہی ہے، ایک ایڈیشن کے بعد دوسرا ایڈیشن آرہا ہے اور ان کے قارئین کا حلقہ بغیر کسی شعوری کوشش کے بڑھتا جارہا ہے۔ واصف کے ملفوظات مختلف رسائل اور اخبارات میں جگہ پارہے ہیں۔ ادبی رسائل میں واصف کے لیے گوشے مخصوص ہورہے ہیں۔ محفلوں میں باہمی گفت و شنید کے دوران واصف کا ذکر ہورہا ہے، کتابوں کا حوالہ دیا جارہا ہے۔ مضامین میں سے اقتباسات کا حوالہ دیا جارہا ہے۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ واصف کی تحریر عبارت آرائی کے حسن یا لفاظی کے سحر کی بنیاد پر مقبول نہیں ہوئی کہ وقتی و عارضی لمحے کے لیے واہ واہ، سبحان اللہ کی آوازیں آئیں اور پھر نہ تحریر یاد رہے نہ صاحبِ تحریر و قلم، واصف کی تحریر تو سننے پڑھنے والے کے دل میں اتر جاتی ہے اور پھر ایک پل چین نہیں لینے دیتی۔ اصلاحِ احوال کے لیے واصف کا چھوڑا ہوا کتابی سرمایہ ایک اہم کردار ادا کررہا ہے۔ اس سارے سرمایہ کے زیادہ حصے کو کتابوں میں محفوظ کر لینے میں اشفاق احمد کا بڑا ہاتھ ہے۔ آڈیو کیسٹ میں ہزاروں محفلوں میں کی گئی واصف علی واصفؒ کی گفتگو کو محفوظ نہ کر لیا ہوتا تو آج ہم اس سے محروم ہو جاتے۔ میرے علم میں یہ بات بھی آئی ہے کہ ابھی کچھ کیسٹس ایسی بھی ہیں جو اشفاق احمد کے پاس محفوظ ہیں، کتابی صورت میں سامنے نہیں آئیں کیا ہی اچھا ہو کہ انہیں بھی تحریری شکل میں لاکر عام کر دیا جائے۔ میری اطلاع کے مطابق یہ کیسٹیں اس گفتگو پر مشتمل ہیں جو اشفاق احمد صاحب اور جناب واصف علی واصفؒ کے درمیان ہوتی تھی۔ واصف کے روزنامہ کوہستان میں قطعات بھی شائع ہوتے تھے جنہیں قارئین اسی طرح پسند کرتے تھے جس طرح رئیس امروہی کے قطعات کو۔

واصف علی واصف سے ملنے والوں کا حلقہ وسیع تھا۔ اس حلقے کے لوگوں کو آپ کسی طور پر بھی مختلف خانوں میں بانٹ نہیں سکتے دولت، عہدے، خاندانی مرتبے یا کسی اور بنیاد پر یہ حلقہ تقسیم ہو نہیں سکتا کہ واصف کے ملنے والوں میں سے ہر کسی نے یہی محسوس کیا کہ یہ شخص، یہ درویش خدا مست اسی کا حصہ ہے اور جتنی محبت اسے اس شخص سے ہے کسی اور سے نہیں۔ ان ملنے والوں کی ایک طویل فہرست ہے، اتنی طویل کہ شاید سارے نام گنوائے ہی نہ جا سکیں تاہم ان احباب نے اپنے حافظہ اور یادداشت پر زور دے کر کچھ نام بتائے جو یہ ہیں۔ پیر صاحب دیول شریف، خلیفہ نظیر صاحب، سائیں اختر، بریگیڈیئر سعید، جسٹس ضیاء محمود مرزا اور بیگم مرزا، اعتزاز حسن کے والدِ محترم، شورش کاشمیری، الٰہی بخش وجدانی، شیخ وزیر علی قصوری، مسعود ہمدانی، چوہدری محمد حسین، عبدالرؤف، سعید الدین علوی، چوہدری رشید (ڈی سی میر پور)، توفیق فہمی محمود شارب، رشید کامل، منصور الرحمن آفریدی، حافظ سرشار، شہباز خان، حسن میاں مختار، علامہ برہان الدین، رفیق باجوہ، ڈاکٹر نذیر، محمد سلیم، چوہدری بشیر، چاچا اللہ دتہ، سردار آصف احمد علی، اشفاق احمد، بانو قدسیہ، حنیف رامے، ڈاکٹر انور سجاد، آپا عائشہ (پرنسپل گورنمنٹ گرلز کالج)، ثمینہ باجی، اعجاز الحق، چوہدری عنایت اللہ، ڈاکٹر رونق زمان (ایم بی بی ایس)، رفیق باجوہ اور ڈاکٹر رونق زمان کے حوالے سے یاد آیا کہ ان دو حضرات سے ملاقات بڑی قابلِ ذکر تھی۔ رفیق باجوہ صاحب پہلی بار واصف صاحب سے ملنے آئے تو کوئی سوال پوچھا۔ جواب ملا ''علم کی بات نہ کیجئے کوئی سوال پریشان کر رہا ہو تو پوچھیے۔'' باجوہ صاحب نے اپنی کسی الجھن کا ذکر کیا تو سارا مسئلہ اس طرح کھول کر بیان کر دیا کہ وہ نہایت مطمئن ہو کر واپس لوٹے اور پھر کئی دفعہ ملاقات کے لیے حاضر ہوئے۔ رفیق باجوہ ایڈووکیٹ اور ان کا پورا پینل حضرت واصف علی واصفؒ کی حاضری میں کالج آتا اور اپنے گھر میں بھی حضرت واصف علی واصفؒ کو بلاتے اور حضرت تشریف لے جاتے۔ ڈاکٹر رونق زمان کے بیٹے نے کسی کتب فروش سے ''کرن کرن سورج'' خرید کر پڑھی اور کتاب ڈاکٹر صاحب کو مطالعہ کے لیے دے دی۔ ڈاکٹر رونق زمان نے مطالعہ کے بعد پوری رات جاگ کر گزاری۔ صبح لاہور واصف کو خط لکھ کہ آپ سے فوری ملاقات بہت ضروری ہے ورنہ میں تو پاگل ہو جاؤں گا۔ میں آ جاؤں یا آپ تشریف لائیں گے؟ واصف لاہور سے ایبٹ آباد پہنچے۔ شب بھر راز و نیاز کی باتیں ہوتی رہیں اور صبح ڈاکٹر صاحب کی ہیجانی کیفیت دور ہو چکی تھی۔ پھر ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔

واصف علی واصف کی اپنی شخصیت کے دو تین پہلو بڑے واضح اور نمایاں تھے۔ استاد، صاحبِ مشاہدہ صوفی، ایک پکے اور سچے محبِ وطن اور اپنے انسانی رشتہ کے تقاضوں سے پوری طرح واقف و شناسا جس کے نتیجے میں انسان، انسان سے محبت کرنے لگتا ہے۔ دوسروں کے عیب اس کی نظر میں کم آتے ہیں۔ احترامِ آدمی کا پاس و لحاظ زیادہ رہتا ہے کہ اولیائے کرام نے اشاعتِ دین کے لیے اسی کو مؤثر ذریعہ بنایا۔ واصف کی تحریریں سینوں کو منور کرتی اور قلوب میں جمی برسوں پرانی میل دھو ڈالتی ہیں۔ ان کی کسی بھی کتاب کی کوئی سطر، ایک بار نظروں سے گزر جائے یا کانوں میں پڑ جائے پھر قاری ہو یا سامع وہ چین سے نہیں بیٹھ سکتا۔ واہ واہ سبحان اللہ کے بعد بات رفت و گذشت نہیں ہو جاتی بلکہ ایک میکانکی عمل اندر ہی اندر اپنا کام شروع کر دیتا ہے۔ وصال سے ایک روز قبل واصف نے اپنے اہلِ خانہ کو جمع کیا اور اپنی یہ غزل ترنم سے پڑھنے کو کہا:

کون کسی کا اس دنیا میں کس نے پیت نبھائی
اپنی ذات میں گم ہیں سارے کیا پربت کیا رائی

پتے ٹوٹ گئے ڈالی سے یہ کیسی رت آئی
مالا کے منکے بکھر گئے ہیں دے گئے یار جدائی
سانس کی آری کاٹ رہی ہے صدیوں کی پہنائی
ہستی کے بہروپ میں واصف موت سندیسہ لائی

پھر بیوی بچوں سے پوچھا کہ کیا وہ سب اللہ کی رضا پر راضی ہیں۔ سب نے ہاں میں جواب دیا تو خود ہی فرمایا: اناللہ وانا الیہ راجعون۔

واصف علی واصفؒ کو ڈاکٹروں نے سگریٹ نوشی سے منع کر دیا تھا۔ پھیپھڑوں میں تکلیف تھی۔ بیش فشار خون (Hypertension) کا اثر گردوں پر پڑا، پھر ڈاکٹروں نے Prostate Gland کے مرض لاعلاج قرار دے دیا تھا۔ احباب کے اصرار پر لندن بھی علاج کے لیے گئے مگر مرض نہ گیا۔ واپسی پر 18 جنوری 1993ء کو شیخ زید ہسپتال لاہور کے انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں داخل رہنے کے بعد اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے اور اب لاہور کے مشہور قبرستان میانی صاحب میں محوِ استراحت ہیں۔

لاہور میں تجہیز و تکفین سے پہلے کچھ عزیز و اقارب نے مشورہ دیا کہ واصف صاحب کو خوشاب لے جا کر آبائی علاقے میں دفن کیا جائے لیکن ملک شوکت محمود (واصف صاحب کے چھوٹے بھائی) اس تجویز سے متفق نہ تھے اس لیے کہ ان کے خیال میں چونکہ واصف ساری عمر لاہور میں رہے تھے۔ اس لیے بھائی نے سوچا لاہور کی خاک انہیں بلا رہی ہے اور یہیں دفن کرنے کا انتظام کر لینا چاہیے۔ ایک دوسرا مشورہ واصف صاحب کی ہمشیرہ ضمیر النساء نے دیا کہ قبر جوہر ٹاؤن لاہور میں گھر کے اندر بنائی جائے اور اس مشورے کا پسِ منظر یہ بیان کیا گیا کہ شوکت محمود کے خسر ملک انور الدین، انجینئر کو خواب میں واصف صاحب نے کہا ہے کہ مجھے اس جگہ دفن کرنا۔ ملک شوکت محمود کو اس تجویز سے اتفاق اس لیے نہ تھا کہ ان کے خیال میں گھر کے دالان میں اپنی قبر بنوانے کی تاکید واصف صاحب کسی سے عالمِ خواب میں نہیں کر سکتے تھے۔ یہ تو مرحوم و مغفور کی تعلیمات اور فلسفۂ حیات کے منافی بات تھی، بھلا وہ ایسا کیوں چاہتے؟ تاہم شوکت صاحب نے کہا کہ تابوت بنوالیا جائے اور فی الحال واصف صاحب کا جسدِ خاکی امانتاً دفن کر دیا جائے۔ رات کے دو بجے تھے اور کوئی فیصلہ نہیں ہو رہا تھا۔ آخر اس بات سے سب نے اتفاق کیا کہ امانتاً دفن کر دیا جائے۔

منصور الرحمٰن آفریدی، ایڈووکیٹ اٹھ کر چلے گئے اور کچھ دیر بعد آ کر اطلاع دی کہ میانی صاحب میں ایک قطعہ زمین خالی ہے مگر زمین سے 20 فٹ نشیب میں ہے تاہم اسے مٹی سے بھرایا جا سکتا ہے۔ صبح تک وہ جگہ ہموار کر دی گئی تھی۔ تابوت اس وقت تک بن کر نہ پہنچ سکا جب تک جنازہ اٹھا نہ لیا گیا۔ یوں امانتاً دفن کرنے کا معاملہ بھی پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ ایک اطلاع کے مطابق میاں میر میں بھی دفن کرنے کے بارے میں غور کیا گیا تھا لیکن کسی وجہ سے وہاں بھی دفن نہ کیا جا سکا۔ یوں واصف صاحب یہ دنیا چھوڑ دینے کے بعد بھی لاہور ہی میں رہے۔ اب ہر سال عرس کا اہتمام بھی ہوتا ہے۔ سیمناروں میں واصف علی واصف کے نام اور کام کا تذکرہ ہوتا ہے۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد حاضری کے لیے آتی ہے اور یوں واصف صاحب کا فیض جاری ہے۔ آپ کی تصنیفات سے نصیب والے قارئین مستفیض ہو رہے ہیں۔ دور و نزدیک کے مشہور و معروف افسانہ نگار برادرم اعجاز احمد فاروق تشریف لائے اور بڑی حیرت سے بتایا کہ ''حرف حرف حقیقت'' کے مطالعہ کے بعد راولپنڈی میں ان کے ملنے والے عبادت و ریاضت

میں محو دکھائی دیے حالانکہ اس سے قبل دین سے دور بھاگتے تھے اور پکے دنیادار تھے، ایسا بہت کم لکھنے والوں کا مقدر بنتا ہے۔ دراصل جو فقر، فکرِ دنیا سے نجات دلاتا ہے اس فقر کا مفہوم سمجھ آجائے تو ایسی تحریریں قلم سے نکلتی ہیں۔ یہ وہی فقر ہے جس کے بارے میں خود واصفؒ فرماتے ہیں:۔

فقر ہے نانِ جویں کی داستاں
زر پرستی فقر کی حامل کہاں
فقر تاریکی میں ہے روشن دیا
فقر کی آواز ہے بانگِ درا

فصل 3۔ واصف علی واصفؒ کی پنجابی شاعری میں صوفیانہ روایت:

واصف علی واصفؒ لمحہء موجود کے ان معروف و مقبول صوفی دانش وروں میں سے ہیں جنہوں نے علمی استدلال، تفکر و تدبر اور حکمت و دانائی سے آج کی بھولی بھٹکی انسانیت کا رشتہ خالقِ کائنات سے مضبوط بنایا۔ وہ بنی نوعِ انسان کی فکری انارکی، ذہنی جمود، اور لاحاصلی کو بار بار موضوع بناتے ہیں تاکہ ہمیں اپنے مقصدِ حیات کے تعین میں آسانی ہو سکے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ انہوں نے شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانیؒ کی طرح تجدیدِ دین کا فریضہ سرانجام دیا ہے مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے ذہن و فکر کے زنگ آلود خانوں کو صیقل کیا، عقل و شعور کو مہمیز دی، تعلیم یافتہ طبقے کو شریعت، طریقت اور حقیقت کے راستے پر گامزن کیا۔

واصف علی واصفؒ کا پنجابی شعری مجموعہ " بھرے بھڑولے" نومبر 1994ء میں شائع ہوا جس کا سرورق محمد حنیف رامے نے بنایا ہے۔ واصف علی واصفؒ کی پنجابی شاعری کا مجموعی تاثر صوفیانہ طرزِ فکر کا ہے، جس کے ذریعے انہوں نے مسلمانوں کی اجتماعی صوفیانہ روایات کے علاوہ اپنے علاقے پنجاب کے صوفیانہ اشارے بھی دیئے ہیں۔ واصف علی واصفؒ ایک روحانی شخصیت تھے، جن کے روحانی تجربے محولہ بالا صوفیانہ تجربات کے ساتھ مملو ہو کر ایک جداگانہ رنگ پیش کرتے ہیں۔ واصف علی واصفؒ خواجہ میر درد کے بعد اردو پنجابی شعری روایت کے وہ واحد صوفی شاعر نظر آتے ہیں جن کی ابتداء سے لے کر آخر تک ہر دو زبانوں میں کی گئی شاعری تصّوف کے نظری پہلوؤں کی بجائے عملی تصورات کو بھی سامنے لاتی ہے۔ ان جیسے لوگ صدیوں کے بعد صفحۂ ہستی پر طلوع ہوتے ہیں جو تصّوف کے روحانی، جمالیاتی تجربات کی باریک بینی کو حق الیقین کی منزل سے نہیں بلکہ عین الیقین کے مقام سے دیکھتے ہیں۔ واصف علی واصفؒ ان خاصانِ خدا میں شمار ہوتے ہیں جن سے قدرتِ کاملہ نے یہ عظیم کام لیا کہ انہوں نے اپنی روحانی وارداتِ قلبی کو اپنی شاعری کا مرکزی جوہر بنایا۔ واصف علی واصفؒ کی پنجابی شاعری کا مجموعہ " بھرے بھڑولے" پڑھنے سے صوفیائے کرام کی تعلیمات کے نقش ہر طرف بکھرے نظر آتے ہیں۔ وہ خدا کے تقرب کے حصول کے لئے عشق کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ دنیا کی بے ثباتی، شیخِ کامل کی ضرورت، عشقِ رسول ﷺ جیسے موضوعات ان کے ہاں بار بار نظر آتے ہیں۔ میں ان کے زیرِ نظر مجموعے میں موجود ان کی ایک نظم " چادر" کی بطورِ خاص تحسین کرنا چاہوں گا جس میں ان کی والہانہ محبتوں اور چاہتوں کے نقوش ہمیں ہر طرف نظر آتے ہیں۔

وارث کھول دے منہ خزانیاں دا

کرے رو کے اج سوال چادر
مستی لے کے جام الست وچوں
کیتا یار دے نال وصال چادر

واصف علی واصفؒ کی نظموں میں فنا کا احساس غالب ہے۔ وہ انمیلیوں، کہنہ مکرنیوں، دوہوں، اور چکی ناموں کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے خوب صورت ادبی انداز اپناتے ہیں تاکہ قاری کو فکرِ آخرت کے لئے تیار کیا جاسکے۔ یہ دنیا چند روزہ ہے۔ صوفی، سادھو، مست الست فقیر، واعظ مولوی اور پنڈت، سب اپنے اپنے رنگ میں انسانوں کو حقیقی منزل کے لئے تیار کرتے ہیں۔ اردو کے صوفی شعراء کی شاعری کو غور سے پڑھیں تو یہ موضوع ہر طرف چھایا ہوا ہے۔ خود پنجابی شعراء کے ہاں بھی یہی شعری روایت تخلیقی تجربے کی فنی مہارت سے مربوطہ ہو کر قاری کی سماعتوں کو تروتازگی عطا کرتی ہے۔ واصف علی واصفؒ کی شاعری کے مجموعے ''بھڑے بھرولے'' میں موجود ایک نظم کے مندرجہ ذیل مصرعے میرے دعوے کی عملی دلیل ہیں۔

ساڈے وہڑے جوگی آیا
بنڑی مصیبت بھاری اے
پیکے گھر وچ کد تک رہنڑا
اج سسرال تیاری اے
جو چاہندا اوہ آپے کردا
نہ کوئی جیندا نہ کوئی مردا
صدقے جایئے اس سوہنڑے دے
جس دی شان نیاری اے

واصف علی واصفؒ کی شاعری میں صوفیانہ لے نظم و غزل ہر دو اصنافِ سخن میں موجود پائی جاتی ہے۔ وہ کبھی سسی کی طرح روہی کے تھل میں تڑپتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کبھی ان کے دل میں ہر طرف شور برپا ہو جاتا ہے۔ ان کی سسی کا شہر بھنبھور اجڑ جاتا ہے۔ شاید یہی وہ جذبۂ عشق حقیقی ہے جس میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت میں تڑپنا، کسمسانا، تلملانا، انسان کا خاصہ قرار پاتا ہے۔ بالاخر تو من تو شدی تو من شدم کا معاملہ پیش آجاتا ہے۔ واصف علی واصفؒ کی شاعری میں ایک اہم موضوع عشقِ رسول ﷺ ہے، وہ اپنی پنجابی شاعری کے ذریعے معرفت و سلوک کے وہ پیچیدہ و دقیق علمی نکات سامنے لاتے ہیں کہ عقلِ انسانی ششدر و حیران رہ جاتی ہے۔ وہ عشقِ رسول ﷺ کو حاصلِ کائنات قرار دیتے ہیں کیونکہ یہی وہ جذبہ ہے جو انسان کو عرفانِ ذات سے ہمکنار کرتا ہے اور اس کے لئے باعثِ نجات ہے۔

اودھی گھر گھر نوبت وجدی

ایہہ ازلی گل نہ اج دی
اوہ م دی بکل مار کے گل کردا ساڈے نال
اونہوں ملنا سوکھی گل اے
اوہ آپے ساڈے ول اے
تسی بیٹھوں اونہوں سوردے
اوہ جاوے دیوا بال

واصف علی واصفؒ کی شاعری میں اسرار و رموز، ہست و بود، فلسفۂ تخلیقِ کائنات اور تعلیماتِ قرآنی کی جھلک واضح نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری اپنے مخصوص رنگ میں علمِ حقیقت کی اتھاہ گرائیوں کو اجاگر کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔

عشق الست بلا دا قصہ عشق نفی اثبات
کثرت دے وچ عشق دی وحدت
وحدت وچ تکبیر
عشق مزمل، عشق مدثر، طٰہٰ تے یسین
ظاہر باطن ذات عشق دی
ایہو مڈھ اخیر

واصف علی واصفؒ آج کے انسان کو فکرِ آخرت کے لئے تیار کرتے ہیں۔ وہ عالمگیر محبت، بے مثال اخوت کے دعوے دار ہیں۔ وہ خود غرضی، حرص و ہوس اور لالچ کے عفریت کو مٹانے کے درپے ہیں، تاکہ صبر و شکر، توکل اور قناعت کے اوصاف کو اپنا کر انسان اپنے حقیقی منزل سے ہمکنار ہو سکے۔

اے دو چار دنا دا میلا دنیا دا
میلا ویکھ تو سنجاں ایتھے ہٹ نہ پا
کریں نہ اتھے روپ دا مانڑ
منہ تے پیارے مٹی پانڑ
کوئی دیویں کم دی مت بھرا
اتھے کد آواں گے وت بھرا
جنہیں بولیا حرف محبت دا
اتھے اوہدی بنڑدی گت بھرا

فصل 4۔ واصف علی واصفؒ کا فنِ نعت گوئی:

واصف علی واصفؒ ایک صوفی دانش ور، دانائے راز، نعت گو شاعر اور بالغ نظر فلسفی تھے۔آپؒ کا نعتیہ مجموعہ ''ذکرِ حبیب ﷺ'' 2004ء میں شائع ہوا جس میں ان کے فرزندِ ارجمند کاشف علی۔۔۔ ۔'عرض ناشر' میں لکھتے ہیں:۔

''حضور ﷺ کے خاص محبان یعنی اولیائے کرام نے جس طرح سے اور جس محبت سے نعت کہی، اس کی نہ کوئی مثیل ہے نہ مثال ہے۔اللہ نے ان کو یہ فضل و فیض اس محبت کے طفیل عطا کیا جو ان کو اپنے آقا و مولا سرکار دو عالم ﷺ سے تھی۔اسی محبت سے قبلہ واصف علی واصفؒ کا قلب اس طرح منوّر تھا کہ ان کے کلام، تحریر اور گفتگو میں جگہ جگہ اس نور کا جلوہ صاف نظر آتا ہے۔' ذکرِ حبیب میں اردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں لکھی گئی نعتیں موجود ہیں جب کہ فرمودات اور خطبات کو بھی شاملِ کتاب کر دیا گیا ہے۔واصف علی واصفؒ کے نعتیہ شعری مجموعے میں شامل '' دعا'' ایک ایسی نظم ہے جس کے عمیق مطالعہ سے ان کی بے پناہ حب الوطنی کے علاوہ ملک میں پائی جانے والی سیاسی بے اعتدالیوں، سماجی انتشار و افتراق کی طرف واضح اشارے ملتے ہیں۔یہ نظم مشرقی پاکستان کے المیہ کی ترجمانی بھی کرتی ہے، واصف علی واصفؒ نوے ہزار فوجیوں کی رہائی کی دعا مانگتے دکھائی دیتے ہیں۔واصف علی واصفؒ کی اس طویل نظم سے یہ امر مترشح ہوتا ہے کہ وہ ملتِ اسلامیہ سے سچی عقیدت رکھتے ہیں۔وہ مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق کا پیغام دیتے ہیں تاکہ عالمِ اسلام سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر مغربی استعمار کا مقابلہ کر سکے۔مجھے ان کے بعض اشعار سے یہ بھی محسوس ہوا کہ وہ حالی، اکبر اور اقبالؒ کی قومی شعری روایت کو آگے بڑھانے کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔ان کی نظم دعا مثنوی کی ہیئت میں ہے۔اس کے بین السطور مفاہیم و مطالب پر نظر ڈالنے سے کہیں کہیں مولانا حالی کی ' مسدسِ حالی' کی بازگشت بھی سنائی دیتی ہے اور کلامِ اقبالؒ کی تفہیم و تحسین کے اثرات بھی واضح طور پر محسوس کئے جا سکتے ہیں۔یہ امر بھی ایک بدیہی حقیقت ہے کہ واصف علی واصفؒ کا دل وطن کی محبت میں ڈوبا ہوا ہے۔وہ پاک سرزمین کی تعمیر و ترقی کا خواب دیکھتے ہیں، ان کی آرزو ہے کہ اللہ کی زمین پر اللہ کا نظام نافذ العمل ہو۔وہ بارگاہِ خداوندی میں نبی اکرم ﷺ کے وسیلۂ جلیلہ سے استغاثہ پیش کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو ذلت و رسوائی سے نجات حاصل ہو اور وہ عزت و کامرانی کے راستے پر گامزن ہو سکیں۔

مسلماں سے مسلماں دُور کیوں ہے
ہر اک اپنی جگہ مجبور کیوں ہے
مسلماں کا لہو ارزاں ہوا ہے
چمن توحید کا ویراں ہوا ہے

واصف علی واصفؒ کی نعتوں میں استغاثہ کا انداز ملتا ہے۔وہ بار بار رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں اپنے غم و الم کی فریاد پیش کرتے ہیں کیونکہ قیامِ پاکستان کے وقت مہاجرین کی آبادکاری، قتل و غارت گری کی فضا میں وہ آقائے دو جہاں ﷺ سے توجہ، استعانت اور نگاہِ خاص کے خواہاں ہیں۔وہ صرف نعت کے شاعر ہی نہیں تھے بلکہ انہوں نے غزلیں، دوہے اور گیت بھی لکھے ہیں، جن میں فنا کا احساس غالب ملتا ہے۔

یا رسول اللہ ﷺ سنو فریاد میری

ہو کشتِ آرزو آباد میری
مصیبت ہے بڑا مجبور ہوں میں
ستم ہے تیرے در سے دور ہوں میں
عہدِ ماضی میں جو امت تھی چٹان
آج وہ گرتی ہوئی دیوار ہے
تو نظر کر دے تو بیڑا پار ہے

واصف علی واصفؒ کی نعت میں قومی تاریخ اور تحریک پاکستان کے اہم حالات وواقعات کے حوالے بھی ملتے ہیں، جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ قومی تاریخ کے دھاروں کو اسلامی تعلیمات اور مذہبی ورثے کی روشنی میں دیکھتے ہیں۔ان کی نعتیہ شاعری میں پاکستانیت کی ایک واضح لہر محسوس کی جاسکتی ہے، جسے بعد میں مجددِ نعت حفیظ تائب نے مزید آگے بڑھانے کا فریضہ سرانجام دیا ہے۔

بنایا تھا تمہارے نام سے جو آشیاں ہم نے
گری ہے اس پہ ہو کے برقِ برہم یا رسول اللہ ﷺ
کرم ہوا ارضِ پاکستان پر یا رحمتِ عالم ﷺ
سلامی دے رہا ہے سبز پرچم یا رسول اللہ ﷺ

واصف علی واصفؒ کا دل ''عشقِ رسول ﷺ'' سے لبریز ہے۔ان کی نعتوں میں اچھوتے موضوعات، منفرد و یگانہ تراکیب، سوز و گداز اور رقتِ قلبی کے مناظر دیکھنے میں آتے ہیں۔ وہ قرآنِ حکیم، احادیثِ نبوی ﷺ اور سیرت النبی ﷺ کے واقعات سے اخذ و اکتساب کر کے نعت لکھتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ انہوں نے زیادہ نعتیں نہیں لکھیں مگر ان کے موجود و دستیاب کلام میں جذبے کی گہرائی، فکری تعمق نگاہی اور فنی اوصاف موجود ہیں۔

سرمگیں چشم آیہ ما زاغ
مصطفیٰ آنکھ ہو خدا صورت
زلف واللیل والضحیٰ چہرہ
ہو خدا آنکھ مصطفیٰ چہرہ

واصف علی واصفؒ کی نعتوں میں وفورِ شوق، تڑپ اور آرزو کا جہان پوشیدہ نظر آتا ہے۔ان کی نعتیں الفاظ و تراکیب کے حسنِ استعمال، معنوی بلاغت، فصیح الکلامی کی شاہکار نظر آتی ہیں۔ واصف علی واصفؒ کی نعتیں بربطِ دل سے پھوٹتا ہوا ہجر و فراقِ طیبہ کا ایک نغمہ ہیں جو آقا ﷺ کی محبت و چاہت میں ڈوبا ہوا ایک دلکشا گیت ہے۔

اللہ ہو جب اس کا ثنا گر نعت کہوں میں کیسے

میں قطرہ وہ ایک سمندر نعت کہوں میں کیسے
صدیاں گزریں آج بھی اس کا ہر گھر میں ہے اجالا
روشن روش نور کا پیکر نعت کہوں میں کیسے

واصف علی واصفؒ عشقِ رسول ﷺ کو تکمیلِ ایمان کا جزو قرار دیتے ہیں۔ان کی نعتوں میں نبی اکرم ﷺ کو عمر بھر کا حاصلِ ایمان گردانا گیا ہے،وہ انہیں ﷺ کی عظیم ہستی کو ذریعۂ نجات سمجھتے ہیں۔ان کی نعتوں میں نبی آخر الزمان حضرت محمد ﷺ سے ان کی قلبی وجذباتی وارفتگی کے مناظر لائقِ صد تحسین ہیں۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ واصف علی واصفؒ حضور اکرم ﷺ کی ذات والا صفات کے سراپا جمال میں ہمہ تن کھو چکے ہیں۔ واصف علی واصفؒ کی نعتوں میں رسول اللہ ﷺ کی تعریف وتوصیف کے بعض قطعی نئے نویلے عنوانات بھی ملتے ہیں جس سے ان کے کلام کی فنی بالیدگی اور فکری ترفع کا بدرجہ اُتم اندازہ ہوتا ہے۔واصف علی واصفؒ نے اپنے فنِ نعت گوئی میں شعوری کاوش سے اپنا مخصوص فکری منطقہ اور نعتیہ آہنگ تشکیل دینے کی کوشش کی ہے، جس میں وہ کامیاب نظر آتے ہیں۔ان کی نعتوں میں موجود مندرجہ ذیل نعتیہ اشعار سے شاعر کی غیر معمولی تخلیقی اپج اور موضوعاتی بوقلمونی کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس نظر میں فاصلے صدیوں کے بھی حائل رہیں
اپنے درویشوں کو وہ ہر دور میں آ کر ملے
تو ہی کائنات کا راز ہے تیرا عشق عین نماز ہے
ترا حسن خاتم دلبری تو رسولنا ہمہ حال ہے
تیرے نام سے جو بنا وطن ہے اس پہ وقت بڑا کٹھن
ہو نگاہ لطف شہ زمن میری آبرو کا سوال ہے
السلام اے راز الا اللہ در شکل بشر
السلام اے فقر و فخری سید صحرا نشیں
السلام اے وجہِ تخلیق جہانِ رنگ و بو
السلام اے ابتدا و انتہائے مرسلیں

واصف علی واصفؒ کی اردو نعتوں میں ایک ایسی نعت بھی دستیاب ہوئی ہے جس میں ہندی لفظیات کے استعمال نے اسے صنفِ دوہا کے قریب تر کر دیا ہے۔یہ نعت موسیقیت و روانی، جذبہ و فکر کی مدھم زیریں لہروں اور مفاہیم و موضوعات کے اعتبار سے رگِ جاں کے قریب محسوس ہوتی ہے۔ واصف علی واصفؒ کی ہر نعت دیر تک یاد رہنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہے۔

جگت گرو مہاراج ہمارے ﷺ

اللہ کے محبوب ہیں پیارے ﷺ

واصف علی واصفؒ کی نعتوں میں الفاظ و تراکیب کا غیر معمولی ذخیرہ بھی ملتا ہے۔ انہوں نے اردو نعت کو نادر و نایاب تراکیب کے تخلیقی استعمال سے باثروت بنایا ہے۔ واصف علی واصفؒ کی نعتیں لسانی اعتبار سے ادبی حسن و رعنائی کا شاہکار ہیں۔ انہوں نے نعتِ رسول اکرم ﷺ میں تسلسلِ فکر کو فروغ دیا ہے۔ وہ ایک ہی موضوع پر مسلسل اشعار لکھنے کی بھرپور صلاحیت سے بہرہ ور ہیں۔ واصف علی واصفؒ کی نعتوں میں بدرِ منوّر، داورِ محشر، آئینۂ جمالِ ازل، قندیلِ بزمِ علم و عمل، دُرِ یتیم و امی لقب، مظہرِ انوار، نازشِ آدم، کمالِ حسنِ شیم جیسی تلمیحات اپنے تاریخی و علمی تناظر میں نت نئے معانی کے آفاق وا کرتی دکھائی پڑتی ہیں۔ واصف علی واصفؒ کے بعض اشعار اپنے اوجِ تخیل اور ندرتِ فکر کے لحاظ سے واقعی لائقِ داد و تحسین ہیں۔

آہو کو چشم سرو کو قامت ہوئی نصیب
پھولوں کو مل گیا ہے پسینہ حضور ﷺ کا

واصف علی واصفؒ کی نظم میلاد النبی ﷺ سے ان کی قادر الکلامی کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سیرتِ رسول ﷺ کی کس قدر تہہ در تہہ پرتوں کو سلیقہ مندی سے سامنے لاتے ہیں۔

در و دیوار طیبہ کے خوشی سے جگمگاتے ہیں
فضائیں رقص کرتی ہیں پرندے چہچہاتے ہیں
ملائک حور و غلماں رہ میں آنکھیں بچھاتے ہیں
کہ سلطانِ زمانہِ دہر میں تشریف لاتے ہیں
جبینِ آسماں جھلکتی ہوئی سوئے زمیں آئے
مبارک ہو جہاں کو رحمت اللعلمیں آئے

واصف علی واصفؒ نے ذکرِ حبیب میں معراج کی رات پر تین طویل نظمیں لکھی ہیں، جن سے ان کی رفعتِ فکر اور قرآنی علوم پر دسترس کی جھلک واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ واصف علی واصفؒ نے حسن و عشق کی اس انوکھی داستان کے لمحاتِ حسین کو زندۂ جاوید کر کے لکھ دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس واقعہ کے تاریخی و مذہبی پسِ منظر سے نہ صرف بخوبی واقف ہیں بلکہ قارئین کے سامنے اسے بیان کرنے کی بھی تخلیقی صلاحیت رکھتے ہیں۔

قابِ قوسین سے ادنٰی ہے مقام محمود
سرنگوں کر گئی افلاک کا سر آج کی رات
خوشبوئے گیسوئے والیل سے مہکا عالم
چشم ما زاغ ہوئی جلوہ نما آج کی رات

واصف علی واصفؒ کی ایک طویل نعت صلِ علی صلِ علی پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بیک وقت فارسی تراکیب اور قرانی آیات سے استفادہ کرتے ہوئے سماع کے رنگ سے ہم رنگ بھی ہیں۔ان کے مصرعے کے مصرعے ایک وجد آفرین کیفیت کے آئینہ دار معلوم ہوتے ہیں۔وہ معرفت و سلوک کے سمندر میں اس قدر غوطہ زن ہو جاتے ہیں کہ قاری کیف و سرور کی ماورائی کیفیت سے ہمکنار ہونے لگتا ہے۔ان کی اس خوبصورت طویل نظم سے حیرت انگیز معانی و مفاہیم کی جہتیں پھوٹی پڑتی ہیں۔ان کے بعض اشعار شعور و احساس کے دبیز پردے اٹھانے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

اے قبلہ گاہ شفیق اے رحمت العالمین
اے وجہِ تخلیقِ جہاں صلی علیٰ صلی علیٰ
دربان ہے روحِ امیں مسند تری عرشِ بریں
تو ہے مکینِ لا مکاں صلِ علی صلِ علی

واصف علی واصفؒ کی نعتوں میں حضور اکرم ﷺ سے والہانہ لگاؤ متنوع الجہات تخلیقی فن پاروں میں ڈھل کر قاری کی سماعتوں میں شیرینی انڈیلتا رہتا ہے۔وہ اپنی نعتوں کے ذریعے فروغِ عشقِ رسول ﷺ کے لئے عملی طور پر کوشاں ہیں۔ان کی یہ پاکیزہ محبتیں دلوں کے قفل کھولتی اور طیبہ کی پاک فضاؤں کو خراجِ عقیدت پیش کرتی دکھائی دیتی ہیں۔

انوار برستے رہتے ہیں اس پاک نگر کی راہوں میں
اک کیف کا عالم ہوتا ہے طیبہ کی مست ہواؤں میں

فصل 5۔واصف علی واصفؒ اور شبِ راز:

واصف علی واصفؒ ایک درویش منش صوفی بزرگ تھے۔آپؒ کا صوفیانہ کلام بنی نوعِ انسان کو خالقِ کائنات سے ملانے کے لئے رابطے کا ذریعہ ہے،جو قاری کے احساس و شعور کو جھنجھوڑتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔واصف علی واصفؒ نے اولاً حضرت علی ہجویری داتا گنج بخشؒ کے نام ایک منقبت تحریر کی ہے، جس میں ان کی محبتیں اور عقیدتیں دلکش ادبی اسلوب میں ڈھل کر سامنے آئی ہیں۔واصف علی واصفؒ کی یہ منقبت شریعت، طریقت اور حقیقت کی منازل علم و عرفان طے کرنے والے صاحبانِ فکر و نظر کے ذوق و وجدان کی تسکین کے لئے ایک سامان بہم پہنچاتی ہے،واصف علی واصفؒ کی یہ منقبت نصرت فتح علیخان نے اپنے مخصوص انداز میں پڑھنے کی سعادت بھی حاصل کی ہے۔

بغداد سے غوث آئے اجمیر سے خواجہ بھی
داتا کے غلاموں کو اب رقص میں آنے دو
مستوں کو مبارک ہو پر کیف گھڑی آئی
بھر جائیں گے پیمانے نظریں تو اٹھانے دو

واصف علی واصفؒ نے سائیں محمد حسین کانواں والی سرکارؒ کی شان میں بھی ایک منقبت لکھی ہے، جس کا ذکر ضروری سمجھا جاتا ہے۔ واصف علی واصفؒ نے سائیں محمد حسین کانواں والی سرکارؒ کی ذات والاصفات کو زبردست انداز میں خراجِ عقیدت یوں پیش کیا ہے۔

میرے بابا کا یہ فیضانِ نظر دیکھے کوئی
اک نظر سے کرتے ہیں جاری دلوں میں ذکرِ ھو
موتو قبل ان تموتو کی یہی تفسیر ہے
اپنا روضہ زندگی میں ہے نظر کے روبرو

واصف علی واصفؒ نے ماہیئے بھی شامل کتاب کیے ہیں۔ اردو ماہیئے کے بانی چراغ حسن حسرت کا مندرجہ ذیل ماہیا بہت مشہور ہوا۔

باغوں میں پڑے جھولے
تم بھول گئے ہم کو
ہم تم کو نہیں بھولے

واصف علی واصفؒ کے ماہیئے زندگی کی بے رحم حقیقتوں اور وقت کے سفاک سفینوں کی نشان دہی کرتے ہیں۔ ان کے ماہیئے دنیا کی بے ثباتی، شدتِ غم اور زمانے کی بیوفائی کے عکاس و ترجمان ہیں۔

گل چاک نہ ہو جائیں
معصوم تمنائیں
بے باک نہ ہو جائیں
باغوں میں بہار آئی
پی پی ہے پپیہے کی
کوئل کی پکار آئی

واصف علی واصفؒ کی نظم "میں قطرے میں ہوئی دریا" رہنمایانِ وقت کی چیرہ دستیوں ارباب سیاست کے منافقانہ روّیوں اور غدارانِ وطن کے منہ پر ایک زبردست طمانچہ ہے۔

واصف علی واصفؒ نے سقوطِ ڈھاکہ ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کے واقعے کے بعد ایک طویل نظم "عید مبارک" بھی لکھی ہے۔ وہ ۹۰ ہزار فوجیوں کو عید مبارک کہتے ہیں مگر ان کا دل غم میں ڈوبا ہوا ہے۔ وہ اربابِ وطن کو اتحاد و اتفاق کا درس دیتے ہیں۔

یہ صبحِ مسرت ہے کہ ہے شامِ غریباں
رنجیدہ و دلگیر و حزیں عید مبارک

ملت کے جواں قید میں پابندِ سلاسل
ہر دیس میں کیمپوں کے مکیں عید مبارک

واصف علی واصفؒ کی غزل سادگی، سلاست اور روانی کی آئینہ دار ہے۔ وہ مشکل پسندی سے شعوری طور پر گریز کرتے ہیں۔ ان کی شاعری حقائق و معارف کی داستان بیان کرتی ہے، وہ دنیا کی بے ثباتی کے موضوع سوز و گداز، درد مندی اور جذبہء بے اختیارِ شوق سے فنِ شعر کی بنت کاری میں مصروف نظر آتے ہیں۔

بہت تھی مختصر رودادِ ہستی
چلے تھے گھر سے ہم گھر آ گئے ہیں

واصف علی واصفؒ کی غزل میں زمانے کی بیوفائی، محبوب کی بے نیازی اور اس کا جور و ستم، جدائی کے بخشے ہوئے زخمِ نہاں جیسے مضامین و موضوعات صاف نظر آتے ہیں مگر ان سب میں جداگانہ موضوع، وارداتِ قلبی اور عشقِ حقیقی کا بیان ہے۔ وہ آج کے انسان کو مادی دنیا کی آسائشات، حرص و ہوا اور لالچ سے دور رکھ کر فکرِ آخرت کے لئے آمادہ کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ جہاں زندگی کی ناپائیداری کا گلہ کرتے ہیں، وہاں وہ آخرت کے لئے زادِ سفر اختیار کرنے کی دعوتِ فکر بھی دیتے ہیں۔

بہاریں ہی بہاریں ہیں چمن میں
گلوں میں رنگ باقی ہے نہ بو ہے
کس کو دیکھا گیا تھا صبحِ ازل
اس کا جلوہ دکھا دیا کس نے
رازِ تسلیم جب کھلا واصف
نقشِ ہستی مٹا دیا میں نے

واصف علی واصف کی غزل اردو کی کلاسیکی شعری روایت کی آئینہ دار ہے۔ وہ حسن و عشق کے معاملات میں بھی جدت طرازی یا ادق و گنجلک پیرایہء اظہار نہیں اپناتے، دل کی باتیں دل کی زبان سے صاف شفاف اسلوب میں صفحہء قرطاس پر منتقل کر دیتے ہیں۔ واصف علی واصفؒ کے عشقِ مجازی میں بھی عشقِ حقیقی کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ کبھی کبھی دردِ جدائی، کیفیات و وارداتِ قلبی کے بیان میں خوبصورت اندازِ بیان اختیار کرتے ہیں۔

مری جاں تو سحر ہے یا قیامت
ترے آنے کا ہر لحظہ گماں ہے
مرے دل میں یا مرے غیر کے گھر
خدا رکھے سلامت تو جہاں ہے

واصف علی واصفؒ کی غزل میں معرفت و سلوک کی منازل طے کرنے کے دوران پیش آنے والی مشکلات کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ وہ پاکیزہ عرفان کی سرمستیوں کو تغزل کے دلنشین انداز میں ڈھال کر بیان کر دیتے ہیں۔ وہ اپنے روحانی ارتقاء کو لفظ در لفظ سمونے کے سلیقے سے بخوبی واقف و آگاہ ہیں۔

مستی مئے عرفان کی کم ہو نہیں سکتی
بے کیف کبھی وادیِ غم ہو نہیں سکتی
واصف کو ملا ہے رازِ بقا اب خاک نشیں ہونا ہی پڑا
جب فیضِ نظر مولا کا ہوا کہتے ہیں مجھے سب مولائی
اعلانِ انا الحق سے کھلا راز یہ واصف
واصل جو کرے موت ستم ہو نہیں سکتی
نظرِ محبوب ہو جاتی ہے ورنہ
یہاں پردہ کوئی حائل نہیں ہے
یہ شمع جل رہی ہے یا پتنگا
وہ کیا جانے جو خود واصل نہیں ہے
کمالِ حسن ہے آئینہ سازی
ہمارا عشق ہی کامل نہیں ہے

واصف علی واصف کی غزل لطافتِ زبان اور مضمون آفرینی کے تال میل سے ترتیب پاتی ہے۔ واصف علی واصفؒ کی غزلوں کے بعض اشعار زبانِ زدعام ہونے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہیں۔ وہ کہیں کہیں سہلِ ممتنع کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔ وہ انسانی جذبات و احساسات سے مزیّن غزل کہتے ہیں۔ واصف علی واصفؒ شادی و غم کی مختلف النوع کیفیات کو سلیقہ مندی سے غزل میں سمونے کی سچی تڑپ رکھتے ہیں۔ واصف علی واصفؒ کے محولہ بالا اشعار اس کی عمدہ مثال قرار دیئے جا سکتے ہیں۔

میری ہستی عبادت ہو گئی ہے
مجھے ان سے محبت ہو گئی ہے
نگاہیں کھل گئیں لب شل ہو گئے ہیں
سرِ راہ وہ اچانک مل گئے ہیں

واصف علی واصفؒ کی غزلیں حکیم مومن خان مومن داغ دہلوی اور عبدالحمید عدم کے رنگِ سخن کے قریب قریب بھی پہنچ جاتی ہیں۔ ان کے شاعرانہ لب و لہجے میں شوخی، رندی، سرمستی، بے خودی، وصل یار اور حسن و عشق کے معاملات کی واضح جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ واصف علی واصفؒ کی

غزل میں عصری میلانات اور سیاسی و سماجی رویئے کہیں کم ہی جھلک دکھاتے ہیں۔ وہ حسن و عشق کے جلوے، دیر و حرم کے قصے اور وصل و فراق کے جھگڑے ہی میں پڑے رہتے ہیں۔

مجھے تم سے محبت توبہ توبہ
یہ گستاخی یہ جرأت توبہ توبہ
اٹھا رکھا ہے سر پر آسماں کو
مگر بارِ امانت توبہ توبہ
یوں تو ہر رات کی قسمت میں سحر ہے لیکن
حسن پابندِ حجابات ضروری تو نہیں
جنونِ باخرد کا راز بن کر
خرد کی گتھیاں سلجھا گیا ہوں
دل ناکام کام کا نکلا
بعد مرنے کے کام آیا ہے
پیار سے دل بڑا ہی ڈرتا ہے
ڈرتے ڈرتے بھی پیار کرتا ہے
آدمی آدمی کا قاتل ہے
آدی آدمی پہ مرتا ہے
رازِ الفت عیاں نہ ہو جائے
خامشی اب زباں نہ ہو جائے
ان کے آنے میں شک نہیں لیکن
اپنی ہستی گماں نہ ہو جائے

واصف علی واصفؒ نے ہندی زبان میں بھی نظمیں اور گیت لکھے ہیں جن میں دنیا کی بے ثباتی کا موضوع اہم ہے۔ وہ خالقِ کائنات کی محبت پر زور دیتے ہیں۔ وہ پنجابی کے صوفی شعرا کی طرح اپنے گیتوں میں عورت کے جذبات و احساسات کو بیان کرتے ہیں۔

بیت گئی ہے عمریا بالی مرلی سن من موہن والی
اب کیا سوچ بچار، سجن تو ہے یاد کرے

آنگن کھیلیں سکھیاں ساری جانا سب نے باری باری
کھیلن کے دن چار سجن تو ہے یاد کرے
مچھلی کھیل ہے دنیا ڈوری کس کے ہاتھ
جا جنگل میں باسیئے کوئی نہ جائے ساتھ

واصف علی واصفؒ کے گیت ہندی دوہے کی شعری روایت کا تسلسل ہیں۔ وہ اپنے گیتوں میں فنا کا احساس اجاگر کرنے کے علاوہ نیک اعمال کی دعوت دیتے ہیں۔ اردو دوہے کی روایت میں جمیل الدین عالی، رشید قیصرانی وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ واصف علی واصفؒ کے دوہے قاری کے دل کے تاروں کو چھیڑتے چلے جاتے ہیں۔ وہ ایک ایسے صوفی باصفا تھے کہ جنہوں نے میر کبیر اور نظیر کی طرح اپنے دوہوں میں بنی نوعِ انسان کے لئے حسنِ اخلاق کو تعمیرِ کردار اور فکرِ آخرت کے پیغامات چھوڑے ہیں۔

فصل 6۔ پروفیسر واصف علی واصفؒ کے بارے میں کچھ یادیں اور ''نادِ وقت''، ڈاکٹر تصدق حسین:

یہ ۱۹۹۷ء کا ذکر ہے مجھے پروفیسر واصف علی واصف صاحبؒ پر کچھ لکھنے کا شوق ہوا تو جناب اشفاق احمد صاحب کو لاہور خط لکھا تا کہ اس سلسلے میں رہنمائی حاصل کر سکوں۔ چند روز بعد جواب آیا۔ '' حضرت واصف علی واصفؒ کے بارے میں کچھ یادیں میرا بھی سرمایہءِ افتخار ہیں لیکن عنایت میاں (چوہدری عنایت اللہ) ہم سب سے زیادہ ان کے قریب تھے۔ اسلام آباد کے محکمہ فوڈ کے ڈسٹرکٹ فوڈ کنٹرولر ہیں اور آپ کے قریب ہی رہتے ہیں۔ ان کا فون نمبر دفتر اور گھر کا، آپ کو لکھ رہا ہوں۔ ان دنوں حضرت مہر علی شاہؒ صاحب کے قریب گولڑہ روڈ پر مکان بنا کر چھپے بیٹھے ہیں لیکن کبھی کبھی پرانی یادیں تازہ کرنے لاہور آجاتے ہیں۔ آپ ان سے مل لیں'' (اشفاق احمد)

یہ خط ملتے ہی عنایت اللہ صاحب کو دفتر فون کیا۔ یہ حاضر سروس ڈسٹرکٹ فوڈ کنٹرولر تھے۔ ہماری پہلی ملاقات کئی گھنٹوں پر محیط تھی مگر نہ جانے کیوں بار بار خیال آیا کہیں مجھے دھوکہ تو نہیں ہوا۔ یہ حضرت اور سبھی کچھ ہو سکتے ہیں مگر محکمہ خوراک کے ضلعی کنٹرولر نہیں ہو سکتے۔ سلسلہءِ ملاقات بڑھا اور مزید آگے بڑھا تو عنایت اللہ صاحب اور ڈسٹرکٹ فوڈ کنٹرولر دونوں سے علیحدہ علیحدہ ملاقاتیں ہونے لگی تھیں۔ ان کی ملاقاتوں کے بعد یہ عقدہ کھلا تھا کہ فوڈ کنٹرولر تو اس عنایت کے ماتحت تھا جسے ربع صدی کی تربیت کے بعد حضرت جناب واصف علی واصفؒ نے خود لاہور سے اسلام آباد بھیج دیا تھا۔ پھر چوہدری عنایت اللہ صاحب ریٹائر ہو گئے۔ آنا جانا رہا۔ میری دلچسپی لاہور میں جناب واصف علی واصفؒ اور عنایت اللہ صاحب کے بارے میں زیادہ سے زیادہ باتیں سننے تک محدود رہتی تھی مگر ایک رات فون آیا کہ عنایت اللہ صاحب مجھے کسی تحریر کے چند صفحات پڑھ کر سنانا چاہتے ہیں۔ میں ہمہ تن گوش سنتا رہا۔ میں نے آخر میں پوچھا کہ یہ تحریر کس کی ہے تو معلوم ہوا کہ موصوف نے ''آئینہ وقت'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے جس کا ایک باب مجھے پڑھ کر سنایا گیا تھا۔ چند روز بعد کتاب کا پورا مسودہ موصول ہوا اور حکم ملا کہ میں کتاب کے بارے میں اپنی رائے لکھ بھیجوں۔ تعمیل کی اور یہ رائے ''آئینہ وقت'' میں شائع ہوئی۔ پھر مختصر سے وقفوں سے ''صدائے وقت'' '' ندائے وقت'' اور ''آوازِ وقت'' شائع ہوئیں۔ ان میں سے ہر کتاب کے لئے راقم نے کتاب کے موضوع سے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور لکھا جسے میں اپنے لئے ایک اعزاز سمجھتا ہوں۔ یہ اعزاز کسی بہت

معروف و نامور مصنف یاادیب کی کسی تصنیف کے بارے میں لکھنے سے کہیں بڑااعزاز تھا کیونکہ لکھاری اس میدان میں ضرور نووارد تھا مگران کی ہر کتاب کا موضوع اپنی اہمیت کے اعتبار سے بہت بڑا موضوع تھا۔ پھر یہ کوئی فسانہ وحکایت پر مشتمل تحریریں نہ تھیں بلکہ اس وطنِ عزیزاور پوری اُمہ کے بارے میں مصنف نے اظہارِ خیال کیا تھا۔ان چار کتابوں میں مصنف نے زندگی کے ایک ایک شعبے پر قلم اٹھایا تھا۔امراض کی تشخیص ایک حکیم الامت کی طرح کی تھی اور علاج بھی تجویز کیا تھا۔ کہیں طبقاتی تقسیم اور طبقاتی تقسیم کے مطابق قائم کئے گئے تعلیمی اداروں کا ذکر تھا تو کہیں سرمایہ دار کے ہاتھوں مات کھا جانے والے مزدور کے تلخ اوقات کو زیرِ بحث لایا گیا تھا۔ کہیں جاگیر دار کے ہاتھ بک جانیوالے دہقان کی دل ہلا دینے والی داستان رقم کی گئی تھی تو کہیں عدل وانصاف فراہم کرنے میں ناکام ہو جانے والی عدلیہ کو جھنجھوڑا گیا تھا۔ بیمار انتظامیہ کے مرض کو کہیں موضوعِ گفتگو بنایا گیا تھا تو کہیں بھوک پیاس سے بلکتے ان غریب اور مفلس بچوں کی داستانِ غم رقم کی گئی تھی۔ اپنی ایک تصنیف میں عنایت اللہ صاحب کا خطاب کشتگانِ سلطان و ملائی و پیری سے تھا۔ان چاروں کتابوں میں چند ایک موضوعات ایسے تھے جو مصنف نے کسی نہ کسی نئے حوالے سے بار بار دہرائے تھے۔ان میں سے ایک موضوع ایسا نکلتا ہے جو ان کی پانچویں تصنیف '' نادِ وقت'' میں بھی آگیا ہے۔ مصنف کی اس کتاب میں کل پانچ ابواب ہیں۔ جس موضوع کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے وہ سرکاری محکموں کے بڑے افسران اور ایوانِ اقتدار میں بیٹھے اراکینِ اسمبلی اور مختلف وزیروں، سفیروں کے وہ اخراجات ہیں جو ملکی خزانے خالی کر دیتے ہیں اور نوبت آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک سے قرضے حاصل کرنے تک جا پہنچتی ہے جو ملوکیت کی آبیاری اور دینی نظریات کو مسخ کرتی ہے۔ دوسرا موضوع جس پر پہلی چار کتابوں میں تو مصنف نے اختصار سے گفتگو کی تھی لیکن ''نادِ وقت''میں جمہوریت اور جمہوریت کے دعویداروں کی قلعی کھول کر رکھ دی ہے۔ وہ طرزِ حکومت جس میں بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے' کی ساری خرابیاں ایک ایک کر کے سامنے لائی گئی ہیں اور اسلام کے شورائی نظام کے ثمرات پر سیر حاصل بات کی ہے۔

''نادِ وقت'' کا ایک باب اس کھلے خط کی حیثیت رکھتا ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کے نام ہے۔اس کا کچھ حصہ ان مذہبی پیشواؤں کے لئے بھی وقف ہے جن سے مصنف بار بار یہ سوال کرتا ہے کہ ان کے پیغمبر کی زندگی میں اس پیغمبرِ محترم پر اترنے والے آسمانی صحیفے میں یہ خونریزی اور قتل وغارت کہاں سے آگئی جس کے مرتکب یہ عیسائی اور یہودی ہو رہے ہیں۔اس کتاب کا یہ حصہ ایک ایسا آئینہ ہے جس میں یہ لوگ اپنی مسخ شدہ تصویر بھی دیکھ سکتے ہیں اور معصوم انسانوں کے خونِ ناحق سے لت پت اپنے ہاتھ بھی۔ مصنف نے اسی ذکر سے پیوستہ اپنے وطنِ عزیز میں قدم قدم پر پھیلی معاشرتی ناہمواریوں کو بھی گنوایا ہے اور فرقہ بندی کے نتیجے میں پارہ پارہ ہو جانے کے اس اُمتِ محمدی ﷺ کو صراطِ مستقیم پر لانے کی کوشش کی ہے جس میں افراد کے نام تو مسلمانوں کے ناموں جیسے ہیں لیکن اعمال اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو نہ ماننے والے فرعونوں اور یزیدوں جیسے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والوں کو مخاطب کر کے مصنف نے ان سے بار بار یہ سوال پوچھا ہے کہ افغانستان اور عراق میں حیلوں بہانوں سے جس طرح امریکا اور برطانیہ کی ان فوجوں نے تباہی مچائی ہے جو عیسائی تھے۔اس طرح فلسطین میں اسرائیلی یہودی مسلمانوں پر ظلم و ستم ڈھا رہے ہیں۔ کیا ان کے مذاہب نے معصوم انسانوں اور کمزور قوموں کے خون کی ندیاں بہانا روا رکھا ہے؟ کیا ان کے مذہبی پیشوا انہیں اس سے روک

نہیں سکتے ؟یقیناً مصنف کو دونوں طرف سے کوئی جواب نہیں ملے گا اس لئے کہ مذہب کو سیاست سے جدا کر کے جس چنگیزیت کو یہود و نصاریٰ نے گلے سے لگالیا ہے اس میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ان کے کلیساؤں اور معبدوں سے وابستہ مذہبی پیشواؤں نے باہر کی دنیا سے یا تو کوئی رشتہ و تعلق ہی نہیں رکھا ہوا یا وہ بھی اس قتل وغارت گری کو دیدہ دانستہ نظرانداز کر رہے ہیں۔

''نادِ وقت'' کے حصے کے مطالعہ کے بعد قاری کے ذہن میں کئی سوالات اٹھتے ہیں۔جن میں سے ایک سوال بے حد اہم ہے کہ کیا اب بھی عالمِ اسلام کے متحد ہو جانے کا وقت نہیں آیا؟ کیا ابھی تک مسلمان اسی غلط فہمی کا شکار ہیں کہ عراق کی جنگ امریکا، برطانیہ اور ان کے اتحادیوں کی جنگ ہے اور اسرائیل فلسطین کی لڑائی دو ملکوں کی لڑائی ہے ؟ عالمی حقوقِ انسانی کے دعویداروں کا مسلمان قیدیوں سے سلوک کسی وضاحت کا محتاج نہیں۔ امریکا، برطانیہ اور ان کے اتحادیوں کے دوستوں کو چاہیئے کہ انہیں نفرتوں کی اس فصل کے عنقریب پک کر تیار ہو جانے کی خبر کر دیں جس کا بیج سرزمین اسرائیل، افغانستان اور عراق میں انہوں نے بویا تھا۔اکیسویں صدی کا ایک پیغام بڑا واضح ہے کہ سکندرِ اعظم کی طرح پوری دنیا کو فتح کر لینے کا خواب دیکھنے والوں کو یہ معلوم ہو جانا چاہیئے کہ ایسا جدید اسلحہ اور عسکری طاقت کے زور پر ہر گز ہر گز ایسا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ وہ پیغام ہے جو زیادہ عرصے تک صدا بصحرا اس لئے ثابت نہیں ہو گا کہ ظلم و تشدد اور انسانی قتال کی مرتکب طاقتوں اور ملکوں کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ ہر کمزور ملک کو اپنی اقلیم میں شامل کر لینے کی سعی و کوشش ناکامی سے دوچار ہوا کرتی ہے اور وہ خالقِ کائنات جو اپنی حکومت کے اندر کسی دوسرے کی حکومت گوارا نہیں کرتا۔ جب فرعون کی سلطنت، ہامان اور شداد کی تیار کردہ جنت پلک جھپکتے ہی ریت کے گھروندوں کی مانند زمین بوس ہو جایا کرتی ہیں۔ سوویٹ روس کی مثال ابھی پرانی نہیں ہوئی۔ کل کی بات ہے کہاں گیا Iron curtain? ۔کہاں گئی سائنسی ترقی؟ کہاں گئی دنیا کی دوسری بڑی سپر طاقت ؟ میرا جی تو چاہتا ہے کہ بھائی عنایت اللہ صاحب سے کہوں زبور، توریت اور انجیل کے پڑھنے والوں کو ان کے آسمانی صحیفوں کے فراموش شدہ اسباق پھر سے زیر مطالعہ لانے کی دعوت دی جائے اور مزید ان سے کہا جائے کہ وہ قرآن حکیم کی صرف وہ سورتیں پڑھ لیں جن میں بستیوں کے الٹ دیئے جانے اور پکے ہوئے میووں والے باغات کے پل بھر میں اجڑ جانے کے قصص بیان فرمائے گئے ہیں۔ ثمود اور عاد نے اس اچانک ٹوٹ پڑنے والی آفت کو جھٹلایا تو ثمود ایک سخت حادثے سے ہلاک کئے گئے اور عاد ایک بڑی شدید طوفانی آندھی سے تباہ کر دیئے گئے۔اللہ تعالیٰ نے اس کو مسلسل سات رات اور آٹھ دن ان پر مسلط رکھا۔(تم وہاں ہوتے تو) دیکھتے کہ وہ وہاں اس طرح پچھڑے پڑے تھے جیسے وہ کھجور کے بوسیدہ تنے ہوں۔اب کیا ان میں اسے کوئی تمہیں باقی بچا نظر آتا ہے۔

الْحَآقَّةُ ۙ﴿۱﴾ مَا الْحَآقَّةُ ۚ﴿۲﴾ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْحَآقَّةُ ؕ﴿۳﴾ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ وَعَادٌۢ بِالْقَارِعَةِ ﴿۴﴾ فَاَمَّا ثَمُوْدُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ ﴿۵﴾ وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۙ﴿۶﴾ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ حُسُوْمًا ۙ فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۚ﴿۷﴾ فَهَلْ تَرٰى لَهُمْ مِّنْۢ بَاقِيَةٍ ﴿۸﴾

ترجمہ:۔''یقیناً واقع ہونے والی گھڑی، کیا چیز ہے یقیناً واقع ہونے والی گھڑی اور آپ کو کس چیز نے خبر دار کیا کہ یقیناً واقع ہونے والی (قیامت) کیسی ہے، ثمود اور عاد نے (جملہ موجودات کو) باہمی ٹکراؤ سے پاش پاش کر دینے والی (قیامت) کو جھٹلایا تھا، پس قومِ ثمود کے لوگ تو وہ حد سے زیادہ کڑک دار چنگھاڑ والی آواز سے ہلاک کر دیئے گئے اور رہے قومِ عاد کے لوگ تو وہ (بھی) ایسی تیز آندھی سے ہلاک کر دیئے گئے جو انتہائی سرد، نہایت گرج دار

تھی،اللہ نے اس (آندھی) کو ان پر مسلسل سات راتیں اور آٹھ دن مسلط رکھا، سو تُو ان لوگوں کو اس (عرصہ) میں (اس طرح) مرے پڑے دیکھتا (تو یوں لگتا) گویا وہ کھجور کے گرے ہوئے درختوں کی کھوکھلی جڑیں ہیں، سو تُو کیا ان میں سے کسی کو باقی دیکھتا ہے۔'' (69-الحاقۃ-8-1)

یہ وہ لوگ تھے جنہیں اپنی قدرت اور اپنے اختیار پر ایسا بھروسہ تھا کہ قسم کھا کر بے تکلف کہہ دیا کہ ہم کل ضرور اپنے باغ کے پھل توڑیں گے اور یہ کہنے کی کوئی ضرورت وہ محسوس نہیں کرتے تھے کہ اللہ نے چاہا تو ہم یہ کام کریں گے۔ قرآنِ حکیم میں قوم لوط کی بستیوں کا بھی ذکر ہے جنہیں تلپٹ کر کے رکھ دیا گیا تھا۔

عنایت اللہ صاحب نے جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ اپنی پانچوں کتابوں میں (جن کے نام میں شروع میں دے آیا ہوں) ایک ایسے بے دین فرعونی جمہوریت کے مرض کی نشان دہی کی ہے جو ملک کو کینسر کی طرح لاحق ہو گیا ہے اور وہ ہے بڑے طبقے کی کرپشن۔ اس میں سیاست دانوں، حکمرانوں، افسر شاہی اور منصف شاہی کے افراد بھی شامل ہیں۔ آہستہ آہستہ پورا ملک ایک ایسے مقام پر پہنچنے والا ہے جہاں صرف دو طبقے رہ جاتے ہیں ایک وہ جسے گندم کی روٹی کے دو نوالے بھی نہ مل رہے ہوں اور دوسرا وہ طبقہ جس کے افراد کو گندم کا نوالہ اچھا ہی نہ لگتا ہو اور اس کی بھوک سونے کے نوالے سے مٹتی ہے۔ سیمناروں، تقریروں میں بڑا طبقہ (جس میں زیادہ تعداد حکمرانوں کی ہوتی ہے) اللہ، اس کے رسول ﷺ اور رسول عربی ﷺ کے صحابہ کرامؓ کے نام تک استعمال کر کے غربت و افلاس اور مصیبتوں کے مارے انسانوں کو بیوقوف بنا لیتے ہیں مگر نہ تو وہ اپنی شاہانہ غاصبانہ زندگی کے طریقہ کار کو بدلتے ہیں اور نہ ہی عوام کو بنیادی سہولتیں مہیا کرنے کی طرف کوئی توجہ دیتے ہیں۔ امراض کی تشخیص ''نادِ وقت'' کے مصنف نے ایک حکیم حاذق کے طور پر کر دی ہے۔ اس میں دو آراء ہو ہی نہیں سکتیں۔ شورائی نظام کا نسخہ اول و آخر انشاءاللہ انسانیت کی بھلائی و بہبود اور خیر و فلاح کا ذریعہ ثابت ہو گا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے بھائی عنایت اللہ صاحب کو سلامت رکھے کہ ان جیسے مردانِ درویش اس وطن کا، اس ملت کا سرمایہ ہیں۔

فصل 7۔ متاعِ فقیر''۔ تعارف و تجزیہ، تحریر: ڈاکٹر محمد عارف:

ڈاکٹر تصدق حسین آبائی گاؤں بادشاہ پور ضلع چکوال سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایم اے انگریزی، ایم اے اُردو کرنے کے بعد اُنہوں نے اُردو میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ 1985ء میں ڈاکٹریٹ کا تحقیقی مقالہ نسیم حجازی اور ان کی ناول نگاری پر لکھا۔ 1960ء سے 1984ء تک درس و تدریس سے وابستہ رہے اور کئی ایک اچھے تعلیمی اداروں میں تدریسی خدمات سرانجام دیں۔ 1985ء سے 1998ء تک مقتدرہ قومی زبان میں دارالترجمہ کے سربراہ کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے۔ تصانیف و تالیفات میں ان کی مطبوعہ کتابوں میں سے غالب حصہ انگریزی سے اُردو تراجم پر مشتمل ہے۔ چند ایک کتابوں کے نام یہ ہیں:۔

۱۔ داستان میری ''آپ بیتی''۔

۲۔ پتھر کی آنکھ (افسانے)۔

۳۔ نسیم حجازی ایک مطالعہ۔

۴۔ نوادراتِ عرشی امرت سری۔

۵۔ اقبال پیام برامید۔

۶۔ اقبال ایک کاسموپولیٹن شاعر ہے۔(انگلش)۔

۷۔ یوسف ظفر کی بات۔

۸۔ جیلانی بی اے کی کہانی۔

۹۔ واصف علی واصفؒ کی سوانح وافکار۔

۱۰۔ علامہ محمد یوسف جبریلؒ ''حیات وخدمات''۔

میرے انتہائی محترم دوست صوفی شوکت محمود اعوان نہ صرف نکتہ رس اور نکتہ سنج انسان ہیں بلکہ درویشانہ مزاج کے حامل بھی ہیں لہٰذا اسی لئے فقراء اور اہل اللہ کی محافل میں اُٹھتے بیٹھتے ہیں۔ ڈاکٹر تصدق حسین سے ان کی پرانی یاد اللہ ہے۔ پچھلے دنوں انہوں نے مجھے ڈاکٹر تصدق حسین کی نثری تصنیف ''متاعِ فقیر'' مرحمت فرمائی تو مجھے بے پایاں تقویت ہوئی کہ اُنہوں نے تصّوف اور معرفت وسلوک کے راستے پر چلنے والے مسافرانِ حق کے لئے ایک اسکول آف تھاٹ کی بنیاد رکھ دی ہے۔ اُردو کے اسلامی ادب پر نظر ڈالیں تو ''تذکرۃ الاولیا'' از شیخ فریدالدین عطارؒ اولیائے اللہ کی زندگی پر ایک مستند کتاب ہے۔ حضرت سید عبدالقادر جیلانیؒ کی ''فتوح الغیب'' اور حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ کی ''کشف المحجوب'' بھی علمِ تصّوف کی اہم کتب سمجھی جاتی ہیں ۔ حضرت امام غزالیؒ کی ''کیمیائے سعادت'' روحی اور فقری نظام کو سمجھنے کے لئے اہمیت کی حامل تصنیف ہے۔ حضرت سلطان باہوؒ کی ''عین الفقر'' اور ''ابیاتِ باہو'' بھی سالک کے لئے پیغامِ ابدیت کی حامل ہیں۔ جدید ترین ادبی تاریخ پر نظر ڈالنے پر پتہ چلتا ہے کہ ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے ''من کی دنیا'' میں قاری کی باطنی اصلاح کے لئے ایک مربوط لائحہِ عمل وضع کیا ہے۔ اشفاق احمد کے لیکچروں پر مشتمل کتاب ''زاویہ'' بھی اہلِ علم سے داد وصول کر چکی ہے۔ پروفیسر احمد رفیق اختر کے لیکچرز ''پسِ حجاب'' کی صورت میں چھپ چکے ہیں۔ ڈاکٹر تصدق حسین کی نثری تصنیف ''متاعِ فقیر'' ستمبر 2008ء میں رُمیل ہاؤس آف پبلیکیشنز راولپنڈی نے شائع کی ہے۔ انتساب حضرت پیر سید مہر علی شاہؒ کے نام ہے۔ یہ کتاب میجر (ر) محمد صادقؒ، خواجہ محمد یامینؒ، پروفیسر عبدالعزیزؒ اور سید عبدالرشیدؒ کی زندگی کے حالات وواقعات پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر تصدق حسین نے پیشِ لفظ میں اپنے روحانی سفر پر روشنی ڈالی ہے۔

ڈاکٹر تصدق حسین بنیادی طور پر تحقیقی مزاج کے حامل انسان ہیں۔ ''متاعِ فقیر'' قارئینِ ادب کے لئے ایک ایسا توشہءِ آخرت ہے جو علم کی حقیقت کے متلاشیان کے لئے بعض انتہائی غیر معمولی حقائق منصہءِ شہود پر لاتی ہے۔ ''متاعِ فقیر'' ڈاکٹر تصدق حسین کے لئے باعثِ فخر بھی ہے اور وسیلۂ نجات بھی کیونکہ وہ اولیائے اللہ کے تذکرے میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں جو کہ آج کی مادی کشاکش کے پُر آشوب عہد میں لائقِ صد تکریم مشن ہے۔ قدرت اللہ شہاب، اشفاق احمد، واصف علی واصفؒ، علامہ محمد یوسف جبریلؒ اور ممتاز مفتی کے بعد ڈاکٹر تصدق حسین اہلِ علم ودانش کی روحانی تربیت کا فریضہ انجام دینے میں متحرک اور فعال کردار ادا کر رہے ہیں۔ وہ آج کے بھولے بھٹکے ہوئے قافلے کو شریعت، حقیقت اور طریقت

کے اسرار و رموز سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ اسرارِ باطن اور اصلاحِ نفس کا موضوع دورِ جدید کی ضرورت بھی ہے اور وقت کی پکار بھی۔ ڈاکٹر تصدق حسین اللہ کی تلاش و جستجو کے سفر پر نکل چکے ہیں۔ پروفیسر عبدالعزیزؒ نے اُنہیں وہ بہت کچھ عطا بھی کر دیا ہے جو وہ کسی کو دینا چاہتے تھے۔ علمِ اکتسابی کے عہدِ ہوسناک میں آج کا قاری دنیاوی شان و شوکت، اقتدار و جاہ و سلطنت کے خواب دیکھتا اور ہوسِ زر کی آرزو رکھتا ہے۔ اسے کرسیءِ اقتدار اور عزت کی آرزو ہے جب کہ علمِ لدنی بنی نوع انسان کو گناہ و معصیت کی تاریکیوں میں بھٹکنے سے بچا کر نیکی، تقویٰ اور فوز و فلاح کی منزل سے ہمکنار کرتا ہے۔ عشقِ الٰہی و عشقِ رسول ﷺ کے عملی تقاضے پورے ہوتے ہیں اور انسانیت کامرانی کے راستے پر چل پڑتی ہے۔ ڈاکٹر تصدق حسین نے یقیناً اپنے لئے درست راستے کا تعین کر لیا ہے اور وہ عنقریب علم و ادب کی دنیا میں بلند ترین مقام کو چھونے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

کتاب کے بابِ اوّل: میں میجر ریٹائرڈ محمد صادقؒ المعروف دستِ شفاء پانی والے میجر کے متعلق گراں قدر معلومات کا ذخیرہ اکٹھا کر دیا گیا ہے جو ہیلنگ پاور سے فیض یاب تھے اور مریضوں کو شفایاب کرنے میں شہرتِ دوام کے حامل انسان تھے۔ میجر محمد صادق کی شخصیت بہت سحر انگیز تھی۔ ہر کوئی ان کے سامنے نہ بیٹھ سکتا تھا۔ اعلیٰ فوجی افسر، بڑے بڑے سول افسران، مجذوب، سالک، پڑھے لکھے مدرسوں کی تعلیم سے دور علمِ لدنی سے مالا مال درویش، روحانی ذوق کے حامل لوگ تھے کہ دور دور سے ملنے کے لئے آتے تھے۔ ان کی غریب پروی اور انسان دوستی میں کوئی شبہ نہ تھا۔ برادری کے لوگوں کی ہر طرح سے مدد کرتے تھے۔ میجر محمد صادق کو حضرت غوث پاکؒ سے بے پناہ عقیدت تھی اور انہیں ان سے بڑا فیض ملا تھا۔

باب دوم: میں خواجہ محمد یامین المعروف سائیں کالا خانؒ کی سوانح حیات اور ان سے رودادِ ملاقات کی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ سائیں کالا خانؒ کا تکیہ سخی آباد حسن ابدال سے آٹھ دس کلو میٹر کے فاصلے پر ایک چھوٹے سے گاؤں نکو کے قریب ہے۔ سائیں کالا خانؒ جھامرہ سے نکو گاؤں منتقل ہوئے تھے۔ پانی کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔ اُن کی دُعا سے بنجر زمین سیر اب ہو گئی اور اس بیابان میں جہاں صدیوں سے خزاں کے ڈیرے تھے بہار آ گئی۔ سائیں کالا خانؒ نے ایک دفعہ فرمایا۔ ''خدا کے ساتھ میں سبھی کچھ ہوں لیکن خدا کے بغیر میں کچھ بھی نہیں''۔ ایک دن ارشاد ہوا۔ ''اگر آپ کو یہ خیال گزرے کہ آپ خدا کے اس قدر قریب ہو چکے ہیں کہ اس کا پلو آپ کے ہاتھوں میں ہے تو پھر بھی کسی گمان میں نہ رہئے گا آپ جیسا بوئیں گے ویسا ہی کاٹیں گے''۔ ایک دن مریدین سے گفتگو کرتے ہوئے واضح کیا کہ ''سچ تو یہ ہے کہ اگر اپنے وجود پر نظر ڈالیں تو یہ بھی شرک ہو گا''۔

باب نمبر تین: میں پروفیسر عبدالعزیزؒ بار ایٹ لا کے متعلق محیر العقول اور از خود رفتہ معلومات فراہم کر کے سعادتِ دارین حاصل کی ہے۔ پروفیسر عبدالعزیزؒ چکوال کے ایک چھوٹے سے گاؤں بڈھیال میں رہائش پذیر تھے۔ یہ گاؤں سہگل آباد کے قریب چکوال سہاوہ روڈ سے چند کلو میٹر ہٹ کر واقع ہے۔ پروفیسر عبدالعزیزؒ نے ڈاکٹر تصدق حسین سے فرمایا۔ ''آپ نے اللہ والوں کا گروپ بنانا ہے اور یہ کام آپ کریں گے''۔ انگریزی میں انہوں نے ایک انڈر ٹیکنگ (عہد) لکھی۔ اسکے آخر میں اپنے دستخط کئے اور اسے ان کی طرف بڑھاتے ہوئے وصول کرنے کی ہدایت کی۔ یہ بھی فرمایا کہ اپنا جھنڈا بنوالو۔ دیا بھی رکھ لو اور لنگر جاری رہنا چاہیئے اور لنگر کے لئے کوئی اپنی خوشی سے دینا چاہے تو اجازت ہے لے لیا کرو۔ پروفیسر عبدالعزیزؒ باطنی علوم میں دلچسپی رکھتے تھے اور علمِ لدّنی کی نعمت سے سرفراز تھے۔ پروفیسر عبدالعزیزؒ ان منتخب ہستیوں میں سے تھے جو قدرت کی

طرف سے منتخب شدہ ارواح میں شامل ہوتے ہیں۔ پروفیسر عبدالعزیزؒ نے سرابوں کے تعاقب میں بھاگتے ہوئے لوگوں کے سفر کو رائیگاں ہونے سے بچایا اور ان کے لئے بے لوث دعائیں کیں۔

باب چہارم : سید عبدالرشیدؒ سے متعلق معلومات پر مشتمل ہے۔ سید عبدالرشیدؒ کو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بیعت فرمایا تھا اور عالمِ خواب میں علمِ قرآن و حکمت سے نوازا۔ ان کی اصل تعلیم علمِ لدن ہے۔ یہ وہی تعلیم ہے کہ جس کے حصول کے لئے ظاہری مدرسہ و کالج کی ضرورت نہیں۔ رابندر ناتھ ٹیگور، صوفی محمد برکت علیؒ، علامہ محمد حسین عرشی امرت سری، احسان دانش، علامہ محمد یوسف جبریلؒ، حکیم محمد صدیق کیانی، استاد فضل حسین قلیل جیسے فاضل اسی راہ کے مسافر تھے۔ ڈاکٹر تصدق حسین نے سید عبدالرشیدؒ کے بعض خطوط ''متاعِ فقیر'' میں شامل کر کے قاری کی معلومات میں اضافہ فرمایا ہے۔

المختصر ڈاکٹر تصدق حسین کی مرتّب شدہ تصنیف ''متاعِ فقیر'' سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اولیاءاللہ سے دلی عقیدت رکھتے ہیں اور ان کے روحانی مشن میں شریک صفِ اوّل کے مجاہدوں میں شامل ہونے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ ڈاکٹر تصدق حسین نے انتہائی عمیق نظری، غیر مختتم خزانہءِ معلومات اور وسیع قوتِ مشاہدہ سے علمِ تصّوف کی تاریخ کو جدید تر عہد کے تناظر میں درست سمتِ سفر سے جانچنے اور پرکھنے کی سعی و کاوش کی۔ ان کی تحریروں سے یہ امر مترشح ہوتا ہے کہ وہ فقراء اور اہل اللہ کے قافلے کے مجاہد ہیں کہ جنہوں نے آج کی بھولی بھٹکی ہوئی انسانیت کو علمِ حقیقت سے آگاہ کرنا ہے۔

فصل 8۔ واصف علی واصفؒ نے کب بولنا شروع کیا: اقتباس عنایت اللہ

حضرت واصف علی واصفؒ نے 1966ء 1967ء میں گفتگو شروع کی۔ پہلے گفتگو سنتے تھے۔

قہوہ خانے جو داتا حضورؒ کے گرد و پیش میں پھیلے ہوئے تھے۔ وہاں لوگ اکٹھے ہو جاتے۔ اسے کٹھالی کہا جاتا تھا۔ فنکاروں نے اپنی اپنی کٹھالیاں بنا رکھی تھیں۔ جہاں پر کلام پڑھا جاتا۔ شاعری ہوتی، گفتگو ہوتی، روحانی نظام اور تصّوف پر گفتگو ہوتی، یہاں پر وارث شاہؒ کی ہیر بھی پڑھی جاتی۔ حشمت نامی ایک سیکرٹریٹ کا ملازم تھا جس کو ہیر از بر زبانی یاد تھی۔ بڑے بڑے علمائے کرام اس کے گرد ہیر سننے کے لئے اکٹھے ہو جاتے۔ کٹھالی سے نکل کر وہ لوگ کالج تشریف لاتے اور حضرت واصف علی واصفؒ سے ملاقات کرتے۔ حضرت واصف علی واصفؒ اس سے ہیر کی تشریح و توضیح سن کر خوش ہوتے اور اس کو انعام سے نوازتے۔ اس کے علاوہ حضرت علامہ محمد اقبالؒ، میاں محمد بخشؒ، شاہ حسینؒ، بابا بلھے شاہؒ، بابا شکر گنج کی شاعری کی الہامی اور روحانی شاعری پر رات بھر تبصرے ہوتے رہتے۔ نت نئے مضامین کھلتے۔ یہ لاہور کی ایک خوبصورت تعلیمی حلقہ کی اس دور کی نشانیاں تھیں وہاں سے شعراء صاحبان اور دیدہ ور لوگ اکٹھے ہو کر انگلش کالج تشریف لاتے۔ وہاں پر مشاعرہ ہوتا۔ ساغر صدیقی لاہور کی کمیٹی کی لائبریری بمقام بھاٹی گیٹ میں عموماً رات کے وقت اپنے تنہائی کے لمحات گزارتے اور واصف علی واصفؒ سے ملاقاتیں کرتے۔ جناب راجہ محمد اکرم صاحب بری شریف والے، محترم اشفاق احمد اور قبلہ واصف علی واصفؒ کے لئے باباجی عنایت اللہ کو ان کے پاس لانے کے لئے اور ٹھہرانے کے لئے کہتے اور وہ یہاں بری سرکار تشریف لاتے۔

داتا دربار کے ساتھ گلی میں بھیا کا مزار بنا ہوا تھا۔ وہاں پر حضرت واصف علی واصفؒ تشریف لے جاتے تو ساتھ ایک ہجوم ہوتا۔ ہوٹلوں پر بیٹھتے تو ایک ہجوم ساتھ ہوتا۔ حضرت واصف علی واصفؒ رات آٹھ بجے کلاسیں ختم کر کے شیخ وزیر علی کے پاس ان کے گھر پہنچتے۔ قصور کے بے شمار لوگ وہاں آتے۔ قرآن حکیم سنتے اور صبح نماز پڑھتے۔ دربار شریف بابا بلھے شاہؒ کے قریب مسجد تھی جہاں پر یہ لوگ نماز ادا کرتے اور حضرت واصف علی واصفؒ واپس موٹر سائیکل لمبریٹا لاہور آجاتے۔ 1961ء تا 1976 تک یہ لمبریٹا کا سفر جاری رہا۔ حضرت واصف علی واصفؒ کی زندگی کا سفر نامہ ایک حسین و جمیل مسافرت سے بھرا پڑا ہے۔ جس وقت ان کا جی چاہتا، رات کو داتا گنج بخشؒ تشریف لے جاتے۔ میاں شیر محمد شرقپوریؒ کے مزار پر حاضری دیتے۔ وارث شاہؒ جنڈالہ شیر خان وہاں پر بھی جاتے۔ سلطان العارفین حضرت سلطان باہوؒ اور تونسہ شریف کے مزارات پر کئی مرتبہ حاضری دی۔ مہاڑ شریف چشتیاں بھی گئے۔ ہر سفر میں محترم باباجی عنایت اللہ ساتھ رہے۔ اس کے علاوہ جلال پور شریفؒ، دربار بادشاہاں سرکار خوشاب، گھمگھول شریف،، پیر دیول شریف، سے حاضری اور ملاقاتیں رہتیں۔ موہڑہ شریف بھی گئے۔ سید کرم الٰہی کانواں والی سرکار کے مزار پر گئے۔ سائیں محمد حسین سے ملاقات رہی۔ علامہ اقبالؒ کے مزار مبارک پر حاضری دی۔ بی بی پاک دامناںؒ پر بہت حاضری دیا کرتے تھے۔ میاں میرؒ کی حاضری دینے کے لئے اکثر شیخ وزیر علی ساتھ ہوتے تھے۔ عنایت اللہ باباجی ہمراہ شامل سفر ہوتے تھے۔ حجرہ شاہ مقیم بھی تشریف لائے۔

ایک بہت اہم واقعہ یہ تھا جس کو بیان کرنا ہے کہ وارث شاہؒ کے مزار پر حاضری دی، دیکھا تو دروازہ چھوٹا سا تھا اور نیچے سے دیواریں ٹوٹ چکی تھیں۔ مزار کے اندر چند کتے بیٹھے ہوئے تھے۔ اندر سے کتے تو بھاگ گئے۔ عنایت اللہ باباجی کہتے ہیں کہ وہ یہ منظر دیکھ کر بہت پریشان ہو گئے اور چیخیں مارنے لگے تو حضرت واصف علی واصفؒ نے پوچھا کہ کیا ہوا ہے۔ تو باباجی عنایت اللہ نے کہا کہ حضور ایک طرف بلھے شاہؒ پر رونقیں ہی رونقیں ہیں جب کہ یہاں پر کتے بیٹھے ہوئے ہیں۔ حضرت واصف علی واصفؒ نے عنایت اللہ کو خاموش کرایا اور کہا آپ نے درخواست پیش کر دی ہے۔ اب کچھ اچھا ہی ہو گا۔ تین دن کے بعد غلام جیلانی گورنر نے دربار کی تعمیر کا اعلان کر دیا۔ تعمیرات شروع ہوئیں۔ مکمل ہونے کے بعد حضرت واصف علی واصفؒ نے چادر ہیر کے انگ میں لکھ کر منقبت لکھ دی۔ جو کتاب میں شائع بھی ہوئی ہے۔ عنایت اللہ صاحب نے یہ لکھی ہوئی منقبت مزار پر پیش کر دی۔ **(اقتباس عنایت اللہ)**

فصل 9۔ باباجی عنایت اللہ اور واصف علی واصفؒ کی سائیں محمد حسین کی خدمت میں حاضری:

سائیں کرم الٰہیؒ کا فیض جناب سائیں محمد حسینؒ بالکے سائیں کرم الٰہیؒ کانواں والی سرکار (گوجر خان) سے جاری ہوا۔ اس فیض کا انعام جناب واصف علی واصف صاحبؒ لاہوری نے بھی اپنی آنکھ کے وضو اور ذکر ھو کے انعامات کی شکل میں سلسلۂ قادریہ کے سائیں محمد حسین صاحبؒ کی صحبت کے روحانی خزانے سے حاصل کیا۔ انکی تیس سالہ خاموشی، ہر قسم کی خوراک سے اجتناب کے تیس سالہ عمل اور صرف ایک پیالہ چائے نوش جان کرنے کی عادت نے انہیں تارک الدنیا اور واصل باللہ کر دیا تھا۔ انکی پاکیزہ روح سے کشید کی ہوئی خوشبو، جناب واصف علی واصفؒ صاحب کی گویائی کی شکل میں انسانیت کو معطر کرنے میں مصروف ہے۔ انکی پہلی ملاقات کی تاثیر ایک منقبت کی شکل میں آج بھی ان کے مزار پر لٹکی ہوئی ہے جو راقم کو کتابت کروا کر وہاں باباجی سائیں محمد حسینؒ کو پیش کرنے کا فریضہ سونپا گیا تھا۔ منقبت درج ذیل ہیں

(نذرانۂ عقیدت)

حضور جناب باباجی سائیں محمد حسین صاحب گوجر خان بالکے کانواں والی سچی سرکار

تیری لب بندی میں پوشدہ جمالِ گفتگو
آستانے پہ تیرے لاتی ہے حق کی جستجو
میرے بابا کا یہ فیضانِ نظر دیکھے کوئی
اک نظر سے کرتے ہیں جاری دلوں میں ذکرِ ھو
مُوتُو قَبلَ اَنۡ تُمُوتُو کی یہی تفسیر ہے
اپنا روضہ زندگی میں ہے رُوبرُو
روز و شب اس آستاں سے قادری لنگر ملے
کر دیا اس مردِ حق نے اہلِ دل کو سرخُرو
سائیں کانواں والیا تو نے کیا روشن چراغ
جسکے جلوؤں کی ضیاء جاری ہوئی ہے چارسُو
پھر کوئی آئے نہ آئے مردِ حق تیری طرح
میکشو ساقی کی چشمِ مست سے بھر لو سُبو
تو سمندر پی کے بھی خاموش ہے بابا میرے
بولنے والوں کے حصّے میں نہ آئی آبِجُو
یوں تو واصف اک زمانہ کے فقیروں سے ملا
آنکھ نے تازہ کیا آکر یہاں اپنا وضو

(بحوالہ گفتگو عنایت اللہ)

فصل 10۔ الٰہی بخش وجدانی:

الٰہی بخش وجدانی ایک وکیل تھے اور وکالت کے پیشہ کے ساتھ منسلک تھے۔ وہ لاہور انگلش کالج میں ایف اے اور بی اے (انگلش) کی کلاسوں کو پڑھاتے تھے۔ انکی پڑھانے کی وجہ یہ تھی کہ ان کی وکالت ان کے گھر کی معاشیات کو چلا نہیں سکتی تھی۔ واصف صاحب سے ملاقات کی وجہ بھی درس وتدریس تھا۔ یہی ان کی قربت کی وجہ تھی۔ ان کو واصفؒ صاحب کی شادی کا پیغام دیا گیا لیکن بدقسمتی سے وہ شامل نہ ہو سکے۔ اس کے علاوہ یہ دہلی میں واصف کے ساتھ امیر خسروؒ، نظام الدینؒ اور دوسرے مزارات پر حاضری کیلئے گئے اور وہاں سے واصف صاحب کو شاعری کا انعام حاصل

ہوا اور یہ دونوں وہاں ایک ہی بزرگ کے پاس بیعت ہوئے اور واپس آکر یہ دونوں اچھے تعلقات میں زندگی کے دن گزارتے رہے۔ واصف صاحب ان کو وقتاً فوقتاً ملاقات کے لوگوں کے کیس دیتے رہے۔ تاحیات دونوں کی دوستی جاری وساری رہی۔ ہم نے جب تک وجدانی صاحب کو دیکھا وہ واصفؒ صاحب کے ادب واحترام میں گم رہے۔ وہ واصفؒ کی گفتگو اور دلائل کے سامنے ہمیشہ سرنگوں پائے گئے۔ یہ ممکن ہے کہ اعجاز صاحب کے روبرو یاان کے کسی دوست کے سامنے کوئی ایسی بات چیت کی ہو جس کا علم ان کے سوا کسی اور شخص کو نہیں۔ جب یہ ہندوستان سے مزارات پر حاضری دینے کے بعد واپس لوٹے تو تمام کیفیات اور تمام واقعات جناب سردار احمد ضیا صاحب اور الٰہی بخش وجدانی نے بتائے۔ ضیا صاحب اور وجدانی صاحب کی کیفیات واصفؒ کی عظمت کی قائل تھیں۔ حتیٰ کہ الٰہی بخش وجدانی کے دل میں ان کا احترام وعظمت بتدریج وقت کے ساتھ بڑھتا گیا اور سردار احمد ضیا کا رول منفی ہوتا گیا۔ کیونکہ وہ ایک فقیر اور درویش بننے کی کاوش میں تھے لیکن سردار احمد ضیا سے ملنے والے اور اس دور کے عظیم لوگ، عوام الناس واصفؒ کے خیال سے استفادہ کرتے اور ان کی قربت میں زیادہ سے زیادہ تشریف لاتے جو ان کو گوارا نہ تھا ان وجوہات کی بناپر وہ عوام الناس میں واصف علی واصفؒ کے مقابلے میں اپنی مقبولیت کھوتے گئے۔ دراصل وہ دہلی شریف کے مرید ہونیکی وجہ سے اپنے آپکو فقیر اور درویش تصور کرتے تھے۔

اعجاز الحق اپنی سوانحی تصنیف فرمائش میں مقام واصف میں رقم طراز ہیں کہ واصف صاحب سے میرا تعارف ان کی زندگی کے آخری عشرے میں ہوا۔ جب ان کا تعارف ہی واصف صاحب کی زندگی کے آخری عشرے میں ہوا تو اس سے پہلے کے واقعات پر اس کی رائے کو مستند کیسے سمجھا جاسکتا ہے۔ (بحوالہ گفتگو عنایت اللہ صاحب)

فصل 11۔ سائیں اختر: بحوالہ باباجی عنایت اللہ

سائیں اختر واصف علی واصفؒ صاحب کے فقر کے طالب اور درویشوں کے گروہ کے ایک رکن تھا۔ واصف علی واصفؒ صاحب کے ساتھ اس کے بہت اچھے تعلق تھے۔ واصف علی واصفؒ صاحب کی فیملی اور ماموں زاد بھائی اکرم صاحب سرگودھا میں دکان داری کرتے تھے۔ اکرم صاحب اور اسلام صاحب۔ اسلام صاحب لاہور میں سروس کرتے تھے۔ یہ ان کے ماموں زاد بھائی تھے۔ ان کی دو ہمشیرہ ان کے گھر میں تھیں۔ واصف علی واصفؒ صاحب خاندان میں شادی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ سائیں اختر، اکرم صاحب اور ان کے بھائی واصف علی واصفؒ صاحب کے ایک دوست ہونے کی حیثیت سے ان کو کہتے تھے کہ وہ ان کی ہمشیرہ کی شادی ان کے ساتھ کروادیں۔ وہ ان کے عقیدت مند بھی تھے اور ان کا ادب بھی کرنے والے تھے جس کی بناپر وہ واصف صاحب کو ان کی ہمشیرہ کے ساتھ شادی کرنے کے لئے زور دیتے رہے یہاں تک کہ پیر دیول شریف صاحب کو بھی اس شادی کے لئے فرمائش کرتے رہے۔ واصف علی واصفؒ صاحب اس کا جواب نفی میں دیتے تھے۔ میں واصف علی واصفؒ صاحب کے مہمانوں اور خاص کر سائیں اختر کے کھانے اور چائے کا بندوبست کرتا تو وہ مجھ سے ہر وقت پوچھتا رہتا تھا کہ یہ لڑکیوں کو پڑھاتے ہیں کہیں انہوں نے کوئی خفیہ شادی تو نہیں کی ہوئی۔ جب وہ مجھ سے بار بار سوال کرتا تو میں نے بالآخر تنگ آکر واصف علی واصفؒ کو بتایا کہ یہ آپ کا دوست سائیں اختر مجھ سے ہر وقت پوچھتا رہتا ہے کہ واصف علی واصفؒ کی شادی کس کے ساتھ ہوئی ہے۔ واصف علی واصفؒ کو میں نے یہ تمام واقعات بتائے انہوں نے مجھے کہا کہ کسی فرضی عورت کا نام لے کر بتادو کہ انہوں نے اس سے شادی کر رکھی ہے اور اس کا نام یہ ہے اور تین بیٹیاں اس میں سے ہیں۔ اس نے مجھ سے یہ بات سنی تو

سیدھا راولپنڈی پیر دیول شریف کے پاس فیض آباد چلا گیا۔ان کو یہ تمام واقعات بتائے اور پھر اس کے بعد سرگودھا چلا گیا۔ وہاں پر واصف علی واصفؒ صاحب کے بہنوئی اکرم صاحب کو یہ تمام واقعات بڑھا چڑھا کر پیش کئے۔ خاندان میں نفاق اور نفرت کی چتا جلائی۔ واپس واصف علی واصفؒ کے پاس لاہور آگیا اور ان کو تمام ماجرا ان کی شادی کے متعلق اپنی روحانی قوت ظاہر کرتے ہوئے بتایا کہ وہ جان چکا ہے کہ آپ نے فلاں عورت کے ساتھ شادی کر رکھی ہے اور آپ کی تین بیٹیاں ہیں۔ جب واصف علی واصفؒ صاحب کو زچ کر دیا تو واصف علی واصفؒ صاحب نے مجھ کو آواز دی ۔مجھے سامنے کھڑا کر کے کہا کہ یہ تمہارا موکل میرے سامنے آگیا ہے۔ تو مجھے بتا کہ میں نے جو تجھے کہا تھا کہ اس کو بتانا ہے تم نے اسے کیا بتایا ہے۔ پھر میں نے تمام داستان سنائی۔ سائیں اختر مجھ پر آگ بگولا ہوا اور مجھے غیر مرئی طاقتوں کے ذریعے خاکستر کرنے کا پیغام اور گالیاں دیتے ہوئے واصف علی واصفؒ صاحب کے کالج سے باہر چلا گیا۔ اعجاز الحق نے واقعات کو توڑ موڑ کر حقائق کو مسخ کر کے جو کتاب کی داستان رقم کی ہے وہ حقائق کے بالکل منافی ہے۔ دراصل حقیقت میں سائیں اختر یہ چاہتا تھا کہ جناب واصفؒ صاحب کی شادی سرگودھا میں اپنے خاندان میں ہو جائے جب کہ واصفؒ کی دو بہنوں کی شادی اکرم صاحب اور اسلام صاحب لاہور والوں کے ساتھ ہوئی تھی۔

اعجاز الحق، واصفؒ صاحب کے پاس بذریعہ آپا عائشہ (پرنسپل اپوا کالج لاہور) آئے۔ آپ کی عائشہ کی قریبی عزیزہ کی لڑکی کے ساتھ شادی ہوئی تھی جو مغربی ملک میں مقیم تھیں۔ وہ اخلاقیات کے حوالے سے ایک اچھی عورت نہ تھی۔ وہ زبان دراز تھی اور اس کے پیچھے پڑی رہتی تھی اور اس کے ساتھ لڑائی اور جھگڑے کا ماحول بنائے رکھتی تھی۔ یہاں تک کہ واصفؒ صاحب ہسپتال میں بیمار پڑے تھے وہاں بھی وہ پہنچ گئی۔ اعجاز الحق تو اس کو وہاں نہ مل سکا لیکن وہ واصفؒ صاحب کے ساتھ بدکلامی اور گالی گلوچ پر اتر آئی۔ واصفؒ صاحب کی ہمشیرہ نے اس کو روکا اور سب نے مل کر اس کو ہسپتال سے باہر نکال دیا اور اعجاز الحق نے اس کو طلاق بھی دے دی لیکن اس سے ملاقاتیں جاری رکھیں اور اس کے روابط قائم رہے۔ کشمیر بک ڈپو لاہور کے تمام بھائی اسکے مالک تھے۔ وہ اکٹھے کاروبار کرتے تھے۔ ان کے کہنے کے مطابق اس نے کاروبار کو تباہ کر دیا۔ ان کا اپنا پریس تھا لیکن بعد میں یہ تمام بھائی الگ الگ ہو گئے۔ اس نے ایک بھائی کے ساتھ پھر ایک دکان حاصل کی۔ اس کو دکان پر بٹھایا لیکن وہ تمام سرمایہ ختم ہو گیا جو اس نے مختلف ذرائع سے ادھار لیا تھا۔ اس کے بعد اردو بازار میں بھائیوں کی مشترکہ دکان پر قابض ہو گیا جو ابھی تک ان کی گزر اوقات کا ذریعہ تھی۔ اس نے دکان کرایہ پر دے دی ۔واضح ہو کہ واصف علی واصفؒ کی بیماری کی وجہ یہی اعجاز الحق بنے جنہوں نے ایک حکیم سے ایسی گولیاں اور ادویات لے کر ان کو دیں جو انکے گردوں پر بری طرح اثر پذیر ہوئیں اور ان کی موت کا سبب ہوئیں۔ (بحوالہ گفتگو باباجی عنایت اللہ)

فصل 12۔ شیخ وزیر علی:

شیخ وزیر علی ایک درویش منش انسان تھے۔ یہ اس وقت واصفؒ صاحب کی قربت میں آئے جب ابھی داڑھی بھی نہیں پھوٹی تھی۔ وہ خوب صورت اور خوب سیرت انسان تھے۔ وہ واصفؒ صاحب کے ساتھ بہت دل و جان سے پیار کرتے تھے۔ ان کے تعلق روحانی طور پر پروان چڑھتے رہے۔ ان کی ایک دوسرے سے قربت ان کی دینی اور الہامی روشنی کے دل کش ابواب تھے۔ شیخ وزیر علی صاحب کو جن لوگوں نے قرآنِ حکیم کی تشریح و توضیح اور تفسیر کرتے سنا وہ قصور اور لاہور میں موجود ہیں۔ کبھی کبھی واصفؒ صاحب جب شام کو کالج سے فارغ ہوتے تو قصور کا رخ کرتے۔ واصف علی

واصفؒ نے باباجی عنایت اللہ کو ہمیشہ ہر سفر میں اپنے ساتھ رکھا۔جب وہ قصور جاتے تو قصور کے لوگ وہاں رات کو اکٹھے ہوتے اور شیخ وزیر علی صاحب قرآنِ حکیم اوراس کی تشریح وتوضیح اور روحانی گتھیاں سلجھاتے اور سمجھاتے اور رات بھر بیٹھ کران کی صحبت سے فیض یاب ہوتے۔آخر کوئی بات تو تھی جو واصفؒ صاحب کو رات کی تنہائیوں میں قصور کھینچ کرلے جاتی۔

یہ حقیقت ہے کہ جب شیخ وزیر علی قرآن حکیم کی تشریح وتوضیح کرتے تو ہوائیں رک جاتیں۔ان کی والدہ ماجدہ تمام رات ان کے دوست احباب اور تمام ملنے والوں کو مٹھائیاں اور کھانے پیش کرتی رہتیں اور خدمت میں مصروف رہتیں۔ایک روز وہ لاہور انگش کالج میں تشریف لائے ۔قبلہ واصف علی واصفؒ کے والد بھی اس دن وہاں موجود تھے۔رات ان کا قرآن کا درس شروع ہوا تو ایک مقام ایسا آیا کہ واصف علی واصفؒ کے والد صاحب کا ذکر جاری ہو گیا اور انہوں نے دھمال ڈالنی شروع کر دی اور تمام معززین اٹھ کھڑے ہوئے۔جب وہ سنبھلے اور ہوش میں آئے تو ان کا چہرہ اور آنکھیں سرمدی مے سے معمور تھیں۔جب صبح ہوئی تو ان کے والد صاحب پوچھنے لگے کہ عنایت اللہ کیا تم انہیں کے پاس جاتے تھے۔تو میں نے کہا جی جناب انہیں کے پاس جاتے ہیں۔کہنے لگے کہ میں بہت غلطی کرتا رہا کہ آپ کو وہاں جانے کی سرزنش کرتا تھا، تم اور واصف ٹھیک تھے۔یہ اس دور کا ایک عظیم درویش ہے۔

آج ان کا مزار میانی شریف میں موجود ہے۔شیخ وزیر علی معرفتِ الٰہی سے نوازے ہوئے ایک درویش تھے جو ایک ہمہ گیر شخصیت تھے۔ان کے ملنے والوں کی تعداد روز بروز بڑھتی گئی۔شیخ وزیر علی واصف علی واصفؒ کو لے کر بابا فرید گنج شکرؒ پاک پتن شریف کے عرس کے دنوں میں بسی شریف لے کر گئے۔باباجی عنایت اللہ اس وقت بھی ان کے ساتھ تھے۔شیخ وزیر علی فقیروں کی بہت تواضع کرتے تھے۔شیخ وزیر علی صاحب کے ایک قریبی رشتہ دار نوجوان ان کے ساتھ ان دنوں خدمت میں مصروف دکھائی دیتے تھے۔وہ نوجوان حضرت میاں علی محمد بسی شریف کے مرید تھے اور ان کے ساتھ رہا کرتے تھے۔

زندگی کا کوئی ایسا سفر نہیں سوائے انڈیا اور انگلینڈ کے، جو میں نے ان کے ساتھ نہیں کیا۔وہ میرے سپرد کالج کا تمام نظام کر کے جاتے۔میں ہی کالج کی دیکھ بھال کرتا۔نظام الدین اولیاؒ کے عرس پر دہلی گئے تو مجھے کالج میں چھوڑ گئے اور دوسرا سفر انہوں نے اکیلا کیا وہ گردوں کی بیماری کے لئے انگلینڈ گئے تو ان کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کو میرے بضد ہونے پر ساتھ لے گئے کیوں کہ میں نے یہاں سے گورنمنٹ سے ان کے اخراجات اور واجبات سرکاری طور پر لندن بھجوانے تھے۔باقی تمام مزارات اور پیر خانے کے سفر کرنے کا شرف اللہ تعالیٰ نے میری قسمت کا حصہ بنا رکھا ہے۔ایک مرتبہ چار روز کے بعد واصف علی واصفؒ واپس لاہور انگلش کالج تشریف لائے۔

واصف صاحب کی محفل میں دو شخصیات محبوب ترمذی صاحب پرنسپل نیپا لاہور اور کیپٹن یوسف ایسی آئیں جو حضور نبی کریم ﷺ کے ساتھ اپنے بالواسطہ اور خواب کے تعلقات کے ذریعے ملاقاتیں اہلِ محفل اور واصفؒ صاحب کو بتاتے رہتے تھے۔محبوب ترمذی کے پاس جب بھی ان کے گھر آنا جانا ہوا تو وہ بڑے نرم اور پیارے لہجے میں بتاتے کہ میرے پاس ابھی نبی کریم ﷺ تشریف لانے والے ہیں۔اسی طرح کیپٹن یوسف بھی اپنے خوابوں کے تذکرے حضور اکرم ﷺ سے منسوب کرتے رہتے اور واصف علی واصفؒ ان دونوں کو سمجھاتے کہ جو بات تم کسی دوسرے

شخص کو نہیں بتا سکتے اور کسی شخص کو اس کا ہمراز نہیں بنا سکتے اور حضور اکرم ﷺ کا چہرہ ان لوگوں کو نہیں دکھا سکتے، تو نبی کریم ﷺ سے ظاہری ملاقات ہو یا خواب کی دنیا ہو، اس کا تذکرہ کرنا ایک گناہِ عظیم ہے۔ تم اس حرکت سے باز آجاؤ۔ اگر تم ان حالات و واقعات کو جاری رکھو گے تو زندگی میں رسوا و بدنام ہو جاؤ گے اور ذلت تمہارا نصیب بن جائے گی۔

علامہ محمد یوسف جبریل اور ان کے صاحبزادے شوکت محمود اعوان صاحب جو ان دنوں ایم اے او کالج میں زیرِ تعلیم تھے۔ واصف علی واصفؒ صاحب کے پاس اکثر و بیشتر تشریف لاتے۔ باباجی یوسف جبریل صاحب تو متواتر و مسلسل تشریف لاتے رہے۔ واصفؒ صاحب ان کو بڑے غور کے ساتھ سنتے اور تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد مجھے چائے کا دو کپ لانے کے لئے حکم دیتے۔ باباجی یوسف جبریل صاحب معرفت و اسرار اور قرانِ حکیم کے رموز سے علمائے کرام اور مشائخ عظام سے کہیں بہتر علم رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ واصفؒ صاحب ان کو ہمہ تن گوش ہو کر سنتے۔ جب وہ ان کو این میری شمل کا مذاکرہ سناتے تو وہ بہت متجسس ہو جاتے۔ این میری شمل ایک عیسائی خاتون تھیں، جن کا قرآنِ حکیم اور دوسری الہامی کتابوں پر پورا عبور تھا وہ ایک مسئلے پر یعنی قرآن حکیم اللہ کی کتاب نہیں بلکہ آقا نبی کریم ﷺ کی تصنیف ہے پر مصر تھیں اس موضوع پر مصر کے علماء کو مات دے کر پاکستان کی طرف رخ کیا تو کوئی عالمِ دین اس کا جواب دینے کے قابل نہ تھا۔ علامہ علاوالدین صدیقی، وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی علامہ یوسف جبریل کے بہت معتقد تھے۔ انہوں نے علامہ صاحب کو کہا کہ اس عورت کا علمی طور پر کوئی بھی جواب دینے کے قابل نہیں۔ مہربانی فرما کر اس کے سوالات کا جواب تو دے دیں۔ آپ کے علاوہ کوئی دوسرا اس کو جواب نہیں دے سکتا۔ پنجاب یونیورسٹی کے اس مباحثہ میں آنے کے لئے وہ رضامند ہو گئے۔ تقریر کے دوران وہاں جا کر اگلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ این میری شمل نے تقریر شروع کی اور کہا کہ قران اللہ کی کتاب نہیں ہے بلکہ آپ کے نبی کریم ﷺ نے لکھی ہے۔ تو علامہ صاحب نے اسے سورۃ الھمزہ کی وساطت سے ایٹم بم کا تذکرہ سنایا کہ آقا نبی کریم ﷺ کے زمانے میں ایٹم بم کہاں تھا جس کا ذکر قرآنِ حکیم میں موجود ہے۔ وہ صرف اللہ ہی جان سکتا ہے جس نے اس کتاب یعنی قرآنِ حکیم میں اس کا اظہار کیا ہے۔ علامہ محمد یوسف جبریل ایک نامور سکالر اور ہمہ گیر شخصیت تھیں۔ دینی اور دنیاوی علوم پر ان کو پورا عبور حاصل تھا۔ حطمہ پر انہوں نے چودہ جلدیں انگلش میں لکھیں۔ برٹرینڈ رسل کے ساتھ ان کی خط و کتابت رہی اور اب امریکہ نے ان کی کتاب قرآن حکیم کے معجزے یعنی وہ چودہ جلدیں، دو جلدوں میں شائع کی ہے۔ علامہ صاحب اور واصف علی واصفؒ صاحب کے مابین ارسطو، کارلائل، برٹرینڈ رسل، ڈارون، سر جیمز جینز، فرانسس بیکن، ابراہیم لنکن، ہیگل، ملٹن کے علاوہ مغربی فلاسفرز اور عالم لوگوں پر بحث ہوتی۔ نامور دانش ور سکالرز کی تعلیم پر بحث ہوتی۔ اسلامی دنیا کی روحانی معتبر شخصیات بھی ان کی بحث کا حصہ ہوتا۔ واصف علی واصفؒ صاحب اکثر و بیشتر جب بھی اسلام آباد آتے تو مجھے ساتھ لے کر علامہ یوسف جبریل کے ہاں حاضری دینا ان کا معمول تھا۔ جب آخری مرتبہ واہ کینٹ تشریف لائے تو واصف علی واصفؒ صاحب لیٹے رہے اور نگاہ ان کی چھت کی طرف رہی۔ آخری دفعہ ان کے گھر سے رخصت ہوئے تو علامہ صاحب نے ان کے لئے بہت لمبی دعا کی بہت بڑی دیر تک دعا کی اور پھر واصفؒ صاحب کو رخصت کیا۔ ان دنوں شخصیات کا ملنا ایک نئے باب کا عنوان ہوتا تھا۔ دونوں کی خوشی کی انتہا نہ رہتی جب دونوں کی ملاقات ہوتی اور خاموشی ان کی محبت کی خوشبو بن کر ان کی محفل کو مسحور کر دیتی۔ (بحوالہ گفتگو باباجی عنایت اللہ)

لاہور انگلش کالج:

ایک روز ایک نوجوان نابھہ روڈ سے گزر رہا تھا تو اس نے ایک بورڈ پر لکھا ہوا دیکھا ''لاہور انگلش کالج''۔ نوجوان سمجھ گیا کہ یہ انگلش پڑھانے والا کوئی ادارہ ہے۔ وہ اندر داخل ہوا اور پھر پرنسپل صاحب کے کمرے کی طرف بڑھا اور اجازت لے کر اندر داخل ہو گیا۔ پرنسپل صاحب نوجوان اور نہایت خوبرو تھے۔ انہوں نے سر اُٹھائے بغیر آنکھیں اُٹھا کے دیکھا اور آمد کا سبب پوچھا۔ نوجوان نے بتایا کہ وہ انگریزی پڑھنا چاہتا ہے لیکن اس کی ایک شرط ہے۔ پرنسپل صاحب نے پوچھا کہ کیا شرط ہے؟ اس نے کہا شرط یہ ہے کہ پہلے میں دو دن آپ سے پڑھ کر یہ فیصلہ کروں گا کہ آپ مجھے پڑھا سکتے ہیں یا نہیں۔ پرنسپل صاحب اس کی اس بات پر نہ حیران ہوئے اور نہ غصّہ کیا بلکہ نہایت تحمل سے جواب دیا کہ مجھے منظور ہے۔ وہ نوجوان دو دن باقاعدگی سے ساری کلاسیں پڑھتا رہا۔ دو دن بعد پرنسپل صاحب نے اسے اپنے دفتر میں یاد کیا اور پوچھا کہ اب بتاؤ تم نے کیا فیصلہ کیا ہے؟ کیا میں تمہیں پڑھا سکتا ہوں؟ نوجوان نے کہا کہ جی ہاں آپ مجھے پڑھا سکتے ہیں اور میں آپ سے پڑھنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے برجستہ فرمایا ''مگر میں نے فیصلہ کیا ہے کہ میں تمہیں نہیں پڑھانا چاہتا''۔ برجستہ غیر متوقع اور اس طرح کا حاضر جواب سن کر نوجوان حیران رہ گیا اور اس کے تو ہوش ہی اڑ گئے۔ جب اس کے حواس سنبھلے تو اس نے اپنی غلطی کی معافی مانگی۔ آپ نے اسے معاف فرما دیا اور ہمیشہ کے لئے طالب علم بھی بنا لیا اور پھر اپنی محبت کا اسیر بھی۔ لاہور انگلش کالج کے یہ پرنسپل ہمارے ممدوح جناب واصف علی واصفؒ ہیں۔

لاہور ہائی کورٹ کے عقب میں اکاؤنٹنٹ جنرل پنجاب کا دفتر ہے جسے عام طور پر اے جی آفس کہتے ہیں۔ اے جی آفس سے ایک سڑک پرانی انارکلی چوک کی طرف جاتی ہے۔ اس سڑک کو نابھہ روڈ کہتے ہیں اسی سڑک پر لاہور انگلش کالج تھا۔

اگر اے جی آفس سے مغرب کی طرف جائیں تو بائیں ہاتھ پر تیسری یا چوتھی عمارت کے سامنے ایکسائز اور کسٹمز کے دفاتر ہیں اور دفاتر کے پیچھے ایک بلند جگہ پر ایک مزار ہے۔ یہ مزار حضرت سید موج دریاؒ کا ہے جو لاہور میں سلسلۂ سہروردیہ کے حوالے سے ایک بہت بلند مقام رکھتے ہیں۔ آپ لاہور شہر میں سلسلۂ سہروردیہ کے نمائندے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سلسلۂ سہروردیہ تصّوف کے چار سلاسل میں سے ایک ہے جو حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ سے منسوب ہے اور اسے برصغیر میں شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانیؒ نے ترویج دیا تھا۔ یہاں پر آپ اکثر حاضری دیا کرتے تھے۔ کالج کی سڑک کی دوسری جانب پرانی انارکلی کے پاس ایک چھوٹی سی مسجد ہے۔ یہاں آپ راتوں کو چھپ چھپ کے عبادت کیا کرتے تھے۔ تہجد کے وقت مسجد کے امام یا خدمت گار آپ کو دیکھ لیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ کسی کو نہ پتہ چلتا کہ سارا دن پینٹ کوٹ میں ملبوس اور انگریزی کی تدریس میں مصروف اور جدید وضع قطع سے ملفوف یہ شخصیت کس طرح آہِ سحر گاہی سے فیض یاب ہوا کرتی تھی۔ آپ ایک انتھک اور مسلسل جدوجہد کرنے والی شخصیت تھے۔ کبھی تھکتے نہیں تھے۔ صبح چھ بجے بھی کلاس پڑھایا کرتے تھے اور رات کے گیارہ بجے بھی۔ سارا دن دوسری مصروفیات بھی رہتیں اور رات کو شبِ بیداری، تہجد اور لکھنے میں گزر جاتی تھی۔ آپ کے ان معمولات کی تاثیر ان کی زبان میں واضح تھی۔ عام گفتگو بھی بڑی پر تاثیر ہوا کرتی تھی۔ جب طلبہ کو پڑھاتے تو شاید ہی کوئی ایسا طالب علم رہ جاتا ہو جس کو لیکچر کی پوری طرح سمجھ نہ آتی ہو۔ لیکچر کے دوران ایک ایک طالب علم پر خصوصی نظر اور توجّہ رکھتے تھے۔ پڑھانے کا انداز یہ تھا کہ نہایت سادہ، آسان اور مختصر فقروں میں بات سمجھایا کرتے تھے۔ پڑھانے کا شوق کب پیدا

ہوا؟اس بارے میں ایک روز فرمایا کہ دورانِ تعلیم میں نے ایک بچے کو پڑھانا شروع کیا اس نے پڑھائی میں بڑی اچھی پراگریس دکھائی۔ آپ نے اس سے کوئی چیز طلب نہیں کی۔ ایک روز وہ بچہ چند انڈے ایک چھوٹی سی ٹوکری میں لے کر آگیا۔ آپ بہت خوش ہوئے کیونکہ یہ محنت کا پہلا پھل تھا۔ اس کے بعد اس طرح کے واقعات ملتے ہیں۔ بہنوں اور بھائیوں کی پڑھائی میں بڑے کوشاں رہتے تھے۔ جن دنوں کالج چھوڑ دیا تھا اور بہت سی دوسری مصروفیات میں سے وقت نکالنا بہت مشکل تھا ان دنوں بچوں کو پڑھا لیا کرتے تھے۔ کالج میں لڑکوں کے ساتھ خواتین بھی آیا کرتی تھیں۔ آپ نے جب محفلیں شروع کیں تو چند عقیدت والی خواتین نے ان میں شرکت کے لئے اجازت مانگی۔ اس روز آپ نے فرمایا کہ میں نے ایک آستانہ دیکھا تھا جو ایک مائی صاحبہ کے زیرِ انتظام تھا۔ اس آستانے پر خواتین اور مرد موجود رہا کرتے تھے لیکن مائی صاحبہ کا جلال اور کنٹرول اس حد تک تھا کہ کوئی کسی کو آنکھ اٹھا کے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ یہی حال کالج کے زمانے میں کلاس کے اندر ہوتا تھا اور بعد محفلوں میں بھی یہی کیفیت رہا کرتی تھی۔ اس کی بڑی وجہ آپ کی شخصیت کا رعب، دبدبہ اور جلال تھا۔ ڈسپلن کے وقت تو یہ حال ہوتا تھا کہ کسی کی ذرا سی غلطی پر جلالی کیفیت چھا جاتی اور اکثر یہ دو الفاظ کہہ کر کمرے سے نکال دیتے تھے۔ آپ کے دو مخصوص الفاظ Shut up and get out کا سب کو پتہ تھا اور عام حالات میں نہایت لطیف حسنِ جمال کے مالک تھے۔ طلباء سے بہت پیار کرتے تھے۔ ان کے ہر طرح کے مسائل حل کرتے۔ پڑھائی سے لے کر سماجی، معاشی اور روحانی مسئلوں کے حل کے لئے کوشاں رہتے۔ جو طلبہ فیس نہ دے سکتے تھے انہیں رعایت مل جاتی یا فیس بالکل معاف ہو جاتی تھی بلکہ کچھ طلبہ ایسے بھی تھے جن کے قیام اور طعام کی ذمہ داری آپ خود قبول فرمالیا کرتے تھے۔ یہ لنگر ہی کی ایک شکل تھی۔ ویسے تو مستقل طور پر لنگر چلتا رہتا تھا۔ باقاعدگی سے دیگیں بھی پکتی تھیں۔ سارا دن مہمانوں اور طلبہ کو چائے بھی پیش کی جاتی تھی اور ہر طرح سے سوال والے شخص کے سوال کے مطابق اس کی مدد کی جاتی تھی۔ کالج کے زمانے ہی کی بات ہے۔ فرمایا ایک روز میں دفتر میں بیٹھا تھا۔ وہاں ایک شخص آگیا۔ شکل سے درویش لگتا تھا اس نے آتے ہی کہا میرا سوال یہ ہے کہ اس وقت جتنے پیسے پڑے ہیں مجھے دیئے جائیں۔ آپ نے بغیر کسی توقف کے کیشئر (Cashier) سے کہا کہ پیسے اسے دے دو۔ کیشئر نے کچھ کہنا چاہا مگر آپ نے محسوس کر لیا تھا کہ یہ کوئی عام سائل نہیں۔ آپ نے کیشئر سے کہا کہ جیسا میں نے کہا ہے ویسے کرو اور سارے پیسے اس درویش کو دلا دیئے۔ آپ فرماتے ہیں اسی رات وہ میرے پاس آگیا اور پھر میں نے اس سے بڑا کچھ حاصل کیا۔ اسی روز اس درویش کا انتقال ہو گیا۔

ایک اور بزرگ کا واقعہ آپ یوں بیان فرمایا کرتے تھے کہ جب وہ تشریف لائے تو میں نے پوچھا کہ میں کہاں کہاں حاضری دوں یعنی کس کس بزرگ سے جا کر ملوں۔ فرماتے ہیں کہ اس بزرگ نے مجھے ایک راز بتایا اور کہا کہ اب کہیں نہ جانا جس جس سے ملاقات ہونی ہو گی وہ آپ کو خود یہاں آکر مل جایا کرے گا۔ پھر فرمایا کہ اس روز کے بعد میں نے یہ راز سمجھ لیا اور پھر اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے یہیں پر بیٹھے بٹھائے سب سے ملاقات ہوتی گئی۔

اس طرح کئی واقعات ہیں جو بڑے حیرت والے ہیں مگر ایک روز آپؒ نے ایسا واقعہ سنایا کہ اس کو سن کر جو حیرت کی کیفیت طاری ہوئی تھی وہ اب بھی ویسی کی ویسی ہے۔ بات ہی کچھ ایسے کمال کی تھی کہ جو بھی سنے وہ ششدر رہ جائے گا۔ ہوا یہ کہ آپ ایک بزرگ سے ملے۔ انہوں نے آپ پر بڑی نظر کی اور اپنے فیضِ کرم سے بہت نوازا۔ جب آپ رخصت ہونے لگے تو آپ نے ان سے درخواست کی کہ اب میرا آئندہ کا پروگرام کیا ہو گا؟

باباجی نے جواب میں فوراً فرمایا کہ تم تو خود کسی کا پروگرام ہو، تم کیا پروگرام بناؤ گے ؟ اتنا سننا تھا کہ آپ پر کیفیت طاری ہو گئی۔ بات ہی کچھ ایسی تھی۔ ایسی شخصیت کو ایک زمانے کے بعد بھیجا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا سارا پروگرام پہلے سے طے شدہ ہوتا ہے۔ ایسی شخصیت کو آمد سے پہلے منزل عطا ہو چکی ہوتی ہے اور زمانوں تک اس کی تاثیر رہتی ہے:

واصفؔ مجھے ازل سے ملی منزل ابد
ہر دور پر محیط ہوں جس زاویے میں ہوں

واصف علی واصفؒ۔ چند یادداشتیں

لاہور انگلش کالج 1958 میں 6 نابھہ روڈ پر شروع ہوا۔ لاہور میں دو تین پرائیویٹ کالج اسی نوعیت کے تھے جو پرائیویٹ طور پر ایف اے، بی اے، ایم اے انگلش کرواتے تھے۔ اے جی آفس، ہائی کورٹ، سول کورٹس، بورڈ آف ریونیو اور سیکرٹریٹ کے ملازمین جو اپنا تعلیمی معیار بڑھانا چاہتے تھے وہ تعلیم کے لئے مختلف پرائیویٹ کالجوں میں داخلہ لیتے تھے اور اپنا مقصد حاصل کرتے تھے۔ ان کالجوں میں سے لاہور انگلش کالج بھی ایک ایسا کالج تھا جہاں قرب وجوار کے دفاتر کے تمام لوگ کثرت سے اس کالج کی طرف رجوع کرتے اور کھلے میدان میں ان کی سائیکلوں کا ایک لمبا چوڑا اکٹھ نظر آتا۔ واصفؒ صاحب تمام کلاسیں پڑھاتے اور اپنی مدد کے لئے مختلف لوگوں کو جو میٹرک، ایف اے، بی اے اور ایم اے کے معیار کے مطابق تعلیم و تربیت کر سکتے تھے اپنا معاون بنا لیتے۔ ان کا پڑھائی کا انداز بڑا مختلف اور دل کو موہ لینے والا ہوتا تھا۔ باپ بیٹا، باپ بیٹی، ماں بیٹی ایک ساتھ مل کر تعلیم حاصل کرتے تھے۔ میں اپنے مالک مکان فدا حسین کے ساتھ تعلیمی رغبت کی وجہ سے لاہور انگلش کالج میں اس کے ساتھ داخلے کے لئے پہنچا، جب کلاس میں بیٹھا تو اس نے مجھے کہا کہ یہ پروفیسر صاحب تو شراب کے دلدادہ دکھائی دیتے ہیں کیوں کہ ان کا چہرہ اور آنکھیں سرخ نظر آتی ہیں لیکن جب واصف علی واصفؒ نے لیکچر دیا تو ان کا انداز بہت دلچسپ اور دل میں اترنے والا تھا۔ میرے مالک مکان نے کہا کہ آج انہوں نے خوب پی ہوئی ہے اور خوب پڑھایا ہے۔ اگلے روز گئے تو واصفؒ صاحب کا چہرہ پیلا پڑا ہوا تھا اور ان کی آنکھیں بیماری کی کیفیت کا اظہار کر رہی تھیں۔ اس دوست کا کہنا تھا کہ آج انہوں نے پی ہوئی نہیں۔ واقعی اس دن انہوں نے نہیں پڑھایا۔ یہ سلسلہ دو ہفتے اسی طرح چلتا رہا۔ میرے دوست کا فیصلہ یہ تھا کہ یہ شخص بغیر پیئے پڑھا نہیں سکتا۔ میں نے کہا مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ استاد روحانی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتا ہے، ایسی تو کوئی بات نہیں۔ بہر حال وقت گزرتا رہا۔ حضرت واصف علی واصفؒ کے انگلش کے لیکچر مجھے بہت اچھے لگے۔ میں اپنے دوست کو گھر بھیج دیتا اور کلاس کے باہر کھڑا ہو کر واصف علی واصفؒ کی گفتگو سنتا رہتا۔ کمرے کے ایک چھوٹی سی کھڑکی سے تمام گفتگو وہاں سے آسانی سے سنی جا سکتی تھی۔ ان کے پاس تین چار فقیر ہمیشہ بیٹھے رہتے تھے اور گفتگو جاری رہتی تھی۔ ان افراد میں ایک صاحب صوفی سرور بھی تھے جو روحانیت کی دلچسپ باتیں اور مختلف سوالات واصفؒ صاحب سے کرتے رہتے تھے ، ملک صاحب ان سوالوں کا جواب ان کو دیتے رہتے تھے۔ دو تین دن جب اس نے مجھے مسلسل کمرے کی اس کھڑکی کے قریب دیکھا تو اس نے واصفؒ صاحب کو بتایا کہ آپ کا ایک طالب علم نہ جانے یہاں کیوں کھڑا رہتا ہے۔ واصفؒ صاحب آئے اور انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تم یہاں کیوں کھڑے ہو، گھر کیوں نہیں جاتے۔ میں نے ان کو بتایا کہ مجھے آپ کی باتیں دلچسپ لگتی ہیں اور میں آپ کی باتیں سنتا رہتا ہوں۔

انہوں نے مجھے کہا کہ تم دروازے پر بیٹھ جایا کرو۔ پھر وہاں سے ایسا سلسلہ شروع ہوا کہ رات بارہ ایک بجے تک ان کی چائے لانا اور ان کے مہمانوں کی خدمت کرنا میری زندگی کا حصہ بن گیا۔

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو — یدِ بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں
تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی — نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

یوں وقت گذرتا گیا۔ واصفؒ صاحب کے ساتھ میری ملاقاتیں بتدریج عروج کی منازل طے کرتی رہیں۔ اس کے بعد داتا صاحب جانا اور وہاں سے حاضری دے کر اپنے گھر آنا اور بعض اوقات کالج آجانا یہ میرا معمول تھا۔ واصفؒ صاحب نے مجھ پر اپنے اعتماد کو بحال رکھا اور مجھے فیسوں کی وصولی کی ڈیوٹی پر لگا دیا۔ ایک دو ماہ تک مجھ سے حساب لیتے رہے لیکن پھر حساب لینا دینا چھوڑ دیا۔ پھر مجھ سے یہی پوچھتے کہ پیسے ہیں یا نہیں۔ ہوتے تو دے دیتا ورنہ انکار کر دیتا۔ یہ پھر زندگی کا معمول بن گیا۔

ضیا محمود مرزا جسٹس سپریم کورٹ اور ان کی بیگم بھی یہاں سے ہی تعلیم حاصل کرتے رہے۔ بہت سارے سرکاری ملازمین یہاں سے گریجویشن کر کے سرکاری ملازمتوں کے ذریعے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہوتے رہے۔ ملک صاحب صبح سے لے کر رات گئے تک سات آٹھ کلاسیں لیتے جس میں ایف اے، بی اے اور ایم اے کی کلاسیں شامل تھیں۔ اس کالج کی دھوم پورے لاہور میں پھیلتی گئی۔ اس کے علاوہ واصفؒ صاحب وائی ایم سی ہال میں مختلف اساتذہ اور سکالرز کو لیکچر دیتے تھے اور لیکچر سننے والوں کے لئے ایک روپیہ ٹکٹ ہوتا تھا۔ جب ملک واصف صاحب کسی مضمون یا آتھر کو بیان کرتے تو اس کے بعد کسی کی جرات نہ ہوتی کہ کوئی فرد بولے۔ نامعلوم وجوہات کی وجہ سے انہوں نے پڑھانے میں عدم دلچسپی سے کام لینا شروع کر دیا۔ پرائیویٹ ادارہ ہونے کی وجہ سب طلبا بھاگ گئے اور دوسرے کالجوں میں جا کر داخلہ لے لیا۔ یہاں تک وہ وقت بھی آگیا کہ کالج کرایہ ادا کرنے کے قابل بھی نہ رہا بلکہ بجلی کا بل ادا کرنے کے لئے قاصر ہو گیا۔ مالکان نے کیس کر کے بالجبر قبضہ لے لیا۔ وہ گلشن راوی کالونی میں ایک کمرے پر مشتمل گھر میں اپنے قبیلے کے پاس چلے گئے۔

پھر گلشن راوی میں رہتے ہوئے انہوں نے جوہر آباد سے شادی کر لی اور اپنے خاندان کے ساتھ رہنا شروع کر دیا۔ اس شادی میں انہوں نے اپنے تمام دوستوں کو شامل ہونے کی دعوت دی لیکن ایک دوست بھی اس شادی میں شامل نہ ہوا۔ شام کو شہرِ آشوب پر نظم لکھی جو رات کو کوہستان اخبار میں تیار کروا کر اور فسٹ پیج پر لگوا کر میں واپس آیا۔ شادی والے دن شہر آشوب کوہستان اخبار کی زینت بنا۔ پھر جب ہم جوہر آباد پہنچے تو وہ اخبار وہاں ان کے گھر والوں اور رشتہ داروں نے پہلے ہی خرید کر رکھی تھی۔ اسی شب ایک گاڑی کرائے پر لی گئی جس کا تیرہ روپے ایڈوانس اور ایک سو چھپن روپے کرایہ پر جوہر آباد کے لئے بک کرائی اور صبح ہم ان کی ہمشیر گان اور باقی تمام رشتہ دار جوہر آباد پہنچے تو میں نے پریشانی کا اظہار کیا کیوں کہ نہ میرے پاس رقم تھی نہ ان کے پاس جو گاڑی والے کو دینی تھی۔ جب مستورات کے بلانے پر واصف علی واصفؒ اندر جانے لگے تو مجھے کہنے لگے کہ عنایت تم بھی چلو میرے ساتھ۔ میں نے کہا۔ میں اندر نہیں جاؤں گا۔ مجھے دکھائی دے رہا تھا کہ نہ ان کے پاس رقم ہے نہ میرے پاس۔ گھر سے ہم نے صرف چائے پی تھی۔ شوکت نے ہمیں چائے کا ایک ایک کپ پلایا۔ میں اپنی زندگی کو کوستا رہا اور اس کرائے کی رقم نے مجھے ایک اذیت ناک

حالات سے دوچار کر دیا تھا لیکن جب واصف صاحبؒ اندر سے باہر آئے تو وہ کپڑا جس میں ان کو شادی کی سلامی ملی تھی وہ مجھے دیا اور کہنے لگے کہ رقم گن لو۔ وہ اتنے زیادہ پیسے تھے جس میں کرایہ بھی ادا ہو جانا تھا اور ولیمہ بھی کر سکتے تھے اور قرضے بھی ادا کر سکتے تھے۔ اسطرح میرا ہوش بحال ہوا ۔میں نے اس مالک کے اس کرشمے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تو اسکے بعد عمر بھر اس خوف سے نکل گیا کہ ضروریاتِ زندگی پوری کرنا میرا فرض نہیں یہ مالک کی مہربانی اور کرم کا کام ہے۔

مفلسی میں امیر رہنے دے　　اپنے رخ کا اسیر رہنے دے
بادشاہت کا اعتبار ہی کیا　　احتیاطاً فقیر رہنے دے

میری اپنی شادی سے پہلے کی یہ بات بتانا نہایت ضروری ہے کہ مجھے واصف علی واصفؒ کے والد صاحب نے پیغام دیا کہ واصفؒ کی والدہ کہتی ہیں کہ واصف علی واصفؒ شادی کر لے۔ واصف علی واصفؒ نے کہا کہ الو کے پٹھے (عنایت اللہ صاحب کو وہ اکثر محبت میں اسی طرح مخاطب ہوتے تھے) تو کبھی اچھی خبر نہ لانا۔ پندرہ بیس دن کے بعد ان کی والدہ صاحب نے دوبارہ پیغام بھیجا کہ تم نے مجھے جواب نہیں دیا۔ واصفؒ صاحب سے پوچھ کر بتائیں کہ وہ کیا خود شادی کرنا چاہتے ہیں یا ہم کریں اور اگر کوئی لڑکی انہوں نے پسند کی ہے تو بتائیں ورنہ ہم شادی کر دیں۔

واصف صاحبؒ نے دوبارہ مجھے ڈانٹ ڈپٹ کی اور کہا کہ تم کبھی اچھی خبر نہ لانا۔ آپ کی بڑی ہمشیرہ بیگم ملک اسلام صاحب کچھ دنوں کے بعد کالج میں خود تشریف لائیں۔ واصف علی واصفؒ کسی دوست کے ساتھ کسی ہوٹل میں گئے ہوئے تھے۔ میں اکیلا اس وقت کالج میں تھا۔ چھٹی کا دن تھا۔ ان کی بہن نے مجھے کہا کہ عنایت کون ہے۔ میں نے کہا میں ہوں۔ انہوں نے کہا واصفؒ کو بتائیں کہ ان کی بہن آئی تھیں زبیدہ اور وہ کہہ گئی ہیں کہ اگر تم نے شادی کا جواب نہ دیا تو میں کالج کی تمام کتابیں اور شیشے توڑ جاؤں گی اور کتابوں کو آگ لگا دوں گی۔ واطف علی واصفؒ اس سے ڈرتے تھے۔ مجھے کہنے لگے کہ ظالم تو کوئی اچھی خبر نہ لانا۔ پہلے تو تو اپنے لئے کوئی رشتہ تلاش کر پھر میری بات کرنا۔ اب تمہارے پاس کوئی بھی رشتہ تمہارے اپنے لئے آئے تو انکار نہ کرنا۔ میرے لئے پریشان نہ ہوں۔

دو تین دن کے بعد میرے ہمسائے میں میری فیملی کے لوگ رہتے تھے۔ ان کی رشتہ داروں میں ان کی بیٹی کی شادی راولپنڈی میں ہوئی تھی ۔ان کی بیٹی کی ایک نند بی ایس سی، بی ایڈ اور سکول ٹیچر تھیں۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں۔ ان میں سے ایک کا رشتہ بھگوان پورہ سے کچھ لوگ آئے ہوئے تھے ان کے پاس۔ انہوں نے ان کا پتہ کرنا تھا لیکن جس خاتون کے گھر میں ٹھہرے ہوئے تھے، اس سے کہا کہ جاؤ اس بچے (عنایت اللہ) کو رشتہ دے دو۔

جب میرے ہونے والے سسر نے یہ تمام واقعات مجھے بتائے تو میں نے کہا مجھے اجازت دیں کہ میں استادِ گرامی سے پوچھوں اور آپ کو ان کے فیصلے سے آگاہ کروں۔ اگلے دن میں نے واصفؒ صاحب کو بتایا تو انہوں نے کہا کہ یہ ٹھیک رشتہ آیا ہے۔ بہنوں کو بھیجو۔ جا کر دیکھ لو۔ بہنوں نے بابا جی کی چھوٹی بیٹی کو پسند کیا۔ میں نے واصفؒ صاحب کو تمام حالات بتائے تو انہوں نے کہا کہ لڑکیوں کی یہ مارکیٹ نہیں لگی ہوئی ہے جو رشتہ آیا ہے وہی کریں گے۔ سسر نے پوچھا کتنے آدمی آؤ گے۔ میں نے کہا دو تین۔ انہوں نے دو تین سو کا انتظام کر دیا۔ دیسی مرغے تیار کروائے۔ جب میں، ملک

واطف علی واصفؒ اور شیخ وزیر علی وہاں پہنچے تو انہوں نے پوچھا کہ آپ کی بارات کدھر ہے۔ میں نے کہا ہم دو تین آدمی ہی بارات میں آئے ہیں۔ واصفؒ صاحب نے ان کو کہا کہ جتنے بھی غریب لوگ ہیں ان کو بلاؤ اور عنایت اللہ کی بارات کا حصہ بناؤ۔ سامان والے اٹیچی کیس کے ساتھ ہم واپس آ گئے اور اس طرح میری شادی ہو گئی۔ اس کے بعد واصف علی واصفؒ نے اپنے گھر والوں کو اپنی شادی کی اجازت دی۔ ایک سال کے بعد ان کی شادی کا سلسلہ پایہءِ تکمیل تک پہنچا اور ان کی بارات جوہر آباد گئی۔

میرے تینوں بیٹوں کے نام واصف علی واصفؒ اور شیخ وزیر علی نے رکھے ہیں اور ان کی پیدائش سے پہلے یہ مجھ سے مٹھائی منگواتے اور کہتے کہ اللہ تعالی آپ کو بیٹا دینے والا ہے۔ اس کا نام بدستور معظم علی، مکرم علی، مقدم علی رکھنا ہو گا۔

شادی کے بعد واصف علی واصفؒ کی ازدواجی زندگی ایک تکلیف دہ حال سے دوچار تھی۔ ضروریاتِ حیات نایاب تھیں۔ اختصاری زندگی سے بھی حالات دگرگوں تھے۔ ذرائع آمدن ختم ہو چکے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے تکلیف دہ وقت گذرتا گیا ویسے ویسے واصف علی واصفؒ صاحب کی عزت و حرمت بڑھتی گئی اور تنگی دوراں بھی اپنا کام دکھاتی رہی ۔ پھر جب نابھہ روڈ سے ہم فزیکل کالج قزافی سٹیڈیم پہنچے تو وہاں چوہدری بشیر صاحب پرنسپل تھے۔ کمرے کے ہال میں لوگوں کا اجتماع ہوتا رہا۔ وہاں یہ محفل ایک ہزار ایک دن جاری رہی جو کہ رات کے آٹھ بجے سے لے کر تقریبا دو بجے صبح تک جاری رہتی اور اس کے اخراجات زیادہ تر چاچا اللہ دتہ جو چمڑے کا کاروبار کرتے تھے پورے کرتے تھے۔ وہ اپنی خوشی سے مختلف نوعیت کے پھل اس اجتماع کے لئے لاتے رہتے تھے اور اسی کالج کے پروفیسر جناب سلطان علی نیازی اور عنایت اللہ مل کر چائے اور بسکٹ کا انتظام کرتے اور مہمانوں کو رات ایک بجے تک پیش کرتے رہتے تھے۔

اسی دوران میرے ایک کولیگ شفیع صاحب اور محترم اشفاق صاحب اور ممتاز مفتی صاحب اکٹھے تشریف لائے۔ انہوں نے نیازی صاحب کو پیر صاحب سمجھ کر اس کی شخصیت کی طرف رجوع کیا تو اس نے کہا کہ جناب واصفؒ صاحب وہ بیٹھے ہیں۔ نیازی صاحب کی شخصیت داڑھی، چہرہ اور ذکر و فکر کی وجہ سے فقیر خانے کے روحانی انداز سے ملتا تھا اور واصف علی واصفؒ کلین شیو تھے۔ انہوں نے فورا کہا کہ واصف صاحبؒ وہ بیٹھے ہیں۔ مفتی صاحب نے سوالات کئے اور واصفؒ صاحب نے جواب دیئے تو مفتی صاحب نے ہاتھ کھڑے کر لئے اور کہا کہ یہ خدائی طاقت ہے اور میں ان کو تسلیم کرتا ہوں۔ اشفاق احمد کہنے لگے کہ میں اکھاڑے میں اترا ہوں، ابھی ہاتھ میں ہاتھ ڈالیں گے اور دو چار دن زور آزمائی کریں گے، پھر کوئی فیصلہ کریں گے میں تمہاری طرح جلدی جلدی فیصلہ نہیں کر سکتا۔

مفتی صاحب واپس اسلام آباد چلے گئے اور اگلے روز شفیع صاحب اور اشفاق احمد دونوں تشریف لے آئے اور اشفاق احمد نے خاموشی کے ساتھ اپنا چھوٹا سا ٹیپ ریکارڈر کھول کر اپنے دائیں ہاتھ میں نیچے رکھ لیا۔ واصف علی واصفؒ کی گفت و شنید شروع ہو گئی۔ جب واصفؒ خاموش ہو گئے تو اشفاق صاحب نے وہ ٹیپ کھول دی تو ان کو وہ بیان دوبارہ سنایا گیا۔ بیان اتنا پرکشش تھا کہ واصف علی واصفؒ نے اجازت دے دی کہ گفتگو تمام کی تمام ریکارڈ ٹیپ کی جائے۔ اس طرح اشفاق احمد اور بانو قدسیہ بیشتر راتوں کی محفلوں میں شامل ہوئے اور گفتگو کو ریکارڈ کیا گیا۔ پھر یہ واقعہ جنگل کی آگ کی طرح پھیل گیا۔ تمام ملک کے ادیب، دانش وار، بیشتر افسران اور ہر طبقہ کے خیال کے لوگ ان محفلوں میں شامل ہونے شروع ہو گئے۔ پھر یہ محفلیں

لوگوں نے اپنے گھروں میں منعقد کروانا شروع کر دیں۔اشفاق احمد نے واصف صاحب کو ٹی وی پر اپنے خیالات کے اظہار کرنے کا موقع فراہم کیا۔ دو پروگرام شہنشاہ کی موجودگی میں واصف صاحبؒ کے ٹیپ کئے گئے جس میں بشیر صاحب پرنسپل فیزیکل کالج، سلطان علی نیازی، سلیم صاحب اور عنایت اللہ شامل تھے۔اس کے علاوہ دو تین طالب علم بھی تھے لیکن حکومت نے واصف صاحب کی اس گفتگو کے پروگرام کی ٹی وی پر کاسٹ کرنے کی اجازت نہ دی۔ واصف علی واصفؒ کی وفات کے بعد میں کئی بار اشفاق صاحب اور آپا بانو قدسیہ کے پاس حاضر ہوا۔ میرے ساتھ راولپنڈی سے فیضان غنی گاڑی چلا کر آتے اور ہم دونوں مل کر زاویہ پروگرام جاری کرنے کی استدعا کرتے لیکن آپا بانو اور اشفاق احمد کہتے کہ میں واصف علی واصفؒ کی باتیں شروع کروں گا تو منو بھائی مجھ پر تنقید کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے کہ یہ تمام باتیں واصف کی ہیں تم کون ہو۔ دعا کرتا ہوں کہ وہ آپ کے پروگرام میں مخل نہیں ہوں گے۔ فیضان غنی کی معاونت سے ہم نے ان کو راضی کیا اور یہ زاویہ پروگرام اشفاق صاحب جاری کرنے میں رضامند ہوئے۔ جب ایک سو دو پروگرام مکمل ہوئے تو اس سے قبل میں کئی بار ان کو کہہ چکا تھا کہ اس تمام گفتگو کے سلسلے مجھے دو تا کہ میں ان کو کتاب اور کمپیوٹر پر چڑھا سکوں لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ زاویہ کتاب کی شکل میں چھپ چکی ہے اور انٹرنیٹ پر بھی چڑھا دی گئی ہیں۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔

اعجاز الحق، اکرام چغتائی اور منو بھائی کی دوستی کی وجوہات کی بنا پر اشفاق صاحب کے خلاف زہر اگلنے کا طریقہ بروئے کار لایا گیا۔ اعجاز الحق جب پریس اور کشمیر بک سٹال کے مالک تھے۔ان دنوں یہ منو بھائی کو بیرونِ ممالک سیر کرواتے رہے اور ان کے تمام اخراجات برداشت کرتے اور ان کی شہرت سے استفادہ حاصل کرتے رہے۔ اسی طرح اشفاق دشمنی کے لئے اکرام چغتائی کو اپنے اثر و رسوخ کے تحت پروان چڑھاتے رہے۔ اکرام چغتائی اور اعجاز الحق کی زندگی کا وطیرہ بن چکا ہے کہ اشفاق احمد کی عظمت اور اس کے کردار و شخصیت کو مسخ کرنے کا رول ادا کرتے رہے۔ منو بھائی کو واصف صاحب کے جملوں پر اعتراض اعجاز الحق کی اختراع تھی جب کہ اشفاق احمد صاحب اس بات کے کئی سیمیناروں میں احاطہ کر چکے تھے کہ وہ واصفؒ صاحب کی صحبت سے حاصل کئے ہوئے علم اور الفاظ اور ان کے خیال کو اپنی ذات سے الگ نہیں کر سکتے لہذا یہ لوگ سچ بولتے ہیں کہ میرے کلام میں بیشتر الفاظ اور خیال واصفؒ صاحب کے پائے جاتے ہیں۔ علم کی گھتیاں سلجھانے کے لئے روئے زمین پر تمام اہلِ دانش ایک دوسرے سے استفادہ کرنے کا عمل جاری رکھتے ہیں۔

واصفؒ صاحب لاہور انگلش کالج میں تشریف لاتے۔ سلیم صاحب، چوہدری بشیر صاحب اور سلطان نیازی یہ سب لوگ وہاں حاضر ہوتے وہاں ختم شریف میں دو دیگیں چاول بمع آلو گوشت پکایا جاتا اور روٹی تندور سے لائی جاتی پھر تمام حاضرین کو یہ لنگر پیش کیا جاتا۔ ایک دن نائی کو پکڑنے کے لئے پولیس آئی لیکن نائی مکان کی پچھلی سمت سے چھلانگ لگا کر بھاگ گیا اور برتن اپنے وہاں چھوڑ گیا۔ جب تک واصف علی واصفؒ اس کالج میں رہے اور محفلیں جاری رہیں تو وہ نائی اس محفل میں نہ آیا۔ البتہ حمد باری تعالیٰ، نعت شریف اور ذکر کی محفلیں مسلسل ہوتی رہیں۔ مختلف شعرا بھی حاضر ہوتے یعنی مشاعرہ بھی ہوتا۔ مشاعرہ میں لاہور کے تمام مشہور شعرا کم و بیش اپنا کلام سناتے۔

جس دن وہاں سے نائی بھاگ گیا اس کے بعد ایک سے تین بجے تک اس کا انتظار کیا گیا۔ نائی گھر بھی نہیں گیا۔ واصف علی واصفؒ مجھے کہتے ہیں کہ لنگر تیار کرو۔ الو کے پٹھے (میرے بارے میں ان کا یہ تکیہ کلام تھا) تم کیوں نہیں کرتے ۔ اگر نائی نہیں ہے تو تم نائی بن جاؤ۔ اس کے بعد میں نے

یہ لنگر تیار کیا۔ پہلے دن یہ لنگر تیار کر کے لوگوں کو برتنوں میں پیش کیا تو اشفاق احمد دھائی دے اٹھے کہ یہ لنگر نائی نے بہت خوب پکایا ہے۔ آج کا کھانا بہت مزیدار ہے۔ یہ عمل تقریباً کم و بیش ایک سال تک جاری رہا کہ میں لنگر پکاتا رہا اور اس کے بعد کھانے کی فراہمی کی ذمہ داری میری ڈیوٹی بن گئی۔

یہ کہنا کہ واصف علی واصفؒ لاہور انگلش کالج میں نہیں آتے رہے بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ یہ پروگرام ہفتہ کی شام کو ہوتا تھا۔ اتوار کو چھٹی ہوا کرتی تھی اور یہ پروگرام محفل کا کم و بیش ایک سال تک ہوتا رہا۔ اس بارے میں ان کے بھائی شوکت کنڈان اور دوسرے احباب بھی اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ جب طویل عرصہ کے بعد اشفاق احمد کو پتہ چلا کہ نائی تو بھاگ گیا ہے اور اس کی جگہ عنایت اللہ نائی کا کام کرتے ہیں تو وہ حیران بھی ہوئے اور پریشان بھی کہ عنایت اللہ بھی عجیب چیز ہے۔

جو بھی تیرے فقیر ہوتے ہیں　　آدمی بے نظیر ہوتے ہیں
بدل کر فقیروں کا ہم بھیس غالب　　تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

اشفاق احمد نے "شب چراغ: کتاب کا افتتاح کیا تو اس میں صدارتی رول ادا کیا۔ واصفؒ صاحب کی ایک طالبہ نے "صحرا میں ترا نقشِ قدم ڈھونڈھ رہے ہیں" پڑھی تو تمام حال پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اشفاق احمد نے اس بچی کو بہت داد دی۔ محفل میں اشفاق آحمد کے آنے پر میڈیا کے کئی لوگ پہنچ گئے اور واصف کی پہچان بتدریج عروج کی منازل طے کرنی لگیں۔ اشفاق آحمد نے قدرت اللہ شہاب، ممتاز مفتی جیسی نامور شخصیات کو واصف علی واصفؒ صاحب سے متعارف کرایا اور ان کے تمام سرکل کے لوگ واصف علی واصفؒ کے پاس سر بہ زانو آکر بیٹھنا شروع ہو گئے۔ واصف علی واصفؒ صاحب کی بیشتر ملاقاتیں قدرت اللہ شہاب کے گھر میں جناب حنیف رامے اور اشفاق آحمد اور تمام افراد کے ساتھ ہوئیں۔ اس سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اشفاق آحمد ملک گیر شہرت کے حامل، ہمہ گیر اوصاف کے مالک پروڈیوسیر تھے۔ تلقین شاہ ان کا مقبول کردار رہا ہے جسے وہ خود چالیس سال تک جاری رکھتے رہے۔ گڈریا ان کا مشہور ترین افسانہ ہے جو ان کو زندہ رکھنے کے لئے ہی کافی تھا۔ ان کا جیون ساتھی آپا بانو قدسیہ ملک کی ایک ہمہ گیر ادبی شخصیت تھیں ان کی عظمت کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ وہ ملکی سطح پر ایک شفیق ماں کی طرح زندگی بسر کر کے چلی گئی ہیں۔ ملک سے اور بیرون ممالک سے بچیاں اور مستورات اپنے مسائل کے حل کے لئے ان کو ٹیلی فون کرتی تھیں اور وہ ان کو واصف علی واصفؒ کا کلام پڑھنے کی تلقین کرتی تھیں اور ساتھ کہتیں کہ اس کلام کو پڑھنے سے آپ کی مشکلات حل ہو جائیں گی۔ انہوں نے دنیا بھر میں واصفؒ صاحب کے کلام کو ہمہ گیر بنانے کے لئے اپنی زندگی کا وطیرہ بنائے رکھا۔

واصف علی واصفؒ نے باباجی عنایت اللہ کو کہا کہ وہ اشفاق احمد کو تلاش کریں اور دیکھو کہ کسی نہ کسی طریقہ سے اس سٹیج پر تقریب رونمائی کے لئے ان کو بلائیں یہ ان کی دلی خواہش تھی۔

ڈاکٹر رونق زمان ایک مرنجاں مرنج اور بذلہ سنج انسان تھے۔ واصف علی واصفؒ ان کی شگفتہ مزاجی، کشادہ روئی اور عطر دبیز طبیعت کے قائل تھے۔ ڈاکٹر رونق زمان واصف علی واصفؒ سے ان کی تحریروں کے ذریعے متاثر ہوئے اور عمر بھر یہ رشتہ و پیوند استوار رہا۔ ڈاکٹر رونق زمان سے ملنے کے لئے واصف علی واصفؒ ایک دفعہ ایبٹ آباد بھی گئے۔ اس سفر میں باباجی عنایت اللہ ان کے ساتھ تھے۔ واصف علی واصفؒ کے انتقال پر ملال

کے بعد پاکستان میں سلسلہ ءواصفیہ کے واحد نمائندے عنایت اللہ سے ان کے اب بھی مراسم استوار ہیں وہ کئی مرتبہ ان کے ہاں اسلام آباد میں آچکے ہیں۔

واصف علی واصفؒ صاحب کو جناب اللہ دتہ مرحوم نے بابا جی کالاخان کے متعلق ان کی زندگی کے حالات و واقعات بتائے۔ان کی قادرالکلامی کی داستان بھی بیان کی اور کہا کہ وہ جب ایک آدمی کے ساتھ گفتگو شروع کرتے ہیں تو سارے پنڈال میں ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ بابا جی میری داستان ہی سنا رہے ہیں اور باباجی میری غلطیوں ،کوتاہیوں اور باطنی دنیا کی برائیوں کو بیان کر رہے ہیں تو ہر آدمی اپنی شرمندگی کے خیال کی کشتی میں ڈوبتا رہتا۔واصف علی واصفؒ میرے اور اللہ دتہ صاحب کے کہنے پر جو لاہور میں چمڑے کا کاروبار کرتے تھے اور فقیروں کے مزارات پر ان کی زندگی کا سفر جاری رہتا تھا، نے واصفؒ صاحب کو قائل کردیا کہ بابا کالا خان کے پاس جائیں گے۔ تو یہ قافلہ بابا اللہ دتہ کی رہنمائی میں ڈاکٹر مختار صاحب بھاٹی گیٹ والے، جناب واصفؒ صاحب اور جناب عنایت اللہ کے ساتھ بابا جی کے مے خانے پر پہنچے توراستے میں ہی بارش کے ساتھ بڑی تیز او ر تند ہوائیں چلنا شروع ہو گئیں۔سردی کاموسم تھا۔جب بابا جی کے کچے راستے کی چڑھائی پر چڑھنے لگے تو گاڑی الٹ گئی۔ مشکل سے ہم سب لوگ باہر نکلے۔اندھیرا اور چمکتے بادل خوف و ہراس کا ایک خوفناک سماں پیدا کر رہے تھے ۔ڈاکٹر مختار صاحب مزاح میں کہنے لگے۔ واہ واصف! کتنے ظلم اور زیادتیاں آپ نے عنایت اللہ پر کی ہیں آج وہ آپ سے تمام انتقام لے رہا ہے۔ آپ کو وہ اس جنگل میں لے آیا ہے جہاں بھیڑیا یا کوئی اور جانور آپ کو کھا جائے یا مار جائے تو آپ کا اتا پتہ بھی کسی کو معلوم نہ ہو ۔آپ یہیں گل سڑ جاؤ۔ ہم نے گاڑی کو سیدھا کیا پھر اس میں داخل ہوئے تو بارش کی وجہ سے پھسلان اتنی زیادہ ہو گئی تھی کہ گاڑی اس گھاٹی پر نہ چڑھ سکتی تھی۔ڈرائیور کو کہا کہ وہ گاڑی چلائے ۔بڑی مشکل سے گھاٹی پار کی۔ بابا جی کے مے خانے تک بارش نے قیامت برسادی، جب بابا جی کو آواز دی تو وہ خطوں کے جواب لکھ رہے تھے۔انہوں نے آواز کو پہنچا نا اور کہا وہ دروازہ کھولتے ہیں۔انہوں نے دروازہ کھولا تو مٹی کے گھروندوں میں داخل ہوئے۔ کم و بیش سو فٹ کی بارہ تیرہ فٹ چوڑی سرنگ موجود تھی ۔اس میں مٹی کی الماریاں بنی ہوئی تھیں۔ نیچے خوب صورت چٹائیاں ، صاف ستھرے بستر اور سرہانے لگے ہوئے تھے ۔بابا جی اٹھے اور ورکروں کو جگایا ۔مہمانوں کے لئے بستر لگانے کا حکم دیا ۔

واصف !دیکھو یہ بستر لاہور میں بھی نہیں ملتے ۔بابا عنایت اللہ تمہیں جنات کے گھر میں لے آیا ہے ۔ڈاکٹر صاحب کو پیشاب کی حاجت ہوئی تو فقیر

خانے والے ان کو دوسری سرنگ میں لے کر گئے۔ وہاں باتھ تھا۔ پیشاب سے فارغ ہو کر واپس آئے تو کہنے لگے کہ واصف !لاہور میں بھی ایسا نظام نہیں ہے جو ادھر ہے۔ ابھی منہ ہاتھ دھوئے بھی نہ تھے کہ تازہ تازہ کھانا جنات لائے ہیں۔ اس وقت کون تازہ کھانا پکاسکتا ہے۔عجیب صورتِ حال تھی ۔بابا جی خلوت کدہ میں چلے گئے اور خطوں کا جواب لکھنے لگے اور دروازہ

بند کر دیا۔تذکرہ ہوتا رہا کہ یہ جنات کا گھر ہے۔ پہلے واصف مجھے کاں کے نام سے پکارتے تھے اس دن کے بعد انہوں نے میرا نام ہد ہد رکھ دیا۔

با با جی سے گفت و شنید ہو ئی اور پھر سو گئے ۔صبح اٹھے تو بابا جی کی حاضری کے لئے تشریف لے گئے۔ گردو پیش کے علاقوں کو بھی دیکھا ،قرب وجوار میں جنگل ہی جنگل تھے البتہ گھر کوئی نہیں تھا ۔مجھے یہ بتا کر خوشی ہوئی کہ راجہ محمد اکرم صاحب بھی اس مے خانے سے تقریباایک سال تک لنگر کھاتے اور کھدائی کے سامان سے سرنگوں کو کھودتے رہے۔جب بابا جی کو میں نے کہا دیکھو کس قدر ظلم ہے کہ راجہ اکرم صاحب جیسے نفیس آدمی سے یہ کھدائی کا کام لیا گیا ہے ۔نرم و نازک ہاتھوں سے یہ کھدائی کا کام کس قدر مشکل ہوگا۔فرمائے لگے، مجھ سے بات نہ کر، نہ کر راجہ اکرم سے پوچھ کہ سودا اسے قبول ہے کہ نہیں ۔میں خاموش ہو گیا۔یہ منظر اور یہاں کا ماحول فطرت کی عکاسی کرتا تھا۔ان کا گیرج ہاؤس والا کمرہ دیکھ کر جہاں دس گاڑیاں کھڑی ہو سکتی تھیں ۔ڈاکٹر مختاراور واصف علی واصفؒ صاحب پریشان ہو گئے ۔جب کھانا پیش ہوا تو وہ کم و بیش بارہ کھانوں پر مشتمل تھا ۔حیرت زدہ ہو گئے کہ اس جنگل میں کس وقت کیسا کھانا تیار ہوا ۔کھانے سے بھاپ نکل رہی تھی۔۔ بابا جی کے جانور، کھیت کھلیان، لاتعداد پھولوں کی کیاریاں ایک خوبصورت رنگ پیش کر رہی تھیں ۔بارہ دری کی شکل مٹی کے تودوں کے درمیان سے کئی سو فٹ نیچے کی طرف جا رہی تھی۔وہ اپنی زمین سے ہر قسم کی پیداوار مثلاسبزیاں اور پھل حاصل کرتے تھے اور جانور بھی پرورش پاتے تھے اور جب کبھی ضرورت پڑتی تو بڑے سے بڑے جانور ذبح کرتے اور گردو پیش کے لوگوں کو پیش کر دیتے ۔بابا جیؒ روح کی تاروں کا ساز چھیڑتے تو دلوں کا مضراب اپنی گفتگو کے دائرہ کار سے باہر نکل کر روحانیت اور تصّوف کی دنیا میں کھو جاتے۔واپسی پر علامہ یوسف جبریل سے ملاقات ہوئی اور ان کو تمام ماجرا سنایا۔ان کو سفر نامہ بتایا گیا اور باباجیؒ کے بارے میں واقعات بتائے گئے۔

واصف علی واصفؒ کے پاس بے شمار مجذوب آتے تھے ۔ لاہور کے مجذوب ایک سے تین بجے تک ان کے ساتھ ہوتے تھے یا داتا صاحب کے ہاں جاتے تو وہاں مجذوب ان کے پاس اکٹھے ہو جاتے۔وہ باقاعدگی سے آتے تھے البتہ واصف علی واصفؒ ان مجذوبوں کی بہت خاطر خدمت کرتے تھے۔ (بحوالہ گفتگو عنایت اللہ باباجی)

فصل 13۔واصف علی واصفؒ ایک صاحبِ حال، تحریر سید زین العابدین علوی:

دنیا والوں کے لئے موت بھی بڑی بے رحم شے ہے لیکن صاحبِ حال لوگوں نے اس موت کو رحمت کہا ہے کیونکہ وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ اللہ اور بندے کے درمیان صرف زندگی حائل ہے۔اگر زندگی کو زندگی دینے والے کے حوالے کر دیا جائے تو بندہ حق سے مل جاتا ہے اور یوں موت وسیلہ ہے بندے کو حق سے ملانے کا۔لہذا صاحبِ حال مرنے سے پہلے ہی مر جاتا ہے۔

موت کیا آ کے تجھے فقیروں سے لینا ہے

یہ لوگ تو مرنے سے پہلے ہی مر جاتے ہیں

ایسے ہی ایک صاحبِ حال واصف علی واصفؒ تھے جنہوں نے زندگی کو اللہ کے سپرد کر کے موت کو خوش آمدید کہا۔ جناب شوکت محمود کنڈان ان کی صحت مند خوبصورت زندگی، بیماری اور بیماری کے بعد آخری لمحوں تک ان کے ساتھ رہے۔ ان کا حوصلہ اور ہوشمندی دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ اسی صاحبِ حال کو موت کا دن سال اور وقت معلوم تھا جس کا اظہار انہوں نے اپنی ایک محفل میں کیا جو ریکارڈ شدہ محفوظ ہے جس کی طرف کسی عقیدت مند کا دھیان نہیں گیا اور پھر یوں ہی ہوا۔ عین اسی دن یعنی 18 جنوری 1993ء کو وہ ہم چاہنے والوں کو روتا ہوا چھوڑ کر حق سے جا ملے۔ اس صاحبِ حال کی زندگی بھی عجیب زندگی تھی۔ ان کی زندگی اپنی زندگی نہ تھی بلکہ وہ اللہ کے بندوں کے لئے وقف تھی۔ وہ اکثر فرماتے تھے کہ اپنا موقف چھوڑ دو لیکن خدا کے بندوں کو نہ چھوڑو۔ صاحبِ حال راتوں کو جاگتے ہیں۔ وہ رات کی تنہائیوں میں اللہ سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ ان کی رات عبادت اور حق سے ہم کلامی کی رازدان ہوتی ہے۔ ان کی آنکھوں میں رات کا رت جگا دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کی آنکھوں میں ایک عجیب سی مستی ہوتی ہے جو کیف و سرور کی مستی ہوتی ہے۔ بقولِ واصف علی واصفؒ

رات کیسے بسر ہوئی واصفؔ
دن کو ہے کیوں خمار آنکھوں میں

واصف علی واصفؒ جو خانوادۂ اعوان سے تعلق رکھتے تھے، ایک صاحبِ حال درویش منش، مردِ حق، صوفی، دانشور ادیب اور شاعر تھے جو لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کرتے تھے۔ انکے جانے کے بعد یہ خلا ان کی کتابیں ان کی گفتگو اور ان کے اقوال اور انکی باتوں سے بھرا جا سکتا ہے جو وہ ہم سب کو دے گئے ہیں۔ صاحبِ حال اپنے حال میں مست در مست ہو کر دوسروں کا حال سنوار جاتا ہے۔ واصف علی واصفؒ ایک ایسے صاحبِ حال تھے جو انسانوں میں رہتے تھے لیکن ان کا اندازِ فکر جدا تھا۔ وہ معمولی واقعہ کو معمولی نہ سمجھتے تھے بلکہ اس کو غیر معمولی اہمیت دیتے تھے ۔ درخت سے اگر پتا گرتا تو وہ پکار اٹھتے تھے۔

پتا ٹوٹا ڈال سے لے گئی پون اڑا
اب کے بچھڑے کب ملیں گے دور پڑیں گے جا

اس صاحبِ حال کو سمجھنا عام آدمی کے بس کی بات نہیں۔ صاحبِ حال بغیر حال کے سمجھ نہیں آتا۔ اس بات کو قبلہ واصف علی واصفؒ نے اپنے ایک مضمون ''صاحبِ حال'' میں یوں بیان کیا ہے:۔

''صاحب حال اپنے وجود میں اپنے علاوہ بھی موجود رہتا ہے۔ معلوم اور نامعلوم کے سنگم پر صاحبِ حال گنگناتا ہے۔ آپ ایک ایسے انسان کا اندازہ کریں جس کے ایک ہاتھ پر آگ اور دوسرے ہاتھ پر برف ہو۔ وہ نہ آگ بجھنے دیتا ہے اور نہ برف کا انجماد ٹوٹنے دیتا ہے۔ وہ ایک ایسی جلوہ گاہ میں محو کھڑا ہوتا ہے جہاں آنکھ کی راہ میں بینائی حائل نہیں ہوتی۔ اس کی پیشانی زمین پر ہو تو اس کی سجدہ گاہ آسمان پر ہوتی ہے۔ وہ کسی کو نزدیک سے پکارتا ہے تو جواب دینے والا دور سے آواز دیتا ہے۔ اس کا دل آنکھ ہوتا ہے اور آنکھ دل میں ہوتی ہے۔ صاحبِ حال نمی دانم کے پردے میں دانائی کے چراغ

جلاتا ہے۔اس کی خاموشی جمالِ گفتگو کے جلوے ہوتے ہیں۔اس کے قرب میں انسان اپنے آپ سے دور ہوتا ہے۔اس کی محفل میں گردشِ زمان و مکان ہی رک جاتی ہے"۔

ایسے ہی صاحبِ حال واصف علی واصفؒ محفلیں سجانے والا اور گردشِ زمان و مکان کو روکنے والا ہم سب کو نم آلود آنکھوں کا تحفہ دے کر کسی اور دیس کی جانب ازلی وابدی محفل ہی میں جا بیٹھا جہاں کا صاحبِ حال سب کے حال سے واقف ہے۔جہاں کبھی کوئی تشنہ لب نہیں رہتا، جہاں سے کبھی کوئی خالی نہیں لوٹا، جہاں سب کی گفتگو خاموشی کی زبان میں سنی جاتی ہے، جہاں سب بول رہے ہوتے ہیں اور آواز کسی کی نہیں سنائی دیتی، جہاں سب کی آنکھیں نم آلود ہوتی ہیں لیکن آنسو نہیں آتے، جہاں سب کی خواہشیں پوری ہوتی ہیں لیکن خواہش کوئی نہیں ہوتی۔اس محفل میں سب ہی صاحبِ حال کہ صاحبِ حال کو صاحبِ حال سے مانگتے ہیں۔واصف علی واصفؒ ایک ایسے ہی صاحبِ حال ہم سب سے اپنا حال چھپا کر اس ازلی و ابدی محفل میں جا بیٹھے۔اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کی محفلوں کے لوگ اور عقیدت مندوں کو اس صاحبِ حال سے متعارف ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔میں اس صاحبِ حال کا حال ان کی اس دعا کے ساتھ ختم کرتا ہوں۔

الٰہی واسطہ رحمت کا تجھ کو الٰہی واسطہ وسعت کا تجھ کو
الٰہی واسطہ عظمت کا تجھ کو الٰہی واسطہ قوت کا تجھ کو
مسلمانوں کو عطا کر زورِ حیدر صفِ دشمن کو تو زیر و زبر کر
خدایا اپنی رحمت عام کر دے بہت بگڑا ہوا ہے کام کر دے
کرم کی اک نظر ہو جانِ عالم سوالی ہیں ترے با چشمِ پُرنم
تجھے ہے واسطہ تیری طلب کا بنا دے اپنا ذاکر قلب سب کا
الٰہی بخش دے سب کی خطا کو قبولیت ملے میری دعا کو

فصل14۔واصف علی واصفؒ روحِ عصر کے نمائندہ ہیں، تحریر ڈاکٹر رشید نثار:

ہمارے عہد میں روحِ عصر کے نمائندہ واصف علی واصفؒ تھے۔اُن کی دانش کے روشن چراغ بابا جی عنایت اللہ ہیں جن کے پاس علم، دانش اور VISION تینوں موجود ہیں۔راقم التحریر جناب واصف علی واصفؒ کو اس عہد کا کشادہ ظرف انسان اور فلسفہ دان تسلیم کرتا ہے۔اس کی فکر کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے لئے ہم سب کو کسبِ فیض کرنا چاہیئے تھا مگر واصف علی واصفؒ اپنے پیش رو آپ تھے۔انہوں نے اپنے ہم عصروں میں نمایاں عزت حاصل کی۔ان کے بعد بابا جی عنایت اللہ دبستانِ واصفؒ کی نمائندگی کرتے ہوئے، نوعیت کے اعتبار سے، ذاتی سطح پر ایک عظیم کارنامہ انجام دے رہے ہیں۔ان کی کتب کی اشاعت اور اسبابِ زوالِ اُمت کے حوالے سے دردمندی کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔

جناب بابا عنایت اللہ نے ماضی کا تجزیہ جس انداز سے کیا ہے اس کی روشنی میں ہم اپنے حال اور مستقبل کو آسانی سے دیکھ سکتے ہیں۔ان کی کتب کی ورق گردانی کرتے ہوئے ہم ایک ایسے شخص سے شرفِ ملاقات حاصل کرتے ہیں کہ جن کے پاس ازمنہِ وسطیٰ کی عظیم تاریخ اور اپنے عصر کا زندہ شعور

موجود ہے۔ان کی کتب دبلی پتلی اور باباجی عنایت اللہ کے قدبت کے برابر ہیں مگران میں حکمت و فلسفہ، حیرت انگیز بصیرت اور ژرف بینی اس امر کی شہادت پیش کرتی ہے کہ وہ اس عہد کا ''غزالی'' ہے۔

باباجی عنایت اللہ ماہرِ عمرانیات ہی نہیں، علم اور حکمت کے تمام متداول شعبوں سے واقف اور صحت مند ذہن کے ساتھ سوچنے کے عمل سے آشنا ہیں۔ وہ یگانہءِ روزگار شخص ہونے کی وجہ سے توفیقِ خداوندی کے زیادہ قریب ہیں۔ چنانچہ انہوں نے نام نہاد جمہوریت کو مسترد کر دیا ہے اور دوسرے مذاہب سے پُرامن تصفیہ حاصل کرنے کیلئے جُرأتِ افکار کی دعوت دی ہے۔

راقم التحریر ان کے حقیقت پسندانہ تجزیئے، کسان مزدور تحریک کا ہمنوا ہے۔ علیٰ ہذالقیاس فکر و عمل کی روشنی میں باباجی عنایت اللہ ابنِ خلدون اور علامہ مشرقیؒ کے بہت قریب دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے سرکاری بالادستی کی جمہوریت کے برعکس انسان کو الہامی نظریات کی نوید سنائی ہے۔

پاکستان جب سے معرضِ وجود میں آیا ہے۔اس عہد سے لے کر آج تک علوم و فنون کو زوال آرہا ہے۔ متمدّن اور مہذب معاشرہ تشکیل نہیں پارہا۔ ظلم و تعدی کو کوئی روکنے والا نہیں۔ مال بنانے کی فیکٹریاں وجود پارہی ہیں۔ خدا خوفی ناپید ہے۔ کاملانِ فن کو رزق دستیاب نہیں۔ چاپلوس اور چرب زبان بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں۔ ایٹم بم فوبیا ہمارے ذہن میں شامل ہو گیا ہے۔ ہم نے ایٹم بم بنا کر طمانیت حاصل نہیں کی لہٰذا خوف کی لرزش اور insecurity کو ہماری گفتگو اور تحریروں کے گہرے سکوت میں عکس کیا جاسکتا ہے۔

پاکستان کے روز و شب سے یہ امر عیاں ہے کہ اس ملک کو امریکہ کے ہاتھوں رہن رکھ دیا گیا ہے لہٰذا ترقی کا پہیّہ جام ہو گیا ہے۔ باباجی عنایت اللہ نے کامل دل سوزی کے ساتھ فلسفیانہ جائزہ لے کر تاریخی حرکت کی نشاندہی کی ہے۔ انہوں نے کائنات کے آغاز اور انجام کو تاریخ کے نظریئے کے ساتھ منطبق کر کے دیکھا ہے۔ چنانچہ ان کے شعور میں اجتماعی زندگی میں شجاعت، تفکر، اور انسانی دائرے کا نیا سفر بدرجہ اُتم موجود ہے۔

موجودہ وقت اور تمام عالم، امریکی سامراجی بربریت کی زد پر ہے۔ زمانہ اور تاریخ دونوں اس کے پنجہءِ استبداد میں ہیں۔ میرے نزدیک یہ تاریخ کا جبری عمل ہے۔ امریکا کو شاید کبھی زوال نہیں آئے گا کیونکہ پوری دنیا اپنے نقطہءِ عروج پر پہنچ کر زوال پر آمادہ ہے۔ پاکستان خصوصی طور پر عہدِ طفلی میں بوڑھا ہو گیا ہے۔ یہ ملک اپنی جوانی امریکا کی باجگزاری میں گزارتا رہا ہے۔ اس کے پاس تہذیب اور تمدن کوئی نہیں لہٰذا بے کراں روحانی افلاس وجود پا گیا ہے۔ باباجی عنایت اللہ اس کا علاج بھی روحانیت ہی میں تلاش کرتے ہیں۔ ان کے اپنے قول و فکر میں واصف علی واصفؒ کی روحانیت، انکا اپنا کشت اور اولی العزمی موجود ہے۔

باباجی عنایت اللہ فقر کی دولت سے مالا مال ہیں۔ انہوں نے ''سرد فکریت'' کی بجائے جدید نقطہءِ نظر کو اپنے تفکر میں روا رکھ کر ''ناد وقت'' سنائی ہے۔ ہم اسے طرزِ تاریخ نگاری کے مشابہہ قرار دے سکتے ہیں۔ یاد رہے ان کی تاریخ نگاری وسیع المشربی اور بے کراں نقطہءِ نگاہ کو پیدا کرتی ہے۔

فصل 15۔ ''چراغِ راہ''، تحریر: ڈاکٹر محمد عارف:

واصف علی واصفؒ نے ایک دفعہ کہا تھا کہ ''ہم زندگی بھر زندہ رہنے کے فارمولے سیکھتے رہتے ہیں اور زندگی جب اندر سے ختم ہو جاتی ہے تو ہم بے بس ہو جاتے ہیں کیونکہ ہم نے موت کا فارمولا سیکھا ہی نہیں ہوتا۔ اسلام نے بامقصد زندگی کے ساتھ بامقصد موت کا فارمولا بتایا ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں انہیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں۔ موت کا یہ فارمولا ہم بھول گئے کہ ہم مرتے نہیں ہیں، ہم صرف مارے جاتے ہیں، سسکتی اور کراہتی ہوئی موت عذاب ہے، ہم نے تڑپنے، پھڑکنے کی توفیق مانگنا چھوڑ دی ہے، ہم میں دلِ مرتضیٰ نہیں، سوزِ صدیق نہیں، زندگی اگر مقصد کے لئے گزری تو موت قبولیت کی سند بن کے آئے گی اور حیاتِ جاوداں کہلائے گی۔ کثرتِ مقاصد نے ہمارے لئے قلتِ سکون پیدا کر دیا ہے، ہم بہت سی زندگیاں گزارتے ہیں، اس لئے بہت سی اموات سے گزرتے ہیں۔ اگر وحدتِ مقصد مل جائے تو کثرت سے بچا جا سکتا ہے۔ جن لوگوں نے زندگی سے کچھ حاصل کیا یا زندگی کو کچھ عطا کیا، وہ لوگ وحدتِ مقصد والے لوگ تھے، نہ وہ خوفزدہ کئے جا سکتے تھے اور نہ خریدے جا سکتے تھے اور نتیجہ یہ کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہیں۔ لوگ زندگی میں مر جاتے ہیں اور وہ لوگ موت میں بھی زندہ ہیں۔ کیا ہم غور نہیں کر سکتے''۔

خواجہ محمد ایوب کریمی آیک وسیع المطالعہ اور صائب الرائے انسان ہیں جنہوں نے عمر بھر اپنے مطالعہ میں آنے والے منتخب اخباری کالم، مضامین اور شاعری ''روشن چراغ'' کے نام سے مرتب کی جس کا مرکزی موضوع یہی ہے کہ بنی نوعِ انسان کو ایک نصب العین کے تحت زندگی بسر کرنی چاہیئے اور وہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے حبیب حضرت محمد الرسول اللہ ﷺ کی خوشنودی ہو تاکہ دنیا و آخرت کی کامیابیاں حاصل کی جا سکیں۔ اس کارِ جہاں میں پروردگار اپنے ہر بندے کو کسی نہ کسی ہنر سے نواز کر بھیجتا ہے تاکہ وہ اس کے ذریعے نہ صرف اپنی ذات کا اظہار کر سکے بلکہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمت کا شکر بھی ادا کر سکے کہ یہی اس کا مصرف ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ کچھ لوگ ساری عمر اس جوہر سے بے خبری میں گزار دیتے ہیں کہ ان کے پاس کتنی بڑی دولت ہے۔ بہر حال یہ انسان کا مقدر ہے کہ وہ کیا پاتا ہے؟

خواجہ محمد عرفان ایوب کریمی کو اللہ تعالیٰ نے کتاب اور قلم سے گہرا قلبی و جذباتی رشتہ تفویض فرما کر ان پر احسانِ عظیم کیا ہے۔ وہ نہ صرف روزانہ کے اخبارات کا عمیق نظری سے مطالعہ کرتے ہیں بلکہ ہر اچھی کتاب کو بھی ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں۔ انہوں نے مختلف بزرگانِ دین اور اولیائے اللہ کے فرمودات بھی اکٹھے کئے ہوئے ہیں جو کہ لائقِ تحسین اور صحت مند علمی مشغلہ ہے۔ ان کی اس مثبت اور صحت مند علمی سرگرمی کو دیکھ کر حضور اکرم ﷺ کی یہ حدیثِ مبارکہ یاد آ جاتی ہے کہ ''علم مومن کی گم شدہ میراث ہے جہاں سے ملے حاصل کر لو''۔ وہ یقیناً اسی حدیث کے مصداق اپنا فریضہ ادا کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔

خواجہ محمد عرفان ایوب کریمی ''چراغِ راہ'' کے حرفِ اوّل میں رقمطراز ہیں کہ ''عرصہ ءِ دراز سے میری یہ خواہش تھی کہ میں وہ کالم اور نادر تحریریں جو اپنی زندگی بھر پڑھ کر جمع کرتا رہا ہوں ان کو کتابی شکل میں ترتیب دے کر قارئین کی دلچسپی اور مطالعہ کے لئے پیش کروں۔ میں نے وہ کالم جمع کئے جو فلاحِ معاشرہ اور ادب کے بارے میں مختلف کالم نویسوں اور دانش وروں نے لکھے ہیں یا وہ کالم جو بعض روحانی اور بزرگ ہستیوں کے بارے میں تحریر کئے گئے ہیں''۔

''روشن چراغ'' میں شامل تحریریں انتہائی محنت، محبت اور خوش سلیقی سے اکٹھی کی گئی ہیں جن کا مقصد قارئین کی ذہنی اور فکری راہنمائی کر کے انہیں ایک بامقصد زندگی گزرنے کے قابل بنانا ہے۔ یوں تو عطاء الحق قاسمی نے ''روزنِ دیوار'' کے نام سے اپنے کالموں کا مجموعہ ترتیب دے دیا ہے۔ جاوید چوہدری نے ''زیرو پوائنٹ'' کالم کو زیورِ اشاعت سے آراستہ و پیراستہ کر دیا ہے، اشفاق احمد نے پی ٹی وی پر متصّوفانہ اور اصلاحی موضوعات پر جو لیکچر دیئے ہیں، ''زاویہ'' کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ واصف علی واصفؒ کی ایک ہزار نائٹس پر مشتمل گفتگو بھی کتابی صورت میں مل جاتی ہے لیکن اس مختصر سی کتاب ''روشن چراغ'' میں متنوع الجہات اور ہمہ گیر مضامین و موضوعات پر وہ رشحاتِ قلم اکٹھے کئے گئے ہیں جو ہر ذوق اور ذہنی سطح کے قاری کے لئے راہنمائی کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ انتساب اللہ رب العزت کے برگزیدہ بندوں کے نام ہے، جن کی محنتوں، ریاضتوں اور قربانیوں کے طفیل آج ہم ایک آزاد اور خود مختار وطن میں اپنے ربِ کریم کی رحمتوں سے بہرہ مند ہیں۔ خواجہ محمد عرفان ایوب کریمیؔ نے ''روشن چراغ'' میں ''آستانہ عالیہ عیدگاہ شریف'' اور ''طبقاتی کشمکش'' کے عنوان سے اپنے دو مضامین شامل کئے ہیں جو لائقِ توجّہ ہیں۔ ان مضامین سے پتہ چلتا ہے کہ وہ خود بھی ایک اچھے مضمون نگار ہیں مگر باضابطہ طور پر اس صنفِ سخن سے ابھی تک وابستہ نہیں ہوئے۔ ان کے محولہ بالا مضامین سے ان کی روحانیت اور عصری مسائل سے دلچسپی واضح ہوتی ہے۔ ان سے التماس ہے کہ وہ ان موضوعات پر قلم اٹھائیں تاکہ ان کے وسیع مطالعہ سے قارئین کو فیض یاب ہونے کا موقع مل سکے۔

واصف علی واصفؒ نے بالکل درست کہا ہے کہ ہر انسان گوہرِ نایاب ہے، ہر انسان کے پاس شرف ہے، سب کی گٹھڑی میں لعل ہے، سب کے آنگن میں چاند نکلتا ہے، سب کے سر پر سایۂ افلاک ہے، سب کے پاؤں کے نیچے وہی زمین ہے، دولتِ احساس ہر ایک کے لئے ہے، سرمایۂ خیال ہر ذہن کے لئے ہے، ہر نظر کو نظاروں سے لطف اندوز ہونے کا یکساں حق ہے، جو بیان نہیں کرتا وہ بھی صاحبِ بیان ہے، جو دیوان چھپ نہیں سکتا وہ بھی دیوان ہے۔ مکمل دیوان مرصع اعلیٰ مگر جس انسان کے دل میں روشنی نہ ہو وہ چراغوں کے میلے سے کیا حاصل کرے گا''۔

خواجہ محمد عرفان ایوب کریمیؔ مدینے کی تجلّی سے لو لگائے ہوئے ہیں اور ان کا دل بقعۂ نور بن چکا ہے، وہ انہی چراغوں کی لوؤں سے کسبِ نور کر کے ہر طرف ضیا پاشیاں کرتے جا رہے ہیں۔ یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ محمد حنیف رامے کے مضمون ''حضرت فضل شاہؒ اور تفسیرِ فاضلی'' مطبوعہ روزنامہ جنگ مورخہ 14 ستمبر 1990ء میں خصوصاً ارشادِ عالیہ حضرت فضل شاہ قطبِ عالم قابل ذکر ہیں جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:۔

''مخلصین کا وجود واحد ہے، چونکہ ان کا مقصود واحد ہے، اور ان کا مقصود یہ ہے کہ لوگوں کو ظلمات سے نور کی طرف لانا''۔

''حق حال پر عائد ہوتا ہے اور حال پر ہی ادا کیا جاتا ہے۔ ماضی کی یاد یا مستقبل کی فکر دامن گیر رہے گی تو حق کی ادائیگی میں کوتاہی ضرور ہو گی''۔

''ولی اللہ وہ ہے جو اللہ کی مخلوق کے ساتھ اللہ کی رضا کے لئے معاملہ کرے اور ہو عادت سے پاک''۔

''جو وقت مخلصین کی معیت میں گزارا جائے وہ سرمایۂ حیات بن جاتا ہے''۔

''جسے احسان کرنے کا شرف ہو اس کو استفادہ کرنے والے کا شکریہ بھی ادا کرنا چاہیے کہ مستفید ہونے والے کی بدولت ہی محسن کو فانی شے کے بدلے دائمی انعام ملتا ہے''۔

''شریعت بمنزلہ دودھ، طریقت بمنزلہ مکھن، اور معرفت بمنزلہ گھی ہے۔ اگر دودھ ہی نہ ہو تو کچھ بن سکتا ہے اور نہ کوئی بنا سکتا ہے''۔

''تضاد میں مبتلا رہنے والے کے لئے لطافت کا دیکھنا ممکن نہیں رہتا''۔

''چراغ راہ'' میں شامل بابا یحییٰ خان کا ایک انٹرویو اہمیت کا حامل ہے جسے رؤف ظفر نے مرتب کیا۔ صوفی، ادیب، درویش، اداکار، ڈائریکٹر، سیاح اور بے حد مخیر انسان باباجی محمد یحییٰ خان صرف اس حوالے سے معروف نہیں ہیں کہ بانو قدسیہ، اشفاق احمد نے انہیں ملک کا سب سے بڑا رائٹر قرار دیا ہے بلکہ ان کا روحانی سلسلہ دنیا بھر میں پھیلا ہوا ہے۔ باباجی محمد یحییٰ خان کی کتب میں ''کاجل کوٹھا''۔ ''پیار نگ کالا'' نہایت اہم ہیں۔ وہ بلاشک وشبہ اس عہد کے سب سے زیادہ پڑھے اور پسند کئے جانے والے ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی کتب بنی نوعِ انسان کی اخلاقی راہنمائی، روحانی تربیت اور تزکیہ باطن کے علاوہ اسرار و رموزِ حیات سے بھی پردہ اٹھاتی ہیں۔ وہ علامہ اقبالؒ کی دعا سے پیدا ہوئے اور انہوں نے عمر بھر مخلوقِ خدا کی بے لوث خدمت کی ہے۔

الحاج بشیر حسین ناظم شاعرِ ہفت زبان کے طور پر جانے پہچانے جاتے ہیں۔ انہوں نے غالب کی زمینوں میں نعتیں کہی ہیں۔ الحاج بشیر حسین ناظم کا ایک مضمون ''حضرت باباجی سرکارؒ الحاج رحمت اللہ علیہ الرحمتہ والغفران دھنکہ شریف'' بھی کتاب میں شامل ہے جس سے اس کتاب کی اہمیت دوچند ہو گئی ہے کیونکہ باباجی دھنکہ سرکارؒ عوام و خواص دونوں میں بے پناہ مقبول ہیں۔ خود صاحبِ مضمون الحاج بشیر حسین ناظم کے تبحرِ علمی، وسعتِ مطالعہ، فنِ عروض، تفحصِ الفاظ پر گرفت کا ایک زمانہ قائل ہے۔ ان کی شخصیت و فن پر بھی پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کیا جا سکتا ہے۔

رؤف ظفر کا ایک اور انٹرویو ''اشفاق احمد کے بابے'' کے عنوان سے شامل ہے جو معروف ادیب اور دانش ور اشفاق احمد کے روحانی سفر کے بارے میں بانو قدسیہ سے خصوصی گفتگو پر مشتمل ہے۔ معروف ادیب اور دانش ور اشفاق احمد کے حوالے سے ایک کتاب ''باباصاحبا'' منظرِ عام پر آئی کہ اس میں اشفاق احمد نے ان بابوں کا ذکر کیا ہے جن کی انہیں زندگی بھر تلاش رہی۔ معروف افسانہ نگار، شاعر اور نقاد محمد حمید شاہد ایک زمانے میں اشفاق احمد شخصیت و فن پر کام کر رہے تھے معلوم نہیں کہ یہ کتاب چھپی ہے یا کہ نہیں۔ واصف علی واصفؒ کو بھی اشفاق احمد نے متعارف کروایا۔ وہ ایک ایسی عظیم الشان شخصیت تھے کہ جنہیں شہرت و نام و نمود کے بھوکے بعض ادباء نے تنقید کا نشانہ بنایا ہے حالانکہ وہ یہ بات بھول گئے ہیں کہ اشفاق احمد جیسے لوگ بلاشک وشبہ صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ انہیں صرف اُردو ادب میں زندہ رہنے کے لئے ان کا افسانہ ''گڈریا'' ہی کافی ہے۔ بعض بالشیئے ایسے بھی ہیں کہ جنہیں ادب میں آئے ہوئے شاید جمعہ جمعہ آٹھ دن بھی نہ ہوئے ہوں کہ وہ تلواریں سونت کر ان عظیم الجہات شخصیات کے درپے آزار ہو گئے ہیں جن میں اشفاق احمد، علامہ محمد یوسف جبریل، چوہدری عنایت اللہ، پروفیسر شوکت محمود کنڈان جیسے لوگ شامل ہیں۔

ڈاکٹر محمد اجمل نیازی وطنِ عزیز کے مایہء ناز شاعر، صوفی دانش ور اور ملک گیر شہرت کے حامل کالم نگار ہیں۔ پاکستان، روحانیت اور عصری مسائل سے دلچسپی ان کی شناخت بن چکی ہے۔ ان کا کالم دنیا بھر کے اُردو دان طبقے میں ذوق وشوق سے پڑھا جاتا ہے۔ وہ اپنے منفرد اسلوب کی وجہ سے لاکھوں میں پہچانے جاتے ہیں۔ ان کا ایک کالم ''داتا صاحب کی حکومت'' انتہائی دلچسپ ہے۔ حضرت داتا گنج بخش علی ہجویریؒ کی شہرت عام اور فیض سینہ بہ سینہ صدیوں سے منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ حامد میر کا مضمون ''مدینے کے بابے'' مطبوعہ روزنامہ نوائے وقت یکم مارچ ۲۰۰۸ء بھی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ مضمون پڑھتے ہوئے ممتاز مفتی کا ''لبیک'' اور قدرت اللہ شہاب کا ''شہاب نامہ'' یاد آجاتا ہے۔ ڈاکٹر تصدق حسین کی علمی تصنیف ''متاعِ فقیر'' بھی اسی تسلسل میں لکھی گئی ایک کتاب ہے۔ ''مدینے کے بابے'' مستقبل کے خدشات اور اعمال کی اصلاح کی طرف دعوت ہے۔ ڈاکٹر مطلوب حسین نے ''سو فی صد نتائج کا حامل ایک تجزیہ'' میں آج کے مضطرب انسان کی بے سکونی کا انتہائی سائنٹفک علاج بتایا ہے کہ خدمتِ خلق کو شعار بنالیا جائے۔ وہ لکھتے ہیں:۔ '' صرف ایک مہینہ کے لئے ہر روز ایک، دو، چار یا دس بیس انسانوں کا کوئی کام کریں، ان کی مدد کریں اور ان کے لئے ایثار کریں، ان کی خدمت کریں، پھر ٹھیک ایک ماہ بعد اگر ذہنی اور دلی سکون نصیب نہ ہو تو جو چاہے مجھے کہیے گا''۔

جدید دور میں فقراء کا انتخاب اسطرح ہوتا ہے کہ جو شخص مخلوقِ خدا کی خدمت میں سب سے سبقت لے جاتا ہے۔ حضور اکرم ﷺ اپنے مقربین بھیج کر اسے بلاتے ہیں۔ سید مبارک شاہ کا ایک شعر تکریمِ انسانیت کے موضوع پر ہمیشہ یادگار رہے گا:۔

آدم کی کسی روپ میں تحقیر نہ کرنا
پھرتا ہے زمانے میں خدا بھیس بدل کے

ڈاکٹر مطلوب حسین کے ایک کالم ''قدرت کے فیصلے غلط نہیں ہوتے'' میں سے ایک منتخب پیرا گراف ملاحظہ فرمایئے:۔ ''بعض مرتبہ بندے کی قسمت میں جسم یا عزت کا نقصان لکھا ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ جسم یا عزت کو محفوظ فرما کر پیسے کا نقصان فرمادیتے ہیں۔ سیانے کہتے ہیں کہ جب کوئی نقصان ہوتا ہے تو بندے کا کہیں نہ کہیں فالٹ ضرور ہوتا ہے''۔

جاوید چوہدری کے کالم ''ریڈ سگنل'' اور ''صدقہ'' بھی اُردو کالم نگاری کی روایت میں ہمیشہ زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ سید عطرت حسین شاہ کا کالم ''بحث کرنا چھوڑ دی'' چونکا دینے والا واقعہ ہے۔ محمد ظفر اللہ شنواری کا مضمون ''آفات وبلیات سے حفاظت'' بھی سبق آموز تحریر ہے۔ رشید نثار خطہء پوٹھوار کی ایک عظیم الشان علمی اور ادبی شخصیت تھے۔ وہ بری امامؒ کے بالکے ہی نہیں بلکہ ایک فاضل محقق، بلند پایہ شاعر اور ادب دوست انسان تھے۔ وہ باقی صدیقی مرحوم کی یاد میں ہر سال ادیبوں اور شاعروں کا قافلہ لے کر سہام (راولپنڈی) جاتے تھے۔ رشید نثار کی علمی وادبی خدمات کا قومی سطح پر اعتراف کیا جانا ضروری ہے۔

نوید مسعود ہاشمی کا مضمون ''نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں'' ایک سبق آموز اور نصیحت آمیز تحریر ہے۔ انتخابِ شعر میں عرضِ حال بحضور سرورِ کائنات ﷺ از مسدس حالی، شورش کاشمیری کی نعت، بارگاہِ رسالت مآب میں از علامہ اقبالؒ، اشعار اقبالؒ، رومانی شاعر اختر

شیرانی کی ایک نعت، ساحر لدھیانوی کی ایک نظم ''ماں کی دعا'' ۱۹۶۵ء کی جنگ کا ایک نغمہ، سقوطِ ڈھاکہ پر منیر نیازی کے اشعار اور استاد دامن کے اشعار وغیرہ شامل ہیں۔

خواجہ محمد عرفان ایوب کریمی کی ان منتخب تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بزرگانِ دین، فقراء واولیاء اللہ سے ایک خاص نسبت رکھتے ہیں۔ کیونکہ اس کتاب میں شامل کئے گئے منتخب مضامین ان نابغہ ءِ عصر ہستیوں پر مشتمل ہیں جن میں اشفاق احمد، بابا جی محمد یحیٰ خان، بابا فضل شاہ جیسے بزرگ شامل ہیں۔ خواجہ محمد عرفان ایوب کریمی نے ان روحانی شخصیات سے متعلق لوگوں کو معلومات فراہم کر کے اس کتاب کو محققین اور صوفیانہ ادب سے دلچسپی رکھنے والے قارئین کے لئے ایک ریفرنس بک بنادیا ہے کیونکہ لوگ ان مشاہیر کے بارے میں بڑی شدت سے جاننا اور سمجھنا چاہتے ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ وہ یا کوئی اور اس موضوع پر مطالعے کو مزید تقویت دے اور اس میں سے منتخب سرمائے کو چھاپ دے تو اس کی یہ خدمت تادیر یاد رکھی جائے گی۔ اگر مصنفین کو خواجہ محمد عرفان ایوب کریمی جیسے قاری میسر آجائیں تو اہلِ قلم کو اچھی کتابیں اور کالم ضرور لکھنے چاہئیں ورنہ تو اب ادب کا اچھا قاری ختم ہوتا جارہا ہے۔ خواجہ صاحب خوش نصیب انسان ہیں انہیں یہ کتاب دوستی اور علم سے محبت عرفان کی منزلوں سے ہمکنار کرے گی۔ میں آخر میں اس کتاب میں شامل مضامین و موضوعات کے بنیادی فکر و فلسفہ کو واصف علی واصفؒ کے الفاظ میں یوں بیان کر سکتا ہوں کہ :۔

''باز اور شکروں کی موجودگی میں چڑیا کے بچے پرورش پاتے رہتے ہیں۔ آندھیاں سب چراغ نہیں بجھا سکتیں، شیر دھاڑتے رہتے ہیں اور ہرن کے خوب صورت بچے کلیلیں بھرتے رہتے ہیں۔ فرعون نے سب بچے ہلاک کر دیئے مگر وہ بچہ بچ گیا۔ زمانہ ترقی کر گیا مگر مکھی، مچھر اور چوہے اب بھی پیدا ہوتے ہیں۔ جراثیم کش دوائیں نئے جراثیم پیدا کرتی ہیں۔ طبِ مشرق و مغرب میں بڑی ترقی ہوئی، بیماریوں میں بھی اضافہ ہوا۔ انسان کل بھی دکھی تھا آج بھی سکھی نہیں۔ اصل میں علاج خالق کے قرب میں ہے۔ لوگ کیوں نہیں سمجھتے''؟ کتاب الحکیم میں عزیز الحکیم کا ارشاد ہے کہ ''وہ جس کو چاہے دانائی عطا کرتا ہے اور جس کو حکمت ملی اسے بہت بڑی حکمت ملی، اسے بہت بڑی نعمت ملی''۔

''آوازِ دوست'' کے مصنف مختار مسعود کے مطابق خیرِ کثیر کے کئی نام ہیں۔ اہلِ شہادت، اہلِ احسان اور اہلِ جمال۔ چنانچہ ''آوازِ دوست'' کے مصنف کے مطابق یہ حکمت اہلِ شہادت کو ملی تو جنوں کہلائی، اہلِ احساں کو ملی تو خیرِ کثیر ہو گئی اور اہلِ جمال تک پہنچی تو حسن بن گئی۔ خواجہ محمد عرفان ایوب کریمی صاحب کی شخصیت اہلِ شہادت، اہلِ احسان اور اہلِ جمال سے کسبِ فیض کا حسین مرقع ہے۔ خواجہ محمد عرفان ایوب کریمی نے جنوں، جمال اور جلال و خیرِ کثیر کی آمیزش سے نہایت عام فہم انداز میں زندگی کے چلن مرتب کئے اور خوش بختی کی راہ دکھائی۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قولِ جمیل ہے کہ ''جس طرح جسم تھک جاتے ہیں اسی طرح دل بھی تھک جاتے ہیں، لہٰذا ان کی راحت و تسکین کے لئے پُراز حکمت باتیں کیا کرو''۔

خواجہ محمد عرفان ایوب کریمی نے بھی دلوں کی راحت و تسکین کا سامان بہم کر دیا ہے جو یقیناً ان کے لئے دنیا میں عزت و کامرانی اور آخرت میں سعادت کا باعث ہوگا۔ بقولِ میر:

بارے دنیا میں رہو، غم زدہ یا شاد رہو

ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

فصل16۔ بھرے بھڑولے، تحریر ارشاد اختر:

دیباچہ نگاری کے حوالے سے محمد عارف کا ایک اور قابلِ ذکر مضمون ''حضرت واصف علی واصفؒ کی پنجابی شاعری میں صوفیانہ روایت'' کے نام سے ہے۔ یہ مضمون واصف علی واصف کی کتاب "بھرے بھڑولے" کو زیرِ بحث لاتا ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ حضرت واصف علی واصفؒ لمحۂ موجود کے ان معروف و مقبول صوفی دانش وروں میں سے ہیں جنہوں نے علمی استدلال، تفکر وتدبر اور دانائی وبینائی سے آج کی بھولی بھٹکی انسانیت کا رشتہ خالقِ کائنات سے مضبوط بنایا۔ وہ بنی نوعِ انسان کی فکری انار کی، ذہنی جمود، اور لاحاصلی کو بار بار موضوع بناتے ہیں تاکہ ہمیں اپنے مقصدِ حیات کے تعیّن میں آسانی ہو سکے۔ مصنف کے خیال میں اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انہوں نے ذہن و فکر کے زنگ آلود خانوں کو سیکل کیا۔ عقل و شعور کو میمیزدی۔ تعلیم یافتہ طبقے کو شریعت، طریقت اور حقیقت کے راستے پر گامزن کیا۔

واصف علی واصفؒ کا پنجابی شعری مجموعہ '' بھرے بھڑولے''نومبر ۱۹۹۴ء میں شائع ہوا جس کا سرورق محمد حنیف رامے نے بنایا ہے۔ واصف علی واصفؒ کی پنجابی شاعری کا مجموعی تاثر صوفیانہ طرزِ فکر کا ہے جس کے ذریعے انہوں نے مسلمانوں کی اجتماعی صوفیانہ روایات کے علاوہ اپنے علاقے پنجاب کے صوفیانہ اشارے بھی دیئے ہیں۔ واصف علی واصفؒ ایک روحانی شخصیت تھے جن کے روحانی تجربے محولہ بالا صوفیانہ تجربات کے ساتھ مملو ہو کر ایک جداگانہ رنگ پیش کرتے ہیں۔ واصف علی واصفؒ خواجہ میر درد کے بعد اردو پنجابی شعری روایت کے وہ واحد صوفی شاعر نظر آتے ہیں جن کی ابتداء سے لے کر آخر تک ہر دو زبانوں میں کی گئی شاعری تصّوف کے نظری پہلوؤں کی بجائے عملی تصورات کو سامنے لاتی ہے۔ واصف علی واصفؒ خواجہ میر درد کے بعد اس صوفیانہ شعری روایت کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی کیونکہ ایسے لوگ صدیوں کے بعد صفحہء ہستی پر طلوع ہوتے ہیں جو تصّوف کے روحانی، جمالیاتی تجربات کی باریک بینی کو حق الیقین کی منزل سے نہیں بلکہ عین الیقین کے مقام سے دیکھتے ہیں۔ واصف علی واصفؒ ان خاصانِ خدا میں شمار ہوتے ہیں جن سے قدرتِ کاملہ نے یہ عظیم کام لیا کہ انہوں نے اپنی روحانی وارداتِ قلبی کو اپنی شاعری کا مرکزی جوہر بنایا ہے۔ واصف علی واصفؒ کے پنجابی شاعری کا مجموعہ '' بھرے بھڑولے'' پڑھنے سے صوفیائے کرام کی تعلیمات کے نقش ہر طرف بکھرے نظر آتے ہیں۔

محمد عارف کی نظر میں واصف علی واصفؒ خدا کے تقرب کے حصول کے لئے عشق کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ دنیا کی بے ثباتی، شیخِ کامل کی ضرورت، عشقِ رسول ﷺ جیسے موضوعات ان کے ہاں بار بار نظر آتے ہیں۔ واصف علی واصفؒ کی نظموں میں فنا کا احساس غالب ہے۔ وہ ان میلیوں، کہنہ مکرنیوں، دوہوں، اور چکی ناموں کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے خوب صورت ادبی انداز اپناتے ہیں تاکہ قاری کو فکرِ آخرت کے لئے تیار کیا جا سکے۔ یہ دنیا چند روزہ ہے۔ صوفی، سادھو، مست الست فقیر، واعظ مولوی اور پنڈت، سب اپنے اپنے رنگ میں انسانوں کو حقیقی منزل کے لئے تیار کرتے ہیں۔ اردو کے صوفی شعراء کی شاعری کو غور سے پڑھیں تو یہ موضوع ہر طرف چھایا ہوا ہے۔ خود پنجابی شعراء کے ہاں بھی یہی شعری روایت تخلیقی تجربے کی فنی مہارت سے مربوطہ ہو کر قاری کی سماعتوں کو تروتازگی عطا کرتی ہے۔ محمد عارف اس سلسلے میں مزید لکھتے ہیں:

''واصف علی واصفؒ کی شاعری میں صوفیانہ لے نظم و غزل ہر دو اصنافِ سخن میں موجود پائی جاتی ہے۔ وہ کبھی سسی کی طرح روہی کے تھل میں تڑپتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کبھی ان کے دل میں ہر طرف شور برپا ہو جاتا ہے۔ ان کی سسی کا شہر بھنبھور اجڑ جاتا ہے۔ شاید یہی وہ جذبہء عشقِ حقیقی ہے جس میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت میں تڑپنا، کسمسانا، تلملانا، انسان کا خاصہ قرار پاتا ہے۔ بالآخر تو من شدی من تو شدم کا معاملہ پیش آجاتا ہے۔ واصف علی واصفؒ کی شاعری میں ایک اہم موضوع عشقِ رسول ﷺ ہے وہ اپنی پنجابی شاعری کے ذریعے معرفت و سلوک کے وہ پیچیدہ و دقیق علمی تفاوت سامنے لاتے ہیں کہ عقلِ انسانی ششدر اور حیران رہ جاتی ہے۔ وہ عشقِ رسول ﷺ کو حاصلِ کائنات قرار دیتے ہیں کیونکہ یہی وہ جذبہ ہے جو انسان کو عرفانِ ذات سے ہمکنار کرتا ہے اور اس کے لئے باعثِ نجات ہے۔ واصف علی واصفؒ کی شاعری میں اسرار و رموز، ہست و بود، فلسفۂ تخلیقِ کائنات اور تعلیماتِ قرآنی کی جھلک واضح نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری اپنے مخصوص رنگ میں علمِ حقیقت کی اتھاہ گہرائیوں کو اجاگر کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ واصف علی واصفؒ آج کے انسان کو فکرِ آخرت کے لئے تیار کرتے ہیں وہ عالمگیر محبت، بے مثال اخوت کے دعوے دار ہیں۔ وہ خود غرضی، حرص و ہوس اور لالچ کے عفریت کو مٹانے کے درپے ہیں تاکہ صبر و شکر، توکل اور قناعت کے اوصاف کو اپنا کر انسان اپنی حقیقی منزل سے ہمکنار ہو سکے۔'' (بحوالہ مقالہ ایم فل اردو)

فصل 17۔ سرچشمہ اسرار و رموز حضرت سید واصف علی واصفؒ، تحریر غنی سکندر شیخ:

قطبِ اکبر اعلیٰ حضرت سید واصف علی واصفؒ 15 جنوری 1929ء کو تحصیل شاہ پور ضلع خوشاب میں پیدا ہوئے۔ آپؒ کے والدِ ماجد کا اسم گرامی ملک محمد عارفؒ تھا۔ جو نہایت متقی، پرہیزگار اور عابد و زاہد انسان تھے۔ والدِ بزرگوار ملک عارفؒ حضرت خواجہ غلام فریدؒ کے بے حد عقیدت مند تھے۔ ملک محمد عارفؒ کا تعلق ایک قدیم اور معزز قبیلے سے تھا۔ اعوان قوم کی مستند تاریخ کے حوالے سے سلسلۂ نسب حضرت علی شیرِ خدا حیدرِ کرار، ابو ترابؓ سے جا ملتا ہے۔ اس قبیلے کے ایک تابندہ چشم و چراغ محمد جمال 1729ء میں ضلع خوشاب میں رہائش پذیر ہوئے۔ ان کی ساتویں پشت سے قبلہ حضور واصف علی پیدا ہوئے۔ صغر سنی ہی میں ذہین، فطین اور سمجھدار تھے غیر معمولی باتیں کرتے تھے۔ ایک روز والد صاحب نے برخوردار واصف سے سوال کیا کہ برخوردار واصف اگر باپ بیٹے سے کہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے حکم دیا ہے کہ تمہاری قربانی کروں تو بیٹے کو کیا جواب دینا چاہئے سمجھدار واصف نے بلا تامل جواب دیا کہ اگر باپ پیغمبر ہو تو اس مقام پر یہ حکم صحیح اور درست ہے اسے تسلیم کر لینا ضروری ہے اور اگر یہ حکم ایک عام انسان کر رہا ہے تو پھر اس پر سوچا جا سکتا ہے۔ والدِ محترم یہ جواب سن کر از حد خوش ہوئے۔

اثاثہ فقیر: آپ کا گھر نادر قدیم کتب کا مخزن تھا۔ قرآنِ پاک کے قلمی نسخے، تفسیر حقانی تصّوف کی کتب، اولیائے عظام کے حالاتِ زندگی اور پند و نصائح کی کتب، دراصل تصّوف کے پرخار میدان میں آپ نے پہلا قدم اس وقت رکھا جب بچپن میں اذان کی آواز سن کر آپ پر کپکپی طاری ہو جاتی تھی۔ تاریخ کہتی ہے یہی عالم سرخیل اولیاء حضرت علی شیرِ خداؓ کا تھا کہ اذان کی آواز سنتے ہی آپ پر کپکپی طاری ہو جاتی تھی۔ اس عنصرِ مشترک نے آپ کو اولیائے نابغہ روزگار کی صف میں لا کھڑا کر دیا۔

روزگار فقیر: ان پر طالبِ علمی کے زمانے سے مقابلے کی ایک دھن سوار رہتی، بقول ان کے اول ہونا وہ اپنا حق سمجھتے تھے چنانچہ بی اے فرسٹ کلاس میں پاس کر کے پنجاب یونیورسٹی سے انگریزی ادب میں ایم اے نمایاں پوزیشن سے پاس کیا۔ ازاں بعد سول سروس کا امتحان پاس کر لیا مگر آپ نے اپنے رجحان کو اس سے منطبق نہ پایا۔ طبیعت کی انفرادیت تو بچپن سے تھی ہی چنانچہ درس وتدریس کے شعبے کو اپناتے ہوئے اپنا ایک تدریسی ادارہ کھولا جس کا نام انگلش کالج رکھا گیا۔ اس اثناء میں آپ کے والد صاحب محکمہ تعلیم سے فارغ ہو گئے اور خوشاب سے آکر لاہور میں مقیم ہو گئے۔ قبلہ واصفؒ صاحب نے خوب جانفشانی، محنت، جہدِ مسلسل سے کالج کو چلایا۔ تدریس کی ہمہ وقت مصروفیات کے ساتھ ساتھ آپ نے اپنے اصل میدان میں کام جاری رکھا۔ شام کو ادبی محافل جاری رہتیں، روحانی، صوفیانہ اور عارفانہ کلام پیش کیا جاتا، جب لو کی تپش بڑھ جاتی تو محفلِ سماع شروع ہو جاتی پھر کیا تھا یوں لگتا کہ اطراف واکناف کی غیبی طاقتیں انسانی شکل اختیار کر کے اس سماع میں شامل ہو گئی ہوں۔ اس کے ساتھ ساتھ شبِ بیداری جاری رہتی۔ تہجد باقاعدگی سے ادا کی جاتی۔

ایک دفعہ ایک بزرگ ولی اللہ حضور واصفؒ کے آستانہ پر حاضر ہوئے۔ آپ نے ان کی خاطر وتواضع مقدور بھر کی۔ ان سے رہنمائی چاہی کہ حضرت بندہ ناچیز کہاں کہاں حاضری دے؟ کس کس ولی اللہ سے جا کر ملے اور کون کون سے مزار پر چلہ کشی کرے۔ بزرگ نے ایک راز بتایا اور کہا کہ اب تمہیں نہیں جانا بلکہ جس سے ملاقات مطلوب ہو وہ اب تمہارے پاس خود آکر مل لیا کرے گا۔ چنانچہ اس روز کے بعد جناب واصفؒ صاحب نے اس پر عمل شروع کر دیا اور پھر اپنے آسانیٔ وقت پر بیٹھے بیٹھے ملاقاتوں کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کے کرم سے رحمتوں وبرکتوں کا نزول جاری وساری ہو گیا۔ اسی دوران ایک اور درویش فقیر قبلہ واصفؒ صاحب کے پاس تشریف لائے، راز ونیاز کی گفتگو شروع ہوئی تو جہاں حضور پاک ﷺ وجہ مقصود کائنات کا اسم گرامی نام نامی آتا وجد طاری ہو جاتا۔ بزرگ کا چہرہ نور سے چمکنے لگتا۔ اسی اثناء میں انہوں نے ایک نگاہ کیمیا قبلہ واصفؒ صاحب کے چہرے مبارک پر ڈالی کہ کایا پلٹ گئی۔ بحکم اللہ کریم بندہ خاکی کو بندہ لولاکی بنا دیا۔ جب وہ بزرگ رخصت ہونے لگے تو آپ نے اپنی رہنمائی کے لیے بزرگ سے پوچھا کہ اب میرا کیا پروگرام ہو گا تو انہوں نے فوراً فرمایا کہ تم خود کسی کا پروگرام ہو تم کیا پروگرام بناؤ گے۔ واصفؒ صاحب نے اتنا سننا تھا کہ وجد میں آ گئے۔ نعرہ حق اللہ ہو، اللہ ہو بلند کرنا شروع کر دیا۔

سبحان اللہ شانِ کبریائی! واصفؒ حضور کو اللہ تعالیٰ نے بہت اعلیٰ اور ارفع مرتبہ ومقام یعنی ''قطبِ اکبر'' عطا کیا تھا جس طرح آسمان پر قطبی ستارہ فضاؤں اور زمین پر سفر کرنے والوں کے لئے رہنمائی اور منزلِ مقصود کے کام میں مدد ومعاون ثابت ہوتا ہے اسی طرح قطبِ اکبر بھی گم گشتہ انسانیت کے لئے منزلِ تلاشی اور منزلِ حصولی میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

فیوض وبرکات: ہر صوفی نے اپنے زمانے میں مخلوقِ خدا کو بے پناہ علمی فیض پہنچایا قبلہ واصفؒ صاحب نے بھی ایسا ہی کیا۔ آپؒ نے علمی، دینی فیوض وبرکات سے ہزاروں بلکہ لاکھوں بندگانِ خدا کو راہِ مستقیم پر چلا کر ان کے روحانی درجات کو بلند کیا اور قربِ خداوندی کے حصول کو آسان سے آسان تر بنا دیا۔ آپؒ کی تبلیغ کا ماحاصل یہ تھا کہ حقوق العباد ادا کرو، دنیا وآخرت سنوارو، دین اور دنیا دونوں قائم رکھو۔

جس طرح ہر زندہ نے آخرت کا سفر کرنا ہے بالکل اسی طرح آپؒ نے بھی اپنا رختِ سفر باندھا اور 18 جنوری 1993ء کو آپ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ **''خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را''**

ترجمہ:۔ ''خدا اِن پاک طینت، نیک فطرت عاشقوں پر اپنی رحمتیں نازل کرے۔''

لاہور داتا کی نگری میں قدیمی قبرستان میانی صاحب میں آقائے دو جہاں ﷺ کے پکے و سچے عاشق حضرت غازی علم الدین شہید کی آخری آرامگاہ کے نزد محوِ استراحت فرما ہیں۔ وہاں ان کا دربارِ عالیہ بنا دیا گیا ہے۔ ان کی قبر مبارک پر ہر وقت سجرے اور تازہ پھولوں کا ڈھیر اس بات کا غماز ہے کہ آپ کے وصال کے بعد بھی وہ خوشبوئیں ان کے مزار روضہ سے جاری ہیں جن کا اجرا ان کی حیاتِ مبارکہ میں ہو چکا تھا۔ بقولِ واصف:۔

اپنے اپنے مزار میں واصف
اپنی اپنی صفات کی خوشبو!

گوشۂ عنایت

ا۔ باباجی عنایت اللہؒ کے سنگ

صحرا کی وسعتوں میں ہے بانگِ درا عنایت
لطف و کرم کا ، پیار کا اک سلسلہ عنایت
سیلابِ تند و تیز میں ہے کشتیٔ اُمید
موجوں کا کوئی ڈر نہیں ، ہے ناخدا عنایت
ظلم و ستم مٹا گیا ، جور و جفا گیا
پیغام بر وفا کا ہے ، روشن دِیا عنایت
زنجیرِ عدل اُس نے ہلائی ہے زور سے !
انصاف عام کر دیا ہے ، مرحبا عنایت
ابلیس کا طلسم تھا چاروں طرف عجب !
وہ صور تُو نے پھونکا کہ ہے سب فنا عنایت
فرعون ہو کہ وقت کا نمرود ہو کوئی !
ملتا نہیں کسی کا کہیں کچھ پتہ عنایت

دیوارِ جبر میں ہیں دراڑیں پڑی ہوئی !
ایوانِ حرف میں ہے کوئی زلزلہ عنایت
جنگل میں جا کے دھونی رماؤ کسی طرح !
بستی کے لوگ سنتے نہیں ہیں صدا عنایت
اک روز ختم ہو گا فسانۂ مال و زر !
رقصِ فنا جہاں میں ہے کب سے بپا عنایت
واصف کی اک نظر نے تجھے کیمیا کیا !
تُو شاہ بری لطیفؒ کا ہے بالکا عنایت
داتا نگر نے تجھ کو کیا معتبر یہاں !
کس کس فقیر سے ہے تیرا رابطہ عنایت
پھر یاد تازہ کر دے ذرا بلھے شاہؒ کی !
پھر شام ہو گئی ذرا گھنگرو تو لا عنایت
نظروں سے پینے والے تجھے جانتے ہیں سب !
مے خانہ ہے کھلا ہوا ، سب کو پلا عنایت
عارفؔ پہ کھل گئے ہیں یہ اسرارِ معرفت !
جب سے یہ بادشاہ کے در کا گدا عنایت

۲۔ باباجی عنایت اللہ

کس نے نصابِ کفر جلایا ہے دہر میں
پیغامِ حق جہاں کو سنایا ہے دہر میں
اُمید کی جلا گیا شمعیں یہاں پہ کون؟
مایوسیوں کو کس نے مٹایا ہے دہر میں
کیسی صدا کی گونج ہے پھیلی ہوئی یہاں؟
سوئے ہوؤں کو پھر سے جگایا ہے دہر میں
ظلم و ستم کے سامنے دیوار کیسی ہے؟

کس نے غرور سب کا مٹایا ہے دہر میں
فرعونِ وقت بھی ہے یہاں دم بخود کھڑا
کس نے عصائے موسیٰؑ اُٹھایا ہے دہر میں
یہ کون لے کے آ گیا ہے مہتابِ نُور؟
ظلماتِ شب کو کس نے بھگایا ہے دہر میں
کس نے بسائیں بستیاں عرفان کی بھلا؟
کس نے یقیں کا شہر بسایا ہے دہر میں
کچھ بھی نہیں ہے پاس بجز دولتِ خلوص
سب کچھ لٹا دیا جو کمایا ہے دہر میں
عارفؔ ضرور محنتِ شاقہ کا ہے ثمر!
جو مرتبہ کسی نے بھی پایا ہے دہر میں

۳۔ باباجی عنایت اللہ

پھول میں خوشبو ، ہوا کا ایک جھونکا ایک شخص
کوئی اُس جیسا نہیں تھا ، جیسا دیکھا ایک شخص
پیڑ برگد کا ہے جس کی چھاؤں ٹھنڈی اور گھنی!
راستے کی دھوپ میں سر پر ہے سایہ ایک شخص
اُس کی درویشی میں پنہاں تھا سراغِ زندگی!
میں نے دیکھا ہے سمندر سے بھی گہرا ایک شخص
دیکھتا تھا ظلم کے بڑھتے ہوئے طوفان کو!
کر رہا تھا شہر کا کب سے نظارا ایک شخص
وہ نظامِ مصطفیٰ ﷺ کا داعیٔ اعظم رہا!
دین کی عظمت کی خاطر کیسا اُٹھا ایک شخص
وہ بلائے وقت سے واقف صدائے وقت ہے!
لکھ گیا ہے وقت کی خاطر صحیفہ ایک شخص

مغربی جمہوریت کا شاخسانہ کھو گیا !
کفر کے ایوان میں ہے ایک لرزا ایک شخص
وقت کی رفتار پر عارفؔ رہی اُس کی نظر !
نبضِ ہستی کو جو سمجھا ہے تو سمجھا ایک شخص

۴۔ باباجی عنایت اللہ

واصف علیؒ کے فیض کا لبِ لباب عنایت
یوں بارگاہِ حق میں ہوا باریاب عنایت
ہاتھوں میں لے کے اُٹھا حسینؓ علم ہے وہ !
قدرت کا اِس جہاں میں حسیں انتخاب عنایت
ظلم و ستم کا کیسا قلع قمع کر گیا !
میں دیکھتا ہوں ہو گیا ہے کامیاب عنایت
چھیڑا ہے اُس نے رُوح کے بربط پہ ایک گیت !
ہاتھوں میں لے کے بیٹھا ہے کیسا رباب عنایت
عکاس اُس کی فکر میں اقبالؒ کی ہے رُوح !
اِس دیس کے عروج کا ہے ایک خواب عنایت
جمہوریت کی مغربی یلغار کے خلاف !
تحریر تُو نے نکتہ کیا لاجواب عنایت
مے خانہ ہے کھلا ہوا ہر ایک کے لیے !
مشرق سے ہے کشید تمہاری شراب عنایت
الطاف تجھ پہ عام ہیں، فیضانِ بے کنار !
رحمت میرے خدا کی ہوئی بے حساب عنایت
عصرِ رواں کی تلخیاں پیشِ نظر رہیں !
قرطاس پہ عیاں ہے ترا اضطراب عنایت
لاتا ہے لامکاں کی خبر آسماں سے تُو !

اُٹھنے لگے ہیں تیری نظر سے حجاب عنایت
عارفؔ یہ کیسے اسم ہیں وردِ زباں ترے !
ٹلنے لگے ہیں وقت کے سارے عذاب عنایت

۵۔ بابا جی عنایت اللہ

برپا بری امامؑ کے در پہ دھمال عنایت
تُو نے کیا ہے رقص وہاں کیا کمال عنایت
سوچوں میں ہے گندھی ہوئی اسلام کی مہک !
افلاک سے بھی آگے ہے تیرا خیال عنایت
تحریر میں چھپے ہوئے جوہر تو دیکھیے !
افکار پیش کر گیا ہے لازوال عنایت
کیسا اثر پذیر یہ صحبت کا رنگ ہے !
کیسی ہوئی ہے میری طبیعت بحال عنایت
اِس کے سنبھلنے کی کوئی تدبیر کیجیے !
اُمت غموں سے ہو گئی کیسی نڈھال عنایت
ذلت میں گھر گیا ہوں میں اغیار کے سبب !
اُلٹی ہوئی ہے میرے ستاروں کی چال عنایت
ہر ایک فرد مرکز و محور سے کٹ گیا !
اس ایک بات کا ہے مجھے بھی ملال عنایت
ہر سمت عام ہو گیا چرچا جہان میں !
ہو شرق یا کہ غرب، جنوب و شمال عنایت
عارفؔ ضرور غور طلب ہیں تیرے نکات !
تُو نے اُٹھا دیے ہیں یہ کیسے سوال عنایت

۶۔ بابا جی عنایت اللہ

شعلہ ہے کہ شبنم ہے ، تحریر عنایت کی

اک سُر ہے کہ سرگم ہے تحریر عنایت کی
ظلماتِ جہاں میں ہے اک نُور کی رم جھم یہ !
اک کوششِ پیہم ہے تحریر عنایت کی
روتا ہے بہت اکثر حالات کی تلخی پر !
اک نوحہ و ماتم ہے تحریر عنایت کی
ملتی ہے جھلک اِس میں افکارِ زمانہ کی !
تصویرِ دو عالم ہے تحریر عنایت کی
آنسو ہیں رواں اِس میں، آہیں ہیں نہاں اِس میں !
وہ سلسلۂ غم ہے تحریر عنایت کی
رُخ موڑ گیا ہے وہ بپھری ہوئی موجوں کا !
طوفان سے کیا کم ہے تحریر عنایت کی
عارفؔ وہ محافظ ہے اسلام کے مرکز کا!
اِس دیس کا پرچم ہے تحریر عنایت کی

۷۔ باباجی عنایت اللہ

گائے گا گن جہاں میں زمانہ تیرا عنایت
دنیا میں عام ہو گا فسانہ تیرا عنایت
سب محفلوں میں ہوں گے تیرے تذکرے ضرور
رہ ایک دل میں ہو گا ٹھکانہ تیرا عنایت
اک روز چُور ہوں گے فراعین کے یہ بت
چُوکے گا کس طرح سے نشانہ تیرا عنایت
ہے دشمنانِ دیں سے تری جنگ بے مثال
ہم نے کمال دل سے ہے مانا تیرا عنایت
تاریخ میں رقم تیری تحریر کا ہے حسن
اسلوب منفرد ہے ، یگانہ تیرا عنایت

بھولیں گے کس طرح سے حریت کی داستاں
عہدِ وفا وطن سے نبھانا تیرا عنایت
کس دل میں جاگزیں ہے یہ عزمِ صمیم عارف
دیوارِ قصرِ جبر گرانا تیرا عنایت

فصل 1۔ باباجی عنایت اللہ کی سوانح حیات:

باباجی عنایت اللہ کا تعلق گجرات کے محلہ فتوپورہ سے ہے۔آپ نزد بڑی مسجد گلی مالہا خان میں واقع اپنے گھر 4اپریل 1935ء کو پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد حسین اور والدہ کا نام حسین بی بی تھا۔آپ نے ابتدائی تعلیم اسلامیہ پرائمری سکول محلہ فتوپورہ گجرات میں حاصل کی۔پنجم اور ششم مشن ہائی سکول گجرات سے پاس کیا جب کہ ساتویں جماعت کا امتحان پبلک ہائی سکول گجرات سے پاس کیا۔بعد ازاں سکول سے رشتہ منقطع ہو گیا کیونکہ انہیں پے در پے صدمات کا سامنا کرنا پڑا۔1949ء میں والدہ ماجدہ فوت ہو گئیں جب کہ 1950ء میں والدِ محترم بھی اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔آپ نے 1953ء میں میٹرک کا امتحان پنجاب یونیورسٹی لاہور سے پرائیویٹ پاس کیا۔آپ کے مضامین آرٹس تھے اور صرف ایک نمبر زیادہ ہونے سے پاس ہو گئے۔آپ نے 1953ء ہی میں سرگودھا ڈسٹرکٹ فوڈ کنٹرولر کے دفتر میں بطورِ کلرک سروس کا آغاز کیا۔یہ ملازمت صرف تین سال چل سکی اور آپ 1956ء میں اس محکمے سے چھانٹی کی بنا پر فارغ کر دیئے گئے۔آپ کی اسی محکمہ میں دوبارہ تقرری لاہور ہو گئی۔ملازمت کے ساتھ ساتھ فاضل پنجابی کی تیاری شروع کر دی۔آپ 1956ء میں فاضل پنجابی کے داخلے کے لئے چوہدری افضل کالج لاہور گئے۔داخلہ فیس نہ ہونے کی وجہ سے ان کا اس کالج میں داخلہ نہ ہو سکا۔چوہدری افضل کے ہاں واصف علی واصفؒ انگریزی کے ٹیچر تھے۔عنایت اللہ صاحب چند دن وہیں رہے مگر کالج کی فیس نہ دے سکے۔اس لئے یہ سلسلہ بھی جاری نہ رہ سکا۔بعد ازاں واصف علی واصفؒ انگلش کالج لاہور آ گئے۔عنایت اللہ نے چوہدری افضل حسین صاحب کی کوٹھڑی میں رہائش اختیار کی اور کوارٹر کرایہ پر لے لیا۔باباجی عنایت اللہ کی چوہدری افضل حسین کے بیٹے فدا حسین سے دوستی ہو گئی۔وہ دونوں تحصیلِ علم کے لئے اکٹھے کوشاں رہتے۔وہ نوکری کے ساتھ گھر میں پڑھتے رہتے تھے۔وہ ایک دن فدا حسین کے ساتھ 1958ء میں لاہور کالج چلے گئے۔آپ نے وہاں فاضل پنجابی پرائیویٹ طور پر مکمل کی۔وہ نوٹس سے استفادہ کرتے رہے۔انہوں نے فدا حسین کو بتایا کہ یہ کالج بہت اچھا ہے۔وہ اعلیٰ تعلیم کے خواہاں تھے۔مختلف لوگوں اور کالجوں سے نوٹس مانگ کر لاتے تھے۔انہوں نے وہیں ایف اے میں داخلہ لے لیا۔کلاس میں داخل ہوئے تو فیس نہ تھی۔واصف علی واصفؒ نے پوچھا کہ فیس کیوں نہیں ہے۔انہوں نے حالتِ زار بیان کی۔وہ مالی مشکلات حل کرنے کے لئے کالج کے کام کاج کرنے لگے اور ساتھ ساتھ تعلیم بھی جاری رہی۔ان کی سب سے پہلے اس کالج میں واصف علی واصفؒ سے ملاقات ہوئی۔واصف علی واصفؒ کا پڑھانے کا انداز بہت اچھا تھا۔وہ بہت خوبصورت انسان تھے۔واصف علی واصفؒ کے ہاں تمام فقرا اکٹھے ہوتے تھے۔عنایت اللہ اکثر کمرے کے باہر کھڑے ہو کر ان کی باتیں سنتے تھے۔صوفی سرور نے ایک دن واصف علی واصفؒ سے کہا کہ عنایت باہر کھڑا رہتا ہے۔واصف علی واصفؒ نے انہیں کہا کہ کیوں کھڑے رہتے ہو۔عنایت نے جواب دیا کہ ویسے ہی باتیں سننے کے لئے کھڑا ہوتا ہوں۔واصف علی واصفؒ نے عنایت

اللہ کو کمرے میں باتیں سننے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ وہ یوں واصف علی واصفؒ کی محفل کا باقاعدہ حصہ بن گئے۔ عنایت اللہ کسی وقت کلاس لینے بھی چلے جاتے۔ بی اے کے بعد میٹرک کی کلاس میں کبھی کبھی تقریر بھی کرتے تھے۔ انہوں نے انگلش کالج میں اکاؤنٹنٹ کا کام بھی کیا۔ وہ دن کو سیکرٹریٹ میں فوڈ ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھے۔ واصف علی واصفؒ کا معمول یہ تھا کہ وہ ساری رات جاگتے رہتے تھے۔ عنایت اللہ ان کی زندگی کا ایک جزو بن کے رہ گئے۔ وہ نہ صرف کالج کے انتظامی امور میں ان کے شریکِ کار بن گئے بلکہ ان کی گھریلو زندگی میں بھی شمولیت اختیار کر لی۔ وہ واصف علی واصفؒ کی جلوت وخلوت کے ساتھی ہیں۔ انہوں نے واصف علی واصفؒ سے شعوری یا غیر شعوری طور پر بہت کچھ سیکھا۔ واصف علی واصفؒ نے ان پر وہ نظر ڈالی کہ وہ ذرے سے آفتاب بن گئے۔ عنایت اللہ اور واصف علی واصفؒ کا ساتھ انگلش کالج سے شروع ہو کر واصف علی واصفؒ کی موت تک جاری رہتا ہے۔ عنایت اللہ کے سینے میں واصف علی واصفؒ کی زندگی کے وہ راز پوشیدہ ہیں جو ان کے علاوہ کوئی بھی نہیں جانتا۔ یہ قدرت کا عجیب کرشمہ ہے کہ گجرات کے محلے فتوپورہ میں پیدا ہونے والا ایک لڑکا عنایت لاہور انگلش کالج پہنچ جاتا ہے اور اس کی ملاقات مردِ قلندر واصف علی واصفؒ سے ہو جاتی ہے۔ عنایت اللہ نے واصف علی واصفؒ کی محفلوں میں شرکت سے زندگی کے اسرار ورموز سیکھے۔ درویشوں اور فقیروں کو سنا۔ واصف علی واصفؒ جیسے بلند مرتبت شخص سے عنایت اللہ کی انتہائی قربت یہ ظاہر کرتی ہے کہ ان کی قسمت کا ستارہ بلندیوں کو چھو رہا تھا۔ افسوس صد افسوس کہ درویشوں اور فقیروں کے تذکروں میں محرم راز درون خانہ کا ذکر ہی نہیں ملتا۔ واصف علی واصفؒ عنایت سے بہت پیار کرتے تھے۔ عنایت اللہ کی نوکری، تعلیم، شادی، الغرض تمام امور میں واصف علی واصفؒ کی مشاورت، دعا اور نگاہ شامل تھی۔ عنایت اللہ اور واصف علی واصفؒ نے پاکستان بھر کے فقراء واولیاء اللہ کے مزاروں پر اکٹھی حاضری دی۔ عنایت اللہ نے واصف علی واصفؒ کا سایہ بن کر زندگی گزاری۔ واصف علی واصفؒ کے قدموں میں سر رکھ کر عنایت اللہ نے سربلندی کا راز پالیا۔ عنایت اللہ کی زندگی علامہ اقبالؒ کے اس شعر کی تفسیر نظر آتی ہے:۔

تمنا درد دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں
نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستیوں میں

عنایت اللہ نے ایک نجی گفتگو میں بتایا کہ واصف علی واصفؒ نے 1967ء میں بولنا شروع کیا۔ اس سے پہلے کا دور خاموشی کا ہے۔ ان کے پاس مائیک آتا تو لوگ سنتے۔ بزرگانِ دین کی کتب اور ان کے حالاتِ زندگی، کشف المحجوب، میاں میر، موج دریا کا تذکرہ، حجرہ شاہ مقیم کا تذکرہ، داتا صاحبؒ کا آنا جانا، کس طرح زندگی گزاری، مختلف لوگوں کا اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرنا۔ واصفؒ سنتے۔ جس دن انہوں نے انگریزی پڑھائی فدا حسین نے دیکھا تو واصفؒ کی آنکھیں سرخ تھیں۔ فدا حسین نے کہا کہ انگریزی پڑھائی ہے لیکن آنکھیں سرخ ہیں۔ اسے شک سا پڑ گیا۔ اس کے بعد لہجہ فطرت کا عکاسی کرتا دکھائی دیا۔ پوئٹری میں ادب کے واسطے سے بیان کرتے تھے۔ لاامتناہی سلسلے کی طرح بولتے تھے۔ زندگی کی تعلیمات پر اصلاحِ احوال کرتے تھے۔ لطف دیتے تھے۔ ہم دوسرے دن ان کا انتظار کرتے تھے کہ وہ آگے بڑھیں۔ کالج میں گفتگو کرتے تھے۔ کیفیت بدلتی رہتی تھی۔ نئی دنیا آگئی۔

وہ علامہ اقبالؒ اور وارث شاہ کا کلام بہت پسند کرتے تھے۔ وہ بھاٹی چوک اور باسٹک ہوٹل میں شام کو بیٹھتے، جہاں مختلف لوگ آجاتے اور گفتگو کا سلسلہ چلتا رہتا۔ میں ان کی ایک ہزار ایک راتوں میں ان کے ساتھ شریک رہا ہوں۔ واصف علی واصفؒ ایک بہترین استاد تھے۔ وہ شاعری کو انگریزی ادب کی اہم صنف کے طور پر پڑھاتے تھے۔ وہ کئی گھنٹے تک مسلسل بولتے رہتے اور تھکتے نہیں تھے۔ وہ طلباء کی اخلاقی تربیت اور اصلاحِ احوال بھی کرتے تھے۔ ان کا تدریسی تجربہ وسیع ہونے کی وجہ سے اندازِ بیان اس قدر دلچسپ تھا کہ عنایت اللہ اور ان کا ساتھی ہی نہیں باقی طلباء بھی اگلے دن ان کے لیکچر کا انتظار کرتے تھے۔ انہوں نے ایک دن انگریزی پڑھائی تو ان کی آنکھیں سرخ تھیں۔ فدا حسین نے کہا کہ شاید انہوں نے شراب پی ہوئی ہے لیکن یہ شراب شراب معرفت تھی۔ یہ ان کی شبِ بیداریوں اور تہجد گزاریوں کا اثر تھا کہ ان کی آنکھیں رات کا فسانہ کہہ رہی تھیں۔ واصف علی واصفؒ کی کیفیات بدلتی رہتی تھیں۔ شاید یہ حالت سکر یا صحو ہو، عنایت اللہ نے چشتی نظامی سلسلے کے اس عظیم مردِ درویش، قطبِ ارشاد واصف علی واصفؒ کے ساتھ ہی زندگی کے شب و روز پورے کئے۔ وہ یہ راز جان گئے تھے کہ

حبِ درویشاں کلیدِ جنت است
دشمن ایشاں نصیب دوزخ است

عنایت اللہ کی قسمت پر صرف رشک ہی کیا جا سکتا ہے۔ وہ اب بھی زندگی کی بھرپور حرکیت و فعالیت کے ساتھ سرگرمِ عمل ہیں اور ان دنوں کلر سیداں میں القائم یونیورسٹی قائم کرنے کے بعد عربی، فارسی، پنجابی، انگریزی، اردو، چینی، جاپانی، سنسکرت زبانوں کی تدریس کا ارادہ رکھتے ہیں۔ عنایت اللہ نے اپنی زندگی مخلوقِ خدا کی خدمت اور فلاحِ انسانیت کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ خدا انہیں اپنے مشن میں کامیاب و کامران کرے۔ آمین۔

باباجی عنایت اللہ صاحب ڈپٹی فوڈ کنٹرولر اسلام آباد ریٹائر ہوئے ہیں۔ آپ واصف علی واصفؒ کے قریبی حلقۂ احباب میں شامل رہے ہیں اور اُن سے بے پناہ کسبِ فیض کیا۔ اس وقت تک آپ کی مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں:۔

(1) آئینہ وقت (2) صدائے وقت (3) ندائے وقت (4) آوازِ وقت
(5) نادِ وقت (6) چراغِ وقت (7) انقلابِ وقت (8) مسیحائے وقت
(9) نوشتہ وقت (10) بلائے وقت (11) دہشت گرد کون

علامہ محمد یوسف جبریلؒ نے اُن کی علمی تصنیف ''آئینہ وقت'' کے دیباچے میں لکھا ہے کہ:۔

''جناب عنایت اللہ صاحب ایک نہایت درد مند دل رکھنے والے نہایت ہی باشعور مسلمان ہیں۔ آپ نے عمر بھر اسلام کی خدمت اور مسلمانوں کی بھلائی کو اپنا وطیرہ بنائے رکھا۔ یہ کتاب ''آئینہ وقت'' جو اُنہوں نے تحریر کی ہے، اِسی اسلامی جذبے اور اِسی درد مندی کی عکاسی کرتی ہے''۔

باباجی عنایت اللہ، علامہ محمد یوسف جبریلؒ کے انتہائی قریبی حلقۂ احباب میں شامل رہے ہیں۔ وہ اُن کے ملی و قومی نصب العین اور ملتِ اسلامیہ کے لیے درد کو شدّت سے محسوس کرتے ہیں۔ اُن کے علمی کام کو دیکھ کر علامہ محمد یوسف جبریلؒ نے فرمایا تھا کہ ''عنایت اللہ! آپ نے میرے علمی مشن کو آگے بڑھایا ہے''۔

باباجی عنایت اللہ صاحب کی علمی تصنیف ''صدائے وقت'' پر پروفیسر شوکت محمود کنڈان نے ایک مبسوط مضمون لکھا ہے۔ پروفیسر شوکت محمود کنڈان' واصف علی واصفؒ کے چھوٹے بھائی ہیں۔ آپ باباجی عنایت اللہ کی علمی تصنیف ''صدائے وقت'' کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ :۔

''آپ واصف علی واصفؒ کے ساتھ اس زمانے سے ہیں، جب واصف علی واصفؒ صرف ملک واصف تھے اور انگریزی ادب کے ایک استاد تھے۔ اس سارے سفر کی کہانی کے اگر کوئی چشم دید گواہ ہیں تو وہ راقم الحروف یا جناب عنایت اللہ صاحب ہیں جو ہر وقت سایہ کی طرح اُن سے منسلک رہے۔ آپ قبلہ واصف علی واصفؒ کے ساتھ ان تمام مزاروں پر دن رات عازمِ سفر رہے جو انہوں نے اپنی زندگی میں دیکھے۔ آپ نے قال سے حال تک اور پھر صاحبِ حال تک تمام منازل دیکھیں۔ شب و روز ان بزرگ ہستیوں کی بھی زیارت سے بہرہ مند ہوئے جن سے قبلہ واصف علی واصفؒ ملے۔ قبلہ عنایت اللہ صاحب کا یہ اعزاز ہے کہ انہوں نے ان ہستیوں کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ یہی وجہ ہے کہ باباجی عنایت اللہ صاحب کی بات میں یہ کاٹ، یہ درد، یہ کرب، یہ لذت، یہ فکر اور یہ بے چینی موجود ہے۔ انہوں نے ان ہستیوں کے فیض کا دامن نہیں چھوڑا۔ خواہ وہ 1965ء کی جنگی راتیں ہوں یا 1970ء کی گولا برساتی ہوئی آگ اگلتی توپوں کے منہ میں لے جانے کی بات ہو باباجی عنایت اللہ صاحب نے کبھی نہ نہیں کی''۔

علامہ محمد یوسف جبریلؒ کی واصف علی واصفؒ سے قیامِ لاہور کے زمانے میں طویل ملاقاتیں رہیں۔ وہ انگلش کالج کے قیام کے دوران روزانہ (تقریباً دو برس) ان کے پاس تشریف لے جاتے رہے، وہاں فلسفہ' سائنس' روحانیت' مذہب' انگریزی' فارسی اور عربی ادب' تصّوف اور موجودہ دور کے حل طلب اہم مسائل پر گفتگو جاری رہتی۔ واصف علی واصفؒ علامہ محمد یوسف جبریلؒ کے پاس واہ کینٹ بھی تشریف لائے۔ فرمایا کہ میرا کام مکمل ہو گیا ہے۔ جس پر علامہ محمد یوسف جبریلؒ نے یہ جواب دیا کہ '' میرا کام باقی ہے''۔ یہ راز و نیاز کے معاملات ہیں۔ فقرا اور اولیا اللہ اپنی متعین شدہ ڈیوٹی ضرور پوری کرتے ہیں اور قوم کی امامت و راہنمائی کا فریضہ سرانجام دے کر اس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔

جناب واصف علی واصفؒ دنیا سے پردہ فرمانے سے قبل علامہ محمد یوسف جبریلؒ کے پاس تشریف لائے اور علامہ محمد یوسف جبریلؒ سے اپنے پردہ کرنے کا تذکرہ کیا۔ تاریخ بھی بتائی۔ علامہ محمد یوسف جبریلؒ نے ان کے لیے ایک طویل دعا کی جس میں تمام عالمِ انسانیت کے لیے بہتری کا وقت آنے کی دعا بھی کی۔

حضرت واصف علی واصفؒ اپنی موت سے آگاہ تھے۔ انہیں اپنی موت کی تاریخ کا بھی علم تھا۔ وہ علامہ صاحب کے پاس آئے تو ایک چارپائی پر لیٹے رہے اور مسلسل چھت کی طرف دیکھتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ آفاق میں گم ہیں۔ علامہ محمد یوسف جبریلؒ نے ان سے بہت دیر تک باتیں کیں۔ وہ بہت خوش تھے اور انہوں نے اِس کا اظہار بھی کیا۔ واصف علی واصفؒ مسلسل علامہ صاحب کی گفتگو سنتے رہے۔ اس گفتگو میں بغداد کے سفر سے لے کر این مری شمل سے ملاقات تک کے واقعات شامل تھے۔ علامہ محمد یوسف جبریلؒ نے جس بات پر زیادہ توجّہ دی وہ موجودہ دور کی معاشی' سیاسی اور سائنسی تباہ کاری کے واقعات' مادہ پرستی کا خاتمہ اور روحانی نظام کا احیا، ملحدانہ فلسفے کے خلاف علامہ صاحب کی تحریک اور آنے والے واقعات تھے۔

واصف علی واصفؒ نے آج کے عہد کے انسان کی ذہنی، عصبی، نفسیاتی اور جذباتی الجھنوں کو حل کرنے کی کوشش کی جب کہ علامہ محمد یوسف جبریلؒ نے ایٹمی جہنم اور مادی جہنموں کو روحانی شعور سے بجھانے کے لیے قلم اٹھایا، تحریکِ تحفظ واستحکامِ پاکستان کے لیے کام کیا اور ملتِ اسلامیہ کے عروج و سربلندی کے لیے سوچتے رہے۔ علامہ محمد یوسف جبریلؒ اس بات پر مصر رہتے تھے کہ حضرت واصف علی واصفؒ انگریزی ادب سے تصوّف کی شاہراہ پر چلیں کیونکہ ان کے پاس روحانی توجّہ بہت زیادہ تھی۔ علامہ محمد یوسف جبریلؒ نے یہ بھی فرمایا کہ حضرت واصف علی واصفؒ ایک دن روحانیت میں اعلیٰ مقام حاصل کریں گے، ان کی یہ بات یقینی طور پر درست ثابت ہوئی۔

ڈاکٹر احسان اکبر وطنِ عزیز کے نامور شاعر، محقق اور نقاد ہیں۔ آپ نے غزل و نظم میں اپنی جداگانہ شناخت قائم کی۔ ڈاکٹر احسان اکبر کا شعری مجموعہ "ہوا سے بات" ملک بھر کے علمی وادبی حلقوں سے داد و تحسین وصول کر چکا ہے۔ آپ نے قرطاس و قلم سے عمر بھر رشتہ قائم رکھا اور گورنمنٹ ڈگری کالج سٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی سے ریٹائرمنٹ کے بعد پنجاب یونیورسٹی لاہور سے "پاکستانی ادب" کے موضوع پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے۔ آج کل بزم حمد و نعت اسلام آباد کے صدر ہیں۔ باباجی عنایت اللہ نے 1999ء میں مغربی جمہوری نظام کے خاتمے کی جدوجہد کا آغاز منظوم انداز میں شروع کیا جسے ڈاکٹر احسان اکبر نے اولاً ملاحظہ فرمایا تو انہوں نے مشورہ دیا کہ آپ اپنے ان انقلابی خیالات کو نثری اسلوب کے قالب میں ڈھالیں۔ انہوں نے اس مشورے پر عمل کیا اور اس وقت تک ان کی اس موضوع پر گیارہ کتابیں چھپ کر آچکی ہیں۔ ڈاکٹر احسان اکبر باباجی عنایت اللہ کی پہلی علمی تصنیف "آئینہ ءوقت" میں رقم طراز ہیں کہ :۔

عنایت اللہ صاحب ان مقربانِ خاص میں سے ہیں جنہیں جناب واصف علی واصف صاحب جیسے درویش طبع دانشور کی خدمت میں رہنے کا شرف انتہائی ابتدائی زمانہ سے نصیب رہا ہے۔ سرکاری ملازمت کی مصروفیات کے باوجود انہوں نے اپنے رفیقِ خاص کی خدمت میں اپنے وقت اور وسائل دونوں کا نذرانہ دیا ہے اور مسلسل دیا ہے مگر جناب واصف علی واصفؒ کے رخصت ہو جانے کے بعد نہ انہوں نے جناب واصف علی واصف مرحوم صاحب سے اپنے مراسمِ خصوصی اور نیازِ دیرینہ کا چرچا کیا، نہ ان کی جاں نشینی کے لئے اپنے نام کو اچھالنے کی اجازت دی۔ یہ سچے فقیروں کا شیوہ ہوتا ہے کہ وہ صرف صدق کی یافت کے لئے کوشاں رہتے ہیں، مفاد کی یافت ان کا مقصد کبھی نہیں ہوتا۔ ملی اور قومی دردمندی کے جس رشتے نے انہیں جناب واصف علی واصف صاحب سے جوڑے رکھا تھا، اسی نے انہیں ملکی، سیاسی اور معاشرتی احوال کی زبوں حالی کی اصلاح پر راغب کیا ہے۔"

اشفاق احمد اردو ادب کی ایک معروف و ممتاز شخصیت گزرے ہیں۔ ان کا افسانہ "گڈریا" ہی انہیں اردو دنیا میں زندہ رکھنے کے لئے کافی ہے، وہ تلقین شاہ کے نام سے پچیس سال تک ریڈیو سے فیچر بھی نشر کرتے رہے جو بے پناہ مقبول ہوئے۔ اشفاق احمد کے لیکچرز "زاویہ" کے نام سے چھپ چکے ہیں۔ اشفاق احمد باباجی عنایت اللہ کے انتہائی قریبی دوستوں میں سے ہیں۔ اشفاق احمد فرماتے ہیں :۔

کتاب "آئینہ وقت" کے مصنف کو میں عرصہ پچیس سال سے جانتا ہوں اور اس کے ساتھ وقت کی ہر بنت سے گذرا ہوں۔ جو دن، دوپہر، شام، رات اور صبح کاذب اور صادق کے درمیان نئے نئے چھاپے چھاپتی اور نئے نئے رنگ ابھارتی ہے۔ عنایت کو میں نے اچھے، برے، تلخ، ترش، کھچاوٹ،

کملاوٹ اور کرب و بلا کی کیفیتوں میں بھی دیکھا ہے، اس پر بوجھ بھی ڈالا ہے اور اس کا بوجھ اٹھایا بھی ہے لیکن ! عنایت اللہ کے موجودہ روپ کا اشارہ مجھے ماضی میں کبھی نہیں ملا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک روز جب گولڑہ موڑ پر پہنچے گا تو اس پر ''آئینہ وقت'' جیسی کتاب وارد ہو جائے گی۔''

یوں تو مغربی طرزِ جمہوریت پر حضرت علامہ نے بھی بڑی شدید تنقید کی ہے اور ملتِ اسلامیہ کی بڑی بڑی اور معتبر دینی جماعتوں نے بھی اس کے منفی اثرات و آثار سے مسلمانانِ عالم کو آگاہ کیا ہے لیکن جس سادگی، صفائی، خلوص اور دردمندی کے ساتھ عنایت اللہ نے اس بلائے بیدرماں کا تجزیہ کیا ہے، وہ ایک معمولی فہم و فراست رکھنے والے ذہن میں بھی بہ آسانی آجاتا ہے۔ اس کی مزید وضاحت کے لئے آخر کے اکیس سوالوں میں ڈائیر کٹ ایکشن کی روح کارفرما ہے۔ یہ سوالات نہیں ہیں، ہماری معاشرتی، ملی، سیاسی، دینی اور اقتصادی زندگی کے انڈیکیٹر ہیں۔ جس طرح انسانی تاریخ میں بعض ایسے صحت مند موڑ موجود ہیں۔ جنہیں معمولی لوگوں، معمولی کتابچوں، اور معمولی عملوں نے آنے والی نسلوں کے لئے مستقل کر دیا ہے۔ اسی طرح مجھے لگتا ہے کہ عنایت اللہ کا ''آئینہ وقت'' بھی تعمیرِ انسانیت کے کسی عظیم منصوبے کے لئے ڈائنامائیٹ بن کر طاغوت کی ازلی بربادی کا سامان بن جائے گا۔

بابا عنایت اللہ وطنِ عزیز میں مغربی جمہوریت کے زیرِ اثر قومی سطح پر انحطاط و زوال اور تہذیبی و ثقافتی شکست و ریخت کو موضوع بناتے رہے۔ انہوں نے موجودہ پاکستان کے سیاسی نظام پر بھی زبردست تنقید کی ہے۔ علامہ یوسف جبریلؒ ''صدائے وقت'' پر قلم اٹھاتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ :۔

''صدائے وقت ایک آواز ہے جو رات کے پچھلے پہر آسمان سے اتر کر انسانی بستیوں کے گلی کوچوں میں پھرتی ہوئی مسجدوں کے اندر سے گھومتی ہوئی ریگزاروں، دریاؤں، پہاڑوں، وادیوں اور سمندروں کے اوپر سے چاند کی پراسرار اور سحر انگیز مگر غیر مرئی چاندنی کی صورت میں گزرتی ہوئی اپنا اثر چھوڑتی چلی جاتی ہے۔''

فصل 2۔ واصف علی واصفؒ عنایت اللہ کی نظر میں:

فقر کے گلستان میں خیال کی دھمال، الفاظ کا مضراب، روحوں کی مستی کے گھنگرو، انسانیت کی رہنمائی کے چراغ، دکھی دلوں کی راحت کے اسباب، کن فیکون سے پہلے کی بات کے عارف، شب بیداری کی نگری کا نور، غور و فکر کے چراغ کا روشن الاؤ، ملفوظات کے چراغوں کا نور، دین کی بیداری کا کیمیا گر، امیر خسرو کی سروں کا ساز، نظام الدین، علاؤالدین، بابا فرید شکر گنجؒ، بختیار کاکیؒ، اجمیری خواجہؒ اور داتا گنج بخشؒ کی مست نگری کا مست گر۔ مولائیؒ میکدے کا ساقی، ماٹی کی مورتی کا سندر پھول، گیانیوں کا گیانی، رندوں کا رند، مستوں کا مست۔ میانی صاحب میں مست نگر بسا کر باب العلم کے در کا فیض جاری کئے بیٹھا ہے۔ عنایت مسکین گوید کہ واصف باکمال آج بھی اپنے مسکینوں کو حضوری مے پلاتا ہے۔ دین کی روشنی سے بجھے دلوں میں خیر کی شمع جلاتا ہے۔ دنیا کے ظلمت کدے میں رشد و ہدایت کے منور چراغ روشن کرتا ہے۔ اخوت و محبت کے دیپ جلاتا ہے۔ درودِ تاج سنانے والا یہاں روح کی مرادیں پاتا ہے۔ باب العلم اور مدینۃ العلم کے در کا فیض جاری کرتا ہے۔

۱۸ جنوری ۱۹۹۳ء کی الوداعی رخصتی کی تاریخ سر عام دو سال قبل بتانے والا، گفتگو کی محفل میں رموزِ حیات و ممات کا عارف، حقیقت کو افشاں کرنے والا خدائی رازداں، دلوں اور روحوں میں اترنے والا واصفِ باصفا، اپنے پرائے کو گلے لگانے والا اہلِ وفا، صحرا میں نقشِ قدم ڈھونڈنے والے مسافروں کا رہنما، بھولے بھٹکوں کو راہِ راست دکھانے والا خضرِ راہ، بیمار روحوں کو شفا عطا کرنے والا مسیحا، انسانیت کا مربی، دین کی شمع کو ہاتھوں میں تھامے، دلوں کے در پر دستک دیتا، ہر دکھ کی دوا، ہر مرض کی شفا، ہر مشکل کی کنجی عطا کرتا، ابدی زندگی کے خاموش سفر پر روانہ ہے۔

انکی گفتگو کی سینکڑوں کیسٹیں بھری پڑی ہیں، جن سے آنیوالی نسلیں روحانی فیوض کے انمول موتی حاصل کرتی رہیں گی۔ یہ آواز اور یہ کیسٹیں بھرنے کا شرف محترمی جناب اشفاق احمد خان صاحب کیلئے قدرت نے مختص کر رکھا تھا۔ انہوں نے اس محفل میں آتے ہی قبلہ جناب واصف صاحبؒ کی گفتگو کو ٹیپ کرنا شروع کر دیا۔ اسی ٹیپ سے تیار کردہ قبلہ جناب واصف صاحبؒ کی گفتگو کے 22 والیم کتاب کی شکل میں مارکیٹ میں آچکے ہیں۔ ان کی صحبت سے نوازے ہوئے آج کے اشفاق احمد جنہوں نے فزیکل کالج قذافی سٹیڈیم لاہور کے ہال میں ایک ہزار ایک رات کی رفاقتوں میں شمولیت کی، جہاں حاضرینِ محفل سے سوال پوچھ کر بات کا آغاز ہوتا۔ جہاں رات کی محفلوں میں انوار کی میٹھی میٹھی پون پڑتی، جہاں رحمتوں کا نزول ہوتا، جہاں روحانیت کے سوتے پھوٹتے، جہاں انسانیت کے درس جاری رہتے، جہاں ادب و خدمت، عزت و احترام، اخوت و محبت، پیار و شفقت کے الفاظ کو حرمت نصیب ہوتی، جہاں سخن کو حسن و جلوہ کا جمیل لباس عطا ہوتا، جہاں اسوۂ حسنہ کی خیرات بانٹی جاتی، جہاں فقر کا نور منور ہوتا، جہاں رشد و ہدایت کے ہدی خواں تیار ہوتے، جہاں بات کرنے کا سلیقہ تقسیم ہوتا، جہاں خیر کے دیپ جلائے جاتے، جہاں تشنہ لب روح کی پیاس کو بجھایا جاتا، جہاں دنیا کی بے ثباتی کا درس جاری رہتا، جہاں حق گوئی و بے باکی کی گرہ کھولی جاتی، جہاں روح کے سر، تان کا ساز بجایا جاتا، جہاں فقر دھمال ڈالتے، جہاں رحمتیں رقص کرتیں، جہاں خیال کا الاؤ روشن ہوتا، جہاں شب بیداری کے عمل سے گذارا جاتا، جہاں ذات کو صفات سے نوازا جاتا، جہاں انسانیت سازی کے روحانی علوم کا گیان دیا جاتا، جہاں اشفاق سخنوں اور شفقتوں سے لبریز ہوتے رہتے۔ جہاں سخنوں کو الفاظ کے لباس کا عرفان دی اجاتا۔

جہاں اشفاق صاحب کی دنیا میں ایک عجیب نکھار پیدا ہوتا رہتا۔ جہاں اشفاق عظیم انسانیت دوست فقیر۔ روحانی بابا بننے کی مسافتیں طے کرتے رہے۔ اللہ تعالیٰ اشفاق صاحب کو اللہ کے نیک بندوں کا عطا کیا ہوا عرفان اور اس عرفان کے فیض کو اپنی میٹھی شیریں زبان سے تقسیم کرنے کی توفیق میں مزید اضافہ فرماویں۔ آمین۔ انہوں نے حاضرینِ محفل کے ہمراہ روحانیت کے خوب خزانے لوٹے۔ رات آٹھ نو بجے سے لیکر صبح ایک دو بجے تک شب بیداری سے دوسرے احباب کے ساتھ مل کر روح کی پیاس بجھاتے۔ اسکے بعد اپنے اور اپنے احباب کے گھروں میں جناب واصف صاحبؒ کی محفلوں سے استفادہ کرتے رہے۔ اشفاق صاحب کی دلی خواہش کا حصہ تھا کہ جناب واصف صاحبؒ کی روح پرور خیالات پر مشتمل گفتگو کو انکی زبانی پوری انسانیت تک پہنچایا جا سکے۔ "زاویہ" پروگرام کی ریہرسل شہنشاہ صاحب کی نگرانی میں لاہور کے ٹی وی ہال میں ہوئی لیکن نامعلوم وجہ سے حکومتی سطح پر یہ پروگرام عوام الناس کے سامنے نہ آسکا۔ اس پروگرام میں جناب اشفاق احمد صاحب، جناب نیازی صاحب، چوہدری بشیر احمد صاحب پرنسپل فزیکل کالج قذافی سٹیڈیم لاہور، جناب سلیم صاحب، دو تین طالبعلم اور راقم شامل تھے۔ آج اسی انداز میں ٹی وی پروگرام "زاویہ" میں اشفاق

صاحب،لاکھوں، کروڑوں انسانوں کو مرلی من موہن والی کے دلکش، دلربااور روح پرور صداقتوں پر مشتمل پروگرام پیش کر کے ان طویل محفلوں کی صحبت کے فیض کی خوشبو پھیلانے میں کوشاں ہیں۔ یہ پاکستان کے ہی نہیں بلکہ دنیا بھر کے ٹی وی چینلوں میں ملتِ اسلامیہ کے اس برگزیدہ بابے اشفاق صاحب کا ایک منفرد پروگرام ہے، جس کی صداقتیں دلوں میں اترتی اور جذب ہوتی جاتی ہیں۔ان کا بیان انکا نصیب ہے۔لوگ انکے پروگرام کے انتظار کی گھڑیاں گن گن کر گزارتے ہیں۔اشفاق تو کیسا خوبصورت اور خوب سیرت حسین و جمیل بابا ہے۔ تیری زباں شیریں، تیرا کلام شیریں، تیرے کشکول میں خیر کا لنگر شیریں جو تو بھوکوں اور حاجتمندوں میں تقسیم کرتا رہتا ہے۔ تیرے تمام احباب کو،دوستوں کو،مہربانوں کو،خویش قبیلہ کو،تمہارے جیون ساتھی کو، تمہارے درویشوں کو، فقیروں کو اور تمام مہربان بابالوگوں کو اور تیری بات سننے والوں کو حضور نبی کریم ﷺ کی سلامتی اور شفاعت نصیب ہو۔ آمین ثم آمین۔

فصل 3۔ چوہدری عنایت سے باباجی عنایت اللہ تک: تحریر فیضان غنی

برسوں پہلے میں سیڑھیاں چڑھ کر ایک افسر سے ملنے کے لئے ایک دفتر میں داخل ہوا۔ایک شخص سے پوچھا۔"صاحب ہیں"۔اس نے دروازے کی طرف اشارہ کر کے کہا"اندر ہیں"۔ میں نے ادھ کھلے دروازے سے اندر قدم رکھا۔ نظر دوڑائی،افسر تو محوِ تنہائی تھا۔ تھوڑا سا کھنکھارا تو اس شخص میں زندگی کے آثار ہویدا ہوئے۔ دفتر پر ایک نظر پڑی تو حیرتم میں چلا گیا کہ دفتر کی دیواروں پر اسم ربِ جلیل، حضور نبی کریم ﷺ کے اسمِ مبارک ،آیاتِ قرآنی، سورۃ مدثر، سورۃ یسٰین، سورۃ مزمل، خوبصورت دلکش فریموں میں سجی لٹکتی ہوئی پائیں، میں سٹپٹا گیا۔ یہ شخص چوہدری عنایت اللہ سرکاری افسر ہے یا کسی پیر خانہ کا متولی؟ میں وضع قطع دیکھ کر پوچھے بغیر ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ سیدھے سادھے آدمی کو دیکھ کر ہر کسی کا حوصلہ بڑھ جاتا ہے۔وہ شخص ٹکٹکی باندھ کر میرا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ میں نے مدعا بیان کیا کہ فوڈ اور انڈسٹری منسٹری کی مسافتیں کئی ماہ سے طے کر رہا ہوں۔این او سی کے سلسلے میں کہیں سے کامیابی نہیں ہوئی۔ کہنے لگے۔آپ اپنے پیڈ پر درخواست لکھ کر لے آؤ۔آپ کا کام ہو جائے گا۔ میں دنگ رہ گیا۔ جو کام پورا سیکرٹریٹ کرنے سے قاصر نظر آیا کہ گورنمنٹ پالیسی اجازت نہیں دیتی۔اسی کے بارے میں تفصیلات سن کر اس مجہول شخص نے نہ افسرانہ رعونیت کا اظہار کیا،نہ ہی کام کی دشواری کا احساس دلا کر مجھے زیرِ بار کیا،بس کہہ دیا"کام ہو جائے گا"۔ میں نے سوچا یہ آدمی کیا کام کرے گا۔ میں نے بے دلی سے پوچھا"کب آؤں"؟ بولے، دو دن کے بعد فون کر کے آنا۔ میں نے اجازت مانگی تو کہنے لگے۔ گھبراؤ نہیں آجانا۔اللہ تعالیٰ کارساز ہے کام ہو جائے گا۔ میں نے بمشکل دو دن گزارے اور دفتر جا پہنچا۔ بریف کیس سے درخواست نکالی اور پیش کی۔ بولے اپنے والد صاحب کو بلا لاؤ۔ بڑوں کا ہونا اچھا ہوتا ہے۔ میں نے والد صاحب کو فون کیا۔وہ آگئے۔ عنایت اللہ صاحب میری درخواست ،مجھے اور والد صاحب کو لے کر اپنے مجاز آفیسر کے پاس پہنچے۔ انہوں نے عنایت اللہ صاحب کو دیکھا اور بیٹھنے کو کہا۔ عنایت اللہ صاحب بولے۔ یہ غنی صاحب ہیں۔افسر صاحب نے اٹھ کر میرے والد صاحب سے مصافحہ کیا اور چائے کا حکم دیا۔ عنایت صاحب نے کہا کہ جناب۔ یہ ہنر مند ہاتھ ہیں جو چومنے کے لائق ہیں۔انہوں نے فلور ملز کی بیشتر مشینری اپنے ہاتھ سے بنائی اور انسٹال کی۔ ہم نے چائے کا کپ ختم کیا اور افسرِ محترم نے درخواست پر احکامات جاری کئے۔ عنایت صاحب نے شکریہ ادا کیا اور ہم دفتر سے باہر آگئے۔ عنایت اللہ صاحب میرے والد صاحب سے گویا ہوئے کہ آپ کو تکلیف دی مگر آپ کا آنا ضروری تھا۔جو کام کئی مہینوں سے التواء کا شکار

تھا وہ فقط دو یوم کی مدت میں مکمل ہو گیا۔ قیمت پچاس روپے مدت دو یوم کرامت ہو گئی۔ یہ تو کرامت کی شروعات تھی۔ ابھی تو کرامتوں کا فیض نسلوں تک جانا تھا۔ میں بے خبر تھا۔ میں نے خوشی میں اجازت مانگی تو کہنے لگے شام کو کیا کرتے ہو؟۔ میں نے کہا کچھ نہیں۔ کہنے لگے اگر شام کو آجاؤ تو امام بری سرکار چلیں گے۔ میں نے کہا ٹھیک ہے۔ کہاں آؤں؟ کہنے لگے دفتر ہی سے چلے جائیں گے۔ میں نے عنایت اللہ کو دفتر سے لیا اور سفر پر نکلا۔ حاضری دی۔ مجھ پر پہلی مرتبہ دربار میں موجود بے شمار چیزوں کے نصیب کا عقدہ کھلنا تھا۔ ایک کونے پر پڑی جھاڑو مبارک کا عقدہ۔ ایک طاقچے میں دھرا چراغ، جو ابد تک جلتا رہے گا۔ ایک مچ شریف جس میں دہکتا ہوا دھواں، "جیں پھولاں تاں لال نیں"۔ میری زندگی ایسی سمت کی طرف گامزن ہوئی جس پر چل کر خوش نصیبوں سے ملاقاتیں ہوئیں جہاں زندگی ایک مقصد بنتی ہے اور موت ایک عرس۔ اس ایک شام سے شروع ہونے والے سفر نے مجھے طول و عرض میں پھیلے ہوئے رحمت کے چشموں سے سیراب کیا۔ اسی روز شہید اکرم راجہ سے ملاقات ہوئی۔ میری تو کیا ملاقات ہوئی۔ راجہ صاحب اور عنایت صاحب دور کھڑے ہو کر گھنٹوں کسی گھمبیر نکتے پر ایک دوسرے کے ساتھ تبادلہء خیالات کرتے رہے۔ بری ہاؤس کا مے خانہ ہو یا راجہ صاحب ہسپتال میں ہوں، یہ سلسلہ تاحیات چلتا رہا۔ میں ہمیشہ ان سے ایک فاصلے پر ہی رہا۔ راجہ صاحب سے رخصت لے کر عنایت اللہ صاحب آہستہ آہستہ قدموں سے بڑھنا شروع ہوئے۔ رات کے اس پہر زمین پر کورے کی تہہ جمنا شروع ہو گئی تھی۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا کہ میں اور عنایت صاحب بری امامؒ جاتے، دروازے پر بہت آہستہ سے دستک دیتے، نہ جانے اندر موجود راجہ افسر صاحب المعروف بابا جھاڑو کش صاحبؒ کس طرح دستک سنتے، دروازہ کھلتا۔ بابا جھاڑو کش شدید سردی کے موسم میں بھی قمیض سے بے نیاز ہوتے۔ فوراً قمیض پہنتے اور کہتے۔ آؤ، آؤ! اندر بیٹھو، سردی ہے۔ وہ چینک اٹھا کر چل پڑتے۔ ہم بہت اسرار کرتے کہ ضرورت نہیں ہے۔ وہ جھکی کمر کے ساتھ اس ہوٹل کی طرف چل پڑتے جو آج بھی چوبیس گھنٹے کھلا رہتا ہے۔ دودھ پتی لاتے، پلاتے اور خوش ہوتے۔ کلو واشر بو کہتے۔ کھاؤ پیو عیش کرو۔ وہاں بھی ایک بات تھی۔ خاموشی میں گفتگو تھی۔ آنکھوں کے رستے چاہتوں کے سوتے پھوٹتے۔ باباجی عنایت اللہ صاحب سے حال احوال پوچھتے، گفتگو کرتے۔ وہ کہتے کہ بھائی صاحب آئے تھے یعنی راجہ اکرم صاحب آئے تھے، میری ان سے بات ہو گئی ہے۔ راجہ بابا اور عنایت اللہ صاحب گفتگو میں مشغول رہتے، میں نہ سمجھنے کے باوجود بیٹھا رہتا۔ باباجی ہمیشہ ایک بات پر انتہائی صدق سے زور دیتے کہ پیر بھائی ماں کے پیٹ سے پیدا بھائی سے آگے ہوتے ہیں۔ ہمیشہ مسکراتے، پیار کرتے، دعا دیتے۔ ایک دن میں اداس تھا۔ وہ میرے دل کی کیفیت جان گئے۔ اپنے گاؤں بن میں بیٹھے تھے۔ موسم خزاں کا تھا۔ نہ میں نے بتایا نہ دعا کا کہا۔ میری حالت نہایت خراب تھی۔ کہنے لگے۔ بھائی جی۔ یہ موسم ہے۔ یہ خزاں کا موسم ہے۔ اس لئے ہر شے خوش نہیں افسردہ ہے۔ موسم بدل جائے تو پھر نوری لاٹیں پھٹنی شروع ہو جائیں گی۔ موسم تو بدل ہی جائیں گے۔ ان کے نور کی لاٹوں (جو انہوں نے اپنی لمبی مضبوط انگلیوں سے آسمان کے کینوس پر قوسِ قزاح کی طرح بکھیریں) سے میرے دل کا تمام اندھیرا رنگوں سے بھر گیا۔ میں حق الیقین میں چلا گیا۔ میں جب انکے گھر کی ڈھلوانیں اتر رہا تھا۔ میری دنیا میں بہار کی خبریں آنا شروع ہو گئیں۔ الفاظ، کیفیت کے کیف کو بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ ساز فقیر کی انگلیوں کی مضراب سے چھڑتے ہیں۔ انسان کردار کو دیکھتے ہیں جانتے ہیں۔ اللہ دل کو جانتا ہے۔ فقیر کی دنیا میں دل کی اصل قدردانی ہے۔ لطیف جذبوں والا دل نفرت و بغض سے پاک دل کثافت سے مصفی دل، لطیف دل، وہ دل جو شرح صدر میں رہتا ہے۔ عنایت اللہ صاحب کے ساتھ دن رات مسلسل سفر میں رہا۔ اگر رات کو گھر آ بھی

گئے تو اپنے اپنے فون اٹھا لئے اور اذان کے وقت بات قطع ہوئی۔ ماضی کی معافی اور مستقبل کی خوش حالی کا راز حال کی جدوجہد میں چھپا ہے۔ عنایت اللہ صاحب کے ساتھ نہ ماضی میں کوئی ندامت ہے نہ ہی حال بد حال ہے۔ نہ ہی اب مستقبل کی کوئی فکر ہے۔ عنایت اللہ صاحب کے ساتھ سفر کے دوران ایک عجیب کیف محسوس کرتا۔ عنایت اللہ میرے ساتھ خاموشی سے بیٹھے رہتے۔ میں بھی خاموشی سے بیٹھا رہتا۔ مجھ پر خاموشی انتہائی گراں گزرتی۔ میں کہتا کیسا ظالم آدمی ہے بات تک نہیں کرتا۔ اپنی دنیا میں گم رہتا ہے۔ میں تو زیر بارِ احسان تھا بولتا کیسے۔ میں برائے اظہار غصہ کار کا ڈیک اونچی آواز میں لگا دیتا۔ اب تو تکلیف پہنچے گی۔ اب تو کم از کم آواز کم کرنے کا کہیں گے لیکن پوری زندگی میں یہ خواب شرمندہء تعبیر نہ ہو سکا۔ جس صاحب کے پاس پہنچتے بات سنتے۔ اگر میں ایک یا دو جملے غلطی سے بول اٹھتا تو عنایت اللہ انتہائی غصے سے مجھے دیکھتے۔ واپسی پر تمام راستے انتہائی سرزنش کرتے، کہتے۔ ہم بات سننے جاتے ہیں۔ اگر بات کہنے کا سلیقہ نہ ہو تو بولنا ہی نہیں چاہیئے۔ بات سننے کا حوصلہ پیدا کرو۔ آج ان کی ہر بات اچھی لگتی ہے۔ تو اس کا لطف، اس کا عطر، اپنے اندر انڈھیل کر خاموشی سے لطف لیتا ہوں۔ اگر بات سمجھ نہ آئے تو اپنی جہالت پر ندامت ہوتی ہے۔ اس دوران ایسے ایسے گوہر نایاب ملے کہ اللہ کی کریمی پر بین دلیل بن کر بیٹھے تھے۔ سائیں محمد حسین بالکا کانواں والی سرکارؒ، گجر خان کے پاس انصاف و مساوات کا حقیقی مظاہرہ دیکھا۔ لنگر میں مساوات کا خیال اس حد تک کہ کم سن بچے سے لے کر حکامِ زمانہ تک ایک سی خوراک ایک سے برتن، ایک ہی جگہ متعین تھی ،وہیں سب بیٹھتے اور لنگر استعمال میں لاتے۔ اگر وزیر، مشیر، حکام اس جگہ بیٹھ گئے جہاں باری آخر میں آنی ہے، تو کسی کو مجال نہ تھی کہ وزیر، مشیر، حاکم، محکوم کو لنگر پہلے دے دے۔ امام بریؒ سرکار والے راجہ بابا جاروبؒ اور سائیں محمد حسین بالکا کانواں والی سرکار سے ہمیں ہمیشہ زادِ راہ ملتا، چادریں ملتیں، اگربتیاں ملتیں، عرق گلاب ملتا، دعا ملتی، سلام ملتا، ہم دونوں یہ باتیں اور چیزیں اپنے دل اور اپنی کار میں رکھ کر سفر پر نکلتے۔ حضرت محمود بادشاہؒ سرکار والد گرامی حضرت امام بری سرکارؒ برادر حضرت امام بری سرکار، بابا لال شاہ بیابانیؒ، کلیام شریفؒ، سائیں محمد حسین بالکا کانواں والی سرکارؒ، حضرت پیراں شاہ غازی دمڑی والی سرکارؒ، حضرت میاں محمد بخش کھڑی شریفؒ، حضرت امام شاہ سرکارؒ مرشد سرکار سائیں کرم الہیٰ کانواں والی سرکارؒ (لالہ موسیٰ) سائیں کرم الہیٰ کانواں والی سرکارؒ (گجرات) حضرت سائیں حسن دین سرکارؒ لاہوری، حضرت بی بی پاک دامن، پیر مکی سرکارؒ، حضرت داتا گنج بخش سرکارؒ، حضرت عنایت اللہ شاہ قادریؒ، بابا بلھے شاہ سرکارؒ (قصور)، حضرت کمال چشتی سرکارؒ (قصور)، حضرت بہاول شیر سرکارؒ حجرہ شاہ مقیم، حضرت عبدالقادر ثانی سرکارؒ پیر کوٹ شریف جھنگ، حضرت سلطان العارفین سرکارؒ گڑھ مہاراجہ، حضرت بابا فرید گنج شکر سرکارؒ پاکپتن شریف، ہر نگری میں گپت صاحبِ مزار کو سلام اور تمام موجود فقراء کے ساتھ محفل، یہ سفر اس طرح پانچ روز جاری رہتا۔ تھکاوٹ، بھوک ضرور محسوس ہوتی مگر عنایت اللہ صاحب کہتے کہ یہ اچھا ہے کہ آدمی فطرت کے تقاضوں کو مان لے۔ پندرہ منٹ سو لو۔ میاں جی کے ہوٹل پر عنایت صاحب کی مہربانیوں کا یہ منہ بولتا ثبوت ہے کہ پانچ دن میں پندرہ منٹ ضرور آرام کیا۔ راجہ اکرم شہید بھی ہمیں مانسر کیمپ لے جاتے تو حضرت سائیں کالا خانؒ اسم یامین چشتی کے مزار پر حاضری دے کر مانسر کیمپ جاتے۔ راجہ صاحب کو کمر بستہ پاتے۔ تمام مہمانوں کو پیار سے لنگر برتاتے۔ معزز مہمان نہال ہو جاتے۔ میں راجہ صاحب کو سلامِ عجز پیش کرتا اور ان کے مرشد حضرت انور شاہ سرکارؒ، سائیں کلو سرکارؒ کے مزار میں جائے پناہ ڈھونڈھتا۔ راجہ صاحب نظم و ضبط کے خاص وصف سے متصف تھے۔ عرس امام بریؒ پاک کے آخری دن عام و خاص کا اکٹھ حضرت اکرم شہید کا ایک خاص مقصد کے ساتھ جہد تھا۔

وہ آج بھی جاری ہے۔ جب کوئی عالمِ دین فرقہ پرستی یا اسلامی معیار سے ہٹ کر بات کرتا تو فوراً بھرے مجمع سے عنایت اللہ صاحب کے پاس آتے اور تلملا کر کہتے۔ اپنے خاص انداز کی بات کرتے اور خاموش ہو جاتے۔ فقیر منش انسان تھے۔ ان کی آغوش وسیع تھی۔ میں آج سائیں حافظ محمد اقبالؒ، حضرت واصف علی واصفؒ، علامہ محمد یوسف جبریلؒ، راجہ اکرم شہید، راجہ بابا المعروف جھاڑو کشؒ، محترم خان بابا چائے والا ایم اے او کالج لاہور، جناب اشفاق احمد صاحب، جناب ممتاز مفتی صاحب، شورش ملک صاحب، آپا بانو قدسیہ، محترمہ آپا عائشہ، بابا عبداللہ ہوٹل والے، شاہ صاحب جی بابا کالا خان صاحب والے، جانے کتنے لوگوں کا مقروض ہوں، ان کے احسانات کا صلہ صرف اللہ ہی دے سکتا ہے۔ بندہ قاصر ہے۔

کسی نے ارشاد فرمایا۔ "عشق میں شکوہ مترادفِ کفر ہے۔ التجا نہ کرنا یہ مترادفِ حرام ہے"۔

کسی نے ارشاد فرمایا کہ "لوگوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کا بھرم نہ توڑنا، اللہ تمہارا بھرم نہیں توڑے گا"۔

کسی نے ارشاد فرمایا کہ "فیضان تم نے محفل میں دعا کا کہہ کر مجھے محفل میں گالی دی، جن دلوں میں حب ہو وہ نہیں کہتے، کہہ دیں تو وہ حب نہیں ہوتی "۔

کسی نے ارشاد فرمایا کہ " دیدہ ور لوگ خواہش پوری کرتے ہیں یا خواہش ختم کر دیتے ہیں"۔

چوہدری عنایت اللہ اب باباجی عنایت اللہ ہیں، نہ تو ادیب ہیں نہ فلاسفر، نہ لکھاری۔ وہ تو ایک حضوری مے کے نشے میں مسحور ہیں۔ ایک مجبور انسان ہیں۔ ایک ڈیوٹی کے بندے۔ باباجی عنایت اللہ واللہ ایک لکھاری نہیں مگر ایک فرض کے تحت مجبور ہیں کہ لکھیں۔ باباجی کی پہلی تحریر نثر نہیں نظم تھی جو کہ حضرت امام بری سرکارؒ کے نام لکھی گئی۔ نعتیں لکھیں، بارگاہِ صمدیت میں عقیدت کے پھول پیش کئے۔ ماضی کے دریچوں میں یاد کے اوراق پلٹتا ہوں تو بابا عنایت یہ کہتے ہوئے یاد آتے ہیں کہ ایک ایسا وقت آئے گا کہ ہم عوام الناس کی زندگی نہ جیئیں گے نہ عوام الناس کی موت مریں گے۔ ایک مقصدِ حیات ہو گا جس کی پذیرائی ہو گی۔ خوفِ خدا ایک جواب دہی ہے۔ اختتامِ زندگی ہمہ وقت ایک شعور ہے۔ اپنے محکوم اور اللہ کے حاکم ہونے کا ہر پل ورد ہے۔ وحدت انسانیت کے لئے بہترین ستون ہے۔ اللہ تعالیٰ باباجی عنایت اللہ کو اس عظیم مقصد میں کامیاب کرے۔ آمین۔ اپنے لئے ہمیشہ بھلائی کا طالب فیضان غنی۔

فصل 4 : کوّا فطرت اور روحانیت کی درسگاہ، تحریر باباجی عنایت اللہ:

کوّا فطرت اور روحانیت کی درسگاہ کا ایک خاموش مبلغ ہے۔ یہ بیحد ہوشیار، چاق و چوبند اور ذہین و فطین پرندہ ہے۔ یہ کسی شخص کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتا۔ کوّا کبھی کسی کا اسیر نہیں ہوتا۔ اگر دنیا میں آج تک کسی نے کوّوں کو اسیر کیا ہے تو وہ ایک درویش، خدامست، فقیر جناب سائیں کرم الہیؒ حضور کانواں والی سرکار گجرات شریف والے ہیں۔ آج بھی کوّے انکے مزارِ اقدس پر کائیں کائیں کرتے اور اپنی زبان میں ذکرِ الٰہی میں مصروف رہتے ہیں جیسے ان کی زندگی میں انکے ساتھ رہتے تھے۔ سائیں کرم الہیؒ سرکار کا تعلق سلسلہ قادریہ سے ہے۔ انکے مرشد پاک پیر امام شاہ صاحبؒ چنڈالہ شریف لالہ موسیٰ کے قریب دفن ہیں۔

فصل 5: ہم نہیں جانتے، اشفاق احمد کا باباجی عنایت اللہ کی کتاب "نادِ وقت" پر تبصرہ:

داستان سرائے

۱۲۱ سی ماڈل ٹاؤن، لاہور۔

''ہم عنایت کو نہیں جانتے مگر وہ ہمیں اور ہمارے مسائل کو بڑی اچھی طرح سے جانتا ہے۔ زیرِ نظر کتاب سے پہلے '' آئینہ وقت''، ''صدائے وقت''، ''ندائے وقت''، '' آوازِ وقت''، چار کتابچے لکھ کر ہمارے مسائل کی نشاندہی کی تھی اور انہیں دور کرنے کیلئے کچھ طریقے تجویز کئے تھے مگر وہ کتابیں ایک ضخیم کتاب کے دیباچے کی حیثیت رکھتی تھیں لیکن '' نادِ وقت'' میں اس نے ہم کو ایک اور زاویے سے روشن مستقبل کی آگاہی بخشی ہے۔

ہم عنایت کو نہیں جانتے مگر اس نے یہ علم آستانوں کی دہلیزوں پر بیٹھ کر اور درگاہوں کی جالیوں سے لگ کر حاصل کیا ہے۔ ہمارے لئے اس میں بہت کچھ نیا اور کافی کچھ نرالا ہے۔'' (اشفاق احمد)

فصل 6: فلیپ برائے نادِ وقت، تحریر محترمہ بانو قدسیہ:

انسانی ارتقاء تبدیلی کے بغیر ممکن نہیں۔

تبدیلی ماحول کی ہو، نظریات کی ہو یا خیالات کی، اس سے کئی مسائل جنم لیتے ہیں۔ بنیادی مشکل انسان کو ہر لحظہ درپیش رہتی ہے۔ وہ چاہے تبدیلی کا خیر مقدم کرے یا اسے کلی طور پر رد کر دے، ہر مقام پر اسے دوئی کا سامنا رہتا ہے، وہ یکجائی کو ترستا ہے لیکن تضاد سے خارج نہیں ہو سکتا۔ انسان اپنے فیصلے کے تیر سے خود شکار ہوتا ہے۔ اکیسویں صدی نے مادیت کو اپنا کر اور بالآخر ماحول کی تبدیلی کو قبول کر کے اپنے لئے اعتقادات، نظریات اور خیالات کے ایسے تضادات کو اجاگر کیا ہے کہ آج کا انسان ہر صبح امید کا فلک بوس سکائی سکریپر اسارتا ہے اور اندھیرے سے ذرا پہلے یاس کا خودکش بم گرا کر اپنے ہی ارادوں کو مسمار کر دیتا ہے۔

یہ عہد عجیب کشمکش آمیز آرزو مندی کا ہے۔ اسی لئے اب ادب کی سمتیں بھی پھیلنے لگی ہیں۔ فرد اور معاشرہ اب افسانے، ناول، غزل سے سرکتے سرکتے کتابوں میں ایسے علاج تلاش کر رہے ہیں جو اس ماحولیاتی نظریاتی تبدیلی کا توڑ ہوں، جو اُن کے وہ دیئے نہ بجھائیں جو یقین، امید اور ایمان کے تیل سے جلتے ہیں۔

'' نادِ وقت'' آج کے عہد کی ایک ایسی ہی کارآمد تفکر پر ابھارنے والی جاندار کتاب ہے۔ مادیت اور روحانیت کے درمیان دوئی کے سفر میں سرگرداں تضاد کے ہاتھوں نالاں سفر کرنے والوں کو '' نادِ وقت'' سے وہ تقویت، استقامت اور راحت مل سکتی ہے جس کی تلاش میں وہ ہر مقام اور ہر لحظہ مارے مارے پھرتے ہیں۔ جناب عنایت صاحب کے لئے دعائیں۔ بانو قدسیہ

فصل 7: کرنل غلام سرور ستارہ امتیاز۔ ملٹری: پیش لفظ چراغ وقت

آج کے معروف دانشور بابا عنایت اللہ کی تازہ تصنیف 'چراغ وقت' پڑھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ میرے دل کی کلی کھلی۔ اس بار موصوف کے دل کی گہرائیوں سے کہی ہوئی بات، قاری کے دل پر جا گرتی ہے اور پھر اپنا اثر دکھاتی ہے۔ موصوف نے اس دور کے معروف فقیر دوست عظیم دانشور

حضرت واصف علی واصفؒ سے اکتسابِ فیض کیا ہے اور یہ ان کا فیضانِ نظر ہے کہ بابا عنایت اللہ کا دل عشقِ حقیقی کی آگ سے ہر دم سلگتا رہتا ہے۔ وہ آج کے پریشان حال انسان کے مسائل کو اسلام کی ابدی ہدایت کے آئینے میں دیکھتے ہیں۔ انکی ہر بات پر ایک نکتہ، ہر نکتہ میں ایک تجربہ اور ہر تحریر میں وارداتِ قلب کی جلوہ فرمائی نظر آتی ہے اور ایک شگفتہ متانت انکی تحریروں میں تیرتی نظر آتی ہے۔

بابا عنایت اللہ کا کہنا ہے کہ دینی حکومت کا منتہا و مقصود اللہ تعالیٰ کی اس سرزمین پر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا قائم کرنا ہوتا ہے اور یہ حاکمیت اللہ کے بندوں پر اللہ کی حاکمیت اور اللہ تعالیٰ کے عطا کئے ہوئے ضابطہ حیات کو ملک میں نافذ العمل کر کے قائم کی جاسکتی ہے۔

بابا عنایت اللہ کو اس بات پر دکھ ہے کہ دین کے منکروں اور منافقوں نے امت کے گلے میں جمہوریت اور بادشاہت کا پھندا ڈال کر اس کا دینی تشخص ان سے چھین لیا ہے۔ اس پر متزاد! جمہوری اور بادشاہی طرزِ حکومت کی سرکاری سرپرستی نے مسلمِ اُمہ کو دین کی روشنی سے محروم اور بے دینی کے ظلمات کے سمندر میں دھکیل دیا ہے۔ فاضل مصنف کے بقول! 'جمہوریت' مادہ پرستوں اور اقتدار پرستوں کے نظریات اور کردار کا ایک بھیانک ضابطہ حیات اور نظریات پر مشتمل سیاسی دانشوروں کا مذہب ہے۔ عنایت اللہ صاحب آج کی پریشان حال صورتِ حال کا تجزیہ جب اسلام کی روشنی میں کرتے ہیں تو انہیں اس کا اصل اور بنیادی سبب صرف ایک ہی نظر آتا ہے اور وہ یہ کہ انسان نے مقتدرِ اعلیٰ کی ہستی کو نہیں پہچانا اور رب السمٰوات والارض کو اپنا حقیقی مقتدرِ اعلیٰ تسلیم کرنے کی بجائے اپنے ہی جیسے کسی ایک فرد یا چند افراد کو اقتدارِ اعلیٰ کے بلند ترین منصب پر فائض کر کے انسانوں کے درمیان حاکم و محکوم کے دو طبقے پیدا کر دیئے۔ اس نے بادشاہ کے اقتدارِ اعلیٰ کا مزہ چکھا تو یہ اقتدارِ اعلیٰ پارلیمنٹ کو منتقل کر دیا۔ پارلیمنٹ نے اپنے جوہر دکھائے تو اس نے دستور کی حدود و قیود میں جکڑ کر اسے قابو میں کرنے کی کوشش کی، مگر پارلیمنٹ اور انتظامیہ نے باہم گٹھ جوڑ کر کے اس دستور کے پرخچے اڑا دیئے۔ راہ کا یہ پتھر جب ہٹ گیا یا سرک گیا تو انتظامیہ نے موقع پا کر مقننہ اور عدلیہ کو زیر کر کے اقتدارِ اعلیٰ پر خود قبضہ کر لیا۔ غرض یہ اقتدارِ اعلیٰ ادھر سے ادھر منتقل ہوتا رہا مگر حاکم و محکوم کا بنیادی رشتہ اپنی جگہ پر قائم رہا۔

اس تناظر میں جناب بابا عنایت اللہ صاحب اپنی سوچ کا اظہار یوں کرتے ہیں کہ اسلام کے نزدیک واحد راہِ نجات یہی ہے کہ انسان ہیر پھیر کے سارے راستے چھوڑ کر سیدھی طرح خالقِ کائنات کو اپنا مقتدرِ اعلیٰ تسلیم کرے اور انسان پر انسان کی حاکمیت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے اور اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حقوق کا احترام کرے، اور بشمول سیاست زندگی کے تمام معاملات میں اسکے احکام کی پابندی کرے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آج انسانی فکرِ نظر کی نارسائی اور عقلی دستور کے درماندگی کے اصل اسباب کیا ہیں۔ اس ضمن میں یہ بات واضح ہے کہ اس سارے بگاڑ کا اصل سبب صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ ہم نے مقتدرِ اعلیٰ کی ہستی کو فراموش کر دیا ہے اور خود ساختہ خداؤں کو اپنی اطاعت و فرمانبرداری کا مرکز بنا لیا ہے۔ یہی جھوٹے خدا آج ہماری گردن دبوچ رہے ہیں اور ہمارے حقوق پامال کر رہے ہیں۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو پورا قرآن اسی صراط مستقیم کی نشاندہی کے لئے نازل ہوا ہے۔ زبور شریف، توریت شریف، انجیل شریف اسی شاہراہِ حیات کو اجاگر کرنے کیلئے نازل ہوئیں۔ حضرت آدم سے لیکر سرور کائنات حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ تک تمام انبیاء کرام بھی صرف یہی ایک پیغام لے کر آتے رہے کہ خدا کے بندو! بندوں کو اپنا خدا مت بنانا تم صرف ایک ہی مقتدرِ اعلیٰ کے لا محدود، دائمی، ہمہ گیر اور کائنات کے ایک ایک

ذرے پر محیط اقتدار کے تحت زندگی بسر کر رہے ہو۔اسکے سوا تمہارا کوئی رب، کوئی مطلق العنان حاکم، کوئی مالک، کوئی رازق نہیں۔قرآن میں ایک ایک نبی پاک کے حالات اس بات کے گواہ ہیں کہ ان سب پیغمبرانِ کرام کا مشن ایک ہی تھا۔اپنے اپنے عہد کے شداد، فرعون اور نمرود کا خاتمہ اور اللہ کے بندوں کو ان کی غلامی سے نجات دلا کر حکمِ الٰہیہ سے ان کا رشتہء بندگی جوڑنا مقصود تھا۔

جناب بابا عنایت اللہ صاحب نے اپنی تصنیف میں اقتدارِ اعلیٰ سے کئے گئے عہد کی پابندی اور اس سے رو گردانی کے نتیجے میں انسانی زندگی پر مرتب ہونے والے اثرات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ہماری دعا ہے۔اللہ تعالیٰ انکے لئے اور ہم سب کیلئے آسانیاں پیدا کرے اور آسانیاں تقسیم کرنے کی ہمیں توفیق بخشے۔آمین (غلام سرور 614 ہارلے سٹریٹ راولپنڈی)

فصل 8: چراغِ وقت:

احترامِ آدمیت سے عبارت ہے: فتح محمد ملک صاحب:

باباجی عنایت اللہ صاحب صوفی ہیں مگر تارک الدنیا نہیں۔مجھے انکی یہ ادا بہت پسند ہے۔وہ طریقت اور معرفت کے اس مسلک سے وابستہ ہیں جو اس مادی دنیا کو روحانی روشنی سے نورٌ علیٰ نور کر دینا چاہتے ہیں۔یہ تمنا اس وقت تک پوری نہیں ہو سکتی، جب تک ذاتی مجاہدہء نفس اجتماعی زندگی میں پیوست نہ ہو۔باباجی مادہ زندگی کے ناخوب کو خوب بنانے کی خاطر روحانی زندگی سے روشنی اخذ کرنے میں کوشاں ہیں۔وہ تصّوف کی ان اقدار کو انسان کی اجتماعی زندگی میں عام کرنا چاہتے ہیں جو احترامِ آدمیت سے عبارت ہیں۔اقبال نے کیا خوب کہا:۔

آدمیت احترام آدمی
با خبر شو از مقامِ آدمی
بندۂ حق از خدا گردد طریق
مے شود بر کافر و مومن شفیق

جمیعتِ آدم کا یہ تصور قرآنِ پاک سے ماخوذ ہے۔خلقنا بنی آدم کنفس واحد ہماری تہذیبی روایت میں اس قرآنی تصور کو شیخ سعدی شیرازی کے سے شاعروں نے عوام کے دلوں میں جاگزیں کر دیا ہے۔بنی آدم اعضائے یک دیگرند۔باباجی وحدت آدم کے اس قرآنی تصور کو پوری دنیا میں عام کر دینا چاہتے ہیں۔انکے ہاں اس کارِ خیر کی ابتداء ملتِ ابراہیمی کے اتحاد اور یک جہتی کے تصور کو عملی شکل میں جلوہ گر دیکھنے کی آرزو سے عبارت ہے۔آج کی دنیا میں مختلف مذاہب کے درمیان بنیادی ہم آہنگی کی یہ تلاش ایک نہایت مبارک عمل ہے۔آج دنیائے انسانیت کو نفرت کے زہر کی بجائے محبت کے امرت کی ضرورت ہے۔باباجی نوعِ انسان کی اس اشد ضرورت کو سمجھتے بھی ہیں اور اسے پورا کرنے میں بھی کوشاں ہیں۔انکی زیرِ نظر کتاب ''چراغِ وقت'' ہمارے عہد کی اس ضرورت کو پورا کرنے کی شدید تمنا ہی کا حسین ثمر ہے۔میں اس کتاب کی اشاعت پر انکی خدمت میں، بصد ادب و احترام، مبارکباد پیش کرتا ہوں۔اللہ سبحان و تعالیٰ انہیں اس نیک کام کو اسی جوش و خروش کے ساتھ جاری رکھنے کی ہمت عطا فرمائے۔مجھے اسی موضوع پر انکی مزید کتابوں کا انتظار ہے۔ (پروفیسر فتح محمد ملک چیئرمین، قومی مقتدرہ، اردو بورڈ اسلام آباد)

فصل9: چراغِ وقت: تحریر: بانو قدسیہ صاحبہ:

ہر معاشرے میں گروہ در گروہ مختلف النوع لوگ اپنے اپنے نظریات میں مقیّد، مختلف راہیں اختیار کرتے ہیں۔ انکی سرشت، ماحولیات، رنگ ہر روپ، طبقاتی بانٹ اور اندر صاف اور گندے لہو کا بہنا اسی بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ وہ اپنی فردیت اور اپنے گروہ کی یکجائی کیلئے سر گرداں رہیں۔ اسی میں انسانی بقا اور اسکے ارتقاء کا راز بھی پنہاں ہے لیکن ان ہی لوگوں میں کچھ سر پھرے، حق کی آواز سننے والے ایسے بھی ہوتے ہیں جو انہیں ایک ہی راستہ کی طرف بلاتے ہیں جو سفرِ حیات کا شارٹ کٹ بھی ہے اور ابدی سکون کا ضامن بھی۔ ان ہی لوگوں میں باباجی عنایت اللہ صاحب ہیں۔ وہ سیدھے راستے کی ترغیب دلانے والوں میں سے ہیں لیکن انکا لہجہ ترش نہیں۔ وہ ملامت نہیں کرتے جھڑکا نہیں مارتے سارے کام تجزیے سے کرتے ہیں۔ مغربی تہذیب ہو یا مغرب کا حالیہ مذہب جمہوریت، وہ بڑے سیدھے سادھے انداز میں، اسکے نیک و بد کو دو اور دو چار کی زبان میں بیان کر دیتے ہیں۔ مخلوط معاشرے کا اندیشہ ہو تو بھی وہ سیدھی بات کرتے ہیں جس میں اصولوں کا انحراف کرنے والوں کیلئے مقامِ فکر ہے۔ وہ تمام انسانیت کیلئے محبت کا مرہم لے کر آگے بڑھتے ہیں، اور واضح کرتے جاتے ہیں کہ گناہ اور جرم میں فرق صرف ضابطہ حیات کا ہے، اور یہی ضابطہ حیات قوموں میں اور فرد میں فرق متعین کرتا ہے۔

باباجی عنایت اللہ صاحب کسی قوم، کسی ملک اور کسی فرد کو ساری انسانیت کا اجارہ دار نہیں سمجھتے۔ وہ دعوتِ حق دیتے ہوئے جینے کا حق بھی تفویض فرماتے ہیں۔ ایمان نہ لانے والوں پر ادب اور محبت کا دروازہ بند نہیں کرتے، راہِ راست پر لانے کیلئے انہیں ایٹم بم کی ضرورت نہیں، نہ ہی وہ امریکی سیاست سے سبق حاصل کر کے کسی پر بمباری کر کے اپنی منوانا چاہتے ہیں۔ یہی باباجی عنایت اللہ صاحب کی خوبی ہے اور شاید اس طاقت کے دور میں انکی خرابی بھی! کیونکہ تبدیلی خیر سے بھی آتی ہے اور شر سے بھی۔ خیر شارٹ کٹ ہے اور شر لمبا راستہ۔ اسی لمبے راستے سے باباجی عنایت اللہ صاحب بار بار بچانے کے درپے ہیں کیونکہ بالآخر شر کو خیر پر منتج ہو کر ہی سکون ملتا ہے۔ جب تک شر ساکت نہ ہو اور خیر فعال نہ ہو جائے انسان فلاح نہیں پا سکتا۔ (بانو قدسیہ، داستان سرائے ،۱۲۱۔ سی، ماڈل ٹاؤن، لاہور)

فصل10۔ سلسلۂ واصفیہ (واصف علی واصفؒ) کے رکنِ اعظم عنایت اللہ اور انقلابِ وقت، تحریر احسان اکبر:

سلسلہ واصفیہ کے رکنِ اعظم عنایت اللہ! صاحبِ قلم بھی ہیں صاحبِ نظر بھی، درد مند بھی اور ملی حوالے سے دردمند۔ جب بھی لکھا ملی سلسلہ پر لکھا۔ عاجز ایسے کہ نام سے کام نہیں رکھا۔ صرف کام کیا اور مسلسل کام کیا۔ واصف صاحبؒ قبلہ نے تو عنایت اللہ صاحب کے یہ مضامین نہیں دیکھے مگر اشفاق احمد صاحب نے تو ان تحریروں کو ضرور دیکھا، پسند کیا اور ان پر قلمِ تحسین اٹھایا مگر سب سے پہلے جسے ان مضامین کو دیکھنے کا شرف ملا وہ راقم ہی تھا۔ بلکہ مان لینا چاہیئے کہ راقم ہی سزاوار سوال ہے جس نے عنایت اللہ صاحب سے نثر میں لکھنے کی فرمائش کی تھی۔ اجمال تفصیل یوں ہے کہ آپ نے اس سے قبل کے اپنے ملی خیالات شاعری میں باندھے تھے جس پر میں نے مشاورت نذر کی۔ ان خیالات کو نثر ہی میں راہ درکار ہے۔ آپ کی شاعری ان خیالات کی متحمل نہیں۔ میری جانب سے ایسے مشورے ماضی میں جتنے شعر گوؤں کو دیئے گئے اکثر ان میں سے بدک گئے یا برا مان گئے۔ ان کی طرف سے نثر میں طبع آزمائی کی مثال خال خال ہی ملی۔ سب سے نمایاں خال عنایت اللہ صاحب ہی کا ہے۔ انہوں نے لکھا اور چھاپا، لکھا اور

بانٹا۔ کسی سے حوصلہ افزائی نہ چاہی۔ کسی ناشر سے رابطے کے لئے نہ رکے۔ پنشن موجود تھی کتابیں آتی گئیں۔ یہ تحریریں جن کو اوپر مضامین کہہ کر میں گذر گیا۔ مضامین نہیں سلسلے ہیں، سلسلے مضامین کے، بلکہ سلسلے کتابوں کے، ان کتابوں کو وقتی سلسلہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ہر کتاب میں قافیہ وقت کا لگتا ہے۔ آئینہ وقت، صدائے وقت، ندائے وقت، آواز وقت، نادِ وقت، چراغ وقت اور اب انقلاب وقت آخری مراحل میں ہے۔ عنایت اللہ جیسا کہ بتایا جاچکا ہے وقتی سلسلہ کی تحریریں لکھ رہے ہیں۔ ملکی سیاست اور جمہوریت پر۔ اللہ دے اور بندہ لے۔ طبع رواں ہے سو، رُکے نہیں۔ چلتے رہے اور چلتے چلے جارہے ہیں مگر موصوف نے لکھا تو ایک اور جہت پر لکھ مارا۔ مستقل لکھا اور بڑا لکھا۔ میں کہتا رہ گیا کہ یہ جمہوریت نہیں جسکی آپ مثالیں دے رہے ہیں۔ جس کی جانب میرا اشارہ ہے مگر وہ قرون اولیٰ کی مثالیں دیکھے ہوئے ہیں۔ اسلام کا عہدِ زریں انہیں ازبر ہے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کی مثالی قربانی، حضرت عمر فاروقؓ کی قمیض، حضرت عثمان غنیؓ کی آدھے اسلامی لشکر کی کفالت، حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کی نانِ جویں انہیں کچھ بھی بھولا نہ تھا۔ میں کہتا رہ گیا کہ عوام کے آگے جوابدہی کی بھی شکل بڑی بات ہوتی ہے مگر نہ انکا حافظہ کمزور تھا نہ قلم۔ انہوں نے لکھا اور ڈٹ کے بچہ جمورا کے خلاف لکھا۔ مجھے اپنا قصور تسلیم کرنا چاہیئے کہ جس مسودہ کو بھی انہوں نے مکمل کیا، مجھے دکھا کر چاہا کہ میں بھی اپنی رائے لکھ دوں مگر میں نے کبھی انہیں دو حرف لکھ کر نہ بھیجے۔ اسکے باوجود انکی محبت کبھی کم نہ ہوئی۔ آنچ کبھی دھیمی نہ ہوئی۔ میں نے جتنا غصہ ظاہر کیا، انہوں نے اسے جھیلا، خندہ پیشانی سے جھیلا مگر قلم کا پرنالہ وہیں رکھا۔ میں نے نہ لکھا مگر اشفاق احمد صاحب، جنرل حمید گل صاحب،، ریاض حسین نقوی صاحب، ملک فتح محمد صاحب، ڈاکٹر رشید نثار صاحب، کرنل غلام سرور صاحب، ڈاکٹر تصدق حسین صاحب، علامہ یوسف جبریلؒ صاحب اور آپا بانو قدسیہ صاحبہ نے لکھ دیا اور محبت سے لکھ کر داد دی۔ اب یہ کہہ کر مسودہ چھوڑ گئے ہیں کہ انکی اس تحریر کی بات ہی اور ہے۔ مجھے بھی یہی کہنا چاہیئے کہ اس تحریر کی بات ہی اور ہے۔ تاہم جمہوریت ہی انکا ہدف ہے۔ البتہ اینٹی کرسچن جمہوریت کا ذکر اضافی ہو گیا ہے۔ عنایت اللہ صاحب کا طرزِ تحریر سادہ ہے مگر جملے طویل ہوتے ہیں۔ اسلئے کہ انکے پاس خیالات کا جہان ہے۔ وقت کی مہلت کم ہے۔ جو تحریر ہے عجلتاً لکھی گئی اور اسے شاید دیکھنا بھی نہیں ملا۔ جن جمہوری علامات یا نتائج سے نفرت کرتے ہیں انکی فہرست بڑی طویل دیں گے۔ شاید ایسا بار بار دیکھنے کو ملے مگر انکا خیال۔ اس ذمہ دار، دردمند کا کہنا ہے کہ جسے گھر میں آگ لگی نظر آرہی ہو اور جس کو کوئی اور دیکھتا نہ ہو سو وہ تو اپنے لہجے اور اپنی پکار کو رنگین بنانے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ اخلاص اور سادگی انکی تحریر کے جوہر ہیں جو قدم قدم پر دکھائی دیتے رہتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ جسے جمہوریت کہتے ہیں عوام میں سے لوگ ان انتخابات میں امیدوار ہو ہی نہیں سکتے۔ چہ جائیکہ وہ جیت بھی سکیں۔ موجودہ زمانے میں جتنی زیادہ سطحوں پر اسمبلیوں کی نشستوں اور اراکین کے حقوق و مراعات میں اضافہ اپنی جگہ بے حد بڑی عیاشی اور ملی المیہ ہے۔ عنایت اللہ صاحب نے ان سب کا ذکر بہت تفصیل سے بار بار کیا ہے۔ میں عنایت اللہ صاحب سے جو تعلق خاطر رکھتا ہوں اسکے پیشِ نظر مجھے امید رہتی ہے کہ انکے قلم سے انکے اخلاصِ قلبی، انکی فطری قلندری اور اس بے درا قافلہ امت کو لمحہ موجود میں کوئی رہنمائی ضرور نصیب ہو گی مگر وہ وقت کی گھنٹی کی آواز بھی تو سنیں۔

فصل 11۔ قادری، چشتی سلسلہ کے بزرگان کی خدمات: بشیر الدین محمود

محمود غزنوی جتنے جی چاہے ہندوستان پر حملے کرتا رہے جب تک کوئی اسلام کے ضابطہ حیات کو سمجھانے والا، خلقِ عظیم کی درس گاہ کا آشنا اور اخوت و محبت کا سفیر نہیں آتا، اس وقت تک اسلام قبول کرنے والے اس دنیا میں میسر نہیں آسکتے۔ دینِ اسلام، اسکے نظریات، اسکی تعلیمات، اسکا ادب انسانیت کا شعور اور اسکے حسنِ خلق کی خوشبو کو پھیلانے کے لئے جناب حضرت ابوالفضلؒ رحمتہ اللہ علیہ نے حضرت داتا گنج بخشؒ کو ہندوستان کی سرزمین میں اسلام کا سفیر اور دین کا مبلغ بنا کر بھیجا اور انہوں نے یہاں آکر اسلام کی تبلیغ جاری کی۔ حسنِ خلق کے چراغ جلائے، مہر و محبت کی قندیلیں روشن کیں، ہندوازم کے طبقاتی نظام براہمن اور شودر کا تصور ختم کیا۔ دینِ محمدی ﷺ کے درس وتدریس کا نظام قائم کیا۔ انہوں نے کئی کتابیں دینِ محمدی ﷺ کو پھیلانے کیلئے لکھیں، کشف المحجوب انکی شہرہ آفاق کتاب ہے۔ انکے حسنِ خلق اور روحانی تصرف سے مسلمانوں کی خاصی تعداد وجود میں آئی انکی تعداد دن بدن بڑھتی گئی، اس دینِ محمدی ﷺ کی دلکش خوشبو بادِ نسیم اور بادِ شمیم کی طرح پورے ملک میں پھیلتی گئی۔ ان کے بعد یہ سلسلۂ طریقت خواجہ غریب نوازؒ کے پاس پہنچا۔ انہوں نے آپ کے مزار سے استفادہ کیا اور ہندوؤں کے گڑھ اجمیر شریف میں جا کر ڈیرہ لگا لیا۔ دینِ محمدی ﷺ کے اسوۂ حسنہ اور اخوت و محبت کی قندیلیں ہی قندیلیں روشن کر دیں۔ لاکھوں کی تعداد میں انہوں نے ہندوؤں کو کلمہ شریف پڑھایا۔ انکی روحوں کو ذکر و فکر کے مضراب عطا کئے۔ انکے دلوں کی لطیف، دلربا اور پر لطف سریں دلوں کو راحت و سرور عطا کرنے لگیں۔ مندر کے بھجن سننے والے قوالی کی سروں میں توحید پرستی کی منزل طے کر کے مست والست ہوتے گئے۔ انکے بعد انکا فیض حضرت بختار کاکیؒ کا مقدر بنا۔ پھر یہ فیض بابا فرید شکر گنج رحمتہ اللہ علیہ زہد الانبیاء کے پاس پہنچا، پھر انہوں نے اس روحانی درسگاہ کا فیض حضرت نظام الدین اولیاءؒ اور علاؤالدین صابر پیاؒ کے نصیب کا حصہ بنا دیا۔ امیر خسروؒ نے نظامِ طریقت کے ایسے چراغ روشن کئے، عشقِ رسول ﷺ میں ڈوبا ہوا ایسا کلام کہا، سازوں کو نئی سریں، نئی دھنیں عطا کیں۔ ایسا رنگ تیار کیا کہ آج بھی انکا کلام سننے والوں کی روحیں مستی میں جھوم جاتی ہیں۔ اس کے بعد چشتیہ سلسلہ کے تمام بزرگانِ دین، مہار شریف، تونسہ شریف، جلالپور شریف، گولڑہ شریف، کلیام شریف اور پورے ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ کے مبلغ کے فرائض ادا کرتے رہے۔ اس دینِ محمدی ﷺ کی شمع کو انہوں نے قریہ قریہ، بستی بستی، نگر نگر روشن و منور کیا۔ قوالوں کے دینی اقوال دلوں کی کھیتیوں کو اسلام کی سلامتی کی آبیاری کرتے چلے آرہے ہیں۔ یہ بزرگانِ دین ایسے پاکیزہ دامن قوالوں کے روپ میں ایسے مبلغ پیدا کرتے جو دلوں میں ذکرِ ربِّ جلیل جاری کر دیتے۔ آج ان صاحبِ مزار میخانوں کے شہزادے، صاحبِ زدگان روح اور روحانیّت جیسے میخانے سے نکل کر مادہ پرستی کے بتوں یعنی اینٹی کرسچن جمہوریت کے نظریات کا ایندھن بن چکے ہیں۔ وہ دلوں پر حکومت کرنا بھول گئے۔

حضرت داتا گنج بخشؒ کے بعد ہندوستان کی دھرتی پر دوسرے عظیم اور نامور دینِ محمدی ﷺ کے سپوت جن کا تعلق اعلیٰ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی محبوبِ سبحانی رحمتہ اللہ علیہ سلسلۂ قادریہ سے ہے جنکا نام نامی جناب حضرت سید بہاول شیر قلندر المعروف دم میراں لعل پاک بہاول شیرؒ ہے جن کا دربار حجرہ شاہ مقیم میں بھولے بھٹکے ہوؤں کی رہنمائی اور رشد و ہدایت کا میخانہ بنا ہوا ہے۔ دوسرے قادریہ خاندان کے عظیم سپوت حضرت شیخ عبدالقادر ثانیؒ پیر کوٹ شریف میں مدفن ہیں۔ انکو برصغیر ہند و پاک کے اولیاء کرام میں اولیٰ و ارفع مقام حاصل ہے۔ آپکے اخلاقِ حمیدہ، عمدہ کردار، بہترین اوصاف اور دلکش صداقتیں کفر کی تاریکیوں میں شمعِ رسالت کی کرنیں بن کر انسانی قلوب واذہان کو روشن و منور کرنے کا

عمل جاری کئے ہوئے ہیں۔ انکی کتاب درالعجائب سالک کو راہِ سلوک کی منزلیں طے کرواتی اور انسان کو انسانیت کی معراج تک پہنچاتی چلی جاتی ہے۔ اس سلسلۂ قادریہ کے خانوادہ کے عظیم روحانی پیشوا جن کا نام نامی حضرت سید علی امیر بالا پیر رحمتہ اللہ علیہ ہے، آسمان کے ستاروں میں کہکشاں کی طرح نمایاں نظر آتے ہیں جن کے فیض سے سلطان العارفین حق باہوؒ، شاہ عنایت قادریؒ مرشد بابا بلھے شاہ صاحبؒ، حضرت پیر شاہ غازی دمڑی والی سرکارؒ اور حضرت عبدالطیف قادری عرف بری پاکؒ جیسے ولی اللہ نے ان سے استفادہ کیا۔ ایسی تمام شخصیات جو سلسلۂ چشتیہ اور قادریہ کے اولیاءاللہ اور فقرا کے روپ میں نمایاں ہوئیں وہ تمام ہندوستان میں پھیل گئیں۔ پورا ہندو پاک دین کے اسرار و رموز اور علم و حکمت کے فیض کا منبع بن کر ابھرا۔ انہوں نے ہندوستان کی تہذیب و تمدن کو بدل کر رکھ دیا۔ دینِ اسلام تلوار سے نہیں! پیار، ادب، محبت، شفقت، خدمت اور دلگیری کی صفات اور صداقتوں سے پھیلا اور ہندوستان کی عوام کا نصیب بن کر ابھرا۔ ہند و پاک کی دھرتی کے ان تمام بزرگانِ دین اور اس میں بسنے والے مسلمِ اُمہ کو سلام پیش کرتا ہوں جنہوں نے سلطان العارفین جناب حق باہوؒ، بابا بلھے شاہ صاحبؒ، وارث شاہ صاحبؒ، شاہ حسین پاکؒ، بابا فرید شکر گنجؒ، بابا غلام فرید مٹھن کوٹیؒ، شہباز قلندرؒ، میاں محمد بخش صاحبؒ جناب علامہ محمد اقبال صاحبؒ جیسے سپوتوں کو جنم دیا جنہوں نے اسلام کی روح کی تشہیر اور بوئے محمد ﷺ کو پوری کائنات میں پھیلانے کا عمل جاری کر رکھا ہے۔ اسی قافلے کے دورِ حاضر کے خاموش مبلّغ جناب باباجی کلو سرکارؒ، سید انور علی شاہ صاحبؒ، راجہ محمد اکرم صاحبؒ باباجی کالا خان صاحبؒ ایک مغنی کی طرح اپنے روحانی ساز چھیڑے بیٹھے ہیں۔ دورِ حاضر کے ہدی خواں جناب واصف علی واصف صاحبؒ نے حضرت سائیں محمد حسینؒ بالکے سائیں کرم الہیؒ کانواں والی سرکار گوجر خان والوں کی صحبت کے روحانی خزانے کی تیس سالہ خاموشی اور تیس سالہ ہر قسم کی خوراک سے اجتناب کرنے کے عمل اور ایک پیالی چائے پر مشتمل انکے پاکیزہ جسم و جاں اور روح سے کشید کی ہوئی روحانی خوشبو کی تاثیر گویائی کی شکل میں زمانوں پر محیط کر دیا ہے۔ ان کی تصنیفوں، تحریروں، گفتگوؤں اور انکی لحدِ اقدس سے بوئے محمدی ﷺ کی خوشبوئیں ہمہ وقت پھوٹتی رہتی ہیں۔ یہ سدا بہار قافلہ، بھولے بھٹکے انسانوں اور راہِ سلوک کے مسافروں کی ہر دور میں رہنمائی کا فریضہ ادا کرتا چلا آرہا ہے۔

آج بے سروسامانی اور قلیل ضروریاتِ حیات کے وارثوں کو کہاں سے تلاش کر لاؤں جنہوں نے ہندوستان کی سرزمین میں شمعِ رسالت کی قندیلیں روشن کیں۔ آج حضرت بابا فرید الدین شکر گنجؒ اور علی امیر بالا پیرؒ حضور کو کیسے آواز دوں۔ حضور نظام الدین صابر پیاؒ، علاؤالدینؒ، چراغ الدینؒ اور امیر خسروؒ جیسے دینی مغنیوں کو کہاں سے تلاش کروں۔ حضرت علی امیر بالا پیر حضورؒ تمہارے گودڑیوں کے لعل حضور سلطان العارفین حق باہوؒ، شاہ عنایت قادریؒ، پیر شاہ غازیؒ اور عبدالطیف امام بری لطیف شریفؒ جیسے دلنواز خطیبوں کو کہاں سے ڈھونڈوں ۔اے عثمان مروندی شہباز قلندر جیؒ، اے بابا بلھے شاہ جیؒ، اے وارث شاہ جیؒ، اے شاہ حسین جیؒ، اے مہر علی شاہ جیؒ، اے میاں محمد بخشؒ جی، اے سائیں کرم الہی کانواں والی سرکار جیؒ۔ اے سائیں محمد حسین جیؒ، اے باباجی کلوؒ سرکار جی، اے باباکالا خاں جیؒ، اے علامہ محمد اقبالؒ جی، اے واصفؒ باکمال جی، اے علامہ یوسف جبریلؒ جی تمہارے نسبت ناموں کو سلام، تمہاری عظمتوں کو سلام، تمہارے کرداروں کو سلام، تمہاری بے سروسامانی کی زندگی کو سلام، تمہارے سخنوں اور سخنوں کی تاثیروں کو سلام، تمہاری روح سوزی، روح سازی اور روح پروری کی توفیقوں کو سلام، اے حسینی سپاہ کے شاہسوارو۔ آج پاکستان میں مسلمِ اُمہ اور انکی نسلوں پر اسلامی جمہوریت کے نظامِ مملکت کی بجائے مغرب کے مادہ پرست دانشوروں کا تخلیق کردہ نان کرسچن جمہوریت کا نظامِ حکومت

اور نظامِ حیات غالب آچکا ہے، اسکے حکمران دینِ محمدی ﷺ کے گلستان کو ویرانوں میں بدل رہے ہیں، ان سے کیسے نجات حاصل کی جاسکتی ہے۔ یا اللہ ہمیں توفیق دے۔ ہماری رہنمائی فرما، ہمیں حضرت محمد الرسول اللہ ﷺ انکی پیاری اُمت کو راہِ راست کی منزل کا مسافر بنا۔ آمین۔

ہندوستان میں مسلمان محمد بن قاسم کی زیرِ قیادت داخل ہوئے۔ کراچی کے ذریعہ ملتان تک آئے۔ محمد بن قاسم ہندوستان کی دھرتی پر قلیل سے وقت کیلئے ٹھہرے۔ ان کے ساتھ جو مسلم سپاہ اور جو مسلمان آئے وہ اپنے حسنِ اخلاق اور حسنِ کردار، ادبِ انسانیت اور خدمتِ انسانیت، اخوت و محبت اور عدل کی بناپر ہندوستان کے ہندوازم، بدھ ازم اور دوسرے تمام نظریات کے ماننے والوں کے دلوں میں اونچ نیچ، براہمن و شودر کا نظریہ ختم کیا۔ وہ ایک محبت کی نورانی کرن اور دلکش خوشبو کی طرح انکے دلوں میں اتر گئے۔ محمد بن قاسم تھوڑے سے عرصہ میں ہندوستان کی سرزمین میں انسانی ادب کے ایسے چراغ جلا کر چلے گئے کہ انکے وطن جانے اور انکے قتل کے بعد ہندوستان کی عوام نے انکی ایک دیوتا کی طرح پرستش اور پوجا کی۔ انہوں نے اسلام کے نظریات، تعلیمات کی روشنی میں اعتدال و مساوات، اخوت و محبت، ادبِ انسانیت اور خدمتِ انسانیت، امانت و دیانت، حسنِ خُلق اور عدل کے چراغ روشن کئے۔ علاوہ ازیں ہندوستان کی سرزمین پر محمود غزنوی نے اپنی بادشاہت قائم کرنے کیلئے سترہ حملے کیے۔ اسلام کی تبلیغ اور اسلام کی آبیاری کیلئے حضرت ابوالفضل رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ کو غزنی سے لاہور بھیجا۔ انہوں نے دریائے راوی کے کنارے کو اپنا مسکن بنایا۔ وہاں بیٹھ کر عبادت و ریاضت اور اسلام کی تعلیمات کی تبلیغ کا فریضہ ادا کرنا شروع کر دیا۔ ہندوستان کی سرزمین پر اسلامی نظریات پر مشتمل تعلیمات کے الہامی دیپ جلائے۔ سادہ، مختصر اور قلیل ضروریات کے نظام کی تعلیمات کو عروج دیا۔ زبان سے ناآشنائی انکے راستے میں حائل نہ ہوئی۔ مخلوقِ خدا کو ادب کے ساتھ اپنے ساتھ بٹھاتے، کھانا کھلاتے، احترام اور عزت کی دولت ان میں تقسیم کرتے۔ مخلوق کو خالق کی نگاہ سے دیکھتے ہوئے انکو پیار کرنے کا عمل جاری کیا، لوگ شہد کی مکھیوں کی طرح انکے گرد اکٹھے ہو جاتے۔ عزت و ادب اور احترامِ انسانیت کا خاص خیال رکھتے۔ اخوت و محبت کی روشنیاں پھیلاتے۔ انسانی اونچ نیچ یعنی برہمن اور شودر کی تفریق کو ختم کرنے کا عملی درس دیتے۔ ہندوستان کی دھرتی پر کالے گورے، اعلیٰ ادنیٰ، اونچ نیچ، ذات پات، برہمن شودر کے نظام اور سسٹم کو ختم کرنے کے لئے نہ صرف کوشاں رہے بلکہ برابری اور مساوات کے دینی نظریات کی تعلیمات کی عملی قندیلیں روشن کیں۔ اعتدال کا سبق سکھایا۔ مخلوقِ خدا کو کنبہ خدا سمجھنے کا راستہ دکھایا۔ انسانی عزت و احترام کے جذبوں کو مخلوقِ خدا میں بیدار کیا۔ اس طرح اعتدال و مساوات کے دلکش نغمات کو کردار کے ساز پر الاپا اور مخلوقِ خدا کو مسحور کر دیا۔ دین کی اعلیٰ، عمدہ صفات کی تعلیمات کو مخلوقِ خدا میں کردار کے حسین روپ کی شکل میں متعارف کروایا۔ انکے نہ مٹنے والے نشانات انکی نسلوں کی وراثت بنتے گئے۔ انہوں نے فطرتی لازوال صداقتوں کو انسانوں میں روشناس کروانے کے عمل کو جاری کیا۔ لوگ دائرہ اسلام میں داخل ہوتے رہے۔ انکے بعد تاشقند سے ایک اور حسین و جمیل آقائے نامدار حضرت محمد مصطفی ﷺ کے نام لیوا ایک غلام اور ایک عظیم سپاہی خواجہ غریب نوازؒ لاہور تشریف لائے۔ داتا گنج بخشؒ کے مزار پر حاضری دی۔ چالیس روز تک ان کے دربار پر چلہ کشی کی۔ اکتسابِ فیض کیا۔ علمی اور روحانی فیوض حاصل کرنے کے بعد انہوں نے ایک شعر انکی شانِ عظیم میں کہا۔

گنجِ بخش فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا

ناقصاں را پیرِ کامل کاملاں را راہنما

اسکے بعد وہ جودپور جو اس دور میں ہندوؤں کا مرکز اور گڑھ سمجھا جاتا تھا جسکو آج اجمیر شریف کے نام سے پکارا جاتا ہے وہاں تشریف لے گئے۔ وہاں پر اس دینِ اسلام کے مبلغ نے تبلیغ کا کام شروع کیا۔ ہندو معاشرے میں براہمن اور شودر کی تفریق کو ختم کیا۔ ہندو معاشرے میں اعتدال و مساوات کی تعلیم عام کی۔ طبقات کے نظام کو ختم کیا، اخوت و محبت کے نور کو نگر نگر پھیلایا، ایک ہی آدم کی اولاد ہونے، ایک ہی کنبہ خدا کے تصور کا نظریہ پیش کیا۔ خدمتِ خَلق کی اعلیٰ اور ارفع عبادت کا شعور عطا کیا، لاکھوں ہندوؤں کو دائرہ دینِ محمدی ﷺ میں داخل کیا۔ شمعِ رسالت ﷺ کی تعلیمات کی روشنی سے دلوں کو منور کیا، اسکے بعد انہوں نے اپنا روحانی فیض بختیار کاکیؒ کو عطا کیا۔ اس کے بعد اس روحانی فیض کا سلسلہ بابا فرید شکر گنجؒ کے سپرد ہوا۔ انہوں نے یہ فیض جناب نظام الدین اولیاؒ، علاؤالدین صابرؒ پیا، انکے بعد یہ فیض جناب میر خسروؒ، تاج الدینؒ، خواجہ نور محمد مہارویؒ چشتیاں شریف، تونسہ شریف، جلال پور شریف، مہر علی شاہ صاحب گولڑویؒ اور پھر یہ سلسلہ چشتیہ اور صابریا کے بزرگانِ دین نے فقر کے گلستان میں ہندو پاک کی سر زمین میں الہامی اور روحانی تعلیمات کے نور کی روشنیاں پھیلانی شروع کر دیں، نسلِ انسانی کیلئے رشد و ہدایت اور روحانی تسلی تشفی کے چشمے جاری و ساری کر دیئے۔

دوسرا سلسلہ جس نے ہندوستان میں اسلام کی تبلیغ کا فریضہ بڑے پر تپاک انداز میں جاری کیا۔ وہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے تربیت یافتہ ایک عظیم قلندر حضرت میراں بہاول شیر لال قلندرؒ اور حضرت مقیم شاہؒ صاحب ہیں جنہوں نے اپنا مسکن حجرہ شاہ مقیم میں قائم کیا اور اسی لڑی اور اسی سلسلہ کے جناب پیر امیر علی بالا حضورؒ جنہوں نے ہندوستان کی زمین میں اسلام کو روشناس کروانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ان سے جناب حضرت سلطان العارفین حق باہوؒ شور کوٹ ضلع جھنگ، شاہ عنایت قادری لاہوریؒ، مرشد سید بلھے شاہ صاحبؒ، پیر اشاہ غازی دمڑی والی سرکارؒ، مرشد حضرت میاں محمد بخش صاحبؒ کھڑی شریف آزاد کشمیر، حضرت سید عبدالطیف قادریؒ المعروف امام بری شریف اسلام آباد نے اکتسابِ فیض حاصل کیا۔ انکے علاوہ اسی لڑی کے شیخ عبدالقادر ثانی پیر کوٹ ضلع جھنگ، سائیں کرم الہیؒ گجرات شریف حضرت شاہ عبدالطیف بھٹائیؒ قادری مقیم شاہی سندھ حضرت شہباز قلندرؒ قادری سیون شریف ضلع دادو، حضرت سخی سرورؒ حضور ضلع ڈی جی خان، اسی طرح سلسلۂ قادریہ اور سلسلۂ چشتیہ کے دینی روحانی پیشواؤں نے ہندوستان کے کونے کونے میں اسلام کا پرچار کیا اور دینِ محمدی ﷺ کے پھیلانے کا فریضہ بڑے احسن طریقہ سے ادا کیا۔ انہوں نے نثر و شاعری اور قلندری رنگ میں قرآنِ حکیم کے دنیا کی بے ثباتی کے رموز اور نقاط کو اس خوبصورت اور احسن طریقہ سے پیش کیا۔ حسنِ خُلق اور حسنِ کردار سے ظلمت کدہ کو نورِ ہدایت کی روشنی سے منور کیا، جس سے قرآن فہمی کے راستے کی گرہ کھلتی جاتی اور اسکی روح سے آگاہی ہوتی جاتی۔ لوگ مست وار دائرۂ اسلام میں داخل ہوتے جاتے۔ ان بزرگانِ دین نے دینِ اسلام کی اصل روح کو ہندوستان کی سر زمین میں متعارف کروایا اور اسکی مسحور کن خوشبو کو پھیلانے میں اہم رول ادا کیا۔ جیسے یہ سر زمین اپنے حسن و جمال میں اپنا ثانی نہیں رکھتی اسی طرح حسین و جمیل، دلسوزی و دلنوازی، روح سوزی و روح سازی، الفت و محبت سے بھرپور شخصیتیں اس دھرتی نے پیدا کرنا اپنا نصیب بنا رکھا ہے۔ ان دینی اور روحانی پیشواؤں، فقیروں، درویشوں نے اپنی عملی زندگی میں دینی نظریات، دینی ضابطہ ءحیات، دینی طرزِ حیات، دینی تعلیمات کے چراغ اس طرح روشن کئے کہ عوام

الناس جوق در جوق دائرہِ اسلام میں داخل ہوتے چلے گئے،آج بھی انکے کلام کے پڑھنے اور سننے والوں پر ایک رِقت آمیز کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ انکے کلام سے اپنی اپنی مادری زبان میں انسان آسانی سے اسلام کی روح تک رسائی کر لیتا ہے۔

وہ دنیا کی بے ثباتی اور توحید کے جام پلاتے ہیں۔وہ بارگاہِ رسالت ﷺ کی شانِ عظیم کے آداب سکھاتے ہیں۔وہ فقر کی طیب زندگی اور پاکیزہ کردار سے آشنائی فرماتے ہیں۔وہ ذکر و فکر کی لذتوں سے متعارف کرواتے ہیں۔وہ حیات و ممات اور فلسفہ ءحیاتِ جاوداں، نیکی بدی، خیر و شر اور اس جہانِ رنگ و بو کے رموز کھول کھول کر بیان کرتے ہیں۔وہ امانت و دیانت کے اصول وضوابط کی روشنی میں انسانی کردار سنوارتے ہیں۔وہ سادہ اور سلیس زندگی کا راستے بتاتے اور اسکی افادیت سے آگاہی بخشتے ہیں۔وہ عمل اور کردار سے مخلوقِ خدا کو کنبہِ خدا سمجھنے کی کردار سازی کا طیب فریضہ ادا کرتے ہیں۔وہ پردہ پوشی اور عفو و درگذر کے عمل کے چراغوں کو جلا کر ختم نہ ہونے والی روشنیاں عطا کرتے ہیں۔وہ اخوت و محبت کے میکدے کو لا متناہی دوام دیتے ہیں۔وہ عدل کو اپنی زندگی پر وارد کرتے ہیں اور پھر اسکی تعلیم و تربیت سے انسانیت کو مستفیض کرتے ہیں۔وہ اپنے کردار سے ایثار و قربانی کے عمل کی لازوال قندیلیں روشن کرتے ہیں۔خدا ترسی، رحم دلی اور اعلیٰ ظرفی انکا شیوۂ عبادت ہے۔ہندوستان کی سرزمین میں اسلام کی شمعیں انہوں نے روشن کیں۔وہ حضور نبی کریم ﷺ کے حسنِ خُلق اور حسنِ کردار کے میخانے کے ساقی کا رول ادا کرتے ہیں۔وہ مخلوقِ خدا میں عمدہ اور اعلیٰ صفات اور فطرتی صداقتوں کا لنگر تقسیم کرتے رہتے ہیں،وہ مخلوقِ خدا میں عزت وادب کے لازوال تحفے بانٹتے رہتے ہیں۔وہ مخلوقِ خدا کو امانت و دیانت،ایثار و نثار،عفو و درگذر کی افادیت سمجھاتے اور خدمتِ خَلق کے کشکول بھرتے رہتے ہیں۔وہ مخلوقِ خدا کو اخوت و محبت کے دلربا جام پلاتے رہتے ہیں۔وہ مخلوقِ خدا کو اعتدال و مساوات کے دلکش اور عمدہ اصول سمجھاتے رہتے ہیں۔وہ مخلوقِ خدا میں ادبِ انسانیت اور خدمتِ انسانیت کا شعور بیدار کرتے رہتے ہیں۔وہ مخلوقِ خدا میں محنت و تجسّس کی شمعیں روشن کرتے رہتے ہیں۔وہ مخلوقِ خدا کو حقوق اللہ اور حقوق العباد کے نظام کی عقدہ کشائی کرتے رہتے ہیں۔وہ مخلوقِ خدا کو آقا اور غلام، برہمن اور شودر کے طبقات سے نجات دلاتے رہتے ہیں۔وہ مخلوقِ خدا کو نفرتوں اور نفاق سے بچنے کی تلقین فرماتے رہتے ہیں۔وہ مخلوقِ خدا میں خیر اور بھلائی کی دولت عام کرتے رہتے ہیں۔وہ مخلوقِ خدا کو نور کا راستہ بتاتے اور ظلمات سے بچاتے رہتے ہیں۔وہ مخلوقِ خدا کو کنبۂ خدا سمجھنے کا درس دیتے رہتے ہیں۔وہ اولاد کو ماں کی نگاہ سے دیکھنے اور مخلوق کو خالق کی نگاہ سے دیکھنے کا عرفان عطا کرتے رہتے ہیں،وہ ادب و محبت کی خوشبو بن کر دلوں کو معطر کئے جاتے ہیں،انہوں نے ہی ہندوستان کی دھرتی میں اسلام کا نور پھیلایا ہے۔آج پچپن کروڑ کے لگ بھگ مسلمِ اُمہ کے فرزندان پاکستان،بھارت اور بنگلہ دیش میں انکی محبت اور شفقت کا ثمر ہیں۔آج بھی انکے مزارِ اقدس مخلوقِ خدا کیلئے منبۂ رشد و ہدایت کی خوشبو سے معطر، گناہ میں ڈوبی ہوئی، بھولی بھٹکی انسانیت کی رہنمائی کا طیب فریضہ ادا کرتے چلے آرہے ہیں۔انکی نثر ہو یا شاعری یا قلندرانہ زندگی کی عملی کتاب وہ دینِ محمدی ﷺ کے نور سے پرنور اور لطف و کرم کے میخانے کے ساقی بنے بیٹھے ہیں۔

داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ ہوں یا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ ہوں۔خواجہ غریب نوازؒ ہوں یا حضرت بہاول شیر قلندرؒ، بختیار کاکیؒ ہوں یا حضرت مقیم شاہ حجرویؒ ہوں، حضرت بابا فرید شکر گنجؒ ہوں یا حضرت پیر امیر علی بالا پیرؒ ہوں، حضرت نظام الدین ؒ یا سلطان العارفین حق باہوؒ ہوں، حضرت صابر پیاؒ ہوں یا بلھے شاہ قصوریؒ، مہر علی شاہ گولڑویؒ ہوں یا میاں محمد بخش کھڑی شریفؒ ہوں، وارث شاہؒ ہوں یا شاہ حسینؒ ہوں، غلام فرید

مٹھن کوٹیؒ ہوں یا سرمستؒ ہوں، شہباز قلندرؒ ہوں یا امیر خسروؒ ہوں، نور محمد مہاروی ہوں یا تونسہ شریف والے ہوں۔ علامہ اقبالؒ ہوں یا واصف علی واصفؒ ہوں۔ انکے علاوہ ہر دور میں ان سلسلہ کے درویشوں، فقیروں اور ولیوں نے قریہ قریہ، نگر نگر، شہر شہر، ملک ملک انسانی دلوں پر نور کی روشنیاں پہنچائیں۔ انکا کلام عشقِ محمدی ﷺ اور ادبِ محمدی ﷺ کے الہامی اور روحانی نور سے سینچا ہوا ہے۔ انسانیت کی رہنمائی اور راہِ ہدایت کے وہ ایسے درخشاں ستارے ہیں جو رشد و ہدایت کے افق پر دینِ اسلام کی دلکش اور مسحور کن نورانی روشنیاں پھیلاتے اور ظلمات کو ختم کرتے چلے جا رہے ہیں۔ ہندوستان کی وہ عوام، وہ جنتا اور وہ مخلوقِ خدا جو مختلف نظریات، ہندوازم، بدھ ازم، آتش پرست یا کسی اور نظریہ سے بھی وابسطہ تھی جنکو مسلمِ اُمہ کے ان عظیم فقیروں، درویشوں اور ولیوں نے اللہ تعالیٰ کی توحید پرستی کا درس دیا۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبران کا تعارف، چار اہلِ کتاب پیغمبران اور ان پر نازل ہونے والی الہامی کتابوں کی آگاہی اور حضرت محمد مصطفی ﷺ کی نبوت کا تعارف، ان پر نازل ہونے والی الہامی کتاب قرآنِ پاک، اسکے نظریات، دستورِ حیات، ضابطہِ حیات، طرزِ حیات، انکی الہامی اور روحانی تعلیمات کی روشنیوں سے متعارف فرمایا۔ انکو خالقِ حقیقی سے روشناس فرمایا۔ خالق کی مخلوق کو خالق کی نگاہ سے دیکھنے کی تعلیمات سے آگاہی بخشی۔ ذات پات، اونچ نیچ، برہمن اور شودر کے باطل نظریات کو ختم کیا، بت پرستی اور آتش پرستی سے نجات دلائی۔ طبقات کی بالادستی کو کچل کر رکھ دیا۔ بنی نوعِ انسان کی عزتِ نفس اور عظمت کو بحال کیا، اولاد کو ماں کی نگاہ اور مخلوق کو خالق کی نگاہ سے دیکھنے کا عرفان بخشا اور سلیقہ بھی عطا کیا۔ ''ساری خدائی ہے کنبہ خدا کی'' کی گرہ کھولی، بنی نوعِ انسان میں انسانی عزت و عظمت، اخوت و محبت کا رشتہ استوار کیا، ادبِ انسانیت اور خدمتِ انسانیت کا لطف و کرم عام کیا۔ بنی نوعِ انسان کو قربتِ خداوندی کی منزل کا مسافر بنا دیا۔ خیر کی دنیا بحال کی اور شر کو ختم کرنے کا راستہ سمجھایا۔

آج وہ اسلام کے ہدی خواں کہاں ہیں جنہوں نے دینِ محمدی ﷺ کے نظامِ حیات کے بے سر و سامانی اور قلیل سی ضروریاتِ زندگی سے رشتہ قائم رکھا اور صبر و قناعت کا درس دیا۔ آج وہ روحانی پیشوا کہاں ہیں، جنہوں نے خالق کی مخلوق کو پیار اور ادب دیا اور مخلوقِ خدا کو خالق کی نگاہ سے دیکھنا سکھایا۔ آج وہ دینِ محمدی ﷺ کے صاحبِ بصیرت ہدی خواں کہاں ہیں جو بنی نوعِ انسان کو اخوت و محبت کی پر لطف کیفیات عطا کرتے اور انکے دلوں میں خوشبو بن کر اتر جاتے تھے۔ آج وہ خیر کے داعی کہاں ہیں جو شہد کی مکھیوں کی طرح انسانوں کو اپنے گرد جمع رکھتے اور دین کا درس دیتے اور انکے دل و دماغ کو منور کرتے۔ آج وہ فقر کہاں ہیں جن کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ انسانوں کی تقدیریں بدل دیتے جو کلمہ شریف لا الٰہ الا اللہ محمد الرسول اللہ کا ورد قلبوں میں جاری کر دیتے۔ آج وہ شب بیدار کہاں ہیں جو مخلوقِ خدا کی خیر، بھلائی اور فلاح کیلئے رب العزت کے دربار میں رات کی تنہائیوں میں آنسو بہاتے اور اپنی توفیقوں اور تاثیروں کیلئے ملتجی کھڑے رہتے۔ آج وہ صبر و توکل کے پیکر کہاں ہیں جو حرص و ہوس میں ڈوبے ہوئے غافلوں کو بیداری عطا کرتے، صبر و توکل کی منازل کا مسافر بنا دیتے تھے۔ آج وہ فطرت کے رازداں کہاں ہیں جو علمِ لدّنی کے وارث اور دلوں کو تسخیر کرنے کی قدرت رکھتے تھے۔ آج وہ عرفان کے عارف کہاں ہیں جو حیات و ممات اور اس فانی کائنات کی گرہ کھولا کرتے۔ آج وہ صحرا نورد کہاں ہیں جو دوائے دردِ دل بیچا کرتے تھے۔

آج وہ مونسِ انسانیت، کہاں ہیں جو بھولے بھٹکوں کو راہِ راست کی منزل کی نشاندہی کیا کرتے، کہاں گئے وہ پیکرِ انسانیت، جنہوں نے ہندوستان کی سرزمین میں پچپن کروڑ انسانوں کے دلوں کی کھیتی میں رحمت العالمین ﷺ پیغمبرِ خدا کے عمدہ اخلاق، اعلیٰ کردار، لاجواب الفت و محبت، انمول پیار، بے مثال الہامی صفات، فطرتی صداقتوں کے چراغ جلائے انہوں نے نظریاتی نفرتوں کو محبت کا جام پلایا۔ بغیر کسی تشخیص کے، کہ کون کون ہے، ہندو ہے، برہمن ہے، شودر ہے، آتش پرست ہے، بدھی ہے یا جینی ہے عیسائی ہے یا مسلمان ہے، کالا ہے یا گورا اونچ ذات کا ہے یا نیچ کا، انہوں نے تمام انسانوں کو ایک جیسی عزت دی، ایک جیسا احترام دیا، اپنے لنگر پر اپنے ساتھ بٹھایا اور اپنے ساتھ کھانا کھلایا، توحید پرستی کا درس دیا، خالقِ کائنات اور اسکے نظامِ کائنات کا فلسفہ سمجھایا، نیکی بدی، خیر اور شر سے متعارف کرایا، مخلوقِ خدا کو کنبۂ خدا کی آگاہی بخشی۔ مخلوقِ خدا کو اخوت و محبت کے پاکیزہ رشتے سے منسلک کیا، انسانی حقوق کو ادب و عزت سے بجالانے کی عبادت سے آگاہی بخشی، دنیا کی بے ثباتی کا سبق یاد کرایا، اعتدال و مساوات کی آفادیت سمجھائی، برہمن اور شودر کے فرق کو ختم کیا، غریبوں مسکینوں، بے سہاروں، بھوکوں، ننگوں، بیماروں، اپاہجوں کی حاجت روائی کا حسین عمل جاری کیا، عبادت کا سلیقہ عطا کیا، رحمت العالمین ﷺ کی رحمتوں اور شفقتوں کو عام کیا، ازدواجی زندگی اور قرابت داری اور انسانی رشتوں کے تقدس کو قائم کیا۔ ہندوستان کی سرزمین میں ان درویشوں اور فقیروں نے دین کی روشنی میں اسلامی تہذیب کو جنم دیا۔ بنی نوعِ انسان کو عدل و انصاف کی اہمیت سے آشنا فرمایا، تمام بزرگانِ دین، دین کی تعلیمات سے آراستہ ہوتے۔ ظاہری اور باطنی علوم کو سیکھتے اور ان پر فوقیت حاصل کرتے۔ بنی نوعِ انسان کو ظلمات کی نگری سے نکال کر الہامی روحانی روشنیوں سے ہمکنار کر دیتے۔ انہوں نے احترامِ انسانیت اور ادبِ انسانیت کے حسین کرداروں کی تشکیل فرمائی۔ انہوں نے بنی نوعِ انسان کو پیار کے پریم کے ساغر پلائے۔ ایک عجمی اور عربی کا فرق مٹایا۔ برہمن اور شودر کو ایک ساتھ کھانا کھلایا۔ طبقات کو ختم کیا، انہوں نے بنی نوعِ انسان کو عزت و توقیر بخشی۔ آج انکے مزارات منبع ورشد و ہدایت بنے پڑے ہیں، انکی قربت میں بوئے محمدی ﷺ، انکے شیریں کلام دلوں کے مضراب، انکی کتب رشد و ہدایت اور دینِ محمدی ﷺ کی تعلیمات کے روشن مینار، انکے ملفوظات روحوں کی مستی کے جام، انکی بات سچی، انکا عمل سچا، انکا کردار سچا، انکے مے خانے آباد، وہ خزاں سے ناآشنا، وہ صدا بہار، وہ انسانی گلستان میں سرسبز و شاداب، وہ میٹھی پون کے سینچے ہوئے، وہ نورِ محمدی ﷺ کے ہرے بھرے شجر، وہ تلخیٔ دوراں کے جلے ہوئے انسانوں کیلئے سایہ رحمت اور آسمانی الہامی نور کی روشنیوں کی ٹھنڈک ، وہ رشد و ہدایت کے مے خانے کے ساقی۔ انکے مست نگروں میں توحید کا لنگر جاری، ساقیٔ کوثر ﷺ کی مستی کے جام جاری، مستوں کو مست الست بنانے کا عمل جاری، خیر کی خیرات جاری، بنی نوعِ انسان کی بھلائی کا علم و عمل جاری، وہ بھولے بھٹکوں کے سہارے، وہ راہِ ہدایت کے ہدی خواں، وہ دین و دنیا کے خضرِ راہ، ذرا انکو پکارو تو، ذرا صحرائے فانی میں انکے نقشِ قدم کو تلاش تو کرو۔

ان کے برعکس اسلام کے نام لیوا، دین کے عملی منکر، منافق مسلمان حکمرانوں نے تقریباً نو سو سال تک برصغیر ہند پر حکمرانی کے ساز بجائے۔ انہوں نے دین اور حکومت کو جدا کر رکھا، انہوں نے بادشاہت کی عیش و عشرت کے مزے لوٹے، انہوں نے دینِ محمدی ﷺ کے خلاف بادشاہت کے نمرودی، فرعونی اور یزیدی نظام کو اپنی اپنی سلطنت میں رائج رکھا۔ وہ تو ہمیشہ اپنی اپنی سلطنتیں قائم کرنے اور انکے تحفظ کیلئے کوشاں و سرگرداں رہے۔ وہ اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ کربلا کا واقعہ کیوں پیش آیا تھا۔ انہوں نے اسلام کے خلاف جبر و ظلم کا، بادشاہت کا، خود ساختہ فرعونی،

یزیدی نظام حیات جاری رکھا۔ ہندوستان کی سرزمین پر اپنی اپنی حکومتیں، سلطنتیں اور اقتدار کو قائم رکھنے اور دوام بخشنے کیلئے حسبِ خواہش اپنے قانون نافذ کرتے رہے۔ تمام بادشاہ دینِ محمدی ﷺ کے خلاف اپنی حاکمیت کے باطل، غاصب ضابطہ حیات کو ملک پر مسلّط کرتے رہے۔ وہ عیش و عشرت میں ڈوبے رہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو قائم کرنا، انکی زندگی کا مقصود ہی نہ تھا۔ اس طرح بنی نوعِ انسان جو ہندو تھے یا بدھ، عیسائی تھے یا مسلمان ،وہ سبھی دینِ محمدی ﷺ کے نظریات، دستورِ حیات اور ضابطہِ حیات کے مطابق اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کی عملی شکل نہ دیکھ سکے۔ انہوں نے تو اسلام کو ان فقیروں، ولی اللہ اور درویشوں کی قرآنی، الہامی تعلیمات، انکے حسن عمل اور حسن کردار کی روحانی تجلیوں کی تاثیروں کی بنا پر اسلام قبول کیا تھا۔ وہ درویشوں، ولی اللہ، فقیروں اور دینِ محمدی ﷺ کے ضابطہِ حیات، انکی تعلیمات، انکے حسنِ خلق، انکے حسنِ کردار، انکے ادبِ انسانیت اور خدمتِ انسانیت کے طریقہ کار، انکے اعتدال مساوات کے آداب، انکے طبقات ختم کرنے کے سلیقے، انکے اخوت و محبت کے درس، انکے اٹھنے بیٹھنے اور ہر عمل میں بوئے محمدی ﷺ، انکے مخلوقِ خدا کو خالق کی نگاہ سے دیکھنے کے اعمال، انکے روحانی اطوار، انکی دینی تعلیمات اور کردار کے خلاف اور متضاد تھے۔ ان مسلمان حکمرانوں کے بادشاہت کے فرعونی نظامِ حیات، انکے یزیدی طریقہ کار، انکے معاشی اور معاشرتی نظامِ حیات اور حکمرانی کی اذیتوں سے ہونے والے شکار چاہے وہ بدھ ہوں یا جینی ہوں یا ہندو ہوں یا عوام الناس سب مسلمان ہوتے گئے۔ وہ تمام دنیاوی حکمران اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو قائم کرنے سے گریزاں رہے۔ دینِ محمدی ﷺ اور روحِ اسلام کی سرکاری بالادستی اور اللہ تعالیٰ کی حاکمیت قائم نہ کر سکے لیکن اس کے باوجود دینِ محمدی ﷺ کی تبلیغ اور فروغ جاری رہا۔ علما کرام، مفسرینِ قرآن، مشائخ عظام اور فقرا کرام نے انکے دوران حکمرانی میں بھی دین کی تبلیغ کا مشن جاری رکھا۔

آج کے پاکستان کو دیکھنا ہو تو آج کے پاکستان کو دیکھنا ہو تو عنایت اللہ صاحب کو دیکھ لیں۔ سلگتا ہوا لاوا جو کبھی بھی پھٹ سکتا ہے۔ غم و غصہ کا مرکب ہیں۔ جانتے ہیں کہ اہلِ پاکستان کے ساتھ بہت بڑا ہاتھ ہو گیا ہے۔ وہ یہ ہاتھ توڑ دینا چاہتے ہیں۔ ان کی اپنی اکثر تحریریں ان کی اس کیفیت کی ترجمانی کرتی ہیں۔ اس ملک کا مدبر حکمران ٹولہ اور ان کا مراعات یافتہ کار سرکار چلانے والا شاہی طبقہ سولہ کروڑ محکوم عوام کا لہو پی رہا ہے اور تمام پیغمبروں کی امم کے نظامِ عدل اور ان کی تہذیب کو ختم کرتے چلے آرہے ہیں۔ مساوات اور نظامِ عدل اور اسلام کے نفاذ کی بات کرنے والوں کو کچلتے چلے آرہے ہیں۔ اب وقت رخ بدل چکا ہے۔ اگر یہ باز نہ آئے تو اب مخلوقِ خدا اور ان کے محافظ اور ان کے لواحقین جو ان کے ظلم و جبر کا نشانہ بنے ہوئے ہیں وہ اس قدر مجبور ہو چکے ہیں کہ وہ ان کے ظلم و جبر اور معاشی اور معاشرتی قتال کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ وہ کب تک ان کو طالبان کا نام دے کر چن چن کر ختم کرتے رہیں گے۔ اب ان کا عیاشانہ طبقاتی نظامِ حکومت، طبقاتی اردلی اور وزیر، ڈرائیور اور مراعات یافتہ طبقہ اور گن مین کا نظام دم توڑ چکا ہے۔ عیاش ٹولہ پر سرخ نشان لگ چکا ہے۔ ان کا بچنا ممکن نہیں۔ کیونکہ ملک سب کا سانجھا گھر ہے۔ حکمران ٹولہ یا مراعات یافتہ طبقہ کا نہیں نامعلوم یہ بات ان کی سمجھ میں کیوں نہیں آرہی۔ فطرت کے اصولوں کے خلاف جنگ لڑی نہیں جا سکتی۔ وقت ہے اب بھی ان مسائل کا حل نکال لیں۔ میز پر بیٹھ کر اس مشکل کو حل کر لیں اور خانہ جنگی سے ملک و ملت اور انسانی نسلوں کو قتال سے بچا لیں۔ وقت بدلتے دیر نہیں لگتی۔ اللہ تعالیٰ ایسے حالات میسر فرمائیں کہ تمام معاشی اور معاشرتی برائیوں کا تدارک ہو سکے۔ آمین۔ افسوس ہے کہ کچھ ناعاقبت اندیشوں نے اس حسین ملک کو اور

اس کے بنانے والوں کو آگ میں ڈال دیا ہے۔ عنایت اللہ صاحب کی تحریریں شعلہ ہیں جس میں سلگاہٹ ہے، کڑک بھی اور کوندتی بجلی کی روشنیاں بھی۔ لگتا ہے کچھ ہو کے رہے گا۔

فصل 12: باباجی عنایت اللہ تحریکِ "تحفظ واستحکام پاکستان" کے خاموش مجاہد، ڈاکٹر محمد عارف:

باباجی عنایت اللہ کا نام اردو دنیا میں شہرتِ دوام رکھنے والے ناموں میں تو شمار نہیں ہوتا مگر وہ اپنے بلند پایہ علمی کام کی وجہ سے صفحۂ اوّل کے حُریّت پسند ادیبوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ان کی علمی تصانیف کے مطالعہ سے یہ نکتہ بدرجۂ اتم واضح ہوتا ہے کہ وہ مولانا محمد علی جوہر کے رسالہ "کامریڈ"، مولانا ظفر علی خان کے اخبار "زمیندار" اور شورش کاشمیری کے "چٹان" کی علمی روایات کے امین، جرأت مندانہ طرزِ اظہار کے آئینہ دار قلم کار ہیں۔ حضور ﷺ کی ایک حدیث ہے کہ "جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنا بہترین جہاد ہے"۔ عنایت اللہ باباجی نے وطنِ عزیز کے داخلی استحکام، جغرافیائی و نظریاتی سرحدوں کے تحفظ اور خلافتِ راشدہ کی روشن صبح کے طلوع کے لیے صحرا میں اذان دینے کا فریضہ انجام دیا ہے۔ مجھے تو وہ قائد اعظم محمد علیؒ جناح، علامہ محمد اقبالؒ، لیاقت علی خان اور سردار عبدالرّب نشتر جیسے محبِّ وطن راہنماؤں کے ہمنوا نظر آتے ہیں جو وطن کی محبّت کے جذبے سے سرشار تھے۔

اگرچہ بت ہیں جماعت کی آستینوں میں
مجھے ہے حکمِ اذاں لا اِلٰہ اِلا اللہ

پاکستانی معاشرت، تہذیب وتاریخ اور قومی سیاست کے مدّوجزر پر متعدد کتب منظرِ عام پر آئی ہیں جن میں مولانا کوثر نیازی کی "اور لائن کٹ گئی" کرنل صدیق سالک کی "میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا"، ذوالفقار علی بھٹو کی "گریٹ ٹریجیڈی" ایوب خان کی "فرینڈز ناٹ ماسٹرز"، ڈاکٹر صفدر محمود کی "مسلم لیگ کا دورِ حکومت"، قدرت اللہ شہاب کا "شہاب نامہ"، اہمیت کی حامل ہیں مگر وطنِ عزیز کے گھناؤنے مسائل، دو قومی نظریے، مغربی جمہوریت اور ایک مخصوص طبقے کی اجارہ داری جیسے مسائل پر قلم اُٹھانا باباجی عنایت اللہ کے نصیب میں ازّل سے تحریر کر دیا گیا تھا جو کہ لائقِ صد تحسین جذبہ ہے۔ حب الوطنی کا جذبہ، 1965ء تک پاکستانی قوم کے دلوں میں سرایت کرتا رہا۔ تقسیمِ ہندوستان اور 6 ستمبر کے واقعات نے اردو ادب پر غیر معمولی آفاقی اثرات مرتب کیے جس کے نتیجے میں افسانہ، رپورتاژ، ڈرامہ، غزل، نظم، نعت، الغرض تمام اصنافِ سخن میں یہی موضوعات درآئے ہیں مگر مقامِ افسوس ہے کہ 16 دسمبر 1971ء کے المناک سانحے کے بعد اردو ادب میں اس موضوع پر کوئی معرکتہ الآراء تخلیق سامنے نہیں آئی۔ عقیل عباس جعفری کی "پاکستان کے سیاسی وڈیرے" جابرانہ وغاصبانہ نظام کی چیرہ دستیوں پر تنقید ضرور ہے مگر لیلائے وطن کی پیشانی پر چمکتے ہوئے داغِ شکست کو جذبہ واحساس کا مرکز ومحور بنالینا اور اسے زمانے کی گردآلود نظروں سے بچانے کے لیے سرتوڑ کوشش کرنا ان محبِّ وطن ادیبوں، شاعروں کا خاصہ رہا ہے جنہوں نے مادرِ وطن کی نظریاتی اور جغرافیائی حفاظت کے لیے نہ صرف قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں بلکہ اپنا لہو شجرِ وطن کی جڑوں پر نثار کر دیا۔ فیض احمد فیضؔ ہوں یا حبیب جالبؔ، ہر دو شاعر وطنِ عزیز کی سیاسی بے اعتدالیوں، جمہوری نظام کی بیخ کنی، بنیادی انسانی

حقوق کی پامالی، طویل مارشل لا اور جبر و استحصال کے خلاف کمربستہ رہے۔ حبیب جالبؔ بار بار یاد آجاتے ہیں کیونکہ وہ عمر بھر سیاسی عدمِ استحکام، طالع آزما جمہوری راہنماؤں کے خلاف سراپا احتجاج بنے رہے، کبھی وہ پکار اٹھتے ہیں۔

'' میں نہیں مانتا میں نہیں جانتا اس دستور کو صبحِ بے نور کو ''اور کبھی وہ یہ کہہ اٹھتے ہیں:۔'' ظلمت کو ضیاء کیا لکھنا بندے کو خدا کیا لکھنا''

باباجی عنایت اللہ صاحب کا اسلوب بلاشبہ خالصتاً ادبی نثر کے اوصاف سے لبریز نہیں ہے مگر جب دل پر سینکڑوں زخم لگے ہوں، دل و دماغ میں بھونچال آیا ہو، پلکوں پہ آنسوؤں کے چراغ روشن ہوں تو نہ صرف لب و لہجہ متاثر ہوتا ہے بلکہ اظہار و بیان میں بھی وہ ربط و تسلسل اور خوبیِ بیان باقی نہیں رہتی مگر غور سے دیکھا جائے تو سچے جذبوں کو تیز آنچ الفاظ کی کٹھالی میں پک کر کندن ہوتی ہوئی ضرور محسوس کی جاسکتی ہے۔ وہ واقعی مبارک باد کے مستحق ہیں کہ تاریخِ اردو ادب میں واحد ادیب ہیں جنہوں نے اردو نثر میں بے باک، طرزِ اظہار انقلابی سوچ، اور جابرانِ وقت کی چیرہ دستیوں کے خلاف ببانگِ دہل احتجاج کو اپنے تحت الشعور کا جزوِ لازمہ بنایا ہے۔ یہ وطن اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کے خوابوں کی سرزمین ہے۔ اس کے لیے لاکھوں مسلمانوں نے اپنا خون بہایا، بچوں، جوانوں اور بوڑھوں نے قربانیاں دی ہیں۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی خصوصی نظرِ کرم اور چشمِ التفات سے ہی یہ خطۂ اسلام کا گہوارہ بنا مگر شومئ قسمت کہ ہم نے ذاتی مفادات کو قومی مفادات پر ترجیح دی۔ حرص و ہوس، لالچ اور خود غرضی ہمارا شعار بنی رہی، جس کی وجہ سے آج ساٹھ سال گزر جانے کے باوجود ہم اپنے ملک میں اسلامی نظام کو نافذ نہیں کر سکے۔ باباجی عنایت اللہ کی تحریر میں جمال الدّین افغانی، مہدی سوڈانی، مفتی محمد عبدہ، اور علامہ اقبالؒ کے لہجوں کی بازگشت ایک دردناک چیخ بن کر ابھرتی ہے۔ ان کے بے قرار دل سے اور اٹھتی ہوئی آہیں ان کے لبوں سے پھوٹتے ہوئے نالے صاف محسوس کیے جاسکتے ہیں۔ یہی تو وہ حریت پسندانہ ادب کی وہ درخشندہ روایت ہے جسے لحۂ موجود میں پوری ادبی تاریخ کے تسلسل میں اکیلے باباجی عنایت اللہ صاحب سینے سے لگائے ہوئے خاموش مجاہد کی طرح اپنی منزل کی طرف کشاں کشاں بڑھ رہے ہیں۔ تحفظ و استحکامِ پاکستان کی تحریک وقت کی اولین ضرورت ہے کیونکہ ہمارے اندرون اور بیرونی دشمنوں کی ناپاک سازشیں ہمیں نیست و نابود کرنے میں سرگرمِ عمل ہیں۔ باباجی عنایت اللہ صاحب کی یہ تحریریں ایک ایسا مقدمہ ہیں جو وہ سولہ کروڑ عوام کی طرف سے وقت، تاریخ، خدا اور رسول ﷺ کی عدالت میں پیش کر رہے ہیں۔ جو یقیناً ان کی طرف سے ایک معرکتہ الآرا اقدام ہے جسے تاریخِ پاکستان کے کسی بھی دور میں نظرانداز نہیں کیا جاسکے گا جس طرح جنگِ آزادی کے خاموش مجاہدوں کو کبھی نظرانداز نہیں کیا جاسکتا اسی طرح اس خاموش مجاہد کی اس عظیم کاوش کو بھی دور تک اور دیر تک یاد رکھا جائے گا۔ اردو کے محبِّ وطن ادیبوں، شاعروں کی ایک پوری تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے جنہوں نے ہر قومی المیے پر نہ صرف قلم اُٹھایا بلکہ صفحۂ اوّل کے مجاہد کا کردار بھی ادا کیا۔ باباجی عنایت اللہ صاحب نے پچیس سال کا طویل عرصہ حضرت واصف علی واصفؒ کی صُحبت میں بسر کیا ہر وقت سایہ کی طرح ان کے ساتھ رہے۔ بے پناہ کسبِ فیض کیا اور اس وقت پاکستان میں واصفیہ مکتبہ فکر کے واحد ترجمان بھی وہی ہیں۔ واضح ہو کہ صوفیاء کی چشمِ التفات، نظرِ عنایت اور خصوصی توجہ کے باعث انھوں نے پاکستان کے داخلی استحکام کے مشن کو شروع کیا۔ اب حضرت واصف علی واصفؒ نے ان پر وہ نظر ڈالی کہ کیمیا ہو گئے۔ اب ان کے آنسوؤں کی مالا واقعی عالمِ بالا کی خبر لاتی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے بقولِ غالبؔ اُن پر غیب سے مضامین اُتر رہے ہیں۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

حضرت واصف علی واصفؒ نے باباجی عنایت اللہ کو علم وادب کے راستے کی طرف گامزن کیااور وہ اس وقت اسلامی جمہوریہ پاکستان کی ترقی وخوشحالی، سیاسی استحکام، نظریہء پاکستان کی بحالی اور بقاء کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ واضح ہو کہ واصف علی واصفؒ کی تربیت کا فیضان ہے کہ آج باباجی عنایت اللہ صاحب پچھلے دس سال سے مسلسل قرطاس و قلم کے ذریعے پاکستان کے سولہ کروڑ عوام کی محرومیوں، دکھوں اور لاینحل مسائل کا حل تلاش اور اسلام کے نفاذ کی بات کرنے میں مصروفِ پیکار ہیں۔ وہ رفاہی و فلاحی کاموں میں بھی پیش پیش ہیں۔ '' مقدمہ پاکستان'' دراصل ان کی روح کی پکار ہے۔ قیامِ پاکستان کے سلسلے میں بھی علماء ومشائخ کے علاوہ فقراء واولیاء کرام نے بے پناہ دعائیں ہی نہیں کیں بلکہ عملی طور پر اس کاوش میں شریکِ کار بھی رہے جن میں پیر جماعت علی شاہ صاحبؒ، پیر مہر علی شاہ صاحبؒ، پیر صاحب زکوڑی صاحبؒ جیسے لوگوں کے علاوہ متعدد خاموش مجذوبانِ خدا، سالکانِ طریقت، عارفانِ حق بھی اپنا کردار ادا کرتے رہے۔ یہی نہیں بلکہ پاکستان بننے کے بعد بھی تحفظ واستحکامِ پاکستان کی تحریک انہی لوگوں کی دعاؤں اور فیضِ نظر کا نتیجہ رہی ہے۔ باباجی عنایت اللہ صاحب کی زندگی میں ایک اور مایہ ناز علمی وروحانی شخصیت کا حوالہ بھی ملتا ہے جس سے وہ بے پناہ متاثر ہوئے۔ وہ شہنشاہ فقر ہی نہیں شہرہ آفاق ایٹمی سائنس دان، مفسرِ قرآن اور قومی شاعر بھی ہیں۔ واضح ہو کہ یہ شخصیت علامہ محمد یوسف جبریلؒ ہیں جنہوں نے وطنِ عزیز میں نظریۂ پاکستان کے عملی فروغ کے لیے جو کام کیا وہ لائقِ صد افتخار ہے۔ ان کی علمی تصنیف ''چڑیا گھر کا الیکشن'' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ باباجی عنایت اللہ صاحب نے ان کے مشن کو آگے بڑھانے کے لیے ''مقدمۂ پاکستان'' آپ اور خدا اور سول ﷺ کی عدالت میں پیش کر دیا ہے۔ فیصلہ آپ کے اختیار میں ہے۔

فصل 13۔ قوم کا سچا رہنما، ملک فدا الرحمن راول ٹاؤن، اسلام آباد:

آج کے اس افراتفری، خوشامدی اور خود غرضی کے دور میں اپنے ضمیر کے مطابق لکھنے والے شائد ختم ہو رہے ہیں۔ ہر شخص اپنے کسی فائدے، اپنی کسی غرض یا پھر سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے قلم اُٹھا رہا ہے لیکن باباجی عنایت اللہ صاحب کی تحریر میں جو کبھی آئینہ وقت، صدائے وقت، ندائے وقت، آوازِ وقت، نادِ وقت، چراغِ وقت، انقلابِ وقت اور کبھی مسیحائے وقت'' جیسی تاریخی اور انمول کُتب کی شکل میں سامنے آتی رہی ہیں۔ مصنف کا یہ خاصہ رہا ہے کہ انہوں نے ساری کُتب ایک سچا اور محبِ وطن پاکستانی اور خالص مسلمان کے طور پر لکھی ہیں۔ کسی بھی تحریر یا کسی بھی کتاب میں ذاتی فائدے کے لیے کوئی چیز شامل نہیں کی۔ کسی کی خوشنودی یا کسی کی دشمنی میں ایک لفظ نہیں لکھا۔ کسی طبقے کی خوشامد نہیں کی۔ جو کچھ لکھا اپنے وطن اور اپنے مذہب کے لیے لکھا۔ اپنی قوم اور خصوصاً نئی نسل کی اصلاح کے لیے لکھا۔ اُن کی تحریروں سے یہ گمان ہوتا ہے کہ لکھتے وقت اُن پر کوئی روحانی طاقت غالب آجاتی ہے اور لفظ اُن پر اُترنے شروع ہو جاتے ہیں۔ لفظوں کا جتنا بڑا خزینہ باباجی عنایت اللہ صاحب کے پاس ہے اتنا بڑا خزینہ یا تو لوگوں کے پاس ہوتا نہیں یا پھر انھیں استعمال کرنا نہیں آتا، کیونکہ باباجی جب لکھتے ہیں تو لفظوں کو لڑیوں میں اس خوبصورتی سے پروتے ہیں کہ وہ صاف پانی کی خوبصورت لہروں کی طرح ہر لڑی اپنی خوبصورتی میں اضافہ کرتی جاتی ہے اور پھر جس موضوع پر بھی لکھتے ہیں اس کے متعلق اردو کی ڈکشنری

میں جتنے بھی خوبصورت الفاظ اس موضوع کے متعلق ہو سکتے ہیں وہ ان تمام الفاظ کو انتہائی مہارت کے ساتھ جوڑتے چلے جاتے ہیں۔ مصنف نے جب بھی قلم کی نوک کو کاغذ پر رکھا تو محسوس ہوا کہ یہ مردِ قلندر ہاتھ میں حق کی انتہائی طاقتور اور مضبوط تلوار لے کر میدان میں اُتر آیا ہے۔ پھر ملک دشمنوں ، نام نہاد جمہوریت کے دعویداروں ، قومی دولت لوٹنے والوں ، غریب کی عزت و آبرو کی دھجیاں اُڑانے والوں اور مذہب کے نام پر بدنما دھبے لیے علمائے سوء کا پورا پورا پیچھا کرتے ہیں۔ وہ وردی کی آڑ میں عوام کے حقوق سلب کرنے والوں کو بھی معاف نہیں کرتے لیکن گندی ، لٹیرِی بدقماش ، چوروں ڈاکوؤں اور جعلی ڈگری والوں کی جمہوریت کو بھی آڑے ہاتھوں لیتے ہیں۔ کمیشن اور رشوت خور سیاستدانوں کا جس طرح وہ پردہ چاک کرتے ہیں ، اُس کی مثال بھی خال خال ہی نظر آتی ہے۔ بلاشبہ جمہوریت اسلام کی جڑ ہے بشرطیکہ اس کو اسلامی طرز پر نافذ کیا جائے۔ جس طرح ایک شخص نے اُٹھ کر حضرت عمرِ فاروقؓ حاکمِ وقت سے یہ سوال کیا تھا کہ آپ کے پاس دو چادریں کہاں سے آگئیں۔ کیا آج کوئی شخص صدرِ مملکت سے یہ پوچھ سکتا ہے کہ صرف ایک بمبینو سینما سے اتنی دولت کیسے آگئی ؟ کیا آج کوئی میاں نواز شریف اور میاں شہباز شریف سے پوچھ سکتا ہے کہ میاں صاحب لوہے کی صرف بھٹی سے اتنی ملیں ، اتنے کارخانے اور اتنی جائیدادیں کیسے بن گئیں ؟ بابا جی اِس جمہوریت کو ، لوٹنے کے لیے ایک ڈھال سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں جتنی بے غیرت اور مادر پدر آزاد جمہوریت آج پاکستان میں نافذ ہے اس کی مخالفت ہر محبِّ وطن پاکستانی کو کرنی چاہیے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس جمہوریت نے ملک کو کنگال کر دیا ہے۔ سیاست دان جمہوریت کے نام پر ملک کو لوٹ رہے ہیں۔ اس جمہوریت میں غریب کی آواز نہ صرف دب گئی ہے بلکہ ختم ہو گئی ہے۔ سفید پوش مہنگائی اور رشوت کے بازار میں پِس کے رہ گیا ہے۔ ہماری خارجہ اور داخلہ پالیسیاں دفن ہو گئی ہیں۔ یوٹیلٹی بلز ناقابلِ برداشت ہیں ، سیاست دان بِک رہے ہیں ، جعلی ڈگریوں پر شرمندہ ہونے اور منہ چھپانے کی بجائے دوسرے اداروں پر الزام تراشی کر رہے ہیں۔ بابا جی اس منحوس جمہوریت سے قوم کو آگاہ کرنے کے لیے اپنے قلم کو تیز دھار تلوار کی طرح استعمال کرتے ہوئے ان جمہوریت کے دعوے داروں کے کرتوتوں سے پردہ اُٹھاتے ہیں۔ میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ الیکٹرونک میڈیا کے اینکر پرسنز ان کی کتابوں کا مطالعہ کر کے ان کے موضوعات پر بحث کرائیں تاکہ عوام کی آنکھوں سے جمہوریت کی کالی پٹیاں اتاری جا سکیں۔ بابا جی واصف علی واصفؒ کے شیدائی ہیں اُن کے علاوہ حضرت پیر مہر علی شاہؒ ، حضرت شاہ عبداللطیفؒ بری امام ، حضرت سائیں محمد حسین بالکے سائیں کرم الٰہی کانواں والی سرکار ، حضرت کلو باباؒ ، حضرت انور علی شاہؒ ، حضرت علامہ محمد یوسف جبریلؒ اور حضرت راجہ محمد اکرمؒ سے جنون کی حد تک محبت کرتے ہیں اور اُن کی یہی محبت مجھے بھی بابا جی عنایت اللہ صاحب کے قریب کرنے کا سبب بنی۔ اس درویش منش شخصیت نے زندگی کی حقیقتوں کو بڑے قریب سے دیکھا اور پرکھا ہے۔ وہ زندگی کے تمام نشیب و فراز کے ساتھ ساتھ جمہوریت اور ڈکٹیٹرین کے بھی تمام مکر و فریب سے آگاہ ہیں۔ انھوں نے قوم کی رہنمائی کرنے اور سچے پاکستانی ہونے کے جذبے سے سرشار ہو کر کم و بیش درجن کے قریب کتابیں لکھ ماری ہیں لیکن ہمارے حکمران اور سیاستدان چاہے وہ کسی بھی سیاسی پارٹی سے تعلق رکھتے ہوں وہ جمہوریت کو بطورِ ڈھال استعمال کر کے دین و دنیا لوٹے جا رہے ہیں لیکن مجھے یہ قوی یقین ہے کہ ایک دن اس قوم کو ضرور احساس ہو گا۔ اس وقت راقم یا بابا جی عنائیت اللہ صاحب اس دنیا میں ہوں گے یا نہیں۔ میری ذاتی خواہش ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا بھی ہے کہ بابا جی عنایت اللہ صاحب اپنی زندگی میں ہی اپنی تحریروں کا اثر دیکھ کر جائیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر دراز کرے اور وہ اس قوم کی رہنمائی فرماتے رہیں۔

فصل 14۔ ''آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں، ڈاکٹر محمد عارف'':

اللہ تعالیٰ نے لفظِ کن سے کائنات کو خلق کیا۔ حضرت آدمؑ کو اسماء کا علم عطا کر کے خلیفۃ اللہ فی الارض کے منصب پر فائز کیا۔ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا۔ انا مدینۃ العلم و علی بابھا۔ میں (محمدؐ ﷺ) علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہیں۔ ازل سے لے کر ابد تک اسی شہرِ علم سے روشنیوں کی بھیک لے کر نور فشانی جاری و ساری ہے۔ صوفیائے کرام نے بنی نوعِ انسان کی فکری راہنمائی کا فریضہ انجام دینے کے لیے ہر دور میں قرطاس و قلم کا سہارا لیا۔ اگر ہم اردو زبان و ادب کا ارتقائی مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ اس کی تعمیر و تشکیل میں بھی صوفیائے کرام کا متعدبہ حصہ موجود ہے۔ جس کی تائید مولوی عبدالحق کی علمی تصنیف ''اردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا حصہ'' سے بدرجۂ اتم ہوتی ہے۔

باباجی عنایت اللہ پاکستان میں مکتبۂ واصفیہ کے وہ ترجمان ہیں کہ جن کے فکر و نظر کو تقدّس و پاکیزگی عطا ہوئی۔ ان کے قلب و ذہن کو کوثر و تسنیم سے دھو کر معطر کر دیا گیا۔ انھیں بھی اسرار و رموزِ خفی و جلی سے آگاہ کر کے ان پر مہربانی کی گئی۔ یہ علم کے موتی، یہ کتابیں، یہ فکر و نظر کے سرچشمے شہرِ علم سے آئے ہیں۔ انھوں نے خاکِ مدینہ و نجف کو اپنی آنکھوں کا سرمہ بنایا اور حضرت واصف علی واصفؒ کی انگلی پکڑ کر برصغیر پاک و ہند کے چاروں سلاسلِ تصوّف سے فیضِ بے بہا پایا۔ باباجی عنایت اللہ دُنیاوی اعتبار سے ڈسٹرکٹ فوڈ کنٹرولر اسلام آباد ریٹائر ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں مال و متاع دُنیا سے خوب نوازا ہے مگر وہ بباطن ایک درویش صفت انسان ہیں۔ باباجی عنایت اللہ واقعی ''بابُ العلم'' کے در کے مانگت ہیں۔ مجھے ان کی شخصیت کو دیکھ کر محمدؐ اظہار الحق کے یہ شعر بے ساختہ یاد آتے ہیں۔

حروف کشف کے ہیں اور ظروف مٹی کے
اُجڑ سکے گی کسی سے نہ خانقاہ مری
فقیر خاک نشیں اور اس کی جنبشِ لب
پھر اس کے بعد ہوئی سلطنت تباہ مری

انھیں تحریک تحفظ و استحکامِ پاکستان کی ذمہ داری سنبھالنی ہے اور وہ اپنی اس علمی تصنیف ''جمہوریت بلائے وقت'' میں غاصبانِ وقت کو للکارتے دکھائی دیتے ہیں۔ انکے لب و لہجے میں وہ گھن گرج، بلند آہنگی اور جوش و جذبہ موجود ہے کہ جسے دیکھ کر بلاشک و شبہ انکے زورِ خطابت کا بھی بے ساختہ قائل ہونا پڑتا ہے۔

باباجی جدید عہد کے انتہائی بالغ نظر، دُور رس، نکتہ فہم اور نکتہ دان دانش ور ہیں جنھوں نے عصرِ حاضر کے قومی و ملی مسائل، تہذیبِ نو کی نیرنگیوں، الحاد و بے دینی، فحاشی و عریانی، بے حیائی و بدکاری اور مادیت پسندی کو اپنی تحریروں کا موضوع بنایا ہے۔ وہ موجودہ مغربی جمہوریت کو چند مادہ پرست فلاسفرز کے پیروکار اور مخصوص حکومتی ٹولہ کی سوچ کا آئینہ قرار دیتے ہیں۔ باباجی عنایت اللہ نے ''جمہوریت بلائے وقت'' میں مغربی جمہوریت کا اِسلامی جمہوری اقدار سے تقابل کرتے ہوئے مغربی فلاسفرز کے افکار و نظریات کو محض قوت و اقتدار اور حصولِ جاہ کا منبع و ماخذ قرار دیا ہے، وہ یہ اَمر بخوبی سمجھتے ہیں کہ اِسلامی جمہوریت کا مرکز و محور تقویٰ اور پرہیزگاری ہے۔ اِسلامی جمہوری معاشرے میں عدل و انصاف، مساوات، قانون

کے احترام اور احتساب رائے جیسے اہم عناصر پائے جاتے ہیں۔ باباجی نے '' جمہوریت بلائے وقت '' میں موجودہ انسانی معاشرت کو مادی طرزِ فکر سے نجات دلا کر تزکیۂ باطن اور رُوحانی ارتقا کا پیغام دیا ہے۔ وہ مغربی فلاسفرز کی ملحدانہ سوچ کو زور و شور سے تنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔ وہ اس امر پر زور دیتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ کم و بیش پانچ چھ ہزار افراد پر مشتمل مادہ پرستاروں کا ایک خاص ٹولہ نہ صرف تیسری دنیا بلکہ ترقی یافتہ اور متمدن تمام ممالک کے ممکنہ مادی وسائل پر قابض ہے۔ دنیا بھر میں مذاہب کی مقدّس تعلیمات کو بالائے طاق رکھنے سے صرف عائلی نظام ہی شکست و ریخت کا شکار نہیں ہوا بلکہ ممالک، اقوام اور پیغمبران کی اُمتوں کے مابین تعلقات میں بھی رخنہ اندازی در آئی ہے۔ ہیروشیما اور ناگاساکی کی تباہی و بربادی، جرمنوں کا قتال اور ان کی مستورات کی بے حُرمتی، افغانستان میں آگ کے بھڑکتے ہوئے شعلے، ایران و عراق کی باہمی جنگ، کشمیر، بوسنیا، چیچینیا اور فلسطین میں بڑھتی ہوئی جارحیت، وطنِ عزیز میں ہر طرف دہشت گردی کی عبرتناک لہر، طاقت ور ممالک کی آمرانہ پالیسیوں کا تسلسل ہے جو کہ حقیقت میں کُفر و دینِ ابراہیمی کی وہی آویزش ہے جو کہ طلوعِ اِسلام کے دور سے چلی آرہی ہے۔ بقول اقبالؒ

ستیزۂ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی ﷺ سے شرارِ بولہبی

باباجی عنایت اللہ کی یہ علمی تصنیف '' جمہوریت بلائے وقت '' ان کی متنوّع الجہات اور بوقلموں شخصیت کے انوکھے زاویوں کو سامنے لاتی ہے۔ مسلمان صوفیائے کرام نے ہمیشہ بنی نوعِ انسان کو سونے چاندی کے ڈھیر، عالی شان عمارات، اعلیٰ نسل کے گھوڑوں، تعیش کی زندگی سے دور رکھا اور دنیا کی بے ثباتی کا درس دیا ہے۔ باباجی کی علمی تصنیف '' جمہوریت بلائے وقت '' میں امرائے سلطنت کو حبِ جاہ و مال کی ہوس سے دور رکھنے کی بھی پوری سعی و کاوش ملتی ہے جو کہ دراصل صوفیانہ تعلیمات کی وہی باوقار روایت ہے جس میں اللہ بس، باقی ہوس نمایاں ترین نکتہ رہا ہے۔ یہ علمی تصنیف دراصل حدیثِ رسول ﷺ کے مصداق ہے جس میں آنحضور ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ہر جابر سلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنا عین جہاد ہے۔ باباجی کی علمی تصنیف '' جمہوریت بلائے وقت '' کا اسلوب جامع، پُر مغز اور مدلّل ہے۔ وہ اپنے تھیسز اور لفظ در لفظ مرصع جملوں سے ایک وسیع المطالعہ، صائب الرائے قومی دانش ور نظر آتے ہیں۔

باباجی عنایت اللہ انسانی برادری اور اہلِ کتاب پیغمبران کی اُمتوں کو لوٹ کھسوٹ، چھینا جھپٹی، انسانی قتال اور حرص و لالچ سے نجات دلا کر ان کے باطن میں صبر، شکر، توکل اور قناعت کے اوصاف پیدا کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ وہ منطق و استدلال اور تفکر و تدبر کا راستہ اپناتے ہوئے صرف مغربی جمہوریت کے تاریک پہلوؤں کو ہی سامنے نہیں لاتے، اہلِ کتاب پیغمبران کی اُمتوں اور ممالک کے مابین بین المذاہب مکالمے اور اخوت و محبت پر بھی زور دیتے ہیں۔ وہ آسمانی الٰہامی کتابوں اور پیغمبرانِ خدا کی تعلیمات کی طرف مراجعت لمحۂ موجود کی ضرورت قرار دیتے ہیں تاکہ معروف مغربی فلسفی فرانسس بیکن کی شیطانی سوچ اور مادی ترقی، سائنسی ترقی اور ایٹمی ترقی کے تباہ کن تصور کو ختم کیا جاسکے۔ دنیا بھر کے جغرافیہ پر نظر ڈالی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ہر دو متحارب گروہ بغاوت، فتنہ و فساد اور محاربت کے اصول پر کار فرما ہیں۔ یہ چند مخصوص مادہ پرست افراد کے گروہ بنی

نوعِ انسان اور پیغمبران کی اُمتوں کے قتال میں مصروف ہیں۔ وہ زیرِ تسلط افراد و اقوام کے ممکنہ قدرتی وسائل پر قابض ہونے کے لیے دلیل، منطق، گفت و شنید اور پر امن جدوجہد کا راستہ اپنانے کی بجائے اپنے ہاتھوں میں ہتھیار اٹھا لیتے ہیں جو کہ مادہ پرستانہ سوچ کا آئینہ دار طرزِ عمل ہے۔

باباجی عنایت اللہ مسلم نشاۃِ ثانیہ کے علمبردار وہ حریت پسند قلمکار ہیں جو روئے زمین پر آجر و اجیر، آقا و غلام اور مزدور و سرمایہ دار کے تفاوت کو جڑ سے اکھاڑ کر ختم کرنا چاہتے ہیں۔ باباجی ایک محبِّ وطن پاکستانی ہی نہیں پوری انسانی برادری کے بہی خواہ، ہمدرد، غم خوار اور خالق کی مخلوق کو خالق کی نگاہ سے دیکھنے کا راہ دکھاتے ہیں۔ باباجی نے '' جمہوریت بلائے وقت'' میں قرونِ اُولیٰ کے مسلمانوں کی اِسلامی جمہوریت کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اسے اقوام و ملل کے لیے ایک رول ماڈل قرار دیا ہے۔ وہ مدینے کی اِسلامی ریاست اور خلفائے راشدین کے شورائی نظام کو بار بار تحسینی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ وہ اس امر کے زبردست خواہاں ہیں کہ اِسلامی جمہوریہ پاکستان میں اِسلامی نظامِ حکومت کا نفاذ عمل میں لایا جاسکے۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ موجودہ پاکستان کے بحرانی دور کا جلد خاتمہ ہو، انتشار و افتراق، بدامنی، دہشت گردی اور لاقانونیت ہمیشہ کے لیے صفحۂ ہستی سے مٹ جائے۔ وہ عدل و انصاف، مساوات کے احترام پر زور دیتے ہیں۔ ہمیں ان کی اس پوری تصنیف میں بین السطور خالص پاکستانی سوچ اور فکر روزِ روشن کی طرح عیاں نظر آتی ہے۔ منیر نیازی نے اس شعر میں شاید انھیں کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی ہے:۔

فروغِ اسمِ محمّد ﷺ ہو بستیوں میں منیر
پرانی یاد نئے منظروں سے پیدا ہو

باباجی عنایت اللہ نے '' جمہوریت بلائے وقت'' میں قارئین کے فکر و نظر کو جھنجھوڑا۔ انھیں پوری قوت سے ببانگِ دہل یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ مادہ پرستانہ افکار و نظریات کے حامل مغربی فلسفیوں کی نابینا تقلید پرستی انھیں قعرِ مذلت کی اتھاہ گہرائیوں تک پہنچانے کا باعث ہے۔ باباجی نے یہ واضح کیا ہے کہ موجودہ مقننہ، عدلیہ، انتظامیہ نے شترِ بے مہار کی طرح قرآن و سنت کی بالادستی کو بالائے طاق رکھ دیا ہے۔ ہر شعبۂ حیات میں شعائرِ اِسلامی کی جھلک نظر آنے کی بجائے وحشت و بربریت، فحاشی و عریانی، انسانی قتال اور جنسیات زدگی کے نقوش صاف دکھائی دیتے ہیں۔ پڑھا لکھا دانش ور طبقہ فرائیڈ کے تحلیل نفسی، نیٹشے کے فوقُ البشر سے ضرور متاثر ہوتا ہے۔ وہ لینن، ماؤ اور کارل مارکس کو اپنا ہیرو قرار دیتا ہے مگر حقیقت میں یہ صناعی جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے۔

باباجی عنایت اللہ کے افکارِ عالیہ پر عمیق نظر ڈالنے سے یہ احساس دامن گیر ہوا کہ ان کی فکر کے سوتے، معروف مسلم سائنس دان، مفکر اور فلسفی علامہ محمّد یوسف جبریلؒ سے ملتے جلتے ہیں۔ جو فقیر نے اپنی علمی تصنیف (کن فیکون) میں اجاگر کیے ہیں۔ باباجی عنایت اللہ ۱۹۶۳ء میں لاہور انگلش کالج لاہور میں تھے۔ جہاں ان کی ملاقات علامہ محمّد یوسف جبریلؒ سے ہوئی۔ جو ادارہ کے سربراہ واصف علی واصفؒ سے ملنے کے لیے وہاں جاتے۔ یہ شرفِ نیاز قیام لاہور کے دوران جاری رہتا ہے اور بعد ازاں واہ کینٹ میں علامہ محمّد یوسف جبریلؒ کی آمد کے بعد بھی اس میں کمی نہیں آتی۔ جب باباجی عنایت اللہ کی دوسری علمی تصنیف ''صدائے وقت'' شائع ہوئی تو انھوں نے واشگاف الفاظ میں فرمایا کہ '' عنایت اللہ! آپ نے میرے مشن کی تکمیل کر دی ہے''۔ علامہ محمّد یوسف جبریلؒ نے باباجی عنایت اللہ کی دوسری علمی تصنیف '' صدائے وقت'' میں یہ بھی تحریر کیا کہ

''صدائے وقت ایک آواز ہے جو رات کے پچھلے پہر آسمان سے اتر کر انسانی بستیوں کے گلی کوچوں میں پھرتی ہوئی مسجدوں کے اندر سے گھومتی ہوئی، ریگزاروں، دریاؤں، پہاڑوں، وادیوں اور سمندروں کے اوپر سے چاند کی پراسرار اور سحر انگیز مگر غیر مرئی چاندنی کی صورت میں گزرتی ہوئی اپنا اثر چھوڑتی چلی جاتی ہے''۔

لہٰذا میں یہ کہنے میں حق بجانب ہوں کہ بقولِ غالبؔ

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

فصل 15۔ فلسفۂ جمہوریت کے فتنہ طراز خالق کا احتساب وقت کی ضرورت ہے، محمد الیاس:

اِس میں شک نہیں کہ جمہوریت بلائے وقت ہے کیونکہ اِس نظام اور نظریۂ ارتقا کے خالق و پرستار اپنے خالقِ حقیقی اور اِس دُنیا کی حقیقت کو سمجھنا اُن کے ذہنِ نارسا کا حصہ نہ بن سکا اور وہ صرف اور صرف مادی پہلو کے حصول کی سعی میں گُم ہو گئے اور تسخیرِ کائنات کی آڑ میں چند ایجادات کے طفیل دُنیا کو اپنے استحصالی نظام کی لپیٹ میں لے لیا۔ بنی نوعِ انسان کو رُوحانی پہلوؤں، موت و حیات اور حیات بعد از ممات سے بے بہرہ کر دیا ہے۔ گو کہ بیکن نے خود کہا تھا یہ تو محض ایک نظریہ ہے اور باقاعدہ ضابطۂ حیات نہیں۔ اس کو علم و عقل کی کسوٹی پر جانچ کر عمل پیرا ہونا چاہیے۔ سب سے بڑا المیہ یہ ہوا کہ جن کے پاس الٰہامی ضابط حیات موجود تھا، وہ مذہب پرست اُمتیں بھی اس فتنہ کو سمجھنے سے قاصر رہیں اور اس فانی دنیا کی تسخیر ہی کو اپنا مقصدِ حیات بنالیا اور اس کے حصول کی سعی کے لیے کوشاں ہو گئیں۔ حتیٰ کہ جمہوریت بھی اپنا دامن مکدر کر بیٹھی۔

اب بات یہاں تک آپہنچی ہے کہ دنیا کو ''گلوبل ویلیج'' کا نام دے دیا گیا مگر اس بات پر غور نہ کیا کہ آج اس بھری دنیا میں آدمی خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ اس ظالمانہ و غاصبانہ نظام میں کوئی کسی کا پُرسانِ حال نہیں ہے اور دکھی انسانیت کے زخموں کا مداوا اور اولادِ آدم کی باہمی محبت سے محرومی نفرت و نفاق کے چنگل میں پھنسا دی گئی ہے۔ رشتۂ انسانیت کی دھجیاں یوں اُڑی ہیں کہ آدمی صدیوں سے انسان کی تلاش میں کوہ و دشت کا سفیر ہے مگر اس دنیا کے سرائے بسیط میں تشنہ لب ہے۔

اس تشنہ لبی کے اسباب کو بے نقاب کرنا ضروری ہے کہ بدھ والے نروان کی دنیا سے بیزار ہوئے، عیسائیت عرفان کی بجائے خرد کی گتھیاں سلجھانے میں مصروف ہو گئی۔ ہندومت دھرمان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور سب سے بڑا المیہ کہ قومِ مسلم جن کے پاس دنیا و آخرت کا مکمل دستور تھا وہ بھی ایمان کی کنجیاں ہاتھ سے گنوا بیٹھی اور مومن کی فراست سے محروم ہو گئی۔ ہر چند صداقت کے امین اس حالتِ زار پر چشم گریاں ہوئے اور ضمیرِ مومن کو بیدار کرنے کی ہر ممکنہ سعی کی۔

حضرت علامہ اقبالؒ نے فرمایا:۔

تقدیرِ اُمم کیا ہے کوئی کہہ نہیں سکتا
مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارا

کسی نے یہ صدا لگائی:۔

نہ کر مادہ پرستوں پہ بھروسا
تو مسلم ہے تیرا حاصل قرآن ہے

باباجی عنایت اللہ صاحب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہیں۔ان کے حقیقی مقام کو سمجھنے کا دعویٰ تو میں نہیں کر سکتا۔ہاں البتہ ان کی من کی دنیا جو اس کتاب '' جمہوریت بلائے وقت ہے'' کے روپ میں سامنے آئی ہے وہ ابنائے آدم کی حالتِ گریہ اور تشنہ لبی سے اس قدر متاثر ہے کہ اس کی کسک دل میں محسوس کرتے ہیں اور بے اختیار ان کی چشم سے موتیوں کی ایک مالا ان کے چہرے پر سج جاتی ہے۔وہ اس مادہ پرستی کی کربناکی سے دل برداشتہ ضرور ہیں مگر مایوس نہیں۔وہ بنی نوعِ انسان کو جمہوریت کی تعلیمات سے نجات دلا کر اَلہامی ضابطۂ حیات کی ضوفشانی میں جگمگاتا دیکھنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے اپنی اس کتاب میں جمہوریت کی کارستانی کے جو حقائق اس جہان فانی کے باسیوں پر آشکار کیے ہیں نہ صرف ان کی نشان دہی کی ہے بلکہ ان کا ازالہ اور مداوا بھی توضیح کے ساتھ کیا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کے لیے وہ ہمہ تن کوشاں بھی ہیں۔ان کے نوکِ قلم پر لائی گئیں جمہوری تعلیمات اور اس کی فتنہ طرازیاں، عقدہ ہائے سیاست اور مذہب پرست اُمتوں کی مذہب سے بیزاری کی کتھا یقیناً جہادِ بالقلم ہے اور ان کی تحریر ہر قاری اور سامع کے دل پر ایسے نقوش مرتّب کرتی ہے کہ وہ بن بلائے ان کی صف میں شامل ہو کر فریضۂ حُر ادا کرنے کی تڑپ سے لبریز یہ نعرہ ضرور لگاتا یا بلند کرتا ہے۔''انقلاب۔انقلاب''۔

یقین جانیے کہ باباجی کے اس ''درماں'' کو اگر زندگی کا مقصد بنالیا جائے تو یونان کا ارسطو ہو یا مغرب کے ڈارون یا، یکن یا پاکستان میں موجود ان کے چیلے ہوں، مذہب سے فرار کی تمام راہیں مسدود ہو جائیں۔ان کی تمام تر ریشہ دوانیاں یکسر آئینے میں اُتر کر نقشِ برآب بن جائیں۔ان کی غاصبانہ کاروائیاں اپنی موت آپ مر جائیں، دنیا ایٹمی ترقی پر محبت کے چراغ جلانے کو ترجیح دے۔

در حقیقت اس دور کا انسان جمہوریت کی ان گھناؤنی سازشوں کے ہاتھوں مجبور و بے بس ہو کر رہ گیا ہے۔رشتوں کا تقدّس کھو بیٹھا ہے، بھائی سے بھائی، باپ سے بیٹا اور ماں سے بیٹی چھین لی گئی ہے۔وہ زندہ ہے مگر مانندِ لاش۔آج دنیا کی بے ثباتی کی حقیقت اور اَلہامی ضابطۂ حیات کے چراغ سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں غرق ہوتے نظر آرہے ہیں۔

افسوس تو اِس بات کا ہے کہ آج کا انسان اِس حقیقت کو سمجھنے کے باوجود پابہ زنجیر کیوں ہے؟ جمہوریت کے زِندان اور اس کی آہنی زنجیریں ایک لمحہ میں ٹوٹ سکتی ہیں بشرطیکہ ہم افتراق و نفاق کے چنگل سے آزاد ہو کر پوری یگانگت کے ساتھ اس کی طرف رجوع کریں جو حضور اکرم ﷺ کے مبارک ہاتھوں سے تشکیل پایا تو یقیناً ہم اپنا کھویا ہوا درخشندہ اور تابناک ماضی لوٹا سکتے ہیں۔

فصل16۔دہشت گرد کون؟ تحریر ڈاکٹر محمد عارف:

الہامی کتابوں کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو خدائے وحدہٗ لاشریک نے اپنی مخلوق کو راہِ ہدایت کی طرف بلانے کے لئے مواعظِ حسنہ، رجز و توبیخ اور جزا و سزا کا موضوع تمام کتبِ آسمانی میں بیان فرمایا۔انبیائے کرام پر نازل کردہ کتابوں میں ایک ہی تھیسز اور ایک ہی تھیوری ملتی ہے۔ولی، اوتار، پیغمبر، مصلح، قوم

اور راہبرانِ ملت بار بار ایک ہی موضوع کو اس لئے بیان کرتے رہے کہ شاید اُمتِ مسلمہ کو اپنی حالتِ زار کے سدھارنے کا خیال آجائے۔ شاید مسلمان اپنے اعمال پر نظر کر کے اصلاحِ احوال کی کوشش کریں۔ انہیں معیشت، سیاست، عدالت، حکومت اور ہدایت کے سب اسرار و رموز ازبر کرنے کیلئے ہر مکتبہءِ فکر کے دانش وروں نے اپنے تئیں اپنی سی کوشش کی ہے۔ فقراء میں بھی جلالی اور جمالی دونوں رنگ کے لوگ ملتے ہیں۔ برصغیر پاک وہند میں بزرگانِ دین نے ہندوؤں کو مشرف بہ اسلام کرنے کے لئے دعوت و تبلیغ کی بجائے صرف حسنِ کردار سے کام لیا ہے۔

ان ہی عظیم المرتبت اور بابرکت ہستیوں نے لوگوں کی دلچسپیوں کے عین مطابق سماع کو اختیار کیا جس کی برکت سے لوگ جوق در جوق دائرہ اسلام میں داخل ہونے لگے کیونکہ نغمہ وآہنگ ان کے مذہب کی بنیادی اساس تھے۔ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ نیکی کا اولین درجہ یہ ہے کہ انسان برائی کو قوتِ بازو سے ختم کرنے کی کوشش کرے۔ باباجی عنایت اللہ صاحب نے اپنے قلم کے ذریعے موجودہ دور کے بھٹکے ہوئے قافلے کو سوئے حرم لے جانے کی تگ ودو کی۔ وہ پیرانِ کلیسا اور صاحبانِ منبر و محراب دونوں کے طرزِ عمل سے خائف ہیں۔ وہ رہنماؤں کو دوراندیشی اور سوجھ بوجھ کا پیغام دیتے ہیں۔ یہی وہ نغمہ سرمدی ہے کہ جو ان کے بربط دل سے بار بار پھوٹتا ہے اور صفحہءِ قرطاس پر بکھرتا چلا جاتا ہے۔ قدرت نے ان کے بیقرار دل میں اس امتِ مرحوم کا غم رکھ دیا ہے۔ وہ اپنی بے کلی کا رونا روتے ہیں۔ ان کے سینے کی چبھن تند و تلخ الفاظ میں ڈھل کر ربط و بے ربط اسلوب اختیار کرتی چلی جاتی ہے۔ یہ تحریر نہ تو کوئی ادبی فن پارہ قرار پاسکتی ہے اور نہ ہی اسے اردو ادب و صحافت میں کوئی بلند پایہ مقام دینے کی کوشش بارآور ثابت ہوسکتی ہے۔

یہ تو انکے بطون میں ایک ایسا آتش فشاں لاوا ہے جو بلند و بالا چٹانوں سے پھوٹتا ہے۔ یہ وہ آگ ہے جو نارِ نمرود کی طرح ہے جسے جلانے کے لئے سال ہا سال تک لکڑیاں اکٹھی کی جاتی رہی ہیں تاکہ حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام کو اس آگ میں ڈال دیا جائے۔ اولادِ ابراہیم اسی آگ میں ابھی تک جل رہی ہے اور ملتِ ابراہیمی کے فرزند لحہ لحہ سلگتی ہوئی زندگی کو جینے کی سعیءِ ناکام کر رہے ہیں۔ آج کے اس مادہ پرستانہ دور میں یہی نارِ نمرود سرد کرنے کی ذمہ داری باباجی عنایت اللہ نے اٹھائی ہے۔

صیہونی قوتیں اور استعماری طاقتیں اپنی تہذیبی و ثقافتی بنیادوں کو فروغ دینے کیلئے جمہوریت کے لباسِ کہنہ کو اتار کر نئے دور کی چکاچوند روشنی کی طرف راغب کرتی نظر آتی ہیں۔ موجودہ مغربی جمہوریت دراصل دیوِ استبداد کی نیلم پری ہے جو اپنی اطلسی ریشمی پوشاک کے ذریعے ساحرانہ وماہرانہ کرتب بازی دکھا رہی ہے۔ علامہ محمد اقبالؒ نے بھی اس طرزِ حکومت کے ذریعے ساحرانہ وماہرانہ کرتب بازی دکھا رہی ہے۔ علامہ محمد اقبالؒ نے بھی اس طرزِ حکومت کی مخالفت کی تھی اور اسے ہدفِ تنقید بنانے کے لئے قرطاس و قلم کو آبدار کرتے رہے۔

باباجی عنایت اللہ ایک ایسے مست الست درویش ہیں کہ جو ایک ہی سُر اور ایک ہی تال میں ایک ہی گیت کو بار بار پیش کرتے ہیں۔ وہ کبھی مدہم اور دھیمے سُروں میں گاتے ہیں اور کبھی اپنے لہجے میں تند و تلخی شامل کر لیتے ہیں۔ یہ وہ نغمہ ہے جو ہر ساز پر نہیں گایا جاتا۔ یہ وہ ساز ہے جو قدرت نے ہر کسی کے مقدر میں نہیں لکھا ہوتا۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ لوگ اس زخمی روح کی دل گداز پکار کو سننے کے لئے تیار نہیں۔ ان کے سینے کے گھاؤ اس قدر گہرے ہیں کہ جو لفظوں کے قالب میں ڈھلنے سے پہلے پہلے ہی کائنات کے حرف و صوت کو تہس نہس کر کے رکھ دیتے ہیں۔ غاصبانِ وقت اور

آمرانِ ملت کو للکارنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کیلئے عملی جہاد کی بھی ضرورت ہے۔ شاید وہ یہی دور آگیا ہے کہ فراعینِ مصر کے مقابلے میں جناب سیدنا موسیٰ علیہ السلام کھڑے ہوتے ہیں اور طلسمِ سامری کو توڑ کے رکھ دیتے ہیں۔ حضرت سیدنا یوسف علیہ السلام، حضرت سیدنا داؤد علیہ السلام، حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام، حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ ،الغرض تمام انبیائے کرام کی زندگی پر نظر ڈالیں تو کلمہِ توحید بلند کرنے کی پاداش میں انہیں روئے زمین پر اس قدر عملی جدوجہد کرنا پڑی کہ آج تک ان جیسی تکلیفیں کسی نے نہیں اٹھائیں۔

باباجی عنایت اللہ موجودہ سماجی گھٹن، عصری جبر اور ناآسودہ فضاء میں ایک ایسی دلگداز آواز ہیں، جو روح کے معبد میں گونجتی ہے۔ یہ وہ صدا ہے جو کبھی مسجدوں کی اذانوں سے بلند ہوتی ہے اور کبھی ناقوس کی گھنٹیوں میں سنائی دیتی ہے۔ باباجی عنایت اللہ کا مشن اسلامی جمہوریت اور ملتِ اسلامیہ کا احیاء ہے۔ یہ دراصل اپنے تئیں ایک کوشش ہے جو یہ مردِ مجاہد تن تنہا انجام دے رہا ہے۔ کبھی کبھی اس کے لب ولہجے کی شدتِ نشتریت اور کاٹ روح کو ہزار چھید بخش دیتی ہے۔ یہی وہ تلخابہءِ حیات ہے کہ جسے پی لینے سے حیاتِ ابدی حاصل ہو سکتی ہے۔ کون ہے کہ جو سقراط کی طرح یہ زہر کا پیالہ پی لے تاکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے امر ہو جائے۔ شاید کوئی ایک بھی نہیں۔ حضور اکرم ﷺ کی حدیثِ مبارکہ ہے کہ بہترین جہاد جابر سلطان کے آگے کلمہءِ حق کہنا ہے۔

باباجی عنایت اللہ یہی بہترین جہاد انجام دے رہے ہیں۔ ان کی تحریر وہ رزمیہ گیت ہیں کہ جو حالتِ جنگ میں غازیوں اور مجاہدوں کے لبوں پر جاری رہتے ہیں۔ سپاہیانِ دین وملت کفار پر حملہ آور ہوتے وقت مجاہدوں میں غیرتِ ایمانی پیدا کرنے کے لئے کبھی کبھی اس قدر جوش اور ولولہ سے کام لیتے تھے کہ انسانی عقل ان کے خطبات سے ششدر وحیران رہ جاتی تھی۔ طارق بن زیاد نے جبرالٹر کے مقام پر راڈرک سے جنگ کرتے ہوئے ایسا ولولہ انگیز خطاب کیا کہ اس کے مجاہدوں نے اپنی کشتیاں تک جلادیں تاکہ ان کے دل میں واپسی کا خیال بھی نہ آئے۔

باباجی عنایت اللہ بھی اپنے ہاتھ میں عصائے موسوی تھامے طلسمِ سامری کو توڑنے کے لئے میدانِ عمل میں کود پڑے ہیں۔ وہ ایک ایسے مردِ قلندر ہیں کہ جو سرتاپا جلال وجمال کا ایک پیکر ہیں۔ ان کے لطیف اور شیریں جذبات بھی زہر خند ہو جاتے ہیں۔ معاشرے میں پائی جانے والی بے اعتدالیوں، ناہمواریوں اور لغزشوں کو دیکھ کر سیخ پا ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ یہ دنیا ایک بہشتی معاشرے کا روپ اختیار کرلے جہاں عدل و انصاف، اعتدال ومساوات اور قانون کی حکمرانی ہو۔ وہ تمام ذمہ دارانِ امورِ مملکت کو متنبّہ کرتے ہیں کہ وہ اپنا قبلہ درست کرلیں۔ یہ وہ اسلوب ہے کہ جسے میں شکستہ اسلوب کا نام دوں گا۔ یہ وہ اسلوب ہے کہ جو stream of sub-consiousness سے جنم لیتا ہے۔ یہ شدتِ جذبات اور وفورِ شوق کی وہ وارفتہ کیفیت ہے کہ جو انسان کو از خود رفتہ کرکے خود کلامی پر آمادہ کرتی ہے۔ یہ وہ خود کلامی ہے کہ جس میں تخلیق کار اپنے دل میں چھپے ہوئے درد اپنے ہی مخصوص زبان میں بیان کرتا چلا جاتا ہے جس میں نہ کوئی قاعدہ ہوتا ہے نہ کوئی کلیہ و قانون پایا جاتا ہے۔ موجودہ دور میں بعض لوگ نثری نظم کو شاعری نہیں مانتے لیکن ایک مخصوص طبقہ ایسا بھی ہے کہ جو نثری نظم کے آہنگ کو شاعری مانتا ہے۔ نثری نظم بھی تو خود کلامی ہی کی ایک شکل ہوتی ہے۔

باباجی عنایت اللہ صفِ اوّل کے ادیب یا قلم کار ہوں یا نہ ہوں اینٹی جمہوریت تھیسز کے حوالے سے ان کا نام علمی وادبی دنیا میں ہمیشہ ہمیشہ زندہ رہے گا۔ کیوں کہ انہوں نے اس موضوع پر منفرد پیرایۂ اظہار میں پہلی دفعہ قلم اٹھایا ہے۔ یوں نہیں ہے کہ اس سے پہلے یہ موضوع اہلِ قلم کی دسترس میں نہیں آیا یا اس پر خامہ فرسائی نہیں کی بلکہ باباجی عنایت اللہ نے اس موضوع میں وہ نکتہ آفرینیاں پیدا کی ہیں کہ جو آتش وآہن کی زنجیروں کو توڑنے کے لئے کافی ہیں۔

پاکستان کے علمی وادبی مرکز لاہور میں عمر بسر کرنے اور واصف خیال کے بانی وموجد واصف علی واصفؒ کی ہمراہی میں زندگی گزارنے سے یہ تو ہوا کہ وہ اپنی ذات میں ایک انجمن، ایک ادارے اور ایک تحریک کا روپ اختیار کر گئے۔ میری دانست میں یہ وہی تسلسلِ فکر ہے کہ جو بنی نوعِ انسان کی ذہنی ونفسیاتی پیچیدگیوں کو دور کرنے کے لئے واصف علی واصفؒ کی تحریروں میں موجود تھا۔ واصف علی واصفؒ کے فرد فرد خیالات کو پڑھنے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بھی موجودہ طاغوتی نظام کی چیرہ دستیوں سے بخوبی واقف وآگاہ تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ معاشرے میں یہ دندناتے ہوئے عفریت نظر نہ آئیں۔ باباجی عنایت اللہ نے بھی اپنے باطن کی دنیا میں اٹھتے ہوئے کہرام کو سنا اور اسے الفاظ ومعانی کی گرفت میں لانے کی اپنی تئیں کوشش کی ہے۔ یہ وہ کہرام ہے جو کبھی حالی واقبالؒ کی شاعری میں نظر آتا ہے کبھی اکبر الہ آبادی کے دل ودماغ پر چھایا ہوا ملتا ہے اور کبھی تنویر سپرا، حبیب جالب، فیض احمد فیض، جوش ملیح آبادی جیسے اہلِ قلم کے فکر وفن کا مرکز بنتا ہے۔ یہی وہ ان کی دردانگیز چیخیں ہیں۔ ان کے اندوہناک نالے ہیں، جو ان کے اسلوب میں ڈھل کر سامنے آتے ہیں۔

افلاطون نے اپنی مثالی ریاست میں شاعروں اور ادیبوں کو جگہ نہ دی، وہ اپنی جمہوریہ میں اپنے ہی قواعد وضوابط کو نافذ العمل کرتے ہوئے عملیت پسندی کے فلسفے کو فروغ دیتا ہے۔ نامور ماہرِ تعلیم روسو بھی فلسفہء حرکت وعمل ہی کو اپنے لئے بنیاد قرار دیتا ہے۔ جان ڈیوی نے تعلیم کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ تعلیم تجربے کی تنظیمِ نو کا نام ہے۔ باباجی عنایت اللہ نے اپنی مثالی جمہوری سلطنت میں اپنے ہی اصول وضوابط کو نافذ العمل کرنے کی کوشش کی ہے۔ باباجی عنایت اللہ کا ناسٹلجیا اسی کربِ دروں اور سوزِ باطن کا ترجمان ہے کہ معاشرے کے ناسوروں کو عبرت ناک انجام تک پہنچایا جائے۔ مجھے اس موقع پر وہ مردِ درویش یاد آتا ہے کہ جس نے اپنی مثالی ریاست میں اسلامی معیشت کے خدوخال کو ہی واضح کیا بلکہ اسلامی فلاحی ریاست کے فرائض کو بھی احاطہءِ تحریر میں لایا۔ اس نے فتنۂ دجال کی چیرہ دستیوں کو سامنے لانے کی کوشش کی۔ وہ بھی نارِ نمرود کو سرد کرنے کے لئے آیا تھا۔ وہ مردِ مجاہد یوسف جبریل تھے۔ یوسف جبریل کو عدم آباد میں بھی چین نہ آیا اور اس نے عنایت اللہ کے روپ میں دوبارہ جنم لیا کیوں کہ عنایت اللہ بھی اپنی تحریروں میں مادہ پرستانہ سوچ کے خاتمے، مغربی جمہوریت کے انہدام، دہشت گردی کی بیخ کنی، صیہونی قوتوں اور اقوامِ مغرب سے اعلانِ جنگ جیسے موضوعات کو بیان کرتے ہیں اور یوسف جبریل کا بھی یہ اختصاص تھا۔ ترقی پسندانہ نظریات اور ملحدانہ سوچ نے ہر طرف اپنا غلبہ قائم کر لیا ہے۔ ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات، سوشل میڈیا، ہر طرف ایک مخصوص طبقہ ہی چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ ہمیں اس پر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ روزنامہ نوائے وقت ہر دور میں نظریہ پاکستان کی حفاظت اور دو قومی نظریئے کی ترویج واشاعت کے لئے کوشاں رہا ہے۔ حمید نظامی، مجید نظامی، عارف نظامی یہ وہ لوگ تھے کہ جنہوں نے ہمیشہ وطنِ عزیز کی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کی ہے۔

باباجی عنایت اللہ اسی محبِ وطن قافلے کے ایک نمائیاں فرد ہیں۔وہ بھی موجودہ دور کے خردافروز روشن خیال دانش وروں کی علمی بصیرت پر چیں بہ جبیں ہوتے ہیں۔وہ بھی فرقہ واریت، نسلی عصبّیت، انتہاء پسندی، مغرب پرستی اور دہشت گردی کو جڑ سے اکھاڑ پھینک دینے کے خواہش مند ہیں۔دورِ جدید میں یہ خالصتاً پاکستانی اور اسلامی طرزِ فکر، بیک وقت صوفیانہ بھی ہے اور عالمانہ بھی۔اسلام اور جمہوریت دو مختلف نظریات ہیں، جن کے فرق کو سمجھنااور سمجھانا ضروری ہے۔

باباجی عنایت اللہ کی مغربی جمہوریت کے پیروکاروں کے خلاف عالمی تحریک کو درست تناظر میں سمجھنے کے لئے ہر دو کے مابین امتیاز سے واقفیت وآگہی اہمیت کی حامل ہے۔باباجی عنایت اللہ کے بنیادی فکر وفلسفے کو جاننے کے لئے بھی زیرِ نظر بحث بنیادی نکتہ ہے جسے قارئین کو ذہن نشین کر لیناچاہیئے۔موجودہ مغربی جمہوریت ایک طبقاتی آمریت اور اسلامی نظامِ حیات کی ضد ہے۔ایک طرف اسلام اللہ کا پسندیدہ دین، ایک عالم گیر نظامِ حیات ہے۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:۔ اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ قف o ترجمہ:۔ ''بے شک اللہ کے نزدیک دین تو صرف اسلام ہے''۔ (3-آل عمران-12) ایک اور جگہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:۔ وَمَنۡ یَّبۡتَغِ غَیۡرَ الۡاِسۡلَامِ دِیۡنًا فَلَنۡ یُّقۡبَلَ مِنۡہُ ۚ وَہُوَ فِی الۡاٰخِرَۃِ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ o

ترجمہ:۔''جو کوئی اسلام کے علاوہ کسی اور دین کا طالب ہو گا اس سے ہر گز قبول نہ کیا جائے گا، اور ایسا شخص آخرت میں خسارہ پانے والوں میں سے ہو گا''۔ (۳۔سورۃآل عمران۔ ۸۵)

جمہوریت یکسر اسلام کے اصولوں کے منافی اور یونانی نظریات پر مبنی عیسائیت ویہودیت کا پھیلایا ہوا طاغوتی نظام ہے۔پس اسلام اور مغربی جمہوریت دو بر عکس اور متضاد نظریات ہیں۔قرآن وحدیث کی رو سے جمہوریت ایسا طاغوتی نظام ہے جس کا کسی بھی انداز میں ساتھ دیناچاہے وہ ووٹ ڈالنے یا اس کی ترغیب دینے کی شکل میں ہو، دراصل گناہ اور ظلم کا ساتھ دیناہے۔مالکِ کائنات کا تو حکم ہے کہ :۔'' نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرو اور گناہ اور ظلم کے کاموں میں مدد مت کیا کرو''۔

اسلام میں مقتدرِ اعلیٰ ذات صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔چند آیات واحادیث کا ترجمہ ومفہوم ملاحظہ فرمائیے:۔

وَلَا یَحۡزُنۡکَ قَوۡلُہُمۡ ۘ اِنَّ الۡعِزَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیۡعًا ؕ ہُوَ السَّمِیۡعُ الۡعَلِیۡمُ o ترجمہ:۔''(اے حبیبِ مکرّم!) ان کی (عناد و عداوت پر مبنی) گفتگو آپ کو غمگیں نہ کرے۔بیشک ساری عزت و غلبہ اللہ ہی کے لئے ہے (جو جسے چاہتا ہے دیتا ہے)، وہ خوب سننے والا جاننے والا ہے۔''(10-یونس-65)

وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّتَّخِذُ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ اَنۡدَادًا یُّحِبُّوۡنَہُمۡ کَحُبِّ اللّٰہِ ؕ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ ؕ وَ لَوۡ یَرَی الَّذِیۡنَ ظَلَمُوۡۤا اِذۡ یَرَوۡنَ الۡعَذَابَ ۙ اَنَّ الۡقُوَّۃَ لِلّٰہِ جَمِیۡعًا ۙ وَّ اَنَّ اللّٰہَ شَدِیۡدُ الۡعَذَابِ o ترجمہ:۔''اور لوگوں میں بعض ایسے بھی ہیں جو اللہ کے غیروں کو اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں اور ان سے ''اللہ سے محبت'' جیسی محبت کرتے ہیں، اور جو لوگ ایمان والے ہیں وہ (ہر ایک سے بڑھ کر) اللہ سے بہت ہی زیادہ محبت کرتے ہیں، اور اگر یہ ظالم لوگ اس وقت کو دیکھ لیں جب (اُخروی) عذاب ان کی آنکھوں کے سامنے ہوگا (تو جان لیں) کہ ساری قوتوں کا مالک اللہ ہے اور بیشک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔ (2-سورۃالبقرۃ-165)

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ o وَ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ o ترجمہ:۔''اے ایمان والو! جو پاکیزہ چیزیں اللہ نے تمہارے لئے حلال کی ہیں انہیں (اپنے اوپر) حرام مت ٹھہراؤ اور نہ (ہی) حد سے بڑھو، بیشک اللہ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا اور جو حلال پاکیزہ رزق اللہ نے تمہیں عطا فرمایا ہے اس میں سے کھایا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو جس پر تم ایمان رکھتے ہو۔'' قانون سازی حرام وحلال کی قیود مقرر کرنے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو ہے''۔

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِى الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ o ترجمہ:۔''اور اگر تو زمین میں (موجود) لوگوں کی اکثریت کا کہنا مان لے تو وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دیں گے۔وہ (حق و یقین کی بجائے) صرف وہم و گمان کی پیروی کرتے ہیں اور محض غلط قیاس آرائی (اور دروغ گوئی) کرتے رہتے ہیں۔''(6-الانعام-116)

اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ o ترجمہ:۔'' مرد عورتوں پر نگہبان ہیں''۔(4-سورۃ النساء-34)

علاوہ ازیں قرآن وحدیث میں عورتوں کی شہادت وو راثت بھی نصف ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:۔'' وہ قوم کبھی فلاح نہ پائے گی جو اپنا حاکم ایک عورت کو بنالے''۔(بخاری)

رسول اللہ ﷺ نے ایک مقام پر ارشاد فرمایا:۔'' اللہ کی قسم! ہم ایسے شخص کو حاکم یا والی مقرر نہیں کرتے جو ہم سے عہدہ طلب کرتا ہے اور اس کی حرص رکھتا ہے''۔(بخاری ومسلم)

اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے عورت کو تاریخِ انسانی میں پہلی دفعہ ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کی حیثیت سے عزت وافتخار بخشا ہے۔یہ امر بھی ملحوظِ خاطر رہے کہ مغربی جمہوریت میں حاکمیتِ اعلیٰ عوام کو حاصل ہوتی ہے۔

جمہوریت کے متعلق چند آرا ملاحظہ فرمایئے:۔

''تمام طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں''۔'' قانون سازی کا اختیار عوام کے منتخب کردہ نمائندوں کو ہوتا ہے''۔'' جمہوریت کا پیمانہ اکثریت کے بل پر ہی گھومتا ہے''۔''جمہوریت میں دو جاہلوں کی رائے ایک عالم کی رائے پر بھاری ہوتی ہے''۔'' جمہوریت میں مرد وعورت کے حقوق مساوی ہیں''۔'' جمہوریت میں عورت بھی سربراہِ حکومت بن سکتی ہے''۔

جمہوریت میں عہدہ کیلئے نہ صرف اپنے آپ کو پیش کیا جاتا ہے بلکہ اپنی خوبیاں بھی بیان کی جاتی ہیں۔جمہوری کلچر پر دوسروں پر کیچڑ اچھالا جاتا ہے،اقتدار کی رسہ کشی میں لاکھوں روپے تشہیر پر خرچ کردیئے جاتے ہیں۔جمہوریت میں مخلوط محافل میں جانا، غیر محرم سے موشگافیاں کرنا، پردے کو پرانا کلچر کہنا حق سمجھا جاتا ہے۔جمہوریت اسی مغربی طرزِ فکر کے ذریعے خرد افروزی اور روشن خیالی کا غلط سبق دے کر عورت کو اشتہاری طور پر پیسے کمانے کا ذریعہ بنادیتی ہے۔اسی نظامِ فکر نے ہر ایک مصرف کی پبلسٹی کے لئے عورت کو نیم برہنہ کرکے اس کی قدر ومنزلت کی توہین کی اور اسے چراغِ خانہ کی بجائے شمعِ محفل بنادیا۔

حامدہ چمکی نہ تھی انگلش سے جب بیگانہ تھی
اب ہے شمعِ انجمن پہلے چراغِ خانہ تھی

پچھلے چار دہائیوں سے پاکستان پیپلز پارٹی، پاکستان مسلم لیگ نون، مسلم لیگ ق، ایم کیو ایم اور اے این پی کی حکومتوں نے اپنی آفادیت کیلئے جمہوریت ، جمہوریت کا راگ الاپ کر اور عوامی حکومت کی ڈفلی بجا بجا کر ملکِ پاکستان اور پاکستانی عوام کا معاشی، معاشرتی، دینی جو بیڑہ غرق کیا ہے، وہ سب کے سامنے ہے۔ پاکستانی باز آئے ان لٹیروں، چوروں، ڈاکوؤں، قاتلوں، حرام خوروں، بے ایمانوں، ذلیل بے غیرتوں کی جمہوریت سے، بھاڑ میں جائیں یہ اور انکی جمہوریت دونوں۔ اللہ تعالی ہمیں ان سے نجات دے۔ (آمین)

ہم بھی کتنے عجیب لوگ ہیں لفظوں کے معانی و مفاہیم بدل دیتے ہیں۔ آج کل جمہوریت کے پیچھے لٹھ لے کر پڑے ہوئے ہیں۔ سیاست دان چار سو واویلہ کر رہے ہیں کہ جمہوریت خطرے میں ہے۔ کون سی جمہوریت، یہ وہ جمہوریت نہیں ہے جس کا پرچار ک ابراہیم لنکن تھا۔ آج اگر وہ زندہ ہوتا تو حیرت سے دیکھتا کہ ہم نے الفاظ کو سنہری چولہ پہنا دیا ہے۔

Government of the People, by the People, for the People.

مادہ پرستی اور ملحدانہ سوچ ایسے حالات کو جنم دیتی ہے کہ جہاں چنگیز خان، ہلاکو خان، ہٹلر، مسولینی، داراشکوہ، سکندر، کیقباد، خسرو پرویز، نپولین، نادر شاہ، راجہ داہر اور تاتاری خونِ انسانی کے دریاؤں میں اپنے رنگینیوں کے جہاز چلاتے نظر آتے ہیں۔ جمہوری طرزِ فکر ہی وہ باغیانہ احساس ہے کہ جس کے زیرِ اثر بے لگام فاتح اپنے مفتوحوں کی لاشوں پر قالین بچھا کر فتح کا جشن مناتے دکھائی دیتے ہیں اور کبھی انسانی سروں کے مینار انسانی درندگی کے عکاس و ترجمان نظر آتے ہیں۔ گویا دین سے دوری نہ صرف فرد کی قوتِ فیصلہ کو بے لگام کر دیتی ہے بلکہ اس کی باغیانہ سوچ کو بھی جلا بخشتی ہے۔

قرآن حکیم میں ایسے ہی لوگوں کو فاسق و فاجر گردانتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:۔

" جو لوگ خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں، وہی کافر ہیں، وہی ظالم ہیں۔ وہی فاسق ہیں"۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ دورِ محمدی ﷺ کو پھر سے زندہ کیا جائے۔ ہمیں نہ صرف سیاست بلکہ کل زندگی کو دین کے تابع کر دینے کی ضرورت ہے تاکہ یہ ارضِ پاک جنت الفردوس کا نمونہ بن سکے۔ مغربی جمہوریت اور استعماری قوتوں نے کبھی ویت نام کی جنگ کو جنم دیا تو کبھی فلسطین میں جارحیت کی بنا رکھی گئی۔ آج اسی جبر و استبداد کے زیرِ اثر کبھی عراق میں کشت و خون کی ہولی کھیلی جاتی ہے، تو کبھی افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جاتی ہے۔ یہ موجودہ مغربی جمہوری نظام کا ہی شاخسانہ ہے کہ کبھی جنت نظیر کشمیر کو دوزخ بنا دیا جاتا ہے اور کبھی ہیروشیما اور ناگاساکی پر بم گرا کر ان سلطنتوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اگر ہم تاریخ پر نظر ڈالیں تو جنگِ عظیم اوّل، جنگِ عظیم دوئم، ۱۹۶۵ء اور ۱۹۷۱ء کی پاک بھارت جنگیں بھی تو جمہوریت کے نام پر مطلق العنانی اور آمریت کو دوام دیتی نظر آتی ہیں۔

تری حریف ہے یا رب سیاستِ افرنگ
مگر ہیں اس کے پجاری فقط امیر و رئیس

بنایا ایک ہی ابلیس آگ سے تو نے
بنایا خاک سے اس نے دو صد ہزار ابلیس

امریکہ، برطانیہ اور دیگر یورپی ممالک میں جمہوری روایات پختہ ہیں اس لئے ان ممالک میں جمہوریت کا سفر صدیوں سے جاری ہے۔ ہمارے ہاں جمہوریت کے نام پر الزام تراشی اور دشنام تراشی ہوتی ہے۔ سیاسی اختلافات کو دشمنی کی حد تک بڑھادیا جاتا ہے اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اسی طرزِ تغافل کو جمہوریت کا حسن قرار دے دیا جاتا ہے۔ ہمارے ملک میں جمہوریت جن کے ہتھے چڑھی ہوئی ہے وہ پارلیمنٹ کو اپنے مفادات کی آماجگاہ بنائے ہوئے ہیں، وہ اپنی مراعات، تنخواہوں اور اعزازیے میں اضافے سمیت ہر مرض کا علاج پارلیمنٹ کو سمجھتے ہیں۔ وہ ملک اور قوم کے سنجیدہ سے سنجیدہ معاملے پر بھی غور نہیں کرتے۔ انہیں صرف اور صرف اپنا ذاتی مفاد ہی عزیز ہے۔ جس قوم کو آپ اپنی حالت بدلنے کا خیال نہ ہو جو جدوجہد نہیں کرتی ،جو ظلم تو سہتی ہے بغاوت نہیں کرتی۔ ربِ ذوالجلال اس کی حالت نہیں بدلتا۔ بقولِ اقبالؒ۔۔۔۔!

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال خود آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

جب دین اور سیاست کا ملاپ ہوتا ہے تو ہر طرف عدل وانصاف، امن وآشتی، حقوقِ پاسداری، بھائی چارہ، مساوات اور حق وصداقت کا دور دورہ ہوتا ہے۔ یہی وہ بہشتی معاشرہ ہوتا ہے جہاں ہر ایک کی عزت محفوظ، مال محفوظ، حقوق محفوظ، گھر بار محفوظ اور عزتِ نفس محفوظ ہوتی ہے، ہر شخص بے خوف وخطر زندگی کے مزے لوٹتا ہے۔ مفکرِ پاکستان علامہ محمد اقبالؒ اسی اسلامی طرزِ جمہوریت کو متاعِ دوجہاں قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:۔

خوشا وہ قافلہ جس کے امیر کی ہے متاع
تخیل ملکوتی و جذبہ ہائے بلند

یہ امر ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ وطنِ عزیز میں نافذ کرسچین جمہوریت، وحدتِ ملت اور جمعیتِ قوم کا تصور ختم کردیتی ہے۔ یہ مغربی جمہوریت صرف مادہ پرستوں اور سرمایہ داروں کا سیاسی کھیل ہے جس میں مادہ پرست دانش ور ہی حصہ لے سکتے ہیں۔ کون ہے جو اس کہنہ نظام اور فرسودہ روایات کے خلاف علم بغاوت بلند کرے گا۔ کون ہے جو جابر سلطان کے سامنے کلمہِ حق کہنے کی ہمت کر سکتا ہے۔

ظلم بچے جن رہا ہے کوچہ و بازار میں
عدل کو بھی صاحبِ اولاد ہونا چاہیئے
دنیا میں قتیل اس سا منافق نہیں کوئی
جو ظلم تو سہتا ہے بغاوت نہیں کرتا

عصری جبر، سماجی گھٹن، سیاسی حبس اور طبقاتی تضاد کی دلدل میں دھنسے ہوئے جس معاشرے میں مجھے جذبوں کے اظہار کا ازن ملا ہے وہ بذاتِ خود تشکیک وابہام اور سکوت وتحریر کی سیاہ چادر اوڑھ کر سانس روکے ہوئے زندگی کی ساعتیں گن رہا ہے۔ عدل وانصاف کے مقابلے میں ظلم اپنے پر

پھیلائے ہوئے دم توڑتے انسانوں کی ہچکیاں نگل رہا ہے، رستے مقتل بن گئے ہیں، چوراہوں سے بارود اگلا جارہا ہے، بازاروں میں زندگی برہنہ رقص رچارہی ہے۔ سچ سرِعام مصلوب اور جھوٹ برملا مسند آرا ہے، جرم رواج بن گیا ہے، غارت گری روایت میں شامل ہورہی ہے، دہشت گرد سے شہر سہمے ہوئے ہیں، وحشت صحراؤں پر مسلط ہے، لہو کے رشتے کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ رہے ہیں، یوں لگتا ہے کہ ظلم کی سیاہ رات نے سورج کو چباڈالا ہو، موجودہ صورتِ حال کی عکاسی کے لئے فقیر کو اپنی غزل کا ایک شعر یاد آگیا:۔

رات جو ہم پہ مسلط ہے کئی سالوں سے
اس کے دامن میں نئی ایک سحر دیکھتا ہوں

پاکستان دو قومی نظریہ کی بنیاد پر معرضِ وجود میں آیا۔ انگریز اپنے وفادار طبقہ کے جاگیرداروں اور غاصب حکمرانوں کو حکومت کا چارج دے کر 1947ء کو رخصت ہوا، جنہوں نے عوام سے دنیا بھی چھین لی اور دین بھی۔ اہلِ وطن کو انگریز سے تو آزادی نصیب ہوئی لیکن بدقسمتی سے ان حکمرانوں نے انگریز کے محکوم عوام پر مسلط کئے ہوئے جمہوریت کے نظامِ حکومت کو جوں کا توں مسلط رکھا۔ عوام پہلے ہی کی طرح جمہوریت کے پنجرے میں بند اور محکوم ہی رہے مگر حکمران بدلتے رہے، ہم نے بنی نوعِ انسان کو آگاہ کرنا تھا کہ اسلام میں کسی سیاسی جماعت کی گنجائش نہیں، اسلام تو اپنے حلقہء انتخاب میں صرف ایسے شخص یا فرد کو منتخب کرنے کا حکم دیتا ہے جو دین کے حسنِ خلق، حسنِ کردار اور حسنِ عمل کا مرقع ہو، جب کہ کرسچین جمہوریت کے نظریات کے مطابق سیاسی جماعتیں اپنا اپنا منشور پیش کرتی ہیں اور الیکشن کے لئے اپنے نمائندے کھڑے کرتی ہیں۔ جمہوریت بھی سوچتی ہوگی کہ کس ملک میں آن پہنچی ہے۔ کن لوگوں کے نرغے میں ہے، مہذب ملکوں میں یہ ایک نظامِ حیات ہے، یہاں ذریعہ معاش ہے، جو شخص الیکشن پر زرِ کثیر خرچ کرتا ہے اسے بخوبی علم ہوتا ہے کہ اس کی بمعہ سود وصولی کس طرح ہوتی ہے، ووٹ حاصل کرنے کے لئے کون کون سے ہتھکنڈے استعمال کرنا ہیں۔

مرے وطن کی سیاست کا حال مت پوچھو
گری ہوئی ہے طوائف تماش بینوں میں

میں باباجی عنایت اللہ کو اپنی تازہ علمی تصنیف ''دہشت گرد کون ہیں'' پر مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ انہوں نے علامہ محمد اقبالؒ کے تصورِ جمہوریت کو اپنے تاریخی تناظرات اور درست سیاق وسباق میں بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس راز کو اک مردِ قلندر نے کیا فاش
ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے
جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے
اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر

خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی ﷺ
جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

باباجی عنایت اللہ کے مغربی جمہوری طرزِ فکر اور پاکستانی معاشرت پر اس کے اثرات کے حوالے سے ان کے افکار و نظریات ملاحظہ فرمایئے:۔

۱۔ ''کتنی حیرت کی بات ہے کہ نہ عوام الناس اسمبلیوں تک پہنچ سکیں اور نہ ان کے این آر او جیسے قوانین کو بدل سکیں اور ان مجرموں کو کیفرِ کردار تک پہنچا سکیں۔ اہلِ وطن کے ساتھ کتنا بڑا دھاندلا، کتنا بڑا دھوکہ، کتنا بڑا فریب''۔

۲۔ ''پاکستان لاالہ الااللہ کے نام پر معرضِ وجود میں آیا تھا جہاں اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو قائم کرنا تھا''۔ ہم مانتے اسلام کو ہیں اور اطاعت کفر کے نظامِ حکومت کی کرتے ہیں۔

۳۔ ''کیا اسلام دنیا کو نظامِ مملکت، اس کا نظام سیلکشن دینے کے لئے آیا ہے یا بے دین اور لادین انسانوں کے تخلیق کئے ہوئے مغربی جمہوریت کے باطل، غاصب، کفر کے مجرمانہ استحصالی نظامِ حکومت کی پیروی یا اطاعت کرنے کے لئے آیا ہے''۔

۴۔ ''مذہب کش مغربی جمہوریت کے نظام الیکشن کی بجائے اسلامی جمہوریت کا نظام سیلکشن یونین کونسل کی سطح پر نافذ کردو''۔

۵۔ ''پاکستان میں جدید علوم پر مشتمل ایک تعلیمی نصاب، ایک جیسے تعلیمی ادارے، ایک جیسے بنیادی حقوق مہیا کرنا، اہلِ وطن کا فطرتی حق ہے''۔

۶۔ ''قرآنِ حکیم مسلمِ اُمہ کی مستورات کو ازدواجی زندگی کا نظامِ حیات عطا کرکے ان کی عزت و حرمت کو ایک نئی شان عطا کرتا ہے''۔

۷۔ ''مغربی جمہوریت کے مجرم سیاست دان مارشل لا کے مجرم ملکی آئین توڑنے والے ملک دشمن، ملکی غدار، چار فوجی ڈکٹیٹروں کی پیداوار ہیں''۔

خداوند کریم سے دُعا ہے کہ وہ انہیں عمرِ خضر عطا کرے تاکہ وہ اسی طرح موجودہ عہد کے طاغوتی نظام کو تہس نہس کرنے کے لئے کمربستہ رہیں۔

فصل 17۔ ''مسیحائے وقت'' کے بارے میں صدائے زمان لاہور کا کالم، تحریر ڈاکٹر محمد عارف:

رائے محمد اشرف صاحب کے روزنامہ ''صدائے زمان'' لاہور میں ''مسیحائے وقت'' کے نام سے جناب عنایت اللہ صاحب کا ایک کالم نظر سے گزرا۔ جناب عنایت اللہ صاحب محبِّ وطن پاکستانی اور قومی نقطہءِ نظر کے حامل دانشور ہیں۔ جناب عنایت اللہ صاحب کی علمی تصنیف ''مسیحائے وقت'' جنوری 2010ء میں شائع ہوئی جس کا انتساب حضرت علامہ محمد اقبالؒ اور حضرت قائدِ اعظمؒ کے نام ہے۔ رائے محمد اشرف صاحب ایک انتہائی زیرک اور دانا صحافی ہیں، ان کی نگاہِ انتخاب عنایت اللہ صاحب پر بالکل درست پڑی کیونکہ وہ لمحہءِ موجود میں ملک و قوم کی ڈوبتی ہوئی ناؤ کو کنارے پر لگانے کے لئے ''جمہوریت'' کا درست تصوّر اُجاگر کرنے میں مصروفِ عمل ہیں۔ رائے محمد اشرف ''مسیحائے وقت'' کو ''صدائے زمان'' میں شائع کرکے یقیناً وقت کی اہم ضرورت کو پورا کررہے ہیں۔ موجودہ کالم نگاروں میں جناب عطاء الحق قاسمی، جناب نذیر ناجی، جناب جاوید چودھری، جناب حامد میر کے نام سرِفہرست ہیں لیکن وطنِ عزیز کی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کے لئے بانگِ دہل آواز بلند کرنا تنہا

جناب عنایت اللہ کے قلم کا کرشمہ ہے۔ وہ وطنِ عزیز کے اندرونی و بیرونی، دشمنوں کے افکار و نظریات پر کاری ضرب لگاتے ہیں اور جمہوریت کے درست زاویوں کے تعیّن کے لئے پچھلے دس سال سے کوشاں ہیں۔ ان کی جمہوری اقدار و روایات کی پامالی اور اسلامی تصوّرِ حیات کے فروغ کے موضوع پر نو کتب چھپ کر زیورِ اشاعت سے آراستہ ہو چکی ہیں۔ (۱) آئینہ وقت، (۲) صدائے وقت (۳) ندائے وقت (۴) آوازِ وقت (۵) نادِ وقت (۶) چراغِ وقت (۷) انقلابِ وقت (۸) مسیحائے وقت (۹) نوشتہءِ وقت۔

جناب عنایت اللہ صاحب ایک درویش منش انسان ہیں۔ وہ شہرت اور نام و نمود سے کوسوں دور بھاگتے ہیں۔ یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ اس وقت پاکستان واصفیہ مکتبۂ فکر کے واحد ترجمان ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ حضرت واصف علی واصفؒ کے زیرِ سایہ بسر کیا جہاں سے انہوں نے اپنے ذہنی ارتقاء اور تعلیم و تربیت کا ایک مکمل دور پورا کیا۔ انہوں نے پینسٹھ سال کی عمر میں یہ سوچا کہ وہ قرطاس و قلم کے ذریعے فکر و نظر میں ایک انقلاب برپا کر سکتے ہیں لہٰذا وہ تخلیقی میدان میں کمربستہ ہو کر آ گئے اور دن رات کی شبانہ روز محنت سے تحریکِ استحکام پاکستان کے لئے کام کرنے لگے۔ جناب بشیر الدین محمود نے درست لکھا ہے کہ ''آج پاکستان کو دیکھنا ہو تو عنایت اللہ کو دیکھ لیں۔ سلگتا ہوا لاوہ جو کبھی بھی پھٹ سکتا ہے۔ غم و غصہ کا مرکب ہیں۔ جانتے ہیں کہ اہلِ پاکستان کے ساتھ بہت بڑا ہاتھ ہو گیا ہے وہ یہ ہاتھ توڑ دینا چاہتے ہیں۔ وہ بخوبی واقف ہیں کہ اس ملک کا مراعات یافتہ طبقہ اور حکومتی ٹولہ سولہ کروڑ عوام کا لہو پینے میں مصروف ہیں جس کا تدارک ہر محبِّ وطن پاکستانی کا ملی و قومی فریضہ ہے''۔

فصل 18۔ حضرت واصف علی واصفؒ کے شاگردِ خاص، مردِ خدا آگاہ، درویشِ خدامست، عنایت اللہ اور ان کا پیغام نادِ وقت، پیش لفظ

نادِ وقت، کرنل (ر) غلام سرور ستارۂ امتیاز:

برادرِ عزیز ڈاکٹر تصدق حسین کا میں تہہ دل سے ممنون ہوں کہ ان کی وساطت سے ایک مردِ خود آگاہ اور درویشِ خدامست سے اکتسابِ فیض کی سعادت نصیب ہوئی۔ میرا اشارہ جناب عنایت اللہ صاحب کی جانب ہے، جنہوں نے ایک طویل عرصہ تک عہدِ حاضر کے عظیم مفکر حضرت واصف علی واصفؒ کے حضور زانوئے تلمذ تہہ کر کے علم و عرفان کی کئی منازل انتہائی خوش اسلوبی سے طے کر رکھی ہیں۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا

ان سے فیض یاب ہونے کی جہاں مجھے بے پایاں خوشی ہوئی وہاں اس بات کا مجھے افسوس بھی ہوا کہ موصوف سے میں اس سے پہلے کیوں متعارف نہ ہو سکا۔ پھر مجھ پر کچھ اس طرح کی کیفیت طاری ہوئی کہ مجھے بے اختیار شاعر کی آواز میں آواز ملا کر کہنا پڑا:۔

نالہ از بہرِ رہائی نہ کند مرغ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود

عنایت اللہ صاحب کی چار تصانیف 'آئینہ وقت' 'صدائے وقت' 'ندائے وقت' اور 'آوازِ وقت' اس سے قبل طباعت کے مراحل طے کر چکی ہیں۔ ''نادِ وقت'' ان دنوں طباعت و اشاعت کے مراحل طے کر رہی ہے۔ امید ہے، بہت جلد یہ کتاب بھی قارئین کے ہاتھوں میں ہو گی۔ کتابِ ہذا پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ ان ابواب میں اُمتِ مسلّمہ کو درپیش مسائل کا تجزیہ بڑے دردمندانہ انداز میں کیا گیا ہے۔ اس کتاب کی امتیازی پہچان یہ

ہے کہ بیک وقت ذہن کے دریچوں کو وا کرتی ہے اور ساتھ ہی قلب کو گرماتی بھی ہے۔ مصنف نے بڑے موثر انداز میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ پاکستان اسلامی ضابطۂ حیات اور اسلامی مملکت قائم کرنے کے لئے حاصل کیا گیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ یہ ملک مسلمِ اُمہ بلکہ پوری انسانیت کو الہامی اور روحانی تعلیمات سے روشناس کرا سکے لیکن وائے حسرت ایسا نہ ہو سکا اور پاکستانی قوم کو سیاستدانوں اور حکمرانوں نے جمہوریت کی بے دینی کی خرافات میں گم کر دیا۔ حصولِ پاکستان کے اصل مقصد کو انہوں نے پسِ پشت ڈال دیا اور طالع آزماؤں اور ابن الوقتوں نے اس کے ملی تشخص کو اس طرح پاؤں تلے روند ڈالا کہ اس پر بسمل کی کیفیت طاری ہو گئی۔ مصنف درست فرماتے ہیں کہ وطنِ عزیز اسلامی نظریات کی بنیاد پر معرضِ وجود میں آیا تھا مگر اس وقت صرف پاکستان ہی نہیں بلکہ پوری ملتِ اسلامیہ اسلام کے منافی جمہوریت کے باطل اور غاصب نظریات پر مشتمل قوانین و ضوابط کے گھپ اندھیروں میں گم ہو کر رہ گئی ہے۔ مصنف کا اسالیب ہے کہ اُمتِ مسلّمہ کی منزل کا تعیّن صرف دینِ حق کے شورائی نظام میں مضمر ہے اور جب تک مسلمان ممالک کی قیادت اللہ کے احکام اور اس کے دستورِ مقدس کا نظام اور ضابطۂ حیات کو نافذ کرنے والے کسی قائد کے ہاتھ نہیں آتی۔ اتنی دیر تک مسلمان قوم اندھیروں میں ٹھوکریں کھاتی رہے گی اور اسے منزل کا سراغ نہیں مل سکے گا۔

مصنف اس بات پر سخت دلفگار ہے کہ گم گشتہ راہ بندگانِ خدا نے انبیاء کرام کے الہامی، نورانی اور دینی ضابطۂ حیات کو پسِ پشت ڈال کر فرعون و یزید کے باطل نظام کی بالادستی کو قبول کر لیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ آج انسانیت طبقاتی کشمکش کی گرفت میں اُلجھی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ مادیّت کے حصول کی جنگ میں غرق ہوتی جاتی ہے۔ مسلمانوں کی زبوں حالی تو مسلّم ہے، اِدھر عیسائیت کے علمبرداروں نے بھی عیسائیت کے نورانی ضابطہءِ حیات اور نظریات کی بجائے جمہوریت کے باطل اور غاصب فرعونی ضابطہءِ حیات اور اس کے نظریات کو اور اس کی تعلیمات کو اپنے اپنے ممالک میں رائج کر رکھا ہے۔ ان منافق حکمرانوں نے اپنے پیغمبران کے نظریات اور ان کی تعلیمات کو ملکی سطح پر منسوخ کر دیا ہوا ہے۔ عیسائیت کو جمہوریت کے مذہب کی تعلیم و تربیت کے ذریعہ فرعونی مادہ پرستی اور قتل و غارت کے باطل نظریات میں کنورٹ کر لیا ہے۔ ان سیاستدانوں نے کمالِ ہنر مندی سے اسلاف کی تاریخ کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ نتیجہ ہم سب کے سامنے ہے۔ آج جمہوریت کے علمبرداروں نے دنیا میں ہر طرف جنگ کے شعلے بھڑکا رکھے ہیں اور ان شعلوں کے اثرات مختلف ممالک میں پھیلتے جا رہے ہیں۔ مصنف کے نزدیک اس سنگین صورتِ حال سے نمٹنے کی صورت یہ ہے کہ مذہبی پیشواؤں اور روحانیت کے علمبرداروں اور عیسائیت کے پیروکاروں کو جمہوریت کے عدل کش نظامِ حیات سے نجات حاصل کرنے کی تدابیر پر غور کرنا ہو گا اور اللہ کی حاکمیت قائم کرنے اور مذہب کی بالادستی کو یقینی بنانے کے لئے منظم مہم کا آغاز کرنا ہو گا۔ اب صرف باتوں سے بات نہیں بنے گی۔ پُل کے نیچے سے پہلے ہی بہت پانی بہہ چکا ہے۔ مصنف کا ارشاد بجا ہے کہ آج کم و بیش تمام ممالک پر کسی نہ کسی حوالے سے جمہوریت کی چھاپ دکھائی دیتی ہے مگر اس وقت گلوبل لائف ان ممالک کی مہلک اسلحہ سازی اور قتل و غارت کی گرفت میں ہے۔ جمہوریت کے تربیت یافتہ رہزن پسماندہ قوموں کو دبوچنے کا طریقہ واردات کچھ یوں ہے کہ یہ ترقی یافتہ ممالک شروع میں دوستی کا روپ دھار کر پسماندہ ممالک کی جانب اپنا دستِ شفقت بڑھاتے ہیں۔ ان ممالک کی بنیادی ضروریات بھی پوری کرتے ہیں اور انہیں مالی امداد بھی فراہم کرتے ہیں پھر ان ممالک کی

ضروریات کا تخمینہ لگا کر ان ممالک پر ڈالروں کی بارش برسانا بھی شروع کرتے ہیں۔ حاجت مند ممالک کہتے ہیں کہ مسیحا نے ان کی مشکلات حل کر دی ہیں۔ اُدھر مسیحا خوش ہے کہ شکار زیرِ دام آ گیا ہے۔

مچھلی نے ڈھیل پائی ہے لقمے پہ شاد ہے
صیاد مطمئن ہے کہ کانٹا نگل گئی

مصنف کا ارشاد بجا ہے کہ آج انسانیت بالخصوص اُمتِ مسلّمہ جمہوریت کے دین کش ایک بہت بڑے دردناک المیہ اور فتنہ سے دوچار ہے۔ دنیا میں اس وقت ۱۶۵ اسلامی ممالک موجود ہیں لیکن ملوکیت نے ان کے بطن میں جا بجا پنجے گاڑ رکھے ہیں۔ ایک جانب مسلمان حسینیتؓ کی یاد کو مناتے ہیں مگر دوسری جانب وہ یزیدی نظامِ حکومت کی سرکاری طور پر پیروی کرتے چلے آ رہے ہیں۔ ان باطل قوتوں کو للکارنے کی اپنے تئیں ہمت نہیں پاتے۔ قول و فعل کے اس تضاد نے مسلمانوں کو ذلت اور رسوائی کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل دیا ہے۔ ایسے میں مسلمانوں کی نجات کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ اسلام کے عطا کردہ شورائی نظام کی روح کو سمجھنے کی کوشش کریں اور ان ابدی ہدایات کی روشنی میں پیش آمدہ حل تلاش کرنے کی کوشش کریں۔ اس میں ان کی فلاح کا راز مضمر ہے۔

دست ہر نا اہل بیمارت کند
سوئے مادر آ کہ تیمارت کند
ہَوا ہے گو تُند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیے ہیں اندازِ خسروانہ

فصل 19: چراغِ وقت نوعِ انسانی کے موجودہ تصوّرات کو بدلنے کا ایک جامع پروگرام اور ایک انقلابی فکر ہے، جنرل حمید گل:

عنایت اللہ صاحب کی تازہ تصنیف (چراغِ وقت) پر میرا اظہارِ خیال ایسا ہی ہے کہ جیسے سورج کو چراغ دکھانا۔ کہنے کو تو یہ وقت کے عنوان سے ان کی تقریباً نصف درجن کتابوں کا تسلسل ہے لیکن درحقیقت یہ نوعِ انسانی کے موجودہ تصوّرات کو بدلنے کا ایک جامع پروگرام اور انقلابی فکر کو بیدار کرنے کا ہدایت نامہ بھی ہے۔ عنایت اللہ صاحب نے مادیّت کے غلبہ کی فضاء میں، روحانی ارتقاء کا راستہ منتخب کر کے بڑی جرأت کا مظاہرہ کیا ہے بلکہ فقر، ایثار، قربانی اور سرفروشی کے افکار ان کو اپنے عظیم مرشد واصف علی واصفؒ سے ورثہ میں ملے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ ان کی ذاتی زندگی، بود و باش، تکلم اور تحریر میں وہ ہر اعتبار سے اپنے افکار کا عملی نمونہ ہیں۔ میری نظر میں ان کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو، ان کی خوش بینی اور بے پناہ عزم، مایوسی کے پھیلے ہوئے سایوں کے درمیان، ان کا عزم و استقلال یقیناً ان کی اندرونی روشنی کا مظہر ہے۔ انہیں یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے حالات میں یک دم تبدیلی رونما ہو گی اور اس وقت راہنمائی کے لئے چراغِ منزل کی ضرورت ناگزیر ہو جائے گی۔ عنایت اللہ صاحب اسی جذبہ کے تحت چراغ پہ چراغ روشن کئے جا رہے ہیں۔ میں ان کے افکار کی اڑان تک پہنچنے کی صلاحیت تو نہیں رکھتا لیکن ان کی تحسین ضرور کر سکتا ہوں۔ میرے لئے مصنف اور ان کی تخلیق دونوں ہی مقدس ہیں۔ میں انہیں دورِ حاضر کا بیش قیمت سرمایہ سمجھوں تو یہ مبالغہ نہیں ہو گا۔

فصل20۔ ''آئینہِ وقت'' دعوتِ فکر و عمل، تحریر، جنرل (ر) حمید گل:

عنایت اللہ صاحب نے اپنی کتاب ''آئینہِ وقت'' میں بڑے اِحسن انداز میں حقیقت نگاری کی ہے۔ اگرچہ یہ ان کی پہلی کاوش ہے لیکن بڑے سلیس و سادہ زبان میں بڑے دردِ دل کے ساتھ اعلیٰ جذبوں کے ساتھ، اعلیٰ جذبوں سے مزیّن ہو کر عوام کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا ہے۔ عنایت اللہ صاحب کے روحانی پیشواء جناب واصف علی واصف صاحب (مرحوم) ہیں جن سے ان کا چار دہائیوں سے واسطہ رہا ہے جو کہ خود دو درجن سے زائد کتابوں کے مصنف ہیں۔ اگرچہ مجھے واصف علی واصف صاحب سے ذاتی طور پر ملاقات کا شرف حاصل نہیں ہوا لیکن یقینی طور پر کتاب ''آئینہِ وقت'' میں اُن کی برسوں کی صحبت کا اثر نمایاں ہے۔

پاکستان، برصغیر کے کروڑوں مسلمانوں کی صدیوں کی بے پناہ قربانیوں اور انتھک جدوجہد کا ثمر ہے لیکن ہم نے اللہ تعالیٰ اور رسولِ کریم ﷺ کے فرمان اور قائدِ اعظمؒ کے ارشادات کو پسِ پشت ڈال کر سامراجی نظام کو تقویّت دی جو کہ آزادی کے بعد بھی ۲۵ سال سے ہم پر مسلّط ہے۔ اسی سامراجی نظام کی بدولت ہم پر فرعونی (حکمران طبقہ) ہامانی (وزراء نوکر شاہی، وڈیرہ شاہی)، قارونی (سود خور اور سرمایہ دار) آزری (ان تینوں طبقوں کے حمائتی مذہبی پیشوا) ہم پر مسلّط ہیں۔ ''آئینہِ وقت'' میں اس طبقاتی کشمکش کی بہت خوبی سے عکاسی کی گئی ہے۔ جوں جوں وقت گذرتا جائے گا۔ ''آئینہِ وقت'' کے احوال واضح ہوتے جائیں گے۔ یہی ایک سچی کتاب کی خوبی ہوتی ہے۔

کتاب کے آخر میں مصنف کے اکیس سوالات ہم سب کے لئے لمحۂ فکریہ ہیں۔ ہمارے اہلِ دانش اور اہلِ قلم حضرات کو دعوتِ فکر اور عمل دیتے ہیں کہ وہ آگے آئیں۔ ان سوالات کی روشنی میں جو زادِ راہ کا کام کر رہے ہیں۔ اصلاحِ احوال کے لئے یعنی مقاصدِ پاکستان کے حصول کے لئے سرگرمِ عمل ہو جائیں گے۔ اقبالؔ فرماتے ہیں:-

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمی

ہمیں مغرب کی جمہوری اقدار کی بجائے اپنی اقدار کو اپنانا ہو گا کیونکہ مغرب کی جمہوری روایات کا منبع و مخرج ان کی پارلیمنٹ ہے جب کہ ہمارے لئے قرآن و سنت آخری حکم ہے۔ پارلیمنٹ کو قانون سازی کا حق نہیں کیونکہ اللہ کی کتاب مکمل ہے۔ پارلیمنٹ صرف اللہ کے دیئے ہوئے قانون کی روشنی میں قانون بنانے کی پابند ہے۔ عنایت اللہ صاحب نے مغرب کے جمہوری نظام کے اس سلسلہ کی بڑے احسن طریقے سے خرابیوں کو آشکار کیا۔ میری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عنایت اللہ صاحب کے زورِ قلم میں اضافہ کرے۔ میری عنایت اللہ صاحب سے استدعا ہے کہ وہ اپنی نگارشات کا سلسلہ جاری رکھیں۔ اللہ تعالیٰ ان کا مقاصدِ پاکستان کی تکمیل میں حامی و ناصر ہو۔ آمین ثم آمین۔

فصل21:۔ ''آئینہِ وقت'' دیکھا ہے جو میں نے اوروں کو بھی دکھلا دے، تحریر: ڈاکٹر تصدق حسین:

''آئینہِ وقت''، کم و بیش سو (۱۰۰) صفحات پر مشتمل عنایت اللہ صاحب کی پہلی قلمی کاوش ہے۔ ہر چند کہ تصنیف و تالیف کی دنیا میں اس کتاب کا نام نیا ہے لیکن اس کے مصنف کا نام نہ نیا ہے نہ ہمارے لئے اجنبی! آپ مشہور و معروف صوفی، معلم، دانش ور، ادیب اور شاعر جناب واصف علی واصف

صاحبؒ کے حوالہ سے علمی وادبی حلقوں کے ساتھ ساتھ ذکر و فکر کی مجالس میں بھی پاکستان کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ''آئینہِ وقت'' کے مصنف نے جناب واصف علی واصف صاحبؒ کی طویل رفاقت میں جو دیکھا جو سنا اور جو پڑھا، اس کے ''قطرہ قطرہ قلزم'' بن کر کتب کی شکل میں سامنے آنے کا وقت اب آیا ہے۔

قبلہ واصف علی واصف صاحب نے ۱۹۷۳ء میں تحریکِ خدمتِ ملت کے نام سے ایک اصلاحی تنظیم کی داغ بیل ڈالی تھی جس کے مقاصد میں اسلامی ثقافتی انقلاب، پاکستان کا استحکام اور علاقائی سالمیت کے لئے کام کرنا اور تحفظِ نظریۂ پاکستان شامل تھا۔ یہ تنظیم تو کچھ عرصے بعد فعال نہ رہی لیکن اس کی بازگشت آج ۲۶ برس بعد ''آئینہِ وقت'' کی شکل میں گونجی ہے۔ لگتا ہے نہ یہ بلاسبب ہے نہ ہی مطلوبہ ثمرات حاصل کئے بغیر اب یہ ختم ہو گی۔

''آئینہِ وقت'' نوحہ ہے ہماری ۲۵ سالہ ملی و قومی زندگی کا۔ اس نوحہ میں مصنف کے یہ الفاظ بار بار ہمارے کانوں سے ٹکراتے ہیں۔ ''اسلام پڑھنے اور سننے تک محدود ہو گیا ہے''۔ وہی اسلام جس کے نام پر پاکستان وجود میں آیا تھا اس میں جمہوریت کے نام پر کھیلے جانے والے اس ناٹک کی تفصیل ہے جو اس وطن میں نصف صدی سے کھیلا جا رہا ہے اور کتنی بے حس اور بدنصیب ہے وہ قوم جو اسے دیکھ کر خوش ہو رہی ہے۔ واہ واہ کر رہی ہے۔ تالیاں بجا رہی ہے۔ اسی قوم کے اندر ایک محبِ وطن پاکستانی نے، اللہ کے ایک بندے نے، شاہِ مرسلین ﷺ کے ایک غلام نے، ایک آواز بلند کی ہے۔ ایک پیغام اس ملک کے عوام اور حکمرانوں تک پہنچانے کی کوشش ہے جو ''آئینہِ وقت'' کی صورت میں ہے اس میں حکمرانوں کے لئے چند مشورے بھی ہیں اور عوام کے غور و فکر کی چند باتیں بھی۔ یہ پیغام ایک فقیر، درویش اور ایسے صاحب کا ہے جو دانا و بینا ہے۔ جسے پروردگار نے ایسی بصیرت عطا فرمائی ہے جو مستقبل میں دور تک دیکھ سکتی ہے۔

''آئینہِ وقت'' ایک عبرت نامہ ہے۔ نصف صدی پہلے آزاد ہونے والے ایک ملک کا۔ دل لخت لخت کی پکار ہے۔ یہ ایک فردِ جرم ہے جس میں سیاست کے ایوانوں میں مسلسل سرزد ہونے والے قومی و ملی سطح کے جرائم کی طویل فہرست درج ہے۔ ''آئینہِ وقت'' کی تحریر سادہ و سلیس ہے۔ اسلوب دلنشین جو دل سے نکلی بات کو قاری کے دل کی گہرائیوں میں پہنچا دیتا ہے مگر کہیں کہیں عبارت پڑھنے والے کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔ ایسے موقع پر جناب واصف علی واصف صاحب کا قلمی فیض عنایت اللہ صاحب کی تحریر کی اوٹ سے بولتا سنائی دیتا ہے۔ ''اپنے حال کو کلمہ شریف پڑھا لیں۔ ماضی خود بخود مومن ہو جائے گا اور مستقبل روشن و درخشاں۔ فریاد، آہ، تڑپ، بیداری، یہ سب روح کے سوز کے ساز ہیں۔ ذرا ان کو چھیڑو۔ زندگی میں انقلاب برپا ہو جائے گا۔ تنہائی میں بات کرو۔ قدرت جواب دے گی اور رہنمائی کرے گی''۔

''آئینہِ وقت'' کا وہ حصہ جس میں محنت کشوں، کسانوں، مزارعوں اور مزدوروں کا استحصال کرنے والی قوتوں کا ذکر ہے۔ زبان و بیان اور اسلوب کی خوب صورتی کے لحاظ سے قاری کے لئے بڑی دلچسپی کا باعث بنتا ہے۔ کھیتوں، کھلیانوں، زرعی علم کی باریکیوں کا ذکر پڑھ کر محسوس یہ ہوتا ہے کہ ''آئینہِ وقت'' کا مصنف نرا ایک لکھاری ہی نہیں، ایک تجربہ کار کسان بھی ہے اور اس کے جذبات و احساسات کا ایک بپھرا ہوا سمندر ہے کہ

جس کی لہریں مصنف کی قلم کی گرفت سے بار بار باہر نکل جاتی ہیں۔اس کے دردِ دل میں برپا ایک سیلاب ہے کہ کسی ساحل کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔

''آئینہِ وقت'' کے مصنف نے یہ آئینہ صرف پاکستان کے حکمرانوں ہی کو نہیں دکھایا۔ بلکہ اسے دنیا کے ان بڑے ملکوں اور اداروں کے سامنے بھی لا رکھا ہے جن کی دوغلی پالیسی کا طلسم اب ٹوٹ چکا ہے، جن کے دوہرے چہروں سے نقاب الٹ دی گئی ہے اور اُمتِ مسلّمہ یہ جان گئی ہے کہ نام نہاد عدل وانصاف کے ان علمبرداروں کا روّیہ عالمِ اسلام میں بسنے والوں کے ساتھ اور ہے اور یہود ونصاریٰ کیساتھ کچھ اور۔۔۔۔

''آئینہِ وقت'' کے آخری صفحات میں مصنف نے اکیس سوالات اٹھائے ہیں جو اس مختصر سی کتاب کے متن ہی سے لے کر تشکیل دیئے گئے ہیں اور یہ ایک طرح سے تلخیص ہے اس کتاب کی۔ان اکیس سوالات میں سے ہر سوال قاری کے لئے غور وفکر اور تدّبر کے دروازے کھولتا چلا جاتا ہے۔

''آئینہِ وقت'' کے مطالعہ کے دوران اس کا تنبیہی انداز قاری کو بار بار اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔یوں محسوس ہوتا ہے کہ منجدھار میں پھنسی ہوئی کشتی کے ملاح کو کوئی چیخ چیخ کر پکار رہا ہے اور اس چٹان کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو اس کی نظر سے اوجھل ہے مگر کشتی اس کی زد میں آچکی ہے۔اس فقیر کی دُعا ہے کہ جو کچھ ''آئینہِ وقت'' کے مصنف نے دیکھا ہے۔اب رب رحیم وکریم وہ ان لوگوں کو بھی دکھادے جن کے ہاتھوں میں ملت کی کشتی کے پتوار ہیں۔آمین ثم آمین۔

فصل22:۔ ''آئینہِ وقت۔فیضِ نگاہ مردِ درویش'' تحریر پروفیسر شوکت محمود کنڈان:

محترم عنایت اللہ صاحب کا ''آئینہِ وقت'' میرے سامنے ہے۔میں نے جب اس کا انتساب دیکھا تو میں یکدم چونکا۔محترم عنایت اللہ صاحب سے تعلق آج سے اکتالیس سال پہلے قائم ہوا اور وہ تعلق آج تک قائم ہے۔اس تعلق کی وجہ برادرِ محترم قبلہ واصف علی واصفؒ صاحب سے ان کی نیاز مندی اور عقیدت مندی ہے جو دمِ تحریر موجود ہے۔سردی وگرمی کا زمانہ ان اکتالیس سالوں کی رفاقت کو نہ مٹا سکا بلکہ اس میں تیزی آئی، کمی نہ آئی۔ محترم عنایت اللہ صاحب کی تعلیمی اور روحانی تربیت اسی مردِ درویش کی نگاہ کے فیض کا نتیجہ ہے۔عنایت اللہ صاحب قبلہ واصف علی واصفؒ صاحب کے شاگردانِ خاص میں سے ہیں اور ان کے شب وروز کی ریاضت سے جتنی آشنائی جناب عنایت اللہ صاحب کو ہوئی کسی اور کو نہیں۔یہی وجہ ہے کہ جناب واصف علی واصفؒ صاحب نے عنایت اللہ صاحب کو اپنے فیض سے خصوصی فیض یاب کیا۔یہ اسی فیض کا نتیجہ ہے کہ ''آئینہِ وقت'' آپ لوگوں کے سامنے ہے۔''آئینہِ وقت'' میں بیباکیِ کلام اور کلمۂ حق کہنے کی جرأت اس بات کی مظہر ہے کہ درویش صفت روباہ صفت نہیں ہوتے ان کی زبان تلوار کی دھار کی طرح ہوتی ہے لیکن نگاہ میں التفاتِ مقناطیس کشش کا حامل ہوتا ہے۔

''آئینہِ وقت'' درحقیقت وقت کا آئینہ ہے۔آئینہ اہلِ تصّوف کے لئے وفا کا پیکر ہے جب کہ دنیاداروں کے لئے بے وفائی کی علامت۔اہلِ تصّوف نے دل کو آئینہ سے تشبیہ دی ہے اور اس کی شکستگی آئینہ ءساز کے قرب کا جواز پیدا کرتی ہے۔''آئینہِ وقت'' ایک ایسا ہی شاہکار ہے جس میں محترم عنایت اللہ صاحب نے تاریخ کے اوراق کی گرد کو جھاڑا اور وقت کا اجلا چہرہ دنیاداروں کو دکھایا۔اصل چہرہ یہ ہے جس کی تلاش کے ہم سب

متلاشی ہیں۔ جوں جوں عنایت اللہ صاحب وقت کے چہرے سے نقاب الٹتے جاتے ہیں توں توں دنیاداروں کے چہروں کے رنگ فق ہوتے جاتے ہیں کیونکہ ''آئینہِ وقت'' میں اپنا چہرہ دیکھنے کی جرأت سوائے اہلِ باطن کے اور کسی کو نہیں ہو سکتی اس لئے محترم عنایت اللہ صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے اس کتابچے کو لکھ کر آنے والے وقت کی آواز سنادی ہے۔ اب یہ ہم سب کا فرض ہے کہ اس کتابچے میں چھپے اس کرب کا مداوا کریں جو محترم عنایت اللہ صاحب کے دل میں موجود ہے اور جو اُمتِ مسلّمہ کو ندا دے رہا ہے کہ اب وقت آگیا ہے انقلاب کے آنے کا۔ اس انقلاب کا جس کی طرف قبلہ واصف علی واصفؒ صاحب نے اشارہ اپنی ایک طویل نظم (دُور کی آواز) میں کیا۔ یہ کتابچہ اسی آواز کا نقیب بھی ہے جب واصف علی واصفؒ صاحب فرماتے ہیں۔ ''آنے والے کمال کے دن ہیں عظمتِ ذوالجلال کے دن ہیں''۔ تو عنایت اللہ صاحب بھی اسی عظمتِ ذوالجلال کے متلاشی دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی تڑپ بے معنی نہیں ہے۔

عنایت اللہ صاحب اس سے پہلے صاحبِ قلم نہ تھے لیکن جب فیض کا سرچشمہ جاری ہو جائے تو ایسی کئی کتابیں منصہءِ شہود پر آجاتی ہیں کیونکہ عطا کسی کے فیضِ نظر کا نتیجہ ہوتا ہے اور جب اس بات کا احساس ہو جائے کہ فیض کا مطمعِ نظر کیا ہے تو ''آئینہ وقت'' تخلیق ہو جاتا ہے۔ ''آئینہِ وقت'' درحقیقت ایک ایسا آئینہ ہے جس میں 1947ء سے لے کر آج تک حاکمانِ وقت اور صاحبانِ سیاست اپنا اپنا چہرہ دیکھ سکتے ہیں۔ اس میں 45 پیراگرافوں میں تاریخِ پاکستان اور موجودہ پاکستان کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس کتابچے میں مردانِ حق اور درویشوں سے اپنا کردار ادا کرنے کی التجا کی گئی ہے اور لوٹ مار کی سیاست اور مغربی جمہوریت کو اُمتِ مسلّمہ کے لئے سُمِ قاتل اور شریعتِ محمدی ﷺ کا نفاذ پاکستان کے لئے منبعِ فیض قرار دیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ اکیس ایسے چبھتے ہوئے سوالات کئے گئے ہیں جن کے جوابات اہلِ نظر کے علاوہ کسی کے پاس نہیں ہیں۔ ان میں محبِ وطن لوگوں کے لئے دعوتِ فکر و عمل بھی ہے اور ملکی ترقی کے راز سے شناسائی بھی۔ عنایت اللہ صاحب نے واصف علی واصفؒ صاحب سے نیاز مندی اور ان کے افکار کی خوشہ چینی کا حق ادا کر دیا ہے۔ میری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سلسلے کو قائم رکھے۔ آمین ثم آمین

فصل 23۔ آئینہِ وقت، تعمیرِ انسانیت کا ذریعہ، تحریر اشفاق احمد:

کتاب ''آئینہِ وقت'' کے مصنف کو میں عرصہ پچیس سال سے جانتا ہوں اور اس کے ساتھ وقت کی ہر بنت سے گذرا ہوں۔ جو دن، دوپہر، شام، رات، اور صبح کاذب اور صادق کے درمیان نئے نئے چھاپے چھاپتی ہے اور نئے نئے رنگ ابھارتی ہے۔ عنایت کو میں نے اچھے، بُرے، تلخ، ترش، کھچاوٹ، کملاوٹ اور کرب و بلا کی کیفیتوں میں بھی دیکھا ہے۔ اس پر بوجھ بھی ڈالا ہے اور اس کا بوجھ کبھی اٹھایا بھی ہے لیکن! عنایت اللہ کے موجودہ روپ کا اشارہ مجھے ماضی میں کبھی نہیں ملا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک روز جب گولڑہ موڑ پر پہنچے گا۔ تو اس پر ''آئینہِ وقت'' جیسی کتاب وارد ہو جائے گی۔

یوں تو مغربی طرزِ جمہوریت پر حضرت علامہؒ نے بھی بڑی شدید تنقید کی ہے اور ملتِ اسلامیہ کی بڑی بڑی اور معتبر دینی جماعتوں نے بھی اس کے منفی اثرات و آثار سے مسلمانانِ عالم کو آگاہ کیا ہے لیکن جس سادگی، صفائی، خلوص اور دردمندی کے ساتھ عنایت اللہ نے اس بلائے بیدرماں

کا تجزیہ کیا ہے وہ ایک معمولی فہم و فراست رکھنے والے ذہن میں بھی بہ آسانی آجاتا ہے۔اس کی مزید وضاحت کے لئے آخر کے اکیس سوالوں میں ڈائیر کٹ ایکشن کی روح کارفرما ہے۔ یہ سوالات نہیں ہیں ہماری معاشرتی، ملی، سیاسی، دینی اور اقتصادی زندگی کے انڈیکیٹر (اشارے) ہیں۔ جس طرح انسانی تاریخ میں بعض ایسے صحت مند موڑ موجود ہیں جنہیں معمولی لوگوں، معمولی کتابچوں اور معمولی عملوں نے آنے والی نسلوں کے لئے مستقل کر دیا ہے،اسی طرح مجھے لگتا ہے کہ عنایت اللہ کا ''آئینہِ وقت'' بھی تعمیرِ انسانیت کے کسی عظیم منصوبے کے لئے ڈائنامائیٹ بن کر طاغوت کی ازلی بربادی کا سامان بن جائے گا۔

فصل24۔مجھے ہے حکمِ اذاں، تحریر ڈاکٹر تصدق حسین:

کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب ''آئینہِ وقت'' کی اشاعت نے محبانِ ملک وملت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔یہ ایک کتابچہ تھا کم وبیش سو صفحات پر مشتمل جس میں مصنف نے پاکستان کی ۲۵ سالہ تاریخ کی کتاب کو ورق ورق کھول کر اپنے قاری کے سامنے یوں رکھ دیا تھا کہ اس کی ایک ایک سطر، ایک ایک لفظ نہ صرف اس کی نظروں کے سامنے آئے بلکہ اسے اس غفلت و کوتاہی کا احساس بھی دلائے جس کا مرتکب وہ بھی ہوا تھا اور اب چند ہی ماہ گزرنے کے بعد عنایت اللہ صاحب ''صدائے وقت'' کے ساتھ ایک بار پھر سامنے آئے ہیں۔اس بار یہ کتاب تقریباً تین سو صفحات پر مشتمل ہے۔میں اِسے آئینہِ وقت کا تفصیلی ایڈیشن سمجھتا ہوں جس میں کل سات ابواب ہیں۔ہر باب اپنے اندر ایک خاص موضوع پر ساری تفصیلات سمیٹے ہوئے ہے۔ان موضوعات میں جمہوریت، کسان، مروّجہ تعلیمی نظام، علمائے دین اور مشائخِ کرام، عدلیہ، انتظامیہ اور طلباء کے معاملات شامل ہیں۔پوری کتاب میں تخاطب اور تکلم کا اسلوب اپنایا گیا ہے۔قدم قدم پر قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے صدائے وقت اس کے مطالعے کے لئے نہیں لکھی گئی بلکہ اسے تو مصنف نے اپنے سامنے ایک جمِ غفیر میں لا بٹھایا ہے جہاں وہ اس سے محوِ گفتگو ہے۔اس اندازِ تخاطب و تکلم میں مصنف اپنے سامنے موجود لوگوں سے سوال بھی کرتا جاتا ہے اور جوابات بھی، کبھی ان سے کبھی خود سے پیش کرتا جاتا ہے۔اسلوب اور طرزِ تحریر آئینہِ وقت سے مختلف نہیں۔عنایت اللہ صاحب کسی منجھے ہوئے ادیب کی طرح لفظوں سے کھیلتے نہیں ہیں اس لئے کہ وہ لکھاری ضرور ہیں مگر اپنے اصطلاحی معنوں میں ادیب ہر گز نہیں ہیں شائید اسی لئے انہیں یہ بھی پسند نہ ہوگا کہ صدائے وقت کو ادب پارہ سمجھ کر پڑھا جائے۔یہ ادبی کتاب نہیں ہے یہ تو ''صورِ اسرافیل'' ہے۔غلط مروّجہ نظام کے خلاف یہ تو خوابِ غفلت سے جگانے کا بگل ہے۔یہ تو ایک طویل فہرست ہے حکمرانوں، علمائے دین اور مشائخِ کرام کی ان کوتاہیوں کی جن سے نہ صرف اس مملکتِ خداداد پاکستان کی جڑیں کھوکھلی ہو گئی ہیں بلکہ دینِ اسلام کی اصل روح تک چھپ گئی ہے جو ملکِ پاکستان کا مطلب کیا ''لا الہ الا اللّٰہ'' کے نعرے سے وجود میں آیا تھا وہاں اللہ کے دین کو حصولِ اقتدار کا ذریعہ بنا کر پھر نظرانداز کیا جارہا ہے۔پاکستان کو اس مغربی جمہوری نظام کے شکنجے میں جکڑ دیا ہے جہاں وہ پاکستان دور دور تک کہیں نظر نہیں آتا جسے ایک نظریاتی مملکت کے طور پر آزاد کرایا گیا تھا ،جسے دنیا بھر میں اسلام کا قلعہ بن کر قائم رہنا تھا، جس کے بارے میں ایک مردِ درویش نے فرمایا ہے کہ ''ایک وقت آئے گا جب پوری دنیا کے معاملات کے فیصلے پاکستان میں ہوا کریں گے''۔اللہ کے ماننے والوں کو اس وقت کس قدر دکھ ہوتا ہے جب وہ مغربی ذرائع ابلاغ پر یہ جملہ سنتے ہیں کہ ''اسلام تو دنیا کا سب سے اچھا مذہب ہے لیکن اس کے ماننے والے سب سے بُرے انسان ہیں''۔ مسلمان اپنے دین، اپنے پروردگار اور اپنے رسول

اکرم ﷺ کے لئے بدنامی کا باعث کیوں بنے؟اس لئے کہ انہوں نے قُرآنِ حکیم کا ساتھ چھوڑ دیا،انہوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا دامن چھوڑ دیا،انہوں نے اسلام کو دنیا اور دنیا کی آسائشوں کے حصول کے لئے ایک ذریعے کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔وہ کسی نام نہاد اسلامی جماعت سے منسلک ہوتے ہیں تو دنیاوی فائدے کے لئے۔وہ کسی پیر فقیر کے آستانے پر آتے ہیں تو اپنی اصلاح کے لئے نہیں' کسی روحانی غذا کے حصول کے لئے نہیں بلکہ دنیاوی منفعتوں کے لئے،ملازمت میں ترقی کے لئے،بڑے عہدے کے حصول کے لئے،دولتِ دنیا میں اضافے کے لئے یہی وہ باتیں ہیں جنہیں عنایت اللہ صاحب نے صدائے وقت کا موضوع بنایا ہے۔

سول سروس کا ڈھانچہ کیا کیا گل کھلاتا ہے۔افسر شاہی،ذاتی مال و دولت اور جائیدادوں کے بنانے میں ملک کی سلامتی اور استحکام کو کس طرح داؤ پر لگاتی ہے۔عدلیہ جیسا معتبر ادارہ کیسے اپنا تقدس اور اعتبار کھو چکا ہے۔بے شمار مشائخِ کرام کے ہاں سے رشد و ہدایت کی جگہ دنیاوی جاہ و حشمت کی تقسیم کس طرح ہوتی ہے۔اس سے دین کی فلک بوس عمارت میں کہاں کہاں دراڑیں پڑتی ہیں۔صدائے وقت کے مصنف نے اس ساری صورتِ حال کا بے باک تجزیہ پیش کیا ہے اور بلاشبہ ان موضوعات پر قلم اٹھایا ہے جن پر اظہارِ خیال کرنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔

وطنِ عزیز میں رائج نظامِ تعلیم پر گفتگو کرتے ہوئے جہاں مصنف نے اس نظام کے نتیجے میں پیدا ہونے والی خرابیوں کی نشان دہی کی ہے وہاں یکساں نظامِ تعلیم اور ایک جیسے تعلیمی اداروں کے قیام پر زور دیا ہے۔راقم کا تعلق بھی چونکہ درس و تدریس سے رہا ہے،اس لئے یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ پوری قوم کے لئے یکساں نظامِ تعلیم اور ایک جیسی درسگاہوں کے قیام سے تو ایک ایسا انقلاب آئے گا جس میں بے شمار خرابیوں کی اصلاح خود بخود ہو جائے گی۔

نظامِ تعلیم بدلنے کے ساتھ ہی سول سروس کا ڈھانچہ تبدیل ہو جائے گا۔یہ ڈھانچہ تبدیل ہوا تو انتظامیہ اور عدلیہ میں ذہین اور لائق نوجوانوں کے ساتھ ساتھ دین سے لیس ایسے نوجوان آئیں گے جو ایماندار،محبِ وطن اور متقی و پرہیزگار ہوں گے،پھر پبلک سروس کمیشن کو اپنا طریقۂ انتخاب بھی لازماً تبدیل کرنا ہو گا۔اب کوئی مقابلے کا امتحان پاس کرنے والا صرف فر فر انگریزی بولنے اور لکھنے کی بنیاد پر کسی اعلیٰ عہدے پر فائز نہیں ہو گا۔نہ کسی نمازی و پرہیزگار کو اس کی پرہیزگاری اور دین سے محبت کی بناء پر پولیس سروس کے لئے نااہل قرار دیا جائے گا۔

صدائے وقت کے مصنف نے کتاب کے سات ابواب میں مختلف موضوعات پر بحث کی ہے اور ایک بات کا ذکر کم و بیش ہر باب میں آیا ہے وہ ہے حکومتی سطح پر ہمارے سرکاری اخراجات اور ان کی تفصیل کا ذکر۔گریڈ ایک تا گریڈ ۲۲ کی تنخواہوں کے تفاوت کا ذکر آیا ہے۔سرکاری گاڑیوں اور پٹرول کے خرچ کا ذکر ہوا ہے اور ان مراعات کی تفصیل دی گئی ہے جو صرف اور صرف بڑے افسروں کو حاصل ہیں جو دین کے بنیادی اصولوں کے منافی ہیں۔ان اخراجات میں کمی،سادگی اپنانے سے آئے گی مگر یہ سادگی کون لائے گا؟چیف ایگزیکٹو صاحب کا کیا خیال ہے؟ جو کچھ ابھی تک اس ضمن میں ہوا کیا وہ ان کی نظر میں کافی ہے؟

ہمارے دیہات اور ان میں بسنے والے ہم وطن آزادی کے ستر برس گذر جانے کے باوجود آج بھی پینے کے پانی،تعلیمی اور علاج معالجے کی سہولتوں سے محروم چلے آرہے ہیں۔صدائے وقت کے مصنف کے خیال میں جب تک اس اکثریتی آبادی والے خطہ پاکستان کو ترقی نہیں دی جائے

گی ملک مجموعی طور پر ترقی نہیں کر سکتا۔ دیہات میں بسنے والی آبادی پاکستان کی ترقی و تعمیر میں بنیادی عنصر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اصولاً تو ان لوگوں کی فلاح و بہبود کے زیادہ انتظامات کئے جانے چاہییں تھے مگر عملاً ہوا اِس کے برعکس ہے۔

صدائے وقت کے مصنف کی نگاہ پورے عالمِ اسلام پر ہے، وہ صرف ایک پاکستان کے لئے فکر مند نہیں، وہ پوری اسلامی دنیا کے لئے فکر مند ہے۔ وہ اتحادِ اُمتِ مسلّمہ کے لئے تمام اسلامی ممالک کے ایک بلاک کی تشکیل کا خواہاں ہے۔ اُس کی نظر میں اتحادِ بین المسلمین سے ہی ان تمام اسلامی ملکوں کو استحکام حاصل ہو گا۔ اُس کے خیال میں اقوامِ متحدہ جیسا عالمی ادارہ مسلم ممالک کے معاملات میں تعصّب اور جانب داری سے کام لے رہا ہے مگر اسلامی ممالک کے متحد ہو جانے کے بعد اس ادارے کو بھی اپنی حکمتِ عملی پر نظرِ ثانی کرنی ہو گی۔ یہ اتحاد کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے اور اس میں ان اسلامی ملکوں کو کیا کیا تدابیر اختیار کرنی ہوں گی۔ یہ ساری تفصیل مصنف نے صدائے وقت میں دے دی ہے۔ ماضی میں مختلف حکمرانوں نے اس ملک کو اسلام کے نام پر کس کس طرح لوٹا۔ اس کی تفصیل پڑھتے وقت قاری خون کے آنسو روتا ہے۔ صدائے وقت کا مصنف جب کرپٹ اور بدعنوان سیاست دانوں کے ذکر کے ساتھ ان علمائے دین اور مشائخِ کرام کا ذکر کرتا ہے جنہوں نے ایک غلط نظام کے پنپنے میں مختلف ادوار میں حکومتِ وقت کا ساتھ دیا اور دنیاوی فائدے اٹھائے تو اس کا قلم ان سے بھی کوئی رو رعایت نہیں کرتا۔

میری رائے میں یہ کتاب پوسٹ مارٹم ہے جسدِ وطن کا۔ اس میں وطنِ عزیز کو لاحق تمام امراض کو سامنے لا کر رکھ دیا گیا ہے۔ علاج بھی تجویز کر دیا ہے اور ایک ماہر و تجربہ کار طبیب کی طرح دوا بھی بتا دی ہے۔ اس نسخے کو استعمال کرنا شرط ہے ورنہ اس کی حیثیت وہی رہ جائے گی جو سرکاری و نیم سرکاری اداروں کے ان دفاتر کی ہے جہاں قائدِ اعظمؒ کی تصویر بھی آویزاں ہوتی ہے اور جلی حروف میں یہ عبارت بھی نظر آتی ہے۔ ''رشوت دینے اور لینے والے کا ٹھکانہ جہنم ہے'' مگر رشوت بلا جھجک لی جاتی ہے۔ پوری کتاب میں ایک سرخی بار بار متن سے باہر نکل آتی ہے۔ وہ قومیں تباہ و برباد ہو جاتی ہیں جو قوانین کے نفاذ میں طرفداری اور رو رعایت سے کام لیتی ہیں اور یہی سرخی موجودہ حکمرانوں کو بار بار اپنی جانب متوجہ کر رہی ہے۔ ملکی دولت لوٹنے والوں کی نشان دہی ہو چکی ہے۔ کس کس بنک میں، کس کس ملک میں، کس کس کا کتنا کتنا روپیہ ہے۔ اربوں کی مالیت کی کوٹھیاں ہیں جن سے ماہانہ لاکھوں روپے کرایہ آتا ہے۔ صدائے وقت کے مصنف نے موجودہ حکومت بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ آرمی چیف ایگزیکٹو سے یہ توقع وابستہ کی ہے کہ جس احتساب کا انہوں نے وعدہ کیا تھا اس میں اب تاخیر نہیں ہو گی۔ ان لٹیروں کا احتساب ہو گیا تو عوام یہ سمجھیں گے کہ خاکی وردی سے اب تک عوام کو جو توقعات وابستہ رہی ہیں وہ پوری ہو گئیں۔ کروڑوں اربوں کی ملکیتیں ان رہزنوں کی ضبط کر کے قرضے اتاریں۔ عوام کو ٹیکسوں کی چتا میں نہ جھونکیں۔ آپ اور عوام ایک ہو جائیں گے اور اس کے نتیجے میں ٹیکس کے نظام میں بھی عوام حکومت کا ساتھ دے گی۔

پاکستان کے آرمی چیف ایگزیکٹو نے اپنے دورِ حکومت میں طبقاتی نظامِ تعلیم ختم کر کے پوری قوم کے لئے یکساں تعلیمی ادارے قائم کر دیئے۔ انتظامیہ اور عدلیہ کا کھویا ہوا اعتماد بحال کر دیا۔ سول سروس کے موجودہ ڈھانچے کو بدل دیا۔ احتساب کا عمل بلا تاخیر اور بلا کسی رو رعایت کے تکمیل تک پہنچا دیا۔ ملکی ترقی سے دیہاتی مستفید ہو گئے تو یہ قوم انہیں سیلوٹ کرے گی۔ یہ سارا عمل اس کرپٹ نظام کو بدلنے کے لئے کیا جانا چاہئے جس میں

ماضی کے ایک جرنیل صدر نے بھی سرِعام یہ اعتراف کیا تھا کہ ملک میں رشوت تو ہے مگر میں بے بس ہوں اسے ختم کرنا میرے اختیار میں نہیں۔ عوام چیف ایگزیکٹو پاکستان سے اس طرح کی بے بسی اور معذوری کی توقع نہیں رکھتے۔ صدائے وقت کے مصنف کی تلخ نوائی ان تمام شعبوں اور ایسے افراد کو گوارا کرنی ہو گی جن کی نشان دہی بڑے عدل وانصاف کے ساتھ کی گئی ہے اس لئے کہ یہ تلخ نوائی ہی کارِ تریاقی کرتی ہے۔ اللہ ہمیں حق بات کہنے اور حق بات سننے اور برداشت کرنے کی ہمت عطا فرمائے اور عنایت اللہ پر اللہ کی مزید عنایات ہوں۔ آمین ثم آمین۔

فصل 25۔ آئینۂ وقت اور عصری تقاضے، تحریر، ڈاکٹر محمد عارف:

اسلام اور پاکستان لازم وملزوم ہیں۔ نظریۂ پاکستان کا مفہوم یہ ہے کہ برصغیر پاک وہند کے مسلمان اپنے لئے ایک ایسا خطۂ زمین حاصل کرنا چاہتے ہیں، جہاں ہر شعبۂ زندگی میں اسلامی قوانین کا نفاذ ہو۔ اسلامی جمہوریۂ پاکستان اسلام کا ایسا قلعہ بن کر اُبھرے جو عالمِ اسلام کے لئے بالخصوص اور پوری دنیا کے لئے بالعموم ایک روشن مثال کی حیثیت رکھتا ہو۔ قائدِ اعظم محمد علی جناحؒ تاریخِ پاکستان کے ایک ایسے بطلِ حریّت ہیں کہ جنہوں نے شبانہ روز محنت سے اسلامیانِ ہند کے لئے جدوجہد کی اور ایک الگ وطن کے حصول کے عظیم مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ یہ ایک تلخ تر حقیقت ہے کہ ہمارے ازلی اور ابدی دشمن بھارت نے آج تک ہمارے وجود کو تسلیم نہیں کیا۔ وہ ہر ممکن تگ ودو میں رہا کہ کسی طرح ہمارے ملی تشخص اور نظریاتی اساس کو نیست ونابود کر دیا جائے مگر وہ اپنی اس ناپاک خواہش کی تکمیل میں کامیاب نہیں ہو سکا اور نہ ہی آئندہ ہو سکے گا کیونکہ یہ وطن برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی بے پناہ قربانیوں کے بعد منظرِ عام پر آیا۔ علامہ محمد اقبالؒ نے ۱۹۳۰ء میں اپنے خطبۂ الٰہ آباد میں واضح طور پر فرما دیا تھا کہ ان علاقوں میں مسلمانوں کی ذیلی ریاستیں بنا دی جائیں جہاں وہ اکثریت میں ہیں اور جہاں ہندو آبادی زیادہ ہے وہاں ان کی حکومت تشکیل دے دی جائے۔ دو قومی نظریئے کی بنیاد سرسید احمد خان نے رکھی۔ واضح ہو کہ سرسید احمد خان ہندوؤں اور مسلمانوں کو دلہن کی دو خوبصورت آنکھوں سے تشبیہ دیتے تھے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست قائل بن کر سامنے آئے مگر جب ۱۸۷۶ء میں اُردو ہندی تنازعہ پیش آیا اور ہندوؤں نے دفاتر میں اُردو کی بجائے دیوناگری رسم الخط کی ضرورت پر زور دیا تو وہی سرسید احمد خان پکار اٹھے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو اکٹھا کرنا آگ اور پانی کو یکجا کرنے کے برابر ہے۔ اگر ہم پاکستانی ادب کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ ہر دور میں شعراء وادبا نے تاریخِ پاکستان کے مختلف گوشوں کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا۔ اُردو غزل کے آئینے میں پوری تاریخِ پاکستان کو بنظرِ غائر پڑھا جا سکتا ہے۔ اُردو افسانہ، ناول، ڈرامہ، انشائیہ، رپوتاژ، ہر صنفِ سخن اسی داستانِ دلگداز کی آئینہ دار بن کر ابھری ہے۔ قرۃ العین حیدر کا ''آگ کا دریا'' اور عبداللہ حسین کا ''اداس نسلیں'' جیسے شہرۂ آفاق ناول بھی ہجرت کے المیے کے تناظر میں برصغیر پاک وہند کی سیاسی وسماجی تاریخ کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے ہیں۔ مولانا ظفر علی خان نے ''زمین دار'' اخبار کے ذریعے تحریکِ پاکستان کے مختلف مراحل میں مسلمانوں کے دلوں میں تحریکِ آزادی کا جوش وجذبہ پیدا کیا۔ واضح ہو کہ ان کی شاعری میں برصغیر پاک وہند کی سیاسی تاریخ کے تمام واقعات کو سمو کر رکھ دیا گیا ہے۔ مولانا محمد علی جوہر کے اخبار ''کامریڈ'' نے بھی مسلمانوں کی سیاسی بیداری میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ نسیم حجازی ایک ایسے بلند پایہ ناول نگار نظر آتے ہیں کہ جنہوں نے مسلمانوں کی عظیم تاریخ کے مختلف پہلوؤں کو اپنی تحریروں کا مرکزی جوہر بنایا۔ کرنل صدیق سالک نے ''پریشر ککر'' اور ''ایمرجنسی'' کے ذریعے وطنِ عزیز کی تاریخ کے بعض نازک گوشوں کو بھی سامنے

لانے کی کوشش کی۔ کرنل صدیق سالک نے ''میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا'' میں وطنِ عزیز کے دولخت ہونے کی داستان کے سیاسی اسباب و علل کو شگفتہ و شاداب اسلوب میں ڈھال کر بیان کیا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی علمی تصنیف "Great Tragedy " میں اسی اندوہناک واقعے کے تناظرات کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے ''Friends not Masters'' میں قومی اور بین الاقوامی تاریخ کے خدوخال کو واضح کیا ہے۔

مختار مسعود نے ''آوازِ دوست'' میں وطنِ عزیز کی تہذیبی و ثقافتی اساس کو اس قدر مؤثر پیرایۂ اظہار میں بیان کیا ہے کہ آج تک اس کی گونج پاکستان بھر کے علمی و ادبی حلقوں میں سنائی دیتی ہے۔ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء میں پاکستان کے منصۂ شہود پر آنے کے بعد ہی سیاسی طالع آزماؤں نے ذاتی مفادات کو قومی مفادات پر ترجیح دیتے ہوئے اپنی تجوریاں بھرنا شروع کر دیں جس کی وجہ سے ہم اپنے مقاصدِ تخلیق کو حاصل نہ کر سکے۔ ''آئینۂ وقت'' ایک وسیع تر تلازمہ ہے جس کے ذریعے باباجی عنایت اللہ نے اپنوں اور غیروں کے ستم، مستقبل کے خدشات اور اندیشہ ہائے دور دراز کو قلم برداشتہ قلم زد کیا ہے۔ ''آئینۂ وقت'' ایک ایسی تحریر ہے کہ جس میں زندگی کے تلخ تر روز و شب کی تصویریں نظر آتی ہیں۔ یہ شذرہ سہلِ ممتنع ہوتے ہوئے بھی ایک دشوار ترین گھاٹی تھی کیوں کہ اپنے عہد کی محرومیوں، دکھوں اور غموں کو شدتِ جذبات میں فرد فرد تحریر کرنا ہی بذاتِ خود ایک مشکل ترین کام ہے۔ کسی فارسی شاعر نے ان کی باطنی کیفیت کو اجاگر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :۔

یک تن و خیلِ آرزو، دل بہ چہ مُدّعا دہم
تن ہمہ داغ داغ شد، پنبہ کجا کجا نہم

کہیں 1965ء کی خون ریز معرکہ آرائی کا ذکر ہے جس میں شہدائے پاکستان نے مادرِ وطن کے لئے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کئے اور کہیں ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کے المیے کو موضوع بنایا گیا ہے۔ وطنِ عزیز کے گوشے گوشے میں مزدوروں، کسانوں اور عام طبقوں کے افراد کی مظلومیت و محکومیت بھی خصوصی طور پر موضوع بنتی ہے کیونکہ صرف بائیس خاندانوں کے آمرانہ تسلّط نے ان کی زندگیوں کو عبرت کی داستانیں بنا دیا ہے۔ باباجی عنایت اللہ دراصل یہ چاہتے ہیں کہ اسلامی انقلاب کا خواب شرمندۂ تعبیر ہو۔ عدل و انصاف کا بول بالا ہو جائے۔ معاشی مساوات، قانون کا احترام ہر گلی کوچے میں نظر آئے۔ مغربی جمہوریت کے رستے ہوئے ناسور کی بجائے اسلامی جمہوری اقدار کا نفاذ عمل میں لایا جائے۔ یہی وہ مرکزی نقطہ ہے کہ جو ان کے لئے سوہانِ روح ہے۔ اب المیہ یہ ہے کہ وہ ان تمام حقائق کی سنگینی کو بیان کرتے ہوئے اپنے لب و لہجے کی تندی و تلخی چھپا نہیں سکتے حتّٰی کہ وہ تمام حدود و قیود کو بھی بالائے طاق رکھ دیتے ہیں۔ شاید یہی ان کے دل میں چھپا ہوا وہ ملتِ اسلامیہ کا درد ہے جو انہیں پیچ و تابِ رازی اور سوز و سازِ رومی سے ہمکنار رکھتا ہے۔ ان کا یہ تھیسز کوئی نیا نہیں ہے بلکہ یہ ہمارے شعر و ادب کا ایک اہم جزو رہا ہے۔ باباجی عنایت اللہ نے پاکستان سے ٹوٹ کر محبت کی ہے۔ ان کے ان رشحاتِ قلم سے واضح طور پر نظر آتا ہے کہ وہ پاکستان کے لئے دن رات کڑھتے ہیں۔ ان کی مضطرب نگاہیں اس روشن صبح کی تلاش میں ہیں کہ جب پاکستان اسلام کا قلعہ بن کر دنیا کے سامنے آئے گا۔ اُردو کے معروف صوفی دانش ور واصف علی واصفؒ نے قطبِ ارشاد کی حیثیت سے مسلمانوں کی ذہنی و نفسی پیچیدگیوں کو دور کرنے کے لئے تحریر و تقریر کو ذریعہءِ اظہار بنایا۔ ان کا اسلوب خالصتاً ادبی تھا۔ وہ ''قطرہ قطرہ

قلزم‘‘ ’’کرن کرن سورج‘‘ اور ’’حرف حرف حقیقت‘‘ کے ذریعے مسلمانوں کو تعلیم و تربیت دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ باباجی عنایت اللہ کی قلمی زندگی بھی ایک معجزے سے کم نہیں ہے۔ وہ عمر بھر حضرت واصف علی واصفؒ کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کئے رہے۔ باباجی عنایت اللہ نے حضرت واصف علی واصفؒ کی بے لوث خدمت کی اور سفر و حضر میں ان کے شریکِ کار رہے۔ حضرت واصف علی واصفؒ کی تمام کتب کی اشاعت ان کی ادبی، صحافتی، دینی، سماجی اور علمی زندگی کے فروغ وارتقاء میں باباجی عنایت اللہ کا کردار ایک روشن مینار کی طرح ہے۔ آپ نے ستر سال کی عمر میں اچانک قلم اٹھایا اور لکھنا شروع کر دیا۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ حضرت واصف علی واصفؒ کی علمی و ادبی تربیت اور ہمہ وقت صحبتِ خاص نے ان کے سینے میں مسلمانانِ پاکستان کے لئے بالخصوص اور انسانیت کے لئے بالعموم وہ پاکیزہ جذبات پیدا کر دیئے جنہوں نے ان کے دل میں ایک ایسا بھونچال پیدا کر دیا جو نہ انہیں دن کو چین لینے دیتا ہے اور نہ رات کو سکون۔ یہ وہ عشق ہے جسے علامہ اقبالؒ نے عشقِ حقیقی سے تعبیر کیا ہے۔ یہ بلند مقاصد کا عشق ہے اور اس کی نظر آسمان کی پہنائیوں کو محیط ہے۔ باباجی عنایت اللہ کو کسی مردِ دانا نے رازِ خلیل سے بھی آگاہ کر دیا ہے۔ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح طلسمِ سامری کو توڑ دینا چاہتے ہیں۔ وہ دورِ جدید کی ایٹمی آگ اولادِ ابراہیم اور نمرود کے استعاروں کو نئی تشریح و تعبیر دے کر ایک ایسی آزمائش کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو آج کی سسکتی، تڑپتی اور کراہتی انسانیت کو درپیش ہے۔

آگ ہے اولادِ ابراہیم ہے نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے

باباجی عنایت اللہ فکرِ اقبالؒ کے توسّط سے دورِ جدید کے ایک اہم مفکر علامہ محمد یوسف جبریلؒ کے خوشہ چین نظر آتے ہیں۔ واضح ہو کہ یہ وہی مردِ خود آگاہ ہیں کہ جن کی نگاہِ دور بین اسی تھیسز کو شاعرانہ، ادیبانہ، خطیبانہ، محققانہ اور عالمانہ انداز میں منکشف کرتی دکھائی دیتی ہے۔ باباجی عنایت اللہ سرمایہ و محنت کے تفاوت پر بھی غور کرتے ہیں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ غریبوں کے دکھ درد کا بھی مداوا ہو جائے۔ مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے علامہ اقبالؒ کی روح ان کے بطون میں حلول کر گئی ہے اور وہ انہیں کے فکری منطقے سے اخذ و اکتساب کرتے ہوئے اُمتِ مسلّمہ کو جھنجھوڑتے اور خوابِ غفلت سے بیدار کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ اسی قافلۂ حریّت کے ایسے مسافر ہیں کہ جو صحرا میں اذان دے رہے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو حرمِ پاک، اللہ اور قرآن کی طرف بلاتے ہیں۔ عصرِ حاضر کے دورِ پُر آشوب میں الحاد و بے دینی نے ہر طرف اپنے آہنی تسلّط کے ذریعے اجارہ داری قائم کر لی ہے۔ مغربی تہذیب کا بول بالا ہے اور ہم اسلام کی نظریاتی اساس سے کوسوں دور جا چکے ہیں۔ یہ وہ فکرِ اسلامی ہے کہ جو علامہ اقبالؒ کے بعد تحریکِ ادبِ اسلامی نے اختیار کی مگر وہ لوگ تصّوف اور فقر کی چاشنی سے آشنا نہ تھے اور نہ ہی انہوں نے کوئی ایسا غیر معمولی کارنامہ انجام دیا ہے کہ جسے سنہری الفاظ میں تحریر کیا جا سکے۔

محمد نقوش کا رسول ﷺ نمبر، نعت نمبر، سیرت نمبر، ماہنامہ الرشید کی دینی خدمات، ضیائے حرم، ضیاء القران، ضیاء النبی ﷺ، ہوں یا راجہ رشید محمود کا ماہنامہ نعت، صبیح رحمانی کا ارمغانِ نعت، شاکر القادری کا ماہنامہ نعت، کتنے ہی ایسے روشن چراغ ہیں جو حضور علیہ الصلوۃ والسلام کی محبت کو فروغ دینے میں پیش پیش ہیں تاکہ ملتِ اسلامیہ ان کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اپنا کھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کر سکیں۔ باباجی عنایت اللہ کا دل بھی

عشقِ رسول ﷺ سے سرشار ہے۔ وہ اولیائے اللہ اور فقراء کی محبت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ اسلامی جمہوریہءِ پاکستان کا ہر فرد و بشر اسی جذبے سے ہمکنار ہو جائے جو ان کے دل میں موجزن ہے۔ اگر ہم مختصر طور پر ان کی فکر کو چند لفظوں میں سمونا چاہیں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ دلوں میں عشقِ رسول ﷺ اور روحِ محمد ﷺ کو جلوہ گر دیکھنے کے خواہش مند ہیں۔ وہ عمر بھر اسی مقصد کے لئے سر گرمِ عمل رہے ہیں۔ وہ بخوبی سمجھتے ہیں کہ اسلام دشمن قوتیں دن رات مسلمانوں کو فرقہ واریت کے چنگل میں گرفتار کر کے ان کی اجتماعی قوتوں کو ختم کرنا چاہتی ہیں تاکہ مسلمان دنیا میں غیر معمولی کارنامے انجام نہ دے سکیں۔

وہ فاقہ کش جو موت سے ڈرتا نہیں کبھی
روحِ محمد ﷺ اس کے بدن سے نکال دو

وہ علامہ محمد اقبالؒ کے الفاظ میں رات دن اُمتِ مسلّمہ کے لئے یوں دعا گو رہتے ہیں کہ :۔

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسمِ محمد ﷺ سے اُجالا کر دے

فصل 26۔ صدائے وقت، پروفیسر شوکت محمود کنڈان:

کتاب لکھنا، کتاب پڑھنا اور پھر کتاب پر تبصرہ کرنا ایک انتہائی مشکل اور کٹھن کام ہے۔ کتاب کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکتا جب تک صاحبِ کتاب کی شخصیت اور اس کے افکار سے شناسائی نہ ہو۔

آیئے ! پہلے صاحبِ کتاب کی شخصیت سے تعارف ہو جائے۔ باباجی عنایت اللہ ایک منکسر المزاج اور مرنجانِ مرنج درویش منش صوفی حلیم الطبع انسان ہیں۔ آپ نے کبھی کسی کی دل آزاری نہیں کی۔ وہ خاموش سمندر کیطرح ہمیشہ خاموش رہے۔ دراصل اس میں عنایت اللہ کا کمال کم ہے کیونکہ ان کی تربیت ہی ایسے فقیر دوست لوگوں کے ہاتھوں ہوئی جو اپنے دور کے دیدہ وبینا لوگ تھے۔ لہٰذا یہ بڑی سیدھی سی بات ہے کہ صحبت کا اثر ضرور ہوتا ہے اور جب سوکھی لکڑی ہو تو آگ بہت جلد پکڑتی ہے۔ میرا آپ کے ساتھ تعارف برادرِ بزرگ قبلہ واصف علی واصفؒ کی وساطت سے ہوا۔ یہ فیض قبلہ واصف علی واصفؒ کا ہے جو ہمیں درویش منش صوفی عنایت اللہ کی شکل میں دکھائی دے رہا ہے۔ میں نے صوفی کے لفظ کو جان بوجھ کر استعمال کیا۔ ممکن ہے یہ عنایت اللہ صاحب کو پسند نہ آئے کیونکہ آپ کی طبیعت میں خوشامد نہیں ہے۔ آپ کی زبان میں سچائی کی کاٹ ایسی ہے جیسی دو دھاری تلوار۔ آپ سچائی کو اخفا کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ آپ واصف علی واصفؒ کے ساتھ اس زمانے سے ہیں جب واصف علی واصفؒ صرف ملک واصف تھے اور ایک استاد تھے انگریزی ادب کے۔ اس سارے سفر کی کہانی کے اگر کوئی چشم دید گواہ ہیں تو وہ راقم الحروف یا جناب عنایت اللہ صاحب ہیں جو ہر وقت سایہ کی طرح ان سے منسلک رہے۔ آپ قبلہ واصف علی واصف کے ساتھ ان تمام منزلوں میں دن رات عازمِ سفر رہے جو انہوں نے اپنی زندگی میں طے کیں۔ آپ نے قال سے حال تک اور پھر صاحبِ حال تک تمام منازل دیکھیں۔ شب و روز ان بزرگ ہستیوں کی بھی زیارت سے بہرہ مند ہوئے جن سے قبلہ واصف علی واصفؒ صاحب ملے۔ قبلہ عنایت اللہ صاحب کا یہ اعزاز ہے کہ انہوں نے ان ہستیوں کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کئے۔ یہی وجہ ہے کہ عنایت اللہ صاحب کی بات میں ایک زبردست کاٹ، درد، کرب، لذت، فکر اور بے چینی موجود ہے۔

اُنہوں نے ان ہستیوں کے فیض کا دامن نہیں چھوڑا۔ خواہ وہ ۱۹۶۵ء کی جنگی راتیں ہوں یا ۱۹۷۱ء کی گولا برساتی اور آگ اُگلتی ہوئی توپوں کے منہ میں جانے کی بات ہو۔ باباجی عنایت اللہ نے کبھی نہ نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مزاج میں ایک عاجزی، انکساری، ادب، خدمت اور فرمانبرداری کا بے پناہ عنصر موجود ہے کیونکہ انہوں نے نہ کرنا سیکھا ہی نہیں اور یہ بات ہے بھی سچ کہ محبت میں نہ ہے ہی نہیں۔ یہ تسلیم کا راستہ ہے اور تسلیم ادب سکھاتا ہے۔ بقول شاعر:۔ **"ادب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں"**

بات لمبی ہوتی جارہی ہے۔ یہ سفر کم و بیش ۴۰ سال پر محیط ہے اور ہماری رفاقت کا یہ سارا زمانہ تربیت کا ہی دور ہے۔ اس رفاقت کی داستان کے لئے ایک الگ کتاب کی ضرورت ہے۔ یہ تعارف اس لئے ضروری تھا کہ صدائے وقت کی اصل صدا اپنے قاری تک پہنچ سکے اور جس پسِ منظر میں یہ تخلیق وارد ہوئی ہے اس کا قاری احاطہ کر سکے۔ صدائے وقت دراصل وقت کی صدا ہے جو آئینہِ وقت میں انسان دیکھ بھی سکتا ہے اور سن بھی سکتا ہے۔ صدائے وقت آج کے دور کا نوحہ بھی ہے اور نشانِ منزل بھی۔ آج ہم جس منزل کی طرف گامزن ہیں وہ منزل ہماری منزل ہے ہی نہیں۔ چنانچہ وہ ہر وقت آواز لگاتے ہیں اور ہمیں اپنی سمت بدلنے کے لئے صدائے وقت کا تازیانہ استعمال کرتے ہیں تاکہ منزل ہم سے جدا نہ ہو جائے سمت کا تعین منزل کی شرطِ اوّلین ہے۔

اُنہوں نے صدائے وقت کو سات ابواب میں تقسیم کیا اور ہر باب ایک مکمل کتاب ہے۔ جمہوریت کا مکروہ چہرہ آپ نے دکھایا جب آپ اس جمہوریت کے خوبصورت چہرہ سے خود غرضی کا غازہ اتارتے ہیں تو نیچے سے جمہوریت کی اصل شکل نکل آتی ہے جو انتہائی مکروہ، پُر فریب اور انسانیت سوز ہے۔ آپ نے مغربی جمہوریت کو یک قلم رد کر دیا اور اس کے اصل کردار کا ذکر بڑی دلیری، جرأت اور خوبصورتی سے کیا ہے۔ اس جمہوریت کی آڑ میں ان لوگوں نے ملی تشخص کو غیر اسلامی نظام میں ڈھال کر مسخ کر رکھا ہے۔ یہ نشتر ایک مردِ حق ہی چلا سکتا ہے۔ جناب عنایت اللہ صاحب نے جمہوریت کو ایک دولہن سے تشبیہ دی ہے اور یہ صرف وڈیروں، جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور آمروں کے محلوں میں اترتی ہے اور ان کے ایوانوں کو اپنے حسن کی روشنی سے چکاچوند کرتی ہے اور اس چمک میں غریبوں کی کٹیا کو اور ان کہاروں (یعنی عوام) کو بھی بھول جاتے ہیں جن کے کندھوں پر سوار ہو کر یہ دلہن ان کے ایوانوں میں اتری۔ عنایت اللہ صاحب کا یہ اعجاز ہے کہ وہ نہ صرف مرض کی تشخیص کرتے ہیں بلکہ اس کا علاج بھی تجویز کرتے ہیں۔ عوام اور بالعموم طالب علموں کو آگاہ کرتے ہیں کہ سیاسی جماعتوں اور مذہبی جماعتوں کا آلہ کار نہ بنیں۔ انہوں نے اپنے تجربے اور گیان سے ان عوامل کی نشان دہی کی ہے۔ خاص طور پر طبقاتی تعلیمی نظام، جس کی وجہ سے ملت طبقوں میں تقسیم کر دی گئی۔ دینی اقدار کو پامال اور اسلامی کردار کو مسخ کر دیا۔ ملی، ملکی وسائل، اقتدار اور خزانہ چند غاصب ہاتھوں میں مقیّد ہو گیا۔ میرٹ میرٹ کہنے والے کس طرح میرٹ کی دھجیاں بکھیر کر کسان، مزدور، ہنر مند کی ۹۹ فیصد عوام سے ان کے حق چھین چکے ہیں۔ میرٹ صرف استحصالی طبقے کا کھیل بن چکا ہے۔ انصاف کا چشمہ ملک میں خشک ہو چکا ہے لیکن عنایت اللہ کے ہاں جس چیز کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے وہ ایک عزم اور منزل کی نشان دہی ہے۔ وہ سوئے حرم کے مسافر ہیں اور لاخوف ہیں۔

دوسرے باب میں عنایت اللہ صاحب نے کسانوں کے کردار پر روشنی ڈالی ہے اور ان کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔ تمام ملکی وسائل یہ طبقہ پیدا کر رہا ہے۔ وہ ۲۲ کروڑ عوام کو ہر قسم کی خوراک، سبزیاں، دودھ، پھل اور ہر قسم کے میوہ جات مہیّا کرتا چلا آرہا ہے۔

وہ غلہ اگاتا ہے اور اپنا شکم نہیں بھر سکتا۔ اس کی کپاس ہی اس کے تن ڈھانپنے کے لئے میسر نہیں۔ اس کی محنت نے جاگیرداروں، سرمائے داروں کے ایوان روشن کئے ہیں۔ ان کے ایئر کنڈیشنڈ وہ چلا رہا ہے لیکن ان کو بجلی میسر نہیں۔ وہ تعلیمی اداروں، ہسپتالوں، سڑکوں، بجلی اور تمام بنیادی ضرورتوں سے محروم ہیں۔ ان کو انہوں نے شودر بنا رکھا ہے۔ عنایت اللہ صاحب ایک مجاہد کی طرح ظالم حاکم کے سامنے کلمۂ حق کہنے میں عار محسوس نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک اگر یہ حکومت کی مشینری ٹھیک ہوتی تو آج ملک کی وہ حالت نہ ہوتی جس مقام پر وہ پہنچ چکا ہے۔ ابھی بھی وقت ہے کہ ان ظالموں اور غاصبوں سے ملک کو آزاد اور اس مروّجہ نظام اور سسٹم سے نجات حاصل کر لی جائے تاکہ ملک صحیح منزل کی جانب گامزن ہو جائے اور دین کی روشنی میں ایسا سسٹم رائج ہو جائے جو وطن کے ماتھے پر جھومر بن سکے۔ عنایت اللہ صاحب کی کتاب ایک ایسی صدا ہے جو سوئے ہوئے لوگوں کو خوابِ غفلت سے جگانے کے لئے صور کا کام دے گی۔ اس ملک کا المیہ ہے کہ حاکم جو بھی آیا' وہ خود غرضی اور ذاتی خواہشات کی بھیانک عدل کش نیت کے ساتھ آیا۔ انکے زیرِ سایہ افسر شاہی اور منصف شاہی، رشوت، کمیشن، کرپشن اور بریف کیس مافیا میں ڈھل گئی۔ عدلیہ نے عدل کے علاوہ باقی سارا کام کیا۔ استاد نے طبقاتی تعلیم پڑھانے پر اعتراض نہیں کیا۔ طالب علموں نے علم کے علاوہ کسی اور منزل کو نشانِ منزل بنایا۔ یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں، طالب علم کسی ملک کی ریڑھ کی ہڈی کا درجہ رکھتے ہیں اور ان کا کردار بھی اتنا ہی مضبوط ہونا چاہئے لیکن عنایت اللہ صاحب نے صدائے وقت میں طالب علموں کے ضمیر کو جھنجھوڑا اور ان کو اپنا ماضی بھی یاد دلایا اور حال کا آئینہ بھی دکھایا۔ انہوں نے بڑے کرب اور دکھ کے ساتھ طالب علموں کو مخاطب کیا اور ان سے ان کا اصل کردار ادا کرنے کی نہ صرف استدعا کی بلکہ منزل کا تقاضا بھی سمجھایا۔ عنایت اللہ صاحب نے طالب علم کو پورے ملک میں ایک نصاب کے تعیّن کا فکر دیا۔ اخلاص کے ساتھ علم کا حصول کرنے اور آئندہ ملک کی باگ ڈور سنبھالنے کی درخواست بھی کی۔ عنایت اللہ صاحب کوئی ادیب نہیں اور نہ ہی انہوں نے کوئی ادبی مقام کا دعویٰ کیا لیکن جب انسان کسی کی نگاہِ انتخاب میں آجائے اور وہ اس انتخاب کا حق دار بھی ہو تو پھر صدائے وقت کا وجود میں آنا ناگزیر ہو جاتا ہے کیونکہ ایسے انسان کو ایک خاص مقصد دے کر انتخاب میں لایا جاتا ہے اور پھر اس کو اتنا ہی ظرف بھی عطا کر دیا جاتا ہے کیونکہ عطا کرنے والی ہستی کے لئے عطاءِ رحمت بھی ہے اور سایہءِ رحمت بھی۔

اللہ تعالیٰ عنایت اللہ کی اس کاوش کو قبولیت کا شرف بخشے اور ان کی تحریریں وہ کام کر جائیں جو بڑے بڑے فلاسفر، ادیب، رہنما اور مصلح بھی نہ کر سکے کیونکہ اکتساب اور انتخاب میں بہت فرق ہے۔ اکتساب والا انسان ادیب تو ہو سکتا ہے لیکن انتخاب والی شخصیت عنایت اللہ کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ ان کی اس بات سے قطعاً کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ پاکستان کے چہرے کو مسخ کرنے والے لوگوں کو کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے اور ان مجاہدوں اور اللہ والے لوگوں کو آگے لایا جائے تاکہ وہ ملک کی زمام کو سنبھالیں اور یہ ملک جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے نام پر حاصل کیا گیا اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہو سکے۔ ملک و ملت کا کھویا ہوا مقام اقوامِ عالم میں نہ صرف بحال ہو بلکہ پوری انسانیت کے کھوئے ہوئے حقوق محبت، ادب، خلوص اور عدل و انصاف کو بھی ادا کر سکیں۔ ان کی اس کتاب میں خوبصورت استعارے بھی موجود ہیں اور کتاب تمثیلی حوالے سے قابلِ تعریف حد تک نمایاں نظر آتی ہے۔ انہوں نے بڑے خوبصورت انداز میں وہ بات کہہ دی ہے جو بڑے بڑے ادیب نہ کہہ سکے اور ان کے سینے

میں ایک سچے مسلمان اور پاکستانی کا دل دھڑک رہا ہے۔اللہ تعالیٰ ان کی اس نیک خواہش کو پایہ ءِ تکمیل تک پہنچائے اور ان کی یہ کاوش قبول کرے۔آمین ثم آمین۔

فصل 27۔ باباعنایت اللہ کی آواز صدائے وقت تبصرہ نمبر2 تحریر علامہ محمد یوسف جبریل:

''صدائے وقت'' کے مصنف باباجی عنایت اللہ کے دل میں جو قوم کا درد ہے اور اس کی آہ وبکا،اور نالہ وفریاد میں جو خلوص ہے اسے دیکھتے اور محسوس کرتے ہوئے ہر مسلمان کے دل سے دعا نکلتی ہے۔روئے زمین پر پھیلی ہوئی اُمتِ مُسلّمہ کی اس قیامت کی گھڑی روئے زمین پر پھیلی ہوئی انسانیت کے مابین، دینی رُجحان کے زوال اور اقصائے عالم میں پھیلے ہوئے فسادات اور انسانیت بلکہ زمین پر موجود ساری زندگی کو تباہ کار ایٹمی خطرات کی موجودگی کے ماحول میں ظاہر ہونے والی کوئی بھی ادبی یا دینی کوشش جو اُمتِ مُسلّمہ کے اصلاحِ احوال اور پند ونصیحت پر مبنی ہے لائقِ صد تحسین ہے جس طرح اندھیری رات میں ایک معمولی سا ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی راہ گم کردہ مسافر کے لئے اُمید کا پیغام بنتا ہے اس طرح آج کے اس قومی اور بین الاقوامی تیرہ و تاریک ماحول میں چراغ جلانے کی کوشش انسان کے دل سے نکلنے والی دعاؤں کی مستحق ہے۔

''صدائے وقت'' کی فضاؤں میں داخل ہوتے ہی ایسے خلوص، ایسی دردمندی، ایسی فلسفیانہ کاوش، ایسی حکیمانہ راہنمائی، اچھے بیش قیمت نصائح، جملہ امراض ونقائص کے ایسے دانشمندانہ تجزیئے، زبان وبیان کے ایسے انمول نمونے نظر پڑتے ہیں کہ تعریف وتوصیف کی بات بہت پیچھے رہ جاتی ہے۔سُبحان اللہ۔کیا کیا دُرہائے ثمین اور کیا کیا گوہرِ آبدار، کیا کیا حقائقِ بے مثل، سامع وقاری کے حضور میں پیش کئے ہیں۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک حکیمِ حاذق، مریضوں کی ٹولیوں کے امراض کی نشان دہی ادویہ کی فہرست، علاج ومعالجے کی طبعی تشریح اس ماہرانہ انداز میں کر رہا ہے کہ پرانے زمانے کے ادوار کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ایسے ایسے تیرِ بہدف نسخے بیان کئے گئے ہیں کہ اگر ان کا صحیح استعمال کیا جائے تو بیماریاں یکسر ختم ہو جائیں اور ملتِ اسلامیہ صحت کا گہوارہ بن جائے اور اُمتِ مُسلّمہ کو انسانی برادری میں ایک ایسا مقام حاصل ہو جائے جس کی تمنّا کی جاسکتی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ ان نصائح پر پورے خلوص ودیانت سے عمل کیا جائے۔اس معاملے میں اللہ تعالیٰ وتبارک سے دعا کی جائے کہ وہ اُمتِ مُسلّمہ کو وہ سوچ عطا فرمائے جس کی ضرورت ہے اور ایسے نصائح اور ایسی رہنمائی پر عمل کر کے حقیقی استفادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

زمانہ اس وقت ایسی تہہ در تہہ پیچیدگیوں میں الجھا ہوا ہے اور ایسی گوناگوں اور بوقلموں مسائل میں گرفتار ہے اور ایسی عجیب وغریب امراض وعلل میں مبتلا ہے کہ ساری انسانی تاریخ ایسی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔علمی، سائنسی، معاشی، اقتصادی، سماجی، اخلاقی، طبّی، جسمانی، روحانی، قانونی، عدالتی اور اخباری پیچیدگیوں کے انبار لگے ہیں اور ان پیچیدگیوں نے ساری انسانیت کو اس طرح جکڑ رکھا ہے جس طرح سمندر میں اپنے شکار کو بے رحم اکٹوپس جکڑ لیتا ہے۔نئی تہذیب کے یکطرفہ رویئے یعنی مکمل مادی نظریات اور روحانیت کے کُلی اخراج سے پیدا ہونے والے قبیح اثرات اور تباہ کن منطقی اور سائنسی نتائج اب سارے مرحلے طے کر کے آخری مرحلے میں داخل ہو چکے ہیں اور یہ دنیا جہنم کا نمونہ بننے والی ہے اور مکمل تباہی کا ہدف بھی بن چکی ہے۔اس وقت بھی پریشانیاں کچھ کم نہیں۔بس پریشانیاں ہی پریشانیاں ہیں۔صرف ایک دلاسا ہے کہ رفتہ رفتہ ان پریشانیوں پر قابو پالیں گے مگر دیکھنے والی آنکھ دیکھتی ہے کہ تباہی بہت مکمل اور بہت قریب ہے۔امریکہ نے جب سائنس دانوں کے منع کرنے کے باوجود صرف روس کے مقابلے میں اپنی انا اور چودھراہٹ کو قائم رکھنے کی خاطر ہائیڈروجن بم جسے ہیل بامب بھی کہا جاتا ہے بنالیا تو اس وقت کے ممتاز ایٹمی

سائنس دانوں اور فلسفیوں بشمول آئن سٹائن اور برٹرینڈ رسل نے ایٹمی بم کی لرزہ خیز تباہی کے پیشِ نظر بین الاقوامی سطح پر انسانیت کے نام اپیل شائع کی جس میں کہا گیا کہ اپنے جھگڑے ختم کر دو۔ اگر اپنے جھگڑے ختم کرو گے تو سائنس تمہارے لئے اس دنیا کو جنت بنا دے گی۔ اگر اپنے جھگڑے ختم نہ کر سکے تو پھر مکمل تباہی ہے۔ انہوں نے ٹوٹل اینی ہیلیشن (Total Annihilation) کی اصطلاح استعمال کی۔ یہ غالباً 1965ء یا اس کے قریب کسی سال کی بات ہے۔ اب بتائیں کہ کیا دنیا سے جھگڑے ختم ہو گئے ہیں۔ نہیں بلکہ اب سن 2000ء میں جھگڑے اس سے سوگنا بڑھ گئے ہیں اور دنیا بڑی تیزی سے تصادم کی طرف بڑھ رہی ہے۔ ان سائنس دانوں اور فلسفیوں کی اپیل بے بنیاد تھی اور مغز سے خالی تھی نیز کسی مذہب نے اس زمین کو بہشت بنانے کی بات نہیں کی۔ سب اسے عارضی ٹھکانہ کہتے رہے ہیں اور اسے آخرت کے لئے امتحان گاہ قرار دیا۔ مقصد میرا یہ ہے کہ اس وقت اس کھائی سے صرف اور صرف اسلام ہی انسانیت کو نکال سکتا ہے اور اس متوقع تباہی سے بچا کر آخرت کی کامیابی کی راہ پر ڈال سکتا ہے مگر صرف وہ اسلام جو اللہ نے رسول اللہ ﷺ پر نازل کیا۔ بے کم و کاست اور مکمل اور اصلی شکل میں۔ صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے

ورنہ دنیا کے جھگڑے بڑھتے رہیں گے، مسئلے بڑھتے رہیں گے۔ انسانیت خدا کی اس زمین پر زندگی اس طرح گویا کہ جہنم میں ہے اور پھر مکمل تباہی کا شکار ہو جائے گی۔ اس مسئلے کا حل سائنس دانوں کے بس کی بات نہ تھی، وہ انسانی دماغ کے مالک ہیں۔ اس مسئلے کا حل قُرآنِ حکیم میں ہے اور قُرآنِ حکیم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کا دماغ کام کرتا ہے اور یہی فرق ہے انسانی اور خدائی دماغ میں۔ البتہ انسانیت سے اپیل کر کے ان سائنس دانوں نے اپنے خلوص و دیانت کا واضح ثبوت پیش کر دیا اور واشگاف الفاظ میں حقیقت بیان کر دی لیکن وہ اس کے بعد بے بس ہو گئے۔ یہ مسئلہ سائنسی نہیں رہا سیاسی بن گیا ہے اور اس کا حل صرف اور صرف قُرآنِ حکیم ہی دے سکتا ہے۔ ان حالات میں جب کہ ساری دنیا مادہ پرستی کے تپ میں مبتلا ہے۔ دین کی حیثیت ثانوی رہ گئی ہے بلکہ مغربی ممالک اور ترقی یافتہ ممالک میں تو دین صرف برائے نام رہ گیا ہے۔ دین اگر ہے اور دین کی حس اور تڑپ ہے تو اسلامی ممالک میں ہے مگر ضرورت قُرآنِ حکیم کی روشنی میں مسائل کا عملی حل ہے تاکہ دنیا عذاب سے بچ جائے۔ آخرت کی تیاری کرے۔ ان حالات میں اگر کوئی شخص اسلام کی یاد دہانی کرانے کے لئے کوئی کاوش کرتا ہے، کوئی کتاب تصنیف کرتا ہے تو صلہ تو رب کے پاس ہے لیکن کچھ نہ کچھ مشکوریت تو اس کے لئے ہونی چاہیئے۔

اس وقت اگرچہ ساری دنیا مصائب و آلام میں مبتلا ہے اور خطرات سے دوچار ہے لیکن ملتِ اسلامیہ ان مصائب و آلام و خطرات کے علاوہ ذاتی مصائب و آلام و خطرات سے بھی دوچار ہے۔ اس کی اپنی کمزوریاں، اپنی بیماریاں، اپنی مجبوریاں، اپنی سوچیں، اپنی ضرورتیں ہیں۔ دنیا اگرچہ جال میں لگی مچھلیوں کی طرح بے بس اپنی منزل کی جانب کھچتی چلی جا رہی ہے تو دنیائے اسلام بھی اس جال میں اس کے ساتھ ہے اور اپنی ابتلاؤں میں الگ مبتلا ہے۔ دنیا کی قوموں میں اُمتِ مُسلّمہ کی ایک خاص پوزیشن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قُرآنِ حکیم میں اسے درمیانی اُمت اور دوسری اُمتوں پر گواہ کہا ہے اور اس کی خصوصیت یہ بیان کی ہے کہ ''تنہون عن المنکر و یامرون بالمعروف''، یعنی یہ کہ تم ایک قوم ہو جو برائی سے روکتی ہے اور نیکی کا حکم کرتی ہے تو کیا اس وقت دنیا میں اُمتِ مُسلّمہ یہ فرض ادا کر رہی ہے اور کیا اس وقت اس کا یہ مقام ہے کہ وہ یہ فرض ادا کرے۔ اگر ایسا نہیں تو پھر ایسا کیوں ہے۔ اس سوال کا جواب تلاش کرنا بے حد ضروری ہے۔ ورنہ اُمتِ مُسلّمہ بھی دوسری دنیا کے ساتھ دینی اور دنیاوی بربادی کا شکار ہو جائے گی جب کہ خود بھی بچنا اور دوسری دنیا کو بھی بچانا اُمتِ مُسلّمہ کا دینی فریضہ ہے۔ قیامت کے روز، اُمتِ مُسلّمہ سے اس کی پوچھ ہو گی۔ اگر یہ فریضہ ادا نہ کیا تو

پکڑ ہو گی، سزا ہو گی۔ اگر کیا تو انعام ملے گا، جنت عطا ہو گی۔ اب ایسے اہم موضوع پر لکھنے والے مصنف اور اس کی تصنیف کی قدر و منزلت کی کتنی ضرورت ہے۔ اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ خلوصِ دل، دیانت اور کافی حقیقی علم کے ساتھ۔ اُمتِ مُسلّمہ کی کمزوریوں، بیماریوں، مجبوریوں کو اُجاگر کر کے علاج بتانے، اور سوئی ہوئی اُمت کو جھنجھوڑ کر جگانے اور قُرآنِ حکیم میں اسلام کی یاد دہانی کرانے والی آواز۔ مکے اور مدینے۔ ایسی آواز اس آواز کی طرح ہے جو رات کے آخری پہر میں آسمان سے اُتر کر گلی کوچوں میں پھرتی ہے، مسجدوں کے اندر سے گھوم کر نکلتی ہے، ریگزاروں، دریاؤں، پہاڑوں، سمندروں کے اوپر سے چاند کی پراسرار چاندنی کی صورت میں گزرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ انسان کو یہ آواز سننے کی توفیق عطا فرمائے اور صدائے وقت کے مصنف کی بات میں برکت عطا فرمائے۔ آمین۔ دل سے دعا نکلتی ہے۔

فصل 28۔ پسِ آئینہ کوئی اور ہے، ڈاکٹر تصدق حسین:

باباجی عنایت اللہ صاحب کی مختصر عرصے میں پانچ کتابیں قارئین تک پہنچ چکی ہیں۔ چراغِ وقت سے پہلے نادِ وقت، آوازِ وقت، ندائے وقت، صدائے وقت اور آئینہءِ وقت یکے بعد دیگرے شائع ہو چکی ہیں جیسا کہ میں اس سے قبل شائع ہونے والی کتاب میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ انکی ساری کتابوں میں ایک موضوع نیا ہوتا ہے جس پر اپنا قلم یہ خونِ جگر میں ڈبو کر لکھتے ہیں۔ خونِ جگر میں ڈبو کر میں نے اس لئے کہا کہ دلِ دردمند کا حامل انسان ایسی تحریریں صفحہءِ قرطاس پر لاتے وقت جس کرب سے گذرتا ہے یہ صرف وہی جانتا ہے جو اس مرحلے سے گذرتا ہے جس میں دل و جگر سے خون اگلنا ایسے انسانوں کا مقدر بن گیا ہوتا ہے۔ دیگر موضوعات یہ اپنی پچھلی کتابوں کے جستہ جستہ دہراتے جاتے ہیں جو یقیناً بے ساختگی سے ہوتا ہے۔ انہیں انکا احساس نہیں رہتا۔ اسے تکرار نہ کہا جائے تو بہتر ہے کہ ہر بار پچھلی باتوں کا اعادہ ہو جاتا ہے۔ مصنف نے زیرِ نظر کتاب میں اہلِ بصیرت کو انکا فرض یاد دلایا ہے کہ وہ اس نازک گھڑی میں انسانیت کی رہنمائی فرماویں۔ چراغِ وقت کے (صفحہ ۵۳) پر یوں فرماتے ہیں۔ ''جس دور میں قلیل سے لوگ اور چند ترقی یافتہ ممالک حق سے زیادہ مال و دولت اور وسائل پر قابض ہو جائیں اور عوام الناس فطرتی ضروریات سے بھی محروم ہوتے جائیں تو یہ زمانہ حق تلفی اور ظلم کا زمانہ ہوتا ہے۔ جب زمانے میں حق پرست اور حق شکن، دین دار اور بے دین، اہلِ بصیرت اور جاہل، صاحبِ کردار اور بد کردار، نیک اور بد، زانی، شرابی، اور متقی، پاکباز اور گنہگار، صالح اور بے حیا، ظالم اور مظلوم، رہبر اور رہزن ایک ہی دام فروخت ہونے لگیں تو اسے اندھیر نگری اور جمہوریت کا دور کہتے ہیں''۔ (صفحہ ۱۶) قارئین محسوس کریں گے کہ ایک فقیر کے دل کی تڑپ الفاظ میں ڈھل کر کتابی شکل میں دل ہائے درد مند اور چشمِ بینا کے حامل پیشواؤں کے سامنے آگئی ہے۔ گناہ اور جرم کے اخلاقیات کو سمجھنے کیلئے، اچھائی اور برائی، نیکی اور بدی، خیر اور شر کی پہچان اور انسانیت کی تباہی کا تدارک اور فلاح کی روشنیاں پھیلانے کیلئے بین الاقوامی سطح پر جمہوریت کے سیاسی دانشوروں کے تیار کردہ اخلاقیات اور مذہب کے اخلاقیات اور الٰہیات کے وارث صاحبِ بصیرت پیشواؤں کیلئے یہ مسودہ پیش کیا جا رہا ہے کہ وہ انسانیت کی رہنمائی فرماویں۔ اسکے علاوہ پیغمبران کی تمام امتوں اور پوری انسانیت کو تابع فرمانِ الٰہی کے روشن پہلوؤں سے روشناس کروائیں (صفحہ ۱۱۷) جب باطن مذہب کی صداقتوں کا پجاری ہو اور ظاہر جمہوریت کے بے دین سیاسی قائدین کے نظام، احکام اور قوانین وضوابط کے روح سوز عمل سے دوچار ہو تو ضمیر کے چہرے پر نفرت کا اظہار کیسے روکا جا سکتا ہے۔ نادِ وقت کے بعد اس مرتبہ چراغِ وقت میں مصنف نے جس حقیقتِ حال کو دکھایا ہے اس سے نہ مفر ہے نہ اغماض برتا جا سکتا ہے۔ نتائج

کی نہ توذمہ داری مصنف کی ہے نہ اسے اصلاحِ احوال کی صورت نظر نہ آنے پر فکر مندی کیونکہ اس کا کام خوابِ غفلت سے بیدار کرنا ہے جس کیلئے وہ پورے خلوصِ نیت سے بر سرِ پیکار ہے۔اس فقیر کی دُعا ہے کہ ہمارا پروردگار ہمارے پیارے آقا ﷺ کے صدقے میں عنایت اللہ صاحب کی کوششوں کو بار آور فرماوے۔ آمین۔ جناب عنایت اللہ صاحب کی تحریر میں رنگِ واصف علی واصفؒ نہ جھلکے یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔اس پر سوز اور پر تاثیر تحریر کی دھیمی دھیمی خوشبو کسی عظیم وقت کی آغوش سے کشید کی گئی ہوئی ہے جو تمام مذاہب کی اُمتوں اور پوری انسانیت کے دلوں کو مسحور کرنے کیلئے اس جہانِ رنگ و بو میں پھیلتی جارہی ہے۔

فصل 29۔ چراغِ وقت کے مطالعہ کے بعد مصنف کے فکر واحساس اور کائناتی وسعت کا احساس ہوتا ہے، تحریر ڈاکٹر رشید نثار:

عالمِ اسلام کے لئے جمہوریت ایک اہم مسئلہ ہے جسے کبھی لطافت اور کبھی دل کی کسک کے ساتھ سوچا گیا اور کبھی جمہوریت کو بانسری کا الم نامہ بنا کر پیش کیا گیا اور یوں جمہوریت مسلمانوں کے لئے حقیقت، عرفان، روحانی رموز و حقیقت کا روپ دھار کر موجود رہی۔ بابا جی عنایت اللہ صاحب مسلمِ اُمہ کے جمہوری دکھ کو محسوس کرتے ہیں اور انہوں نے اسے عارضی اور کثیف معاملات سے حقیقت و معارف بنا کر اس موضوع پر بحث کی ہے اور اہلِ اسلام کو شورائی جمہوریت کا مشورہ دیا ہے۔ان کے نزدیک جمہوریت کی اصل روح مشاورت ہے۔ چنانچہ ان کی تمام سوچ اور فکر ایک خاص زاویہ نگاہ کی درست اور قابلِ تحسین شکل ہے۔زندگی کی حقیقت اور اس کے اسرار کو تلاش کرنا بابا جی عنایت اللہ صاحب کا ایک جوکھم ہے۔انہوں نے مادی اور جسمانی زندگی کے استعارات کو جناب واصف علی واصفؒ کے مکاشفات میں دیکھا۔انہوں نے اپنی پوری زندگی جناب واصف علی واصف کی قربت اور انکے روحانی تجربات کی روشنی میں بسر کر دی۔اب واصف علی واصفؒ دوسری دنیا میں ہیں مگر ان کی نمائندگی جناب بابا جی عنایت اللہ صاحب کر رہے ہیں۔دراصل مصنف کا میلانِ طبع اور عادتِ فکر انسانی یک رنگی کے جلوہ رنگ کو آنکھیں کھول کر دیکھنا اور عارفانہ بصیرت کو حاصل کرنا ان کی اعلیٰ سطحی صلاحیت ہے۔جناب بابا جی عنایت اللہ صاحب نے عامتہ الورود مسائل کے بر عکس صادق اور شائستہ موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔ انہوں نے اسلامی جمہوریت کے موضوع پر لکھتے ہوئے انسان کی اصلی عظمت کو منکشف کیا ہے۔وہ کہتے ہیں۔''شورائی نظامِ انتخاب جو جمہوریت کی اصل روح ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی حاکمیت قائم کی جاتی ہے''۔ جناب بابا جی عنایت اللہ صاحب کو تخلیقی اپج کی گرمی انہیں بے چین رکھتی ہے۔یہ بے چینی انہیں ایک لذت اور نشہءِ تخلیق مہیّا کرتی ہے۔چنانچہ وہ ایک کتاب کے بعد دوسری کتاب تخلیق کرتے ہوئے کتاب دوستی کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔اب تک اس موضوع پر ان کی پانچ کتابیں یکے بعد دیگرے شائع ہو چکی ہیں۔موصوف نے ہر کتاب میں اپنی قابلیت کی روشنی مہیّا کی اور اپنے پندار کو برقرار رکھا۔

زیرِ نظر کتاب (چراغِ وقت) میں مصنف نے جمہوریت کی وضاحت میں ہمت اور توفیق کو بھی اپنا شعار بنایا ہے جس کی داد دینی پڑتی ہے۔اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ انہوں نے مذہبی موضوعات کو بلا خوفِ تردید اپنی زندگی کا آدرش بنایا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ انہوں نے مذہبی دنیا کی کم نگہی کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے چنانچہ کتاب کے مطالعے کے بعد مصنف کے فکر واحساس اور کائناتی وسعت کا انکشاف ہوتا ہے۔ اسلامی جمہوری نظام بے حد وسیع ہے اور ہمہ گیر ہے تاہم اس موضوع پر کسی مصلحت اندیشی سے کام نہیں لیا جاسکتا۔جناب بابا جی عنایت اللہ صاحب نے دوٹوک الفاظ میں اللہ تعالیٰ

کی حاکمیت اور شورائی نظام کے پیچ و خم میں الجھے بغیر، صاف اور واشگاف الفاظ میں فیصلہ کن لہجے میں حوصلے اور بڑے نشاط کا جلوہ دکھایا ہے۔ اسلامی شورائی نظامِ تمدّن انسانی قدروں کی نمائندگی کرتا ہے جب کہ یورپی، اشتراکی اور شاہی حکومتوں میں بربریّت کی جملہ علامات ہمیشہ باقی رہتی ہیں۔ چنانچہ کمزور جمہورتوں کو مارشل لاء کے ذریعے ختم کر دیا جاتا ہے جہاں سے آمرانہ کردار کی تربیت کا آغاز ہوتا ہے لیکن اسلامی جمہوری نظام میں ایسا نہیں ہوتا کہ ایک تو مجلسِ شوریٰ کا انتخاب بلند ترین تصوّر کے مطابق کیا جاتا ہے جس سے خداخوفی اور بالغ شعور کی تشکیل ہوتی ہے چنانچہ مجلسِ شوریٰ مخالف حادثات کا مقابلہ کرنے کی سکت رکھتی ہے اور عالمِ بقا کے لئے انسان کی رہنمائی کرتی ہے۔

اسلامی جمہوریہ کا قیام موجودہ عہد میں نازک اور جذباتی بنا دیا گیا ہے جس نے جناب باباجی عنایت اللہ صاحب کو تڑپا دیا ہے چنانچہ اسلامی نظام اور اسلامی جمہوریت کو موصوف روح اور مٹی کا رشتہ قرار دیتے ہیں۔ ان کا یہ آدرش اندرونی پست کا باعث اور باطنی اختلاف کے انکار کی طرف پیش رفت کا امکان ہے۔ اسلامی جمہوریت کسی جماعت یا کسی حاکم کا منشور نہیں بلکہ اس نظام کا تعلق خدا، قُرآنِ حکیم اور رسولِ پاک ﷺ سے ہے۔ انسانی حرکت اور انتہائی مضطر قلب وروح کی آسودگی کا راز اسلامی جمہوریت میں مضمر ہے۔ اس کے برعکس دوسری جمہوریتیں تاویلات سے تعلق رکھتی ہیں جن سے ''وقت'' کا ضیاع خارج از امکان نہیں ہے۔ جناب باباجی عنایت اللہ صاحب اسی لئے اسلامی جمہوریت کو ''چراغِ وقت'' سے تعبیر کرتے ہیں کہ اسلامی جمہوریت تاویل یا تفصیل نہیں بلکہ ممتاز مرتبے، معیار، پختگی اور جیّد اندازِ نظر سے اس کا انمٹ رشتہ ہے۔

جناب باباجی عنایت اللہ صاحب نے اپنی فکر کے ذریعے مغربی جمہوریت اور اسلامی جمہوریت کے فرق کو واضح کرتے ہوئے بتایا ہے کہ دونوں جمہورتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اصل میں مغربی جمہوریت سر کے بل کھڑی ہے جب کہ اسلامی جمہوریت اپنی ٹانگوں کے بل پر ایستادہ ہے۔ چنانچہ ''چراغِ وقت'' زیرِ نظر کتاب مغربی جمہوریت پر زبردست تنقید ہے جس کی ورق گردانی سے حیرت ہوتی ہے کہ جناب باباجی عنایت اللہ صاحب نے ایک اہم سائنسی موضوع پر بڑے دلکش انداز اور اندرونی دکھ کے ساتھ اپنے زاویہءِ نگاہ کو پیش کیا ہے۔ ان کے نقطہءِ نظر سے اختلاف اس لئے مشکل ہے کہ موصوف کی ہمہ گیری، فراخ حوصلگی اور ذہنی آزادی انتہائی بے باک ہے جو کھرے کھوٹے کی اصلیت کو ثابت کرتی ہے۔ میرے نزدیک جناب باباجی عنایت اللہ صاحب ایک ایسی شخصیت ہیں جو اسلامی مسائل اور مسلمِ اُمت کے دکھ کو فطری منصب سمجھ کر اپنے ذاتی انہماک اور نشاطِ کار کو پیش کر رہے ہیں۔ خدا اُن کے قلم کو ہمیشہ رواں دواں رکھے۔ آمین۔

فصل 30۔ ہم نہیں جانتے، تحریر اشفاق احمد:

ہم عنایت کو نہیں جانتے مگر وہ ہمیں اور ہمارے مسائل کو بڑی اچھی طرح سے جانتا ہے۔ زیرِ نظر کتاب سے پہلے اُنہوں نے '' آئینہِ وقت''، ''صدائے وقت''، ''ندائے وقت''، ''آوازِ وقت''، چار کتابچے لکھ کر ہمارے مسائل کی نشاندہی کی تھی اور انہیں دور کرنے کیلئے کچھ طریقے تجویز کئے تھے مگر وہ کتابیں ایک ضخیم کتاب کے دیباچے کی حیثیت رکھتی تھیں لیکن ''نادِ وقت'' میں اس نے ہم کو ایک اور زاویے سے روشن مستقبل کی آگاہی بخشی ہے۔ ہم عنایت کو نہیں جانتے مگر اس نے یہ علم آستانوں کی دہلیزوں پر بیٹھ کر اور درگاہوں کی جالیوں سے لگ کر حاصل کیا ہے۔ ہمارے لئے اس میں بہت کچھ نیا اور کافی کچھ نرالا ہے۔

فصل 31۔ آئینہِ وقت'' ملی اور قومی درد مندی سے عبارت ہے تحریر پروفیسر احسان اکبر:

عنایت اللہ صاحب ان مقربانِ خاص میں سے ہیں جنہیں جناب واصف علی واصفؒ صاحب جیسے درویش طبع دانشور کی خدمت میں رہنے کا شرف انتہائی ابتدائی زمانہ سے نصیب رہا ہے۔ سرکاری ملازمت کی مصروفیات کے باوجود انہوں نے اپنے رفیقِ خاص کی خدمت میں اپنے وقت اور وسائل دونوں کا نذرانہ دیا ہے اور مسلسل دیا ہے مگر جناب واصف علی واصف صاحب کے رخصت ہو جانے کے بعد نہ انہوں نے جناب واصف علی واصف مرحوم صاحب سے اپنے مراسمِ خصوصی اور نیازِ دیرینہ کا چرچا کیا، نہ ان کی جان نشینی کے لئے اپنے نام کو اچھالنے کی اجازت دی۔ یہ سچے فقیروں کا شیوہ ہوتا ہے کہ وہ صرف صدق کی یافت کے لئے کوشاں رہتے ہیں مفاد کی یافت ان کا مقصد کبھی نہیں ہوتا۔

ملی اور قومی درد مندی کے جس رشتے نے انہیں جناب واصف علی واصف صاحب سے جوڑے رکھا تھا اسی نے انہیں ملکی، سیاسی اور معاشرتی احوال کی زبوں حالی کی اصلاح پر راغب کیا ہے۔ زیرِ نظر تحریر ''آئینہِ وقت'' ان کی اسی ملی اور قومی درد مندی سے عبارت ہے۔ انہیں اس پر حیرت ہوتی ہے کہ احوال کی اصلاح کے لئے جو اقدام ضروری ہیں وہ بہت واضح ہونے کے باوجود اربابِ اختیار کی نظر سے ہمیشہ اوجھل کیوں رہے ہیں اور اربابِ اختیار عوامی احساسات سے اتنے بے تعلق کیسے رہ لیتے ہیں۔ اصلاحِ احوالِ ملکی کے لئے مصنف کی سیدھی سیدھی باتیں ایک دل مخلص و درد مند کی قدرتی تڑپ کی صورت میں آپ کے روبرو ہیں۔ اصلاح کا آرزومند یہ دل شریعتِ محمدی ﷺ کے فوری نفاذ اور مکمل احتساب کا طالب ہے۔ بے لاگ اور غیر جانبدار احتسابِ کلی جس کے بغیر عنایت اللہ صاحب اصلاح کے روبہ عمل آنے کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے اور جس کے نفاذ میں تاخیر کو بھی ملتِ اسلامیہ اور پاکستانی قوم کے لئے باعثِ نقصان سمجھتے ہیں۔ آپ دیانتداری کے ساتھ ان سے اختلاف ضرور کر سکتے ہیں مگر ان کی درد مندی پر حرف نہیں رکھ سکتے۔ خدا اس درد مند لے کو دلنواز بھی بنائے اور دلنشیں بھی۔

فصل 32۔ ''آئینہِ وقت'' مضطرب روح کی پکار تحریر شورش ملک:

''آئینہِ وقت'' ایک بے قرار روح کی چیخ ہے۔ یہ روائتی انداز میں نہ تاریخ ہے نہ جذباتی طور پر محض نوحہ ہے بلکہ یہ پاکستانی معاشرے کی ایسی تصویر ہے جس میں کچھ رنگ نمایاں اور کچھ دھندلے ہیں۔ بے رنگ حصہ بھی ایک کہانی ہے جس میں عبرت بھی ہے اور تازیانہِ عبرت بھی۔ اس انوکھے انداز کی کتاب کا نام ''آئینہِ وقت'' ہی ہونا چاہیئے تھا سو جناب عنایت اللہ صاحب کو پہلی مبارک باد تو اس کتاب کے عنوان کی دینی چاہیئے۔

''آئینہ وقت'' کا تناظر بہت وسیع ہے لیکن صاحبِ نظر جناب عنایت اللہ صاحب نے اس خوبی سے ہر مرحلہ طے کیا ہے کہ اس کتاب کا کوئی بھی قاری داد دیئے بغیر نہیں رہ سکے گا۔ ایک درد مند پاکستانی اور پر سوز مسلمان اور پر کیف صوفی کی حیثیت سے جناب عنایت اللہ صاحب نے جو محسوس کیا جو دیکھا اور جو کچھ برتا، اِن سب تجربات کو جس خوبصورتی سے قلمبند کیا ہے وہ انہی کا حصہ ہے شائید دوسرا کوئی اس موضوع پر قلم اٹھاتا تو ہزار ٹھوکریں کھاتا۔

یہ کتاب صرف احوالِ درد ہی نہیں علاجِ درد بھی ہے بشرطیکہ کوئی شخص صاحبِ درد ہو اور دل کی میل دور کرنے کی تمنا سے سرشار ہو، عمل پر راضی اور فکر کے لئے تیار ہو کیونکہ فکر و عمل کے بغیر نہ دنیا سمجھ آسکتی ہے اور نہ دین کی حقیقت تک رسائی ممکن ہے۔

انتساب مرشد یعنی جناب واصف علی واصف کے نام ہو اور دیباچہ علامہ محمد یوسف جبریل صاحب نے تحریر کیا ہو تو پھر ''آئینہِ وقت'' ایک انقلاب کا عکس نظر آتا ہے۔ اس عہد کا اضطراب، سوچ اور عمل بظاہر نتیجہ خیز نظر نہیں آتا لیکن کسے معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ غیب سے کیا پردہِ شہود پر لانے والا ہے۔ آخر یہ سب نیک ارواح عصرِ حاضر کے خلاف سراپا احتجاج کیوں بنی ہوئی ہیں۔ کچھ تو ہونے والا ہے جس کا ادراک صرف انہی ارواح کو ہے۔ جنہیں اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے نواز چکا ہے یا نواز رہا ہے۔

''آئینہِ وقت'' ایک سادہ رنگین داستان کا صرف ایک باب ہے۔ ممکن ہے جناب عنایت اللہ صاحب کے علاوہ دیگر ابواب بھی تحریر کریں اور اس طرح جانے والے وقت کا نوحہ اور آنے والے وقت کا قصیدہ موجودہ نسل بھی سن سکے۔

کاش یہ زمانہ میری زندگی میں آئے اور مسلمان اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو دوبارہ پاکر اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک کا شکر ادا کرکے اور حضور نبی کریم ﷺ حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی غلامی پر ناز کر سکے۔

فصل 33۔ باباجی عنایت اللہ اور جمہوری نظامِ مملکت تحریر ڈاکٹر محمد عارف:

باباجی عنایت اللہ اور پاکستان لازم و ملزوم ہیں۔ باباجی نے اپنی نثری تالیفات میں صبح جمہوریت کو زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ وہ فرنگی سیاست کی چالبازیوں، دو قومی نظریئے اور تشکیلِ پاکستان جیسے موضوعات پر خامہ فرسائی کرتے ہیں۔ باباجی عنایت اللہ نے اپنی نثری تالیفات میں پاکستان اور سرزمینِ پاکستان کے باسیوں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ڈاکٹر تصدق حسین نے اپنے مضمون میں ''وہی ہے بندۂ حر جس کی ضرب ہے کاری'' میں لکھا ہے:۔

''عنایت اللہ نے ''آئینہِ وقت'' کتاب میں زندگی کے بہت سے شعبوں پر گفتگو کرتے ہوئے ''آئینہِ وقت'' کو بطورِ خاص ان لوگوں کے سامنے رکھا ہے جن پر کسی معاشرہ کی معاشی، معاشرتی، سیاسی، مذہبی اصلاح و تبدیلی کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے''۔

بشیر الدین محمود صاحب نے درست لکھا ہے۔ کہ ''آج کے پاکستان کو دیکھنا ہو تو عنایت اللہ کو دیکھ لیں، سلگتا ہوا لاوہ جو کبھی بھی پھٹ سکتا ہے۔ غم و غصہ کا مرکب ہے۔ جانتے ہیں کہ اہلِ پاکستان کے ساتھ بہت بڑا ہاتھ ہو گیا ہے۔ وہ یہ ہاتھ توڑ دینا چاہتے ہیں''۔

باباجی عنایت اللہ لمحہءِ موجود میں نظریہءِ پاکستان کے خلاف تیزی سے نمودار ہونے والی فکری لہر کو شد و مد سے توڑنے کے لئے شعوری طور پر کمربستہ ہیں۔ عالمی پنجابی کانفرنس کے نام پر بعض روشن خیال کالمسٹوں کے مضامین پڑھنے سے اکھنڈ بھارت کے تصّورات کی طرف جھلک ذہن و شعور کو شدید ذہنی صدمے سے دوچار کرتی ہے۔ پچھلے دنوں ایک انٹرویو کمیٹی کے دوران پوسٹ گریجویٹ سطح کے طلباء کی ایک کثیر تعداد کو نظریہءِ پاکستان کے مفہوم تک سے ناواقف پایا گیا۔ کیا آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہمارا موجودہ نظامِ تعلیم اور ہمارے رہنمائے ملت نئی نسل کو تحریکِ پاکستان کے اغراض و مقاصد اور نظریہءِ پاکستان کے عملی پہلوؤں سے کس حد تک آشنا کر رہے ہیں؟ یہی تو وہ مجرمانہ غفلت ہے جس کی وجہ سے سولہ دسمبر 1971ء کو سقوطِ ڈھاکہ کا واقعہ پیش آیا۔ ہم نے اسلامیات پڑھانے کیلئے ہندو اساتذہ مقرر کر لئے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو سروس ان محرومیوں کو اجاگر کرنے کیلئے دن رات کوشاں رہی ہے جنہوں نے مشرقی پاکستان کے باسیوں کے دلوں میں ایک لاوہ پیدا کر دیا۔ پڑھے لکھے طبقے سے بحث کرنے

کے دوران یہ امر بھی مترشح ہوتا ہے کہ نظریۂ پاکستان کا تصوّر ہی خدانخواستہ مخدوش ہے۔ میرے دل پر کئی دفعہ چوٹ لگی اور میں سیخ پا ہوا کہ آخر ہم نئی نسل کو کس طرف لئے جارہے ہیں؟ انٹر میڈیٹ میں صرف پچاس نمبر کا مطالعہِ پاکستان اور بی اے میں صرف 75 نمبر کے مطالعہ پاکستان سے یہ ضروریات ہر گز پوری نہیں ہوں گی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قائدِ اعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کا نظریاتی پاکستان کب دیکھنے میں آئے گا؟ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے سکولوں اور کالجوں میں تاریخِ پاکستان کا سو فی صد نمبر پرچہ رکھا جائے اور تحریکِ پاکستان کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کے لئے تحریکِ پاکستان کے نامور رہنماؤں اور پاکستانیات کے موضوع پر کام کرنے والے ریسرچ سکالرز کو اس موضوع پر گفتگو کا موقع دیا جائے تاکہ ہم اپنی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں کی بطریقِ احسن حفاظت کر سکیں۔ باباجی عنایت اللہ کا وجود لمحہِ موجود میں نعمتِ خداوندی سے ہر گز کم نہیں کہ وہ قومی ہمدردی کے جذبے سے سرشار ہو کر بے لوث خدمت کے ذریعے وطنِ عزیز کی تاریخی صداقتوں، جبریت اور سیاسی و فوجی شاہی مراعات کو موضوع بنا رہے ہیں۔ وہ ایک ایسے محبِ وطن پاکستانی ہیں کہ جنہوں نے قائدِ اعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کے دیئے ہوئے نظریہِ پاکستان کے اوّلین پہلوؤں کو وطنِ عزیز کے ہر شعبہِ حیات میں جاری و ساری کرنے کا عزم کر رکھا ہے۔ مجھے بالکل یاد نہیں پڑتا کہ تاریخِ پاکستان کی چند درسی کتابوں کے علاوہ اس موضوع پر کسی نے سیر حاصل گفتگو کی ہو۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے پاکستان کے سیاسی اور ثقافتی عوامل پر ایک مقالہ ضرور لکھا ہے مگر وہ بھی بہت ہی اختصار پسندی اور جزیات نگاری کا شکار ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد کا رجحان صرف علمی مباحث اور تاریخی استدلال تک ہی محدود ہے۔ وہ تحریکِ پاکستان میں علماء کرام کے کردار اور بزرگانِ دین کی خدمات سے صرفِ نظر کر گئے ہیں۔ پچھلے دنوں فقیر کی نظر سے جناب صابر حسین بخاری صاحب کی ایک کتاب ''قائدِ اعظمؒ بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں''، گزری تو طبیعت باغ و بہار ہو گئی کہ فاضل محقق نے بعض پڑھے لکھے علماء کے جمہوری سیاسی نظریات پر تنقید ہی نہیں کی بلکہ نظریہِ پاکستان، قائدِ اعظمؒ محمد علی جناح، تحریکِ پاکستان کے تاریخی تناظر جیسے موضوعات پر سیر حاصل گفتگو بھی کی ہے۔ باباجی عنایت اللہ کی کتب اسلامی جمہوریہ پاکستان کو داخلی استحکام، ترقی و خوشحالی، مغربی جمہوریت کی غاصبانہ تسلّط جیسے موضوعات کو بتدریجِ احسن اجاگر کرتی ہیں۔ وہ تعمیرِ وطن کے جذبے سے سرشار ہیں۔ ان کے لفظ لفظ میں وطن کی محبت کروٹیں لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ وہ ایک ایسے اسلامی انقلاب کے دعوے دار ہیں کہ جس میں عدلیہ آزاد ہو، قانون کی حکمرانی ہو، زندگی کے ہر شعبے میں اسلامی تعلیمات کی حقیقی جھلک نظر آسکے۔ سیاسی اور فوجی مراعات یافتہ طبقے پر ان کا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ تاریخِ پاکستان کے ارتقائی مطالعے میں عنایت اللہ کا نام سرِ فہرست ہو گا کہ انہوں نے جابر سلطان کے سامنے کلمہِ حق سربلند کیا ہے جس کے لئے جرأتِ رندانہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ باباجی عنایت اللہ جیسے بزرگ بار بار پیدا نہیں ہوتے جن کے دل میں اسلام اور پاکستان کے باسیوں کی محبت ٹھاٹھیں مار رہی ہو۔ جو تحریکِ پاکستان میں ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کی بے مثال قربانیوں کا ذکر کرتے ہوئے زار و قطار رو پڑتا ہو جس کی پیراسالی میں آنے والی ہر رات سولہ کروڑ عوام کی محرومیوں، ان کے دکھ درد اور مسائل کی یاد سے مامور ہو، جس کے سینے میں سینکڑوں زخم آچکے ہوں۔ جس کا دل 16 دسمبر 1971ء کے سانحے میں ابھی تک اٹکا ہوا ہو جو اسی (۸۰) فی صد عوام کی زندگی کے کرب ناک مسائل کا مقدمہ ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے سربگریباں کھڑا ہو۔ ہمیں ان کی پکار پر لبیک کہنا ہو گا۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

فصل 34۔ یومِ حساب قریب ہے تحریر ڈاکٹر تصدق حسین:

زیرِ نظر کتاب ''نسخہ ءِانقلابِ وقت'' عنایت اللہ صاحب کی ساتویں کتاب ہے۔اس سے قبل انکی شائع ہونے والی کتابوں میں درج ذیل کتب شامل ہیں:۔ا۔آئینہِ وقت۔۲۔صدائے وقت۔۳۔ندائے وقت۔۴۔آوازِ وقت۔۵۔نادِ وقت۔۶۔چراغِ وقت۔مصنف نے اس کتاب میں بہت سے سوال اٹھائے ہیں،ان میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ کیا موجودہ جمہوری نظامِ حکومت نے اس خطے میں بسنے والوں کو وہ پاکستان دیا ہے جو پاکستان کا مطلب کیا لا الہ الا اللّٰہ محمد الرسول اللّٰہ کے نام پر حاصل کیا تھا۔عنایت اللہ صاحب اس مغربی جمہوریت کو وہ نان کرسچن جمہوریت کہتے ہیں۔ انہوں نے اس سے قبل اپنی کم و بیش ساری کتابوں میں مغربی جمہوریت اور اسکی خرابیوں کی بات کی ہے لیکن نسخہ ءِانقلابِ وقت میں اس پر سیر حاصل بحث کرتے ہوئے انہوں نے کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا جس پر مدلّل بات نہ کی ہو۔کتاب میں شامل دیگر موضوعات میں سودی معاشی نظام،طبقاتی تعلیمی نظام،مخلوط تعلیمی نظام،ٹیکس کلچر،ہارس ٹریڈنگ کی باطل سیاست،محتسبوں کے شاہی اخراجات،عدلیہ اور انتظامیہ میں پائی جانے والی خرابیوں کی نشان دہی اس خوبصورتی سے کی ہے کہ خود ان خرابیوں کے پیدا کرنے والے ان سے انکار کرنا چاہیں تو انکار کی گنجائش نہ نکلے اور اعتراف کے بغیر نہ بن آئے۔نسخہِ انقلابِ وقت کو ادبی پیمانے پر پرکھنا اسلئے ضروری نہیں کہ یہ ادبی کتاب نہیں ہے مگر کہیں کہیں خوبصورت اسلوبِ بیان اور رواں عبارت کی دلکشی قاری کے دامنِ ذوق کو کھینچ لیتی ہے۔اک اقتباس ملاحظہ فرمایئے اور سر دھنیے۔

''الفاظ کی حرمت اور انکی پاسدار خالقِ کونین کا عطیہ ہے،الفاظ خیال کا لباس ہیں۔خیال کی دلہن کو انہی سے سجایا اور سنوارا جاتا ہے۔دلنوازی کا پیغام انہی الفاظ سے انسانی قلب و روح تک پہنچایا جاتا ہے،خیر کی دنیا انہی الفاظ سے تابندہ و پائندہ ہوتی ہے۔خیر اور شر،نیکی اور بدی کی پہچان الفاظ کے دم سے ہی قائم ہوتی ہے۔گلستانِ حیات کا حسن الفاظ سے ہی جلوہ آرا ہوتا ہے۔الفاظ جمال کی روشنی اور نوعِ انسانی کے دل و دماغ کا خامہ ءِ دلنواز ہوتے ہیں۔دلنواز،دلسوزی اور دلربائی کے میخانہ کا مست،مستی کے جام،ہمہ دم اور دمہ دم جاری کرنے والا کسی صحرا و بیاباں میں تنہائی کی چادر اوڑھے بیٹھا ہے۔وہ دیکھ رہا ہے کہ الفاظ کے میخانہ میں مستیءِ کردار کی ستار خاموش کسی صاحبِ اعجاز کی منتظر بیٹھی ہے کہ وہ آئے اور خوابیدہ ملت کو بیدار کردے۔ چشمِ ملت اس منظر کو دیکھنے کے لئے بڑی دیر سے منتظر ہے''۔

اس کتاب کا وہ حصہ دل میں اتر جاتا ہے جہاں عنایت اللہ صاحب نے مغربی جمہوریت کی خرابیوں پر مفصل بحث کرتے ہوئے اسلامی شورائی نظام سے اسکا تقابلی جائزہ بے حد دلنشین انداز میں کیا ہے۔چند ایک مقامات تو ایسے بھی آتے ہیں جہاں مصنف کی بصیرت قاری کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتی ہے۔مسلمِ اُمہ کے ۱۶ کروڑ فرزندان کا مقدمہ بنا کر نان کرسچن جمہوریت کے سیاستدانوں اور حکمرانوں کے خلاف حضور نبی کریم ﷺ کی کچہری میں آج مورخہ ۲۱ دسمبر ۲۰۰۵ء کو بوقت دو بجکر بارہ منٹ پر پیش کر دیا ہے۔

زیرِ کتاب کے ہر باب کا اختتام دُعائیہ جملوں سے ہوا ہے اور مصنف نے اپنی آواز کو ایک ایسے فقیر کی صدا کہا ہے جو صبح کے بھولے ہوئے حکمرانوں کو شام گھر واپس لوٹ آنے کی آواز دے رہا ہے۔عنایت اللہ صاحب ایک انسان دوست محبِ وطن پاکستانی ہیں جو اس ملک کو اس ترقی کی جانب بڑھتا دیکھنے کے آرزومند ہیں جس میں اس ملک میں بسنے والے ہر شخص کو احترامِ انسانیت،عدل و انصاف بلا کسی امتیاز کے مل سکے اور حکومتی ایوانوں،عدلیہ اور انتظامیہ کے زیرِ نگرانی چلنے والے اداروں کو اس کرپشن،بد دیانتی،رشوت،لوٹ کھسوٹ سے نکالنا چاہتے ہیں جن سے مادرِ وطن کا

پورا جسم زخمی ہو چکا ہے اور وہ کسی معالج و مسیحا کے انتظار میں ہیں کہ وہ آگے بڑھے اور مسیحائی کا فریضہ انجام دے۔ اللہ کرے عنایت اللہ صاحب جیسے لکھاریوں کی تحریروں کی قبولیت کا وقت جلد آئے اور نبی پاک ﷺ کے صدقے میں پاکستان اور اہلِ پاکستان پر اس ربِ کائنات کا فضل و کرم ہو جائے جو بڑا رحیم و کریم ہے۔ (آمین)

فصل 35۔ پیغمبرِ خدا ﷺ اور انکا دین کثرت رائے کا محتاج نہیں تحریر باباجی عنایت اللہ:

پیغمبرِ خدا، انسانوں کے ووٹ اور کثرت رائے سے منتخب نہیں ہوتے۔ ان کا مرتبہ انسانوں کا دیا ہوا نہیں بلکہ وہ مرتبہ تو اللہ تعالیٰ کی عطا ہوتا ہے۔ وہ ذاتِ اقدس اور انکا دین کثرت رائے کا محتاج نہیں۔ جمہوریت دین کے معاملے میں عمل دخل نہیں دے سکتی۔ اگر کسی بھی پیغمبر کی اُمت کو جمہوریت کے حوالے یعنی رائے عامہ کے حوالے کر دیا جائے تو اسکی الہامی تعلیمات، اسکے روحانی نظریات اور اسکے تیار کردہ بے دین کردار مذہب اور ملت کو کچل کر رکھ دیں گے۔ جمہوریت، آمریت اور بادشاہت کے راستوں سے ایوانِ اقتدار میں آنے والوں کو دینی حکومت قائم کرنے سے کیا غرض۔ وہ کیوں اپنا اقتدار اور اپنی حکومتیں کچلنے اور ختم کرنے کا خطرناک عمل از خود کریں، یہ ملتوں کے فرزندان کا حق بنتا ہے کہ وہ مذہب کے الہامی نظامِ حیات کو بحال کروائیں۔ کیا جمہوریت کے نادانوں نے الیکشنوں کا پیمانہ مقدار اور تعداد کی برتری کو قائم کر کے، معیارِ عظمت اور معیارِ اخلاق کو منسوخ نہیں کر رکھا۔ ان رہزن سیاسی قائدین نے جوہر شناسی اور مردم شناسی کا شعور انسانی قافلے سے چھین نہیں لیا۔ کیا بادشاہت، جمہوریت کے آمروں نے ملتِ اسلامیہ کے فرزندان پر دین کے خلاف حکومتیں قائم نہیں کر رکھیں۔ کیا جمہوریت کے مذہب کے سیاسی دانشوروں نے جھوٹے ووٹ اور سچے ووٹ کا وزن اخلاق کے ترازو میں برابر کر کے اللہ کے غضب کو پکارا نہیں۔ جمہوریت کا یہی عدل کش ضابطہ اخلاق جمہوریت کا نوحہ خواں ہے جو انسانوں کی تباہی کا باعث بنتا چلا آرہا ہے۔ کیا بادشاہت پیغمبران کے ضابطۂ حیات کے خلاف کھلی بغاوت اور جنگ نہیں۔ جمہوریت کے دجالوں نے پیغمبران اور انکے مذاہب کے دستورِ حیات، انکی تعلیمات، انکی اعلیٰ صفات، انکی صداقتوں، انکے توحید پرستی کے اسباق اور انکے دنیا کی بے ثباتی کے درس کو صدائے صحرا بنا کر رکھ نہیں دیا ہے۔ اسی طرح بادشاہت کا نظام بھی مسلمِ اُمہ کے نظریات کے منافی اور دین کے خلاف ایک ہولناک نظامِ حیات نہیں ہے جو مسلمِ اُمہ کی بے دینی اور تباہی کا باعث بنا ہوا ہے، جس سے نجات حاصل کرنا ملت کے ہر فرد کا پاکیزہ اور طیب فریضہ ہے، جمہوریت، آمریت اور بادشاہت کے نظریاتی دجال دنیائے عالم پر سرکاری برتری اور بالادستی حاصل کرنے کے بعد پیغمبرانِ خدا اور ادیانِ عالم کی عمارت کو ریزہ ریزہ کرتے جا رہے ہیں۔ ادیانِ عالم اور بنی نوعِ انسان اس جدید دور کے جمہوریت کے قائدین کے تیار کردہ نظام اور سسٹم کی قید میں سسک سسک اور تڑپ تڑپ کر دم توڑے جا رہے ہیں۔ یا اللہ تمام پیغمبران کی اُمتوں کو ان جمہوریت کے دجالوں کے عذاب سے نجات کا کوئی راستہ عطا فرما۔ آمین۔

فصل 36۔ مجرم عدلیہ کا کیس عوام الناس کی عدالت میں تحریر باباجی عنایت اللہ:

بادشاہی کفر میں قائم رہ سکتی ہے مگر ظلم اور ناانصافی میں نہیں جن قوموں میں عدل و انصاف ناپید ہو جاتا ہے تباہی و بربادی اس قوم کا مقدر بن جاتی ہے۔ عدل و انصاف قائم کرنا کسی معاشرے کے استحکام کے لئے انتہائی ضروری ہے جس کو قائم کرنے کے لئے ایک عدالتی نظام قائم کیا جاتا ہے اور اس عمل کو ممکن بنانے کے لئے منصفوں یعنی ججوں کی تقرریاں کی جاتی ہیں جو ایک قانون کے تحت مقدمات کے فیصلے کرتے ہیں اور اس طرح ان

عناصر سے مل کر ایک انصاف کا نظام تشکیل پاتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے ان عناصر میں سے کوئی عنصر اپنا کام صحیح نہ کر رہا ہو تو انصاف کے نظام میں تعطل اور تاخیر پیدا ہوتی ہے۔ قومی سطح پر اس کے انتہائی برے اثرات مرتب ہوتے ہیں جو آہستہ آہستہ معاشرے کے فلاحی عمل کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔

ہمارے ملک پاکستان میں ابھی بھی بیشتر ایسے مقدمات موجود ہیں جو گذشتہ کئی دہائیوں سے عدالتوں کی زینت بنے ہوئے ہیں جو کہ ہماری عدالتوں، اس کے ججوں اور رائج الوقت نظام کی نااہلی کا منہ بولتا ثبوت ہیں یعنی ان تینوں عناصر میں سے کوئی ایک یا سب انصاف کے لئے کینسر کا باعث بنے ہیں اور اس خرابی کی وجہ سے ججوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے باوجود انصاف نایاب ہو چکا ہے۔ میں ملک کی عدلیہ سے یہ سوال پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا ان کے پاس اس بات کا کوئی جواز موجود ہے کہ جمہوریت کا مروّجہ استحصالی نظامِ حکومت، طبقاتی نظامِ تعلیم اور تعلیمی ادارے قُرآنِ حکیم کے نظریات کے خلاف تیار نہیں کئے جاتے؟ کیا لادینی نظامِ جمہوریت کے نظریات کی سرکاری بالادستی نے قُرآنِ حکیم کے نظریات اور اس سے وابستہ تہذیب کو زوال کے صحرا میں گم نہیں کر دیا؟

کیا برٹش لاء، امریکن لاء، انڈین لاء، جیوری پریویڈنس کی تعلیم و تربیت سے تیار کی ہوئی عدلیہ اور اس کے عادل قُرآنِ حکیم کے نظریات کی اطاعت کرتے ہیں یا ان کے باغی ہیں؟ جب دامنِ دین ہاتھ میں نہ ہو تو اسلام کیسا اور مسلمان کیسے؟ کیا لادینی نظامِ جمہوریت کے جرم میں ملوث اسمبلی کے ممبران، اپوزیشن اور ان کی پشت پناہی اور سرپرستی کرنے والا عدلیہ کا یہ ٹولہ قرآنِ حکیم، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے باغی منکر اور منافق نہیں ہیں؟ کیا اسمبلی کے ہارس ٹریڈنگ اور نظریہءِ ضرورت کے مجرم ممبران کے پاس کئے ہوئے قوانین ایک اسلامی ملک اور مسلم معاشرے پر نافذ العمل ہو سکتے ہیں؟ کیا جمہوریت کا نظامِ حکومت قُرآنِ حکیم کے نظریات کا تضاد نہیں ہے؟ عدلیہ کے عادلوں کے زیرِ سایہ قرآنی نظریاتِ حکومت کو جمہوری نظریاتِ حکومت سے بدل نہیں دیا گیا؟ اے منصفو! انصاف کرو کہ کیا تم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے مجرم نہیں تو نہیں ہو؟ کیا ہماری عدلیہ کے منصف جرائم کو صداقتوں اور صداقتوں کو جرائم میں بدلنے کے مجرم نہیں ہیں؟ کیا فوجی ڈکٹیٹر اور سیاسی حکومتی ٹولہ عدلیہ کے منصفوں سے اپنی پسند کے فیصلے نہیں کرواتے؟ کیا یہی عدلیہ اور اس کے عادل ملک پر مارشل لاء کو جائز قرار دیتے نہیں ہیں؟ کتنے جھوٹے مقدمات سیاسی غنڈوں، ایم پی اے، ایم این اے اور فوجی افسروں وغیرہ کے اشاروں پر تھانے میں درج ہوتے ہیں۔ کتنے جھوٹے مقدمات پولیس سے ذاتی تعلقات، بھاری رشوتوں کی بنیاد پر درج ہوتے ہیں اور رشوت سے ہی کتنے مقدمات کے فیصلے خریدے جاتے ہیں؟ کتنے مجرموں کی جگہ معصوم افراد کو جھوٹے مقدمات میں پھنسایا جا چکا ہے اور ۱۹۴۷ء سے اب تک کتنوں کو پھانسی پر لٹکایا جا چکا ہے، اس کے مقابلے پر کتنے مجرم معاشرے میں دندناتے پھرتے ہیں جنہوں نے ملک کو جرائم کدہ میں بدل کر رکھ دیا ہے۔ کتنے جھوٹے مقدمات عدالتوں میں دائر ہوتے ہیں اور دوسری پارٹیوں کو خارج کروانے میں کئی نسلیں اور کئی سال لگ جاتے ہیں۔ اس اندھی عدلیہ اور اس کے بدنصیب عادلوں کو آج تک یہ نہیں پتہ چلا کہ جھوٹے مقدمات کیسے اور کتنے درج ہوتے ہیں اور مجبور لوگوں کی جیبیں کیسے صاف کروائی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ یہ بات زبان زدِ عام ہے کہ عدالتوں کی دیواریں بھی پیسہ کھاتی ہیں۔ کیا پاکستان آمرانہ جمہوریت کے چھ ہزار جاگیردار، سرمایہ دار، استحصالی ٹولہ اور ان کی اولادوں پر مشتمل مراعات یافتہ طبقے کی ملکیت نہیں بن چکا۔ ملک کے تمام وسائل، مال و دولت، خزانہ اندرونی بیرونی قرضے ان کی ذاتی ملکیتوں میں بدل نہیں چکے؟ نو لاکھ سپاہ کی فوج اور اٹھارہ کروڑ کسان، مزدور، محنت کش،

ہنر مند، سفید پوش ان کے قیدی اور غلام نہیں بن چکے؟ کیا پاکستان ان سب کا نہیں ہے؟ اور ان کا بھی ہے تو ان میں سے کوئی جمہوریت کے الیکشنوں میں کھڑا کیوں نہیں ہو سکتا؟ کیا ان میں سے کوئی ایک فرد بھی ۱۹۴۷ء سے لے کر آج تک صوبائی و قومی اسمبلی کے ممبر، وزیر، وزیر اعلیٰ، گورنر، وزیر اعظم سے صدر یا عدلیہ کا عادل بن سکا ہے؟ تو پھر ہارس ٹریڈنگ اور نظریۂ ضرورت کے مجرم ہی کیوں عدلیہ کے زیرِ سایہ ہو کر بار بار حکومت و اقتدار پر قابض ہوتے آرہے ہیں۔ کیا جمہوریت کے نظریات کا زہر کھانے والے افراد کی زہر سے لاعلمی زہر کو اثر کرنے سے روک سکتی ہے؟ اور کیا عدلیہ کے دانش ور اس زہر کا تدارک جانتے ہیں؟ کیا انصاف عدالت سے ظاہر ہونے سے قبل ہی دم توڑ نہیں جاتا ہے۔ ایک اعلیٰ قابل وکیل رشوت اور تعلقات کی بنیاد پر ایک کمزور نااہل وکیل سے ہار نہیں جاتا؟ حقیقت تو یوں ہے کہ ایک مقدمہ کے فیصلہ ہونے کا قطعاً مطلب یہ نہیں کہ انصاف ہو گیا ہے بلکہ اس کے معنی کچھ اس طرح لیے جا سکتے ہیں کہ ایک زیادہ پیسوں میں ملنے والا قابل وکیل اپنی ذہانت اور مضبوط دلائل کی وجہ سے کم پیسوں میں مل جانے والے نالائق وکیل پر غالب آگیا ہے۔ اب جس غریب کے پاس اچھا وکیل کرنے کے پیسے نہیں ہیں وہ کیا کرے اور کہاں جائے؟ کیا اس استحصالی نظامِ انصاف سے کوئی سرمایہ دار، شکست کھا سکتا ہے۔ کیا ان ججوں اور ان کے نظامِ انصاف کی نااہلیت کی وجہ سے ان کی شاہی تنخواہیں رہائشیں، گاڑیاں ہر ماہ شائع ہونے والی پی ایل ڈی اور دیگر سہولیات عوام الناس کے اوپر شدید بوجھ نہیں؟ غرض یہ کہ رائج الوقت عدلیہ کا نظام اس کے منصف، انصاف کو کینسر کی طرح چمٹ چکے ہیں اور انکے کردار کی بنا پر اہلِ وطن عدلیہ کے ادارے کو ایک خدائی عذاب اور قتل گاہ سمجھتے ہیں۔ پاکستان مسلمِ اُمہ کا ملک ہے مگر عدلیہ کے کردار کی وجہ سے اسلامی مملکت نہیں بن سکا۔ عدلیہ اور عادل اس کا جواب اٹھارہ کروڑ فرزندانِ اسلام کو دے کہ جنہوں نے قُرآنِ حکیم اور دینِ محمدی ﷺ کے نفاذ کے کیس کو التوا کی بھٹی میں جھونک رکھا ہے اور ان فرزندان اور ان کی نسلوں کا معاشی، معاشرتی اور نظریاتی قتال جاری ہے۔ اب اس صورتِ حال کے پیشِ نظر ہم عدلیہ، ججوں، وکلا برادری سے التماس کرتے ہیں کہ خدارا اس کیس کا از سرِ نو جائزہ لیں اور حقیقی نظامِ عدل کے قیام کی جدوجہد میں ہمارے شانہ بشانہ حصہ لیں تاکہ اس ملک کو حقیقی فلاحی ریاست بنایا جا سکے۔

گوشۂ جبریل

منظُوم خراجِ عقیدت

حالیؔ و اکبرؔ و اقبالؔ کا لہجہ جبریلؔ		عصرِ حاضر کے لیے ایک مسیحا جبریلؔ
تُو غریبوں کے لیے مونس و غم خوار بنا		کون اسلامی معیشت کا حوالہ جبریلؔ
ہیروشیما کی فضا ہو کہ وہ ناگاساکی		اُگ نہیں سکتا زمینوں سے بھی سبزہ جبریلؔ
دورِ سائنس کی تباہی پہ لہو روتا تھا		ایٹمی آگ کے شعلوں کو بجھاتا جبریلؔ

اِک نظر پڑ ہی گئی غوثِ جلیؒ کی تجھ پر		تجھ کو بخشا گیا یہ علم خزانہ جبریلؔ
دستگیری تجھے حاصل شہِ جیلاں ؒ کی رہی		ربط قائم ہوا تا عمر یہ کیسا جبریلؔ
لوگ اسلام کے لشکر کو مٹانے نکلے		حق و باطل میں ہُوا معرکہ برپا جبریلؔ
تیری آواز کی للکار ہے غاصِب کے لیے		یوں تِری ذات سے ہے ظلم کو خطرہ جبریلؔ
رکنے پائے گا نہ اب قافلہ دیوانوں کا		گونج اُٹھے گا زمانے میں یہ نعرہ جبریلؔ
اُس کی تقدیر میں لکھا تھا براہیم ؑ سے ربط		ہم نے اِس دَور کے دوزخ میں جلایا جبریلؔ
خضرؑ کی راہ نمائی میں چلا جاتا ہے		تُو نے پایا ہے مقدر سے یہ رستہ جبریلؔ
دہر پہ چھائی ہے یہ رات نہ جانے کب سے		ہو گا اِک روز سرِ بزم اُجالا جبریلؔ
تیرے اشعار میں لَو دیتی ہیں سوچیں تیری		تیرے افکار ہیں ہر عہد میں زندہ جبریلؔ
کورچشموں کے لیے ایک بصیرت کا سبق		علم و عرفان کا اُمڈا ہوا دریا جبریلؔ
ہم نے دو لخت کیا پہلے وطن کو اپنے		کھو نہ جائے کہیں یہ دیس بھی آدھا جبریلؔ
زندگی قعرِ مذلّت میں گھری جاتی ہے		ایک زنداں میں ہے محبوس زمانہ جبریلؔ
پھیلتے جاتے ہیں یوں ظلم کے سائے ہر سُو		زندہ رہنا ہُوا دشوار ہمارا جبریلؔ
تُو کہ یُوسف بھی ہے، اعوان بھی، جبریلؔ بھی ہے		کیا تیرے پاس ہے اِس دکھ کا مداوا جبریلؔ
تیرے سینے میں تھا قرآن کا پیغامِ عمل		تُو یہی نور لیے دہر میں اٹھُا جبریلؔ
تُو حسینؑ تھا، یزیدوں کے مقابل ٹھہرا		ظلم کے زور کو قوّت سے مٹایا جبریلؔ
اِس طرح درس دیا سورۂ الہمزہ کا		غیر مسلم بھی پکارے کہ بھئی واہ جبریلؔ
دستِ قدرت نے بڑا کام لیا ہے تجھ سے		کس بلندی پہ تھا قسمت کا ستارا جبریلؔ
میرے الفاظ سے ممکن نہیں اس کی توصیف		جب میری سوچ کی حد سے بھی ہے بالا جبریلؔ
فقر کا منصبِ عزت تو اُسے حاصل تھا		دنیا والوں کی نگاہوں سے نہاں تھا جبریلؔ
صدق و اخلاص و مروّت کا مجسّم پیکر		بزمِ ہستی میں ہے گویا کہ فرشتہ جبریلؔ
خوں نچھاور کیا، شاخوں پہ لہو چھڑکا تھا		آج صیّاد نے ہر پھول ہے نوچا جبریلؔ
جل اُٹھے دیپ تِری فکر کے رستہ رستہ		ہو گیا پل میں تِرے نام کا چرچا جبریلؔ
روحِ اقبالؒ ہے افسردہ، پریشاں، مغموم		سپنا ٹوٹا ہے مرا خواب اُدھورا جبریلؔ
اس زمانے کو ہے پھر تیری ضرورت درپیش		التجا ہے کہ ذرا لوٹ کے آ جا جبریلؔ
ذکر جاری ہے رگ و پے میں مسلسل کیسا		جپتا رہتا ہوں یہ کس نام کی مالا جبریلؔ

مغربی فکر کا جمہوری تماشا ہو ختم		ہو وطن، مذہب اسلام کا قلعہ جبریلؔ
نارِ نمرود براہیمیؑ نظر مانگتی ہے		کون آئے گا یہاں آپ کے جیسا جبریلؔ
عہدِ فرعون میں درکار عصا موسیٰؑ کا		مار ڈالے نہ یہ دجّال کا فتنہ جبریلؔ
آنکھ والوں کو نظر آئے حقیقت اس کی		ورنہ پیغام تو موجود ہے تیرا جبریلؔ
تختِ بلقیس، سلیمانؑ تک آ پہنچا تھا		یہ ولایت کا ہے ادنیٰ سا کرشمہ جبریلؔ
راز کی بات سناتا تھا وہ محبوبوں کو		انبیاؑ نے تو کئی بار ہے دیکھا جبریلؔ
یہ بھی جبریلؔ ہے اک علمِ لدُنّی کا امیں		میرے اللہ نے کیا کیا نہیں بخشا جبریلؔ
گرتے جاتے ہیں سب اصنامِ خیالی یکسر		یہ ترا وعظ ہے یا ایک ہے لرزہ جبریلؔ
جو مری شور زمینوں کو بھی ہریالی دے		کیا فلک پر کبھی چھائے گی وہ برکھا جبریلؔ
کاش عارفؔ کو بھی وہ حکمت و دانائی ملے		جس سے تبدیل کرے وقت کا نقشہ جبریلؔ

منظوم خراجِ عقیدت

نذرِ جبریل

(خوابِ اقبال کے تناظر میں)

خوابِ جبریل ہے تعبیر سے کیوں دور ابھی		دولتِ فقر نگاہوں سے ہے مستور ابھی
اس کے کردار میں کب جوشِ عمل ہے باقی		آئینہ امتِ مسلم کا بھی ہے چور ابھی
روحِ اقبال زمانے میں دوبارہ آئے		حاطفِ غیبی کی جانب سے اشارہ آئے
قوم منجدھار میں ڈوبی ہے خدا خیر کرے		تند موجوں میں مرے ہاتھ کنارہ آئے
جنگ برپا مری کشمیر و فلسطیں کے لئے		سر بکف پھرتا ہوں اللہ کے اس دیں کے لئے
مری خواہش ہے کہ جاگ اٹھیں مسلمان کبھی		سر کٹانے کو ہوں تیار فرامیں کے لئے
فتنۂ دورِ یہودی کا زمانہ آیا		سب سمجھتے ہیں کہ یہ وقت سہانا آیا
اگلے وقتوں کی وہ غیرت نہیں باقی ہم میں		اپنے اسلاف پہ کب جان لٹانا آیا

آئے جبریل سرِ بزمِ تماشا آئے		کب سے پیاسا ہوں مرے سامنے دریا آئے
کب سے محصور ہوں میں بند گلی کے اندر		معجزہ ہو کہ مرے ہاتھ بھی رستہ آئے
سازشیں کرتے ہیں دن رات زمانے والے		مرے بازو کو ہیں یہ لوگ کٹانے والے
جانے کب آئے گی سلطانیٔ جمہور یہاں		جانے کب آئیں گے وہ وقت بھی آنے والے
یاد آتے ہیں مجھے قائد و اقبال بہت		میری حالت ہے یہاں خستہ و بدحال بہت
مادیت حاوی ہوئی مجھ پہ ہوس کا ہوں شکار		مرے درپئے ہوا اس دور کا دجال بہت
عدل وانصاف کی دنیا ہے طلب گار بہت		جس کو دیکھو وہی ہے ظلم پہ تیار بہت
حسنِ اخلاق ہے باقی نہ ہے سیرت باقی		کیا کریں گر چکا ہے زیست کا معیار بہت
اپنے آبا کی نشانی ہے وطن سوچو تو		خوں دے کر تو یہ مہکا ہے چمن سوچو تو
گنگناتی ہے ہوا گیت سہانے کیسے		کتنے تاروں سے بھرا نیل گگن سوچو تو
اپنی مٹی میں چھپے کتنے خزانے ہوں گے		دوستو ہم نے وہی ڈھونڈھ کے لانے ہوں گے
خاک میں ہم ہی ملائیں گے یہ سطوت اس کی		تاج اس کبر کے نخوت کے گرانے ہوں گے
مرے پرکھوں کی نشانی تو نہیں کھو سکتی		مجھ سے اک یاد پرانی تو نہیں کھو سکتی
کل جسے خون سے تحریر کیا تھا میں نے		سچ یہی ہے وہ کہانی تو نہیں کھو سکتی
منتشر سوچ کو یکجائی میں لانے والے		آتشِ عشق کو سینے میں بڑھانے والے
خوابِ غفلت میں پڑا سویا رہے گا کب تک		لے گئے کاٹ کے بازو تیرا جانے والے
مری گردن پہ نہ شمشیر چلا پائے گا		اپنی اس حرکتِ مذموم پہ پچھتائے گا
جان دے دوں گا مجھے شوقِ شہادت کی قسم		ایسی جرأت پہ بڑا روئے گا پچھتائے گا
سن خبردار تجھے پار نہ آنے دوں گا		پاک دھرتی پہ میں غدار نہ آنے دوں گا
ایک چپہ بھی وطن کا تجھے دے سکتا نہیں		جان دینے کو ہوں تیار نہ آنے دوں گا
مرا کشمیر مجھے جان سے بڑھ کر ہے عزیز		مری اس جنتِ ارضی پہ فدا ہے ہر چیز
اس کے جنگل بھی حسیں باغ بھی اجلے روشن		اس کے چشموں کا مجھے شہد سے پانی ہے لذیز
تو نے سمجھا ہے مجھے حوصلہ ہاروں گا میں		عمر یہ اپنی غلامی میں گزاروں گا میں
میری یہ جنگ رہے گی یوں ہی پیہم تجھ سے		میں مروں گا جو اگر تجھ کو بھی ماروں گا میں
تو نے دنیا میں اگر ظلم کی حد کرنی ہے		مرے اللہ نے بھی اب میری مدد کرنی ہے
میرے کشمیر کو آزاد فضائیں دے دے		میں نے تعمیر یہاں اپنی لحد کرنی ہے

چاروں صوبوں میں دراڑیں ہیں تیرے ہاتھوں سے		ہم چمن اپنا اجاڑیں ہیں تیرے ہاتھوں سے
بیل کیکر کی اگی آتی ہے اس آنگن میں		کتنی ویران یہ باڑیں ہیں تیرے ہاتھوں سے
توڑ دوں گا میں ترے جبر کی زنجیروں کو		میں نہیں مانتا ان ظلم کی تحریروں کو
یاد رہتے ہیں مجھے اپنے بزرگوں کے نقوش		بھول سکتا نہیں آباء کی تصویروں کو
خون شاہراہوں پہ بہتا تھا وطن کی خاطر		دل ستم کتنے ہی سہتا تھا وطن کی خاطر
بستیاں اجڑیں نگر اجڑے ہیں آنگن اجڑے		ایک مقتل سجا رہتا تھا وطن کی خاطر
میرے قائد نے جوانی ہے وطن کو بخشی		تب کہیں صبح سہانی ہے وطن کو بخشی
خواب اقبال کا شرمندہ تعبیر ہوا		اس نے ترتیبِ زمانی ہے وطن کو بخشی
اس کی تعمیر میں شامل ہے لہو ملت کا		یہ نشاں ہے مری عزت کا مری غیرت کا
خوں شہیدوں کا بھی تزئینِ وطن کرتا ہے		وقت نے دیکھا سماں ان کی جواں ہمت کا
تو نے کیا مجھ کو فقط نقشِ خفی سمجھا ہے		جو تیری سوچ ہے بس مجھکو وہی سمجھا ہے
میں گداگر ہوں حسین ابنِ علی کے در کا		کچھ بتاؤں کہ مری بات ابھی سمجھا ہے
اب اگر آنکھ بھی ڈالے گا وطن کی جانب		اپنی فوجوں کو نکالے گا وطن کی جانب
تجھ کو پسپا نہ کروں میں تو مرا نام نہیں		اک قدم بھی جو بڑھا لے گا وطن کی جانب
میرے لشکر میں ہیں غدار میں یہ جانتا ہوں		مجھ پہ ہوتے ہیں کئی وار میں یہ جانتا ہوں
کیا بگاڑیں گی تری سازشیں پیارے دشمن		مری قسمت میں نہیں ہار یہ میں جانتا ہوں
لال قلعے پہ بھی لہرائے گا پرچم میرا		یہ خبر ہے کہ نہیں ہو گا یہ سر خم میرا
دشمنی جتنی تری مجھ سے بڑھے میرے عدوّ		جذبہ قومی ذرا بھر بھی نہ ہو کم میرا
جس کسی نے کہیں توہینِ رسالت کی ہے		کون بدبخت ہے جس نے بھی یہ جرأت کی ہے
جان دے دوں گا مگر آنچ نہ آنے دوں گا		بات یہ میرے محمد ﷺ کی عزت کی ہے
میرے آباء میں کوئی غازی علم دین بھی تھا		جرم ایسا کوئی اس شخص کا سنگین بھی تھا
یہ بھی سچ ہے کہ فدا اپنے نبی ﷺ پر وہ ہوا		سامنے اس کے یہ اسلام کا آئین بھی تھا
میرے اللہ نے کیا ذکر محمد ﷺ کا بلند		تذکرہ اس نے کیا حرفِ مشدد کا بلند
روضہ پاک پہ انوارِ الہیٰ برسیں		یوں ہی ہوتا رہے مینار یہ گنبد کا بلند
دینِ اسلام کی دنیا میں شہنشاہی ہو		چاہے ادبار کی ہر سمت گھٹا چھائی ہو
ذکر چلتا رہے یوں پیارے نبی ﷺ کا ہر سو		ان کا پیغام مدینے سے صبا لائی ہو

یہ وطن دینِ محمد ﷺ کا نگہبان بنے		اس کی سرحد کا محافظ یہ مسلمان بنے
چھوڑ دے کاش یہ اغیار کے رستوں کا طواف		دل میں حسرت ہے کہ یہ حاملِ قرآن بنے
یاد رہتے ہیں مجھے اپنے بزرگوں کے نقوش		بھول سکتا نہیں آباء کی تصویروں کو
طارق و خالد و قاسم کی قیادت دے دے		مری اُمّت کو بھی دنیا کی امامت دے دے
کاش پھر لوٹ کے آئے مرے ٹیپو کا جمال		دشمنِ دیں کو مٹانے کی سعادت دے دے
خوابِ اقبال ادھورا اسے پورا کر دے		ایک دن عالمِ اسلام کو یکجا کر دے
ٹوٹ جائے گا غلامی کا فسوں اس کا جنوں		اپنے اللہ کی دہلیز پہ سجدہ کر دے
کاسہ لیسی کی یہ لعنت ہے بری مان بھی لے		اس سے ایمان پہ چلتی ہے چُھری مان بھی لے
تو نے سننی ہے یہ لے نغمہ افرنگ کی سن		اپنے آہنگ میں ہے بے سُری مان بھی لے
غیر اقوام سے یہ دوستی کیسی ہے تری		مان کھویا گیا عزت بھی گئی ہے تری
تجھ کو قدرت نے ودیعت کیا دستورِ حیات		دھوم تاریخ کے صفحوں میں بڑی ہے تری
کاش تو قوتِ بازو پہ بھروسا کر لے		اپنے اللہ کو مددگار اکیلا کر لے
یہ تجھے کس نے کہا ہے کہ تو ان کا بن جا		اپنے ایمان کی قوت کو توانا کر لے
اپنے قائد کی قیادت سے سبق سیکھ ذرا		اس کے ایمان کی جرأت سے سبق سیکھ ذرا
اس نے افرنگ کی آنکھوں میں تھیں آنکھیں ڈالیں		اس کے کردار کی عظمت سے سبق سیکھ ذرا
دیکھ ہر سمت ہے اربابِ سیاست کا فتور		قوم بدحالی سے اب ہوگئی تھک کر چور
اٹھ ذرا چشمۂ اسلام سے پانی پی لے		تا کہ ہو جائے ترے دل کی سیاہی کچھ دور
ہر طرف تیری تباہی کے ہیں اسباب بہت		ریزہ ریزہ ہوئے ہر دور میں ہیں خواب بہت
سوچ کچھ اپنے لئے تو بھی بقا کی تدبیر		تیری منزل کے ہیں رستے یہاں پایاب بہت
تیرے آباء تو گئے روم کی ایران کی سمت		تو بھی کچھ بڑھ ذرا اپنے درِ امکان کی سمت
شمعِ توحید جلا لے کہ اندھیرا ہے بہت		تھوڑا ہو جائے اجالا دلِ ویران کی سمت
حرمتِ دینِ محمد ﷺ پہ فدا ہونا ہے		جان سے جانا ہے اب اور تو کیا ہونا ہے
سر ہتھیلی پہ لئے آؤ ذرا مقتل میں		موت کا رقص یہاں پھر سے بپا ہونا ہے
قوم پھر آگئی ہے ان کی عمل داری میں		عقل کچھ باقی نہیں ہے ذرا بے چاری میں
بیچ دیتے ہیں یہاں لوگ وطن کے نقشے		ہو گئے دنیا میں مشہور یہ غدّاری میں
پاک افواج کے کردار کو میرا ہو سلام		میری دھرتی کے لئے پیار کو میرا ہو سلام

اس نے مشکل کی گھڑی میں مری ڈھارس باندھی		اس کے ہر اک سپہ سالار کو میرا ہو سلام
میرے دشمن کے لئے آہنی تلوار ہے فوج		اس کی سازش سے ہر اک لمحہ خبردار ہے فوج
میری سرحد کی حفاظت پہ کمر بستہ رہی		اس کی آنکھیں ہیں کھلیں ہر گھڑی تیار ہے فوج
میری افواج کو ہے سیدِ عالم ﷺ کی دعا		ان کا مقصود فقط ہے مری ملتؔ کی بقا
جسم ہو ان کا یہاں روح مدینے پہنچے		کون کہتا ہے کہ مر کر ہوئے دنیا میں فنا
ہم نے اس ملک کی تقدیر بدل دینی ہے		اپنے آئندہ کی تصویر بدل دینی ہے
ہر طرف گونجے گا اب عزم و عمل کا نعرہ		ہم نے دیوار کی تحریر بدل دینی ہے
ہم نے اغیار سے آزادی کی کھائی ہے قسم		تو بھی سن لے تیری بربادی کی کھائی ہے قسم
بھا گئے کوہ و دمن اپنے وطن کے پیارے		ہم نے اس دیس کی ہر وادی کی کھائی ہے قسم
تو نے دیوار کے پیچھے سے جو ڈالی ہے کمند		تو نے سوچا ہے کہ پہنچائے گا مجھ کو بھی گزند
مجھ کو ہے خوف فقط اپنے خدا کا دشمن		میرے ایمان کی قوت میرے اللہ کو پسند
تو مجھے اسوۂحسنہ کا قرینہ دے دے		مجھ کو کچھ اور نہ دے خاکِ مدینہ دے دے
ان کی چاہت میں جیوں ان کی محبت میں مروں		اس قدر سوز میں ڈوبا ہوا سینہ دے دے
سر بلندی ہو میری قوم کی دنیا بھر میں		کاش بے مثل ہو یہ اپنے ہر اک جوہر میں
اس کی ڈوبی ہوئی یہ ناؤ کنارے سے لگے		ایسے اوصاف ہوں پیدا میرے ہر رہبر میں
اپنی اقدار پہ کچھ ہم کو یقیں آ جائے		سلطنت دنیا کی پھر زیرِ نگیں آ جائے
ہم نے افلاک کو چُھونا ہے یقیناً اک دن		پہلے قدموں کے تلے اپنی زمیں آ جائے
چاند تاروں کو بھی چُھونا ہے خلاؤں میں کبھی		اڑتے جانا ہے کہیں دور فضاؤں میں کبھی
ہفت افلاک کو تسخیر کریں گے اک دن		ہم دیئے اپنے جلائیں گے ہواؤں میں کبھی
روحِ جبریل ہوں میں عارفِ یزدانی ہوں		ساری دنیا کے لئے باعثِ حیرانی ہوں
تو نے سمجھا ہے مجھے علم و عمل سے بیزار		کیا خبر تجھ کو کہ میں فقر کی سلطانی ہوں
میرا پیغام فقط حضرتِ جبریل کا ہے		مرحلہ باقی فقط حرف کی ترسیل کا ہے
میں نے جو دیپ جلایا ہے اجالے کے لئے		کام اس شمع کا دنیا میں تو قندیل کا ہے
میں نے زردار سے نفرت کو ہوا دینی ہے		عام انسان کی توقیر بڑھا دینی ہے
میں نے تو حرف سجانے ہیں فقط کاغذ پر		میرے اللہ نے میری بات بنا دینی ہے
میں نے انصاف کی آواز اٹھانی ہے ضرور		آج اس جبر کی دیوار گرانی ہے ضرور

تو نے اسلام کے پیغام کو سمجھا کب ہے		میں نے یہ بات تجھے آج بتانی ہے ضرور
غور کرتا نہیں قرآن کے سیپاروں میں		نام لکھواتا ہے تو عشق کے بیماروں میں
کاش اس دعوت و تبلیغ کو سمجھے تو بھی		گونجتی رہتی تھی مکے کی جوان غاروں میں
لوگ کہتے ہیں کہ ایٹم کا زمانہ آیا		ہم سمجھتے ہیں تباہی کا بہانہ آیا
تو نے بھولا ہے سبق عظمتِ اسلامی کا		ہاتھ میں کب تیرے وہ اپنا خزانہ آیا
میں نے اقبال سے رومی سے تعلق جوڑا		عقلِ دشوار کی گھاٹی سے ہے منہ کو موڑا
میرے ہاتھوں میں رہیں میرے نفس کی باگیں		کس بلندی پہ اڑے میرے نفس کا گھوڑا
ہر گھڑی رہتا ہوں میں ارض و سموات میں گم		تو کہ ہر لحظہ رہا اپنی ہی اک ذات میں گم
میرے لہجے کو ہے ایمان نے قوت بخشی		اس لئے ایک زمانہ ہے میری بات میں گم
میرے باطن میں ہے جو راز بتاؤں تجھ کو		آ ذرا علمِ لدّنی نہ سکھاؤں تجھ کو
تب ملے گی تجھے کچھ رازِ حقیقت کی خبر		فقر کا درس کسی روز پڑھاؤں تجھ کو
جوڑ لے اپنا تعلق کسی دیوانے سے		کیا سمجھ آئے گی تجھ کو میرے سمجھانے سے
ہاتھ آئے گی ترے پھر سے سرور و مستی		تھوڑی پی لے گا اگر یار کے میخانے سے
چھوڑ دنیا کو میرے یار فسانہ ہے عبث		جو فدا اس پہ ہے وہ شخص دوانہ ہے عبث
مال و زر حرص و ہوس اور یہ شان و شوکت		ان کی چاہت میں ترا جان سے جانا ہے عبث
خاک میں دفن یہ دنیا کے دفینے ہوں گے		تجھ کو حاصل کبھی جینے کے قرینے ہوں گے
ہم نے اسلام کی تعلیم پہ چلنا ہے ضرور		جام کوثر کے اگر حشر میں پینے ہوں گے
درس توحید و رسالت کا سمجھنا ہے ضرور		ہم نے یہ راز ولایت کا سمجھنا ہے ضرور
دینِ اسلام بچایا ہے تو حسینؓ نے ہے		فلسفہ آج شہادت کا سمجھنا ہے ضرور
کاش مل جائے ہمیں عشقِ رسولِ عربی ﷺ		ان کی سیرت میں ڈھلے اپنی متاعِ ہستی
اس قدر رفعت و عظمت بھلا حاصل ہے کسے		جس قدر شان میرے پیارے نبی ﷺ کی ہے بڑی
قافلے چل دیئے ہیں دیس کے صحراؤں کو		چین آتا ہی نہیں ان کے شناساؤں کو
جن کے بیٹے ہیں محاذوں پہ کھڑے ہر لحظہ		پیش کرتا ہوں سلامی میں انہیں ماؤں کو
یاد تازہ ہوئی پھر عہدِ جہالت تیری		چھن گئی مردِ مسلمان حکومت تیری
آج دنیا میں ترا نام و نشاں ملتا نہیں		بزمِ ہستی میں تھی مشہور خلافت تیری
آ گیا دنیا میں فرعون کا شداد کا دور		ختم کب ہو گا یہاں ظلم کا بیداد کا دور

آدمی جبرِ مسلسل سے ہے گھبرایا ہوا		ظلم ہے قہر ہے یہ آہ کا فریاد کا دور
میرا شاہین تھا مشہور پروبالی میں		آج مصروف ہے مغرب کی یہ نقالی میں
کون اب اس کے سنبھلنے کی کرے گا تدبیر		حد سے بڑھنے لگا ہے اپنی زبوں حالی میں
کتنے الو نظر آتے ہیں مجھے گلشن میں		پھول ہی پھول تھے بکھرے ہوئے اس دامن میں
لے گئے ساتھ یہ ہر شاخ کا زیور اپنے		اب تو مایوسیاں باقی ہیں مرے جیون میں
سو گئے خاک میں قربانیاں دینے والے		چھا گئے چاروں طرف پھر سے یہ بادل کالے
مٹ گیا اپنے تحفظ کا بھی احساس عجب		اب نہ شمشیر ہے ہاتھوں میں نہ نیزے بھالے
ہر طرف خوف کے سائے ہیں اترتے دیکھے		پیلے پتے ہیں سرِ راہ بکھرتے دیکھے
کوئی شادابی نہیں عمر کی ویرانی میں		کچی عمروں میں کئی لوگ ہیں مرتے دیکھے
غم نہیں چھوڑتا تا عمر غمِ دوراں کا		کوئی غم خوار نہیں آج کے انساں کا
لے گیا نوچ کے صیاد ہر اک غنچے کو		ایک بھی پھول نہیں باقی گلستاں کا
اب سنبھل جا کہ کہیں پیچھے اجل آتی ہے		وہ جو اک زندہ حقیقت ہے اٹل آتی ہے
چھوڑ جائے گا یہیں اپنے خزانے سارے		آج آتی ہے مرے دوست وہ کل آتی ہے
لوگ لے جائیں گے یہ مال چرا کر تیرا		کچھ نہیں چھوڑیں گے یہ ہاتھ بڑھا کر تیرا
تو پڑا سوئے گا اس خاک کے نیچے لیکن		نام لیں گے نہ کبھی جشن منا کر تیرا
زعم ہے تجھ کو یہاں صاحبِ جاگیر ہے تو		جو نکل جائے کمانوں سے وہ اک تیر ہے تو
یہ تکبر تو تجھے راس نہ آئے گا کبھی		اپنے اس جرم پہ کچھ لائقِ تعذیر ہے تو
کب مدینے کی ریاست کا تصور سمجھے		ہم فقط اس کو طبیعت کا تکدُّر سمجھے
اب سمجھ آیا ہے کہ ویران ہے اس کا گلشن		حجرۂ روح کو ہم لوگ بھی تھے پُر سمجھے
آتشِ عشقِ نبی ﷺ ہو گئی مدہم دل میں		اب اسی بات کا رہتا ہے بڑا غم دل میں
اب کہاں میرے تصوُّر میں رہا ہے موجود		جو مدینہ کبھی موجود تھا پیہم دل میں
یاد آتے ہیں بڑے مجھ کو اویسؓ اور بلالؓ		آتشِ ہجر میں دن رات پڑے تھے بے حال
جب نگاہوں میں تھا موجود سراپا ان کا		اب نہ وہ دن ہیں مہینے ہیں نہ ہیں وہ سال
جانے کب روضۂ انور ﷺ کی زیارت ہو گی		ان کے دربار میں جانے کی اجازت ہو گی
میں بھی پہنچوں گا درِ یار پہ اڑ کر اک دن		مجھ پہ مائل بہ عطا ان کی طبیعت ہو گی
کیا وہ سن لیں گے کبھی گریہ و زاری میری		یوں ہی بے کار نہ ہو عرض گزاری میری

ان کو پا لوں میں کبھی ان کو بنا لوں اپنا		اس تمنا میں کٹی عمر ہے ساری میری	

فصل 1۔ حضرت علامہ یوسف جبریلؒ اور حضرت واصف علی واصفؒ کی ملاقاتیں، ڈاکٹر تصدق حسین کی گفتگو:

حضرت علامہ محمد یوسف جبریلؒ کی زندگی کے دو واقعات یاد آ گئے۔ ایک ان کا شیر خوارگی کے دوران اونٹ کے کجاوے سے گرنا اور جوان ہو کر ماں جی سے پوچھنا: ''مائے! وہ اونٹ سے میرا گرنے والا واقعہ کیا تھا؟۔'' ماں نے پوچھا۔ ''یہ تمہیں کس نے بتایا ہے؟ بیٹے نے جواب دیا۔ ''کسی نے نہیں۔ مجھے خود یاد ہے'' اور دوسرا واقعہ وہ جس کے راوی برادرِ مکرم چوہدری عنایت اللہ صاحب سابقہ فوڈ کنٹرولر اسلام آباد ہیں۔ چوہدری صاحب فرماتے ہیں۔ ان کی موجودگی میں کئی بار حضرت واصف علی واصفؒ مشہور انگریزی ڈرامہ نگار شیکسپیئر یا شعراء میں سے ملٹن، ورڈزورتھ، شیلے یا بائرن کے بارے میں کوئی ایک جملہ پڑھتے یا ان شعراء کی نظموں میں سے کسی ایک نظم کا ایک سٹانزا کہتے تو علامہ صاحب Milton's Paradise Lost پوری نظم زبانی دہرا دیتے۔ جب ان ہی کی زبانی سنتا ہوں کہ جب واصف علی واصفؒ واہ چھاؤنی علامہ محمد یوسف جبریلؒ سے ملنے آتے تھے تو اکثر و بیشتر علامہ صاحب بولتے رہتے تھے اور حضرت واصف علی واصفؒ (ہزاروں کے مجمعے میں ''گفتگو'' فرمانے والے جن میں اشفاق احمد صاحب جیسے حضرات بھی شامل ہوتے تھے) ہمہ تن گوش سنتے رہتے تھے۔ تو ایک حسرت دل میں مچل مچل جاتی ہے۔ کاش ان مجالس میں بیٹھنے اور انہیں سننے کا موقع اس فقیر کو بھی ملا ہوتا مگر حضرت واصف علی واصفؒ سے صرف ایک گھنٹے کی ملاقات 1980-81ء میں ان کے چھوٹے بھائی پروفیسر شوکت محمود ملک کے گھر پر اور حضرت علامہ یوسف جبریلؒ کے وصال سے صرف تین روز قبل 2 جنوری 2006ء کو ان کے درِ دولت پر پونے چار گھنٹے کی ایک ہی ملاقات میری زندگی کا وہ گرانقدر سرمایہ ہے جس پر میں بجا طور پر ناز کر سکتا ہوں۔ چوہدری عنایت اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ جب لاہور میں علامہ صاحبؒ، حضرت واصف علی واصفؒ کے پاس تشریف لاتے تھے تو محفل سج جاتی تھی۔ حضرت واصف علی واصفؒ روزانہ دروازے پر کھڑے ہو کر علامہ صاحب کا انتظار فرمایا کرتے تھے اور جب وہ تشریف لاتے تو بعض دفعہ اپنے ہاتھوں سے ان کو اور ان کے ساتھ ان کے بیٹے شوکت محمود اعوان کو چائے پلاتے۔ ان کے بیٹے شوکت محمود اعوان ان دنوں ایم اے او کالج میں ایف ایس سی کے طالبعلم تھے۔ اس چائے میں اس قدر خلوص ہوتا جس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ چوہدری عنایت اللہ صاحب ان دنوں حضرت واصف علی واصفؒ کے ساتھ تمام سکول کے انتظامات کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ مہمانوں کی خدمت کرنا ان کی ذمہ داری تھی۔ گویا کہ لنگر کا تمام اہتمام بھی وہی کرتے تھے۔ حضرت واصف علی واصفؒ کی طبیعت بہت سخت تھی تاہم چوہدری صاحب کو اللہ تعالیٰ نے ناقابلِ بیان حد تک صبر کا مادہ عطا فرمایا تھا۔ اس کی مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔ اس محفل میں جناب حفیظ جالندھری صاحب، جناب حفیظ تائب صاحب، جناب طفیل ہوشیار پوری صاحب، جناب مسعود ہمدانی صاحب، جناب الٰہی بخش وجدانی ایڈووکیٹ صاحب، جناب ڈاکٹر مختار احمد صاحب، جناب چوہدری محمد حسین صاحب اور اکثر ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب شامل ہوتے تھے۔ شاید 1961 تا 1964 کا زمانہ تھا۔ جب حضرت واصف علی واصفؒ نے حضرت علامہ محمد یوسف جبریلؒ کو بہت سنا۔ یہ حقیقت ہے اور بڑی عجیب بات ہے کہ اتنے بڑے بولنے والے انسان (ایک سمندر کی مانند، ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر) حضرت علامہ محمد یوسف جبریلؒ کے ساتھ بیٹھتے تو خاموشی سے حضرت علامہ صاحب کی گفتگو

سنتے رہتے تھے۔جناب واصف علی واصفؒ کو انگریزی لٹریچر سے روحانی لٹریچر کی طرف منتقل کرنے میں جن روحانی شخصیات کا ہاتھ ہے ان میں حضرت علامہ صاحبؒ کی خدمات کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ان سے مل کر حضرت واصف علی واصفؒ نے محسوس کیا کہ انگریزی لٹریچر محض سطحی چیز ہے۔اس کا صرف اور صرف دنیا میں فائدہ ہے لیکن روحانی علوم کا آخرت میں بہت اہم کردار ہے۔لہٰذا بہتر یہ ہے کہ روحانیت کی طرف توجہ مبذول کی جائے۔اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک عالی مقام دماغ اور صلاحیت سے مزیّن دماغ عطا فرمایا تھا۔علامہ صاحبؒ فرماتے تھے کہ آپ روحانیت کی وجہ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ رہیں گے نہ کہ انگریزی لٹریچر کی وجہ سے چنانچہ حضرت واصف علی واصفؒ علامہ صاحب سے بہت متاثر ہوئے۔یہ حقیقت ہے کہ اس دور میں علامہ صاحب جیسے مخلص انسانوں کا وجود ناپید ہو چکا ہے۔لہٰذا حضرت واصف علی واصفؒ یہ بھی اچھی طرح سے جانتے تھے کہ علامہ صاحب دنیادار نہیں بلکہ ایک مخلص دوست اور وفادار ساتھی ہیں اور یہ بڑی غنیمت تھی کیونکہ حضرت واصفؒ بھی دنیاداروں سے دنیا کے حوالے سے بات کرتے تھے لیکن جب روحانی دنیا کا کوئی انسان آتا تھا تو اس سے گھل مل جاتے۔ان کیطرف مکمل توجہ دیتے۔حضرت علامہ یوسف جبریلؒ صاحب بھی حضرت واصفؒ صاحب سے بہت متاثر تھے۔یہاں مقصد مقام کا تعین نہیں۔دو روحانی شخصیات کی دوستی اور بھرم کا اہتمام تھا جب علامہ صاحب روحانی شخصیات پر بولتے بالخصوص حضرت رومیؒ، حضرت سلطان باہوؒ، حضرت اقبالؒ، تو ان کے چہرے پر ایک نئی روشنی نمودار ہوتی اور اس طرح وہ وقت بھی آگیا کہ حضرت واصف علیؒ واصف انگریزی لٹریچر کا راستہ بدل کر روحانیت کے دائرے میں آگئے۔علامہ صاحب فرماتے تھے کہ حضرت واصف علی واصفؒ ایک دن دنیائے روحانیت کا درخشاں ستارہ ہوں گے جو کبھی غروب نہیں ہو گا۔حالات نے وہی کچھ کر دکھایا۔" نعرہ جبریلؒ" کی شاعری نے حضرت واصف علی واصفؒ پر بہت گہرا اثر چھوڑا اور انہوں نے بھی شاعری کی جس میں روحانیت اعلیٰ درجے کی موجود ہے۔حضرت واصف علی واصفؒ اور حضرت علامہ محمد یوسف جبریلؒ صاحب کے درمیان بیکن اور کارلائل پر بات ہوتی تھی۔بیکنی فلسفے پر علامہ صاحب بہت زور دیتے تھے اور کہتے تھے کہ دنیا کا تمام تر نظام اب بیکنی فلسفے پر چل رہا ہے اور مادیت پرستی اس قدر پھیل چکی ہے اور مستقبل میں پھیلے گی کہ مسلمان اور غیر مسلم میں فرق مٹ جائے گا۔وہی دنیاوی اغراض، وہی دنیاوی حسرتیں وہی دنیاوی لالچ، وہی دنیاوی فخر و غرور، بڑی بڑی بلڈنگیں تعمیر کرنا اور ترقی کے مراحل سے حطمہ کی طرف بڑھنا ہے۔

ہیگل اور ڈارون پر بھی بحث ہوتی۔معاشی نظام، مغربی دانش وروں کا تنقیدی جائزہ، فلسفہ ءاٹامزم، فلسفۂ بیکن پر بہت زیادہ گفتگو ہوتی۔ اقبالؒ کو انسانیت کا قلندر مانا جاتا تھا۔حضرت علامہ صاحب فرماتے تھے کہ اقبالؒ میرے روحانی استاد بھی ہیں۔حضرت واصف علی واصفؒ سگریٹ اور چائے کا خوب اہتمام کرتے۔علامہ صاحب بھی چائے کے بہت شوقین تھے اور سگریٹ تو ایک بجھتی اور دوسری جلتی تھی جسے Chain smoking کہتے ہیں۔ایسا معلوم ہوتا کہ دو علم کے سمندر آپس میں گفتگو کر رہے ہیں۔عجیب ماحول ہوتا تھا۔وہ وقت بھولا جا نہیں سکتا۔علامہ صاحب عام حالات میں تنگیء دوران خیال کی دنیا میں مست رہتے تھے۔انہوں نے زندگی کا زیادہ حصہ تنگدستی میں گزارا لیکن اپنے مشن سے ہٹے نہیں۔شدید سے شدید مشکلات بھی ان کو اپنے مشن سے ہٹا نہیں سکیں۔اسی طرح حضرت واصف علی واصفؒ بھی ایک عظیم مشن کے مالک تھے۔ان کی زندگی میں جو محبت اور خلوص علامہ صاحب نے جناب واصف علی واصفؒ کو دیا وہ کبھی نہیں بھول سکے۔اسی وجہ سے وہ کئی مرتبہ واہ کینٹ میں علامہ

صاحب کو ملنے آئے اور ان کے ساتھ دوستوں کا ایک جمِ غفیر ہوتا۔ علامہ صاحبؒ وہاں بھی بولتے رہتے اور حضرت واصف علی واصفؒ سنتے رہتے۔ چوہدری صاحب فرماتے ہیں کہ میں حیران ہوں کہ اس شخص کے سامنے کوئی شخص بات نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کتنا عرصہ حضرت علامہ صاحبؒ کی گفتگو نہایت توجہ سے سنتے رہے اور پھر جب کبھی ہم لوگ ان کے ہاں واہ کینٹ میں جاتے تو وہ زیادہ تر ایک جھونپڑے میں بیٹھے ہوتے۔ حضرت واصف علی واصفؒ کے لئے چارپائی کا اہتمام کرتے۔ تو واصفؒ ان کے ساتھ بیٹھ کر وہ خوشی محسوس کرتے جس کا اظہار ان کا چہرہ اور دل کیا کرتا تھا۔

حضرت واصف علی واصفؒ ہر شخص کی عزت اور احترام کرتے تھے۔ فروعی معاملات سے گھبراتے تھے اور بڑے بڑے اہم موضوعات پر گفتگو فرماتے۔ محفل میں وہ ہر شخص کی صلاحیت کا اعتراف کرتے۔ انہوں نے جتنے بھی روحانی سفر کئے ان میں چوہدری عنایت اللہ صاحب کو ساتھ رکھا۔ علامہ صاحبؒ، حضرت واصف علی واصفؒ کو اپنی مری شملہ کا واقعہ بہت دلچسپی سے سنایا کرتے تھے اور مشنِ ابراہیمی پر بہت زور دیتے تھے۔ یاد رہے علامہ صاحب بدھ 4 جنوری 2006ء کو پی او ایف واہ کینٹ ہسپتال میں داخل ہوئے۔ جمعرات 5 جنوری 2006ء شام 5:35pm بجے وفات پاگئے اور 6 جنوری کو بروز جمعہ ان کا نمازِ جنازہ بمقام ڈھوک گھیبا ملک آباد نزد نواب آباد میں جناب قاری محمد امین چشتی خطیب جامع مسجد غوثیہ نواب آباد نے پڑھایا جس میں میں نے شرکت کی اور یہ عظیم جنازہ تھا۔ خلقت اس قدر تھی کہ سما نہیں سکتی تھی۔ ہفتہ 7 جنوری کو رات کے ایک بجے ان کو دفن کیا گیا جب انکا بیٹا کینیڈا سے پاکستان پہنچا۔ دوسرا جنازہ جناب حضرت سید کبیر حسین شاہ ہمدانی صاحب نے پڑھایا جن کو علامہ صاحب نے پہلے ہی آگاہی دے رکھی تھی۔

فصل 2۔ علامہ یوسف جبریلؒ کی زندگی کے بارے میں، تحریر اکرام اللہ:

علامہ یوسف جبریلؒ کی زندگی پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے۔ وہ سال ہا سال سے مسلمانانِ عالم کو بیدار کرنے میں مصروفِ عمل ہیں۔ وہ قرآنی تعلیمات کی روشنی میں دنیا کو امن اور سلامتی کا پیغام دے رہے ہیں۔ علامہ یوسف جبریلؒ کی شخصیت نہایت عجیب و غریب تھی۔ انہوں نے نہ صرف اردو بلکہ انگریزی زبان میں بھی کتابیں اور مضامین لکھے ہیں۔ اپنے خیالات کی تبلیغ واشاعت اور اپنے شعلۂ دل کو تابناک بنانے کیلئے شعر کا بھی سہارا لیا ہے۔ ان کی زندگی کا آغاز انگریزی فوج میں ایک سپاہی سے ہوا۔ انہوں نے انگریزی قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے عراق کے جیل خانہ مصّیب میں کورٹ مارشل کی سزا برداشت کی۔ علامہ صاحب کو گورکھا ٹوپی نہ پہننے کی پاداش میں کورٹ مارشل کی سزا تجویز ہوئی۔ اگرچہ ان کو کڑی سے کڑی سزا کی رضامندی ہوئی لیکن لندن سے انگریز آرمی کو یہ انتباہ ملا کہ عین اس وقت جب دشمن تمہارے سامنے ہے تم ایک مسلمان سپاہی محمد یوسف کو گورکھا ٹوپی پہننے کی پاداش میں پھانسی کی سزا دیکر اڑھائی لاکھ مسلمان فوجیوں میں نفرت اور بغاوت کا بیج بونا چاہتے ہو۔ علامہ صاحب کو پچیس برس کی عمر میں جیل بھیج دیا گیا۔ وہاں ان کو تجلیاتِ الہٰی دیکھنے کا موقع ملا۔ علم و تعلیم و تعلم کا آغاز کیا اور اپنی خداداد صلاحیتوں سے اسلامی تعلیمات کو فروغ دینے میں مصروف رہے۔ وہ قرآنِ حکیم کے تلمذ اقبالؒ کے شیدائی اور ہادیءِ اکرم تاجدارِ عرب، عرب و عجم حضرت محمد ﷺ کے فدائی تھے۔ علامہ یوسف جبریلؒ کا تعلق وادی سون سکیسر کے گاؤں کھبیکی سے ہے۔ انہوں نے کسی کالج یا یونیورسٹی سے تعلیم حاصل نہیں کی۔ بچپن ہی سے تعلیم کو خیر باد کہہ دیا لیکن بعد میں انگریزی، عربی، فارسی زبان کے علاوہ بے شمار زبانوں پر عبور حاصل ہوا۔ یہ سب کچھ روحانی سلسلہ تھا۔ علامہ صاحب فرماتے ہیں۔

شملہ کانفرنس کے دوران قائداعظمؒ انگریزی اور کانگریسی وفد کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے پاکستان کے حصول میں ناکام ہو رہے تھے۔ قدرت مجھے دہلی لے گئی۔ اورنگ زیب روڈ پر حضرت قائداعظمؒ سے ملاقات ہوئی۔ میرے منہ سے نکلا۔ ''قائداعظمؒ آپ حکم کریں۔ انشاءاللہ آپ ہم کو فرماں بردار پائیں گے''۔ قائداعظمؒ پاکستان کے مطالبے پر سخت مضبوط ہو گئے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے کامیاب و کامران ہوئے۔

علامہ صاحب نے 1963ء میں شہرۂ آفاق جرمن مستشرق اینی مری شمل سے مذاکرہ کیا اور اسے قرآنِ حکیم میں قدیم و جدید فلاسفی آف اٹامزم اور ایٹمی سائنس دکھائی۔ تو وہ لاجواب ہو گئیں۔ بعد میں اس نے اسلام قبول کر لیا۔ علامہ صاحب نے روئے زمین کے ایٹمی سائنس دانوں کو چیلنج کیا کہ وہ قرآنِ حکیم کی سورۃ الھمزہ پڑھ لینے کے بعد بھی سب اکٹھے ہو کر نیوکلیر فائر کی اتنی ہی مختصر، ایسی ہی جامع تعریف و تخصیص پیش کریں جیسا کہ قرآنِ حکیم میں موجود ہے۔ اس سائنس کے دور میں سائنس کی بنیاد پر وہ ایسا ہرگز نہیں کر سکیں گے جیسا کہ نزولِ قرآن کے دوران عرب لوگ فصاحت و بلاغت کی بنیاد پر قرآنِ حکیم کے مقابلے میں ایک سورۃ بھی پیش نہیں کر سکتے تھے اور انہوں نے روئے زمین کے جدید فلسفیوں کو بھی چیلنج کیا ہے کہ وہ قرآنِ حکیم کی سورۃ الھمزہ پڑھ لینے کے بعد سب اکٹھے ہو کر یہ فیصلہ دیں کہ جس طرح قرآنِ حکیم نے سورۃ الھمزہ میں جدید و قدیم اٹامزم کے فلسفے کو دنیا میں نمودار ہونے والے ایٹمی جہنم (ایٹم بم اور ایٹمی تابکاری) کی بنیاد قرار دیا ہے۔ حالانکہ قدیم اٹامزم پچیس سو برس قدیم ہے اور جدید اٹامزم سترہ سو پہلے ظاہر ہوا۔ ایٹمی جہنم بیسوی صدی میں نمودار ہوا کیا ایسا کرنا انسانی ذہن کے لئے ممکن ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ کے بغیر یہ بات چودہ صدیاں قبل کسی کے علم میں تھی۔ فلسفی علامہ صاحب کے جواب میں ہرگز یہ نہیں کہہ سکتے کہ ذہنِ انسانی کے لئے ایسا کرنا ممکن تھا۔ قرآنِ حکیم میں حطمہ کی حقیقت کا انکشاف اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے علامہ یوسف جبریل کے ذمے تھا اور قرآنِ حکیم ہی نے انسانیت کو ایٹمی جہنم سے نجات کا طریقہ بتایا۔

علامہ یوسف جبریل جب ڈاکٹر جاوید اقبال، حضرت علامہ اقبالؒ کے فرزند سے ملے۔ تو انہوں نے ان کو علامہ اقبالؒ کی اپنی کرسی پر بٹھایا اور کہا کہ مجھے آپ کے کلام سے اپنے والد کی خوشبو آتی ہے اور ان سے کلامِ جبریل سنا اور روتے رہے۔

علامہ صاحب کی کتاب ''جبریلز اسلامک بم'' کی اشاعت کے بعد امریکہ، یورپ اور دوسرے مخالف ممالک کا پاکستان کے اسلامی بم کے خلاف پروپیگنڈا ایک دم ختم ہو گیا۔

۱۹۶۸ء میں اسلام آباد کے شہرزار ہوٹل میں دنیا بھر کے سفیروں کے سامنے ''قرآنِ حکیم اور ایٹم بم'' کے موضوع پر تقریر کی۔ تقریر ختم ہونے پر روس کے سفیر نے علامہ صاحب کے پاس آکر مصافحہ کیا اور کہا۔ The most thought provoking lecture I have heard in my life. یعنی ''سب سے زیادہ فکر انگیز تقریر جو میں نے اپنی زندگی میں سنی ہے۔'' اس کے بعد امریکی سفیر ان کے پاس آئے اور اس نے بھی وہی جملہ کہا جو روس کے سفیر نے کہا تھا۔ البتہ اس کا مصافحہ کچھ زوردار تھا۔ شنگا کو امریکہ کے Bulletin of the atomic scientist. پاکستان ٹائمز، Newsweek, Time اور اس کے علاوہ سینکڑوں اخبارات اور رسائل میں ان کے مضامین شائع concept, News ہوئے۔

1964ء میں علامہ صاحب کے استفسار کے جواب میں انگریز شہرہ آفاق فلسفی برٹرینڈ رسل نے آپ کو لکھا۔ کہ " جب سے آدم اور حوا نے گندم کا دانہ کھایا ہے۔ انسان نے ہر وہ حماقت کی ہے جو وہ کر سکتا ہے اور انجام ایٹمی جہنم ہے۔"لیکن علامہ صاحب کو سورۃ الھمزہ نے ناامید نہ ہونے دیا۔ ویسے رسل کا تجزیہ موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے کچھ غلط نہ تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے قرآنِ حکیم میں ایٹمی جہنم سے بچنے کی تدبیر بتا دی ہے۔

علامہ صاحب بچپن میں سکول سے بھاگ گئے۔ پچیس برس کی عمر میں 1942ء میں دوسری جنگ عظیم کے دوران بغداد و کربلا کے قریب ایک مقام مصیّب میں انہوں نے کئی روحانی خواب دیکھے۔ وہ انڈین آرمی میں سپاہی تھے بعد میں حوالدار بنے۔ ایک حکم آیا جس میں اسلام اور ایمان پر زد پڑتی تھی جس پر علامہ صاحب نے آرمی کمانڈر کا حکم ماننے پر انکار کر دیا۔ ہندوستانی میجر نے GOC مڈل ایسٹ جنرل الیگزینڈر کے خط کے ساتھ علامہ صاحب کے سامنے فوجی سٹار پھیلا کر کہا جو کہو میں یہاں سے تم کو بنا کر (یعنی کرنل جنرل وغیرہ) بھیج دیتا ہوں مگر علامہ صاحب نے قطعی طور پر اس سے انکار کر دیا۔ انگریز مڈل ایسٹ میں ڈھائی لاکھ مسلمان ہندی فوجیوں کے ردِ عمل سے بے حد خوف زدہ تھا۔ علامہ صاحب کا کورٹ مارشل کر دیا گیا اور پھر چالیس برس یعنی 1982ء تک شب و روز علم کے حصول میں منہمک رہے۔ اردو، فارسی، عربی، انگریزی زبان، ان زبانوں کے تمام ادب، قرآن حکیم، توریت، زبور، انجیل کی تفسیر و تشریح، ایٹمی سائنس، ایٹمی فزکس گہرائی تک، فلسفے اسلامی فلسفے، غیر اسلامی فلسفے، ڈاروینی فلسفہ، بیکنی فلسفہ سر جیمز جینز اور برٹرینڈ رسل کا مطالعہ، عربی، ہندی، انگریزی تواریخ، جغرافیہ، ہومیوپیتھک اور ایلوپیتھک، بوٹنی، زوالوجی، تصّوف، باطنی علوم، سنیاسی علوم اور دوسرے قدیم و جدید علوم حاصل کئے اور آخر کار انگریزی اور اُردو زبان میں متعدد جلدیں تحقیقی لکھیں جو سب کی سب ایٹمی جہنم کے متعلق قرآنِ حکیم اور سائنس کے حوالے سے متعلق ہیں۔ فارسی میں کلام اور مضامین شامل ہیں۔ آپ نے 1942ء میں مختلف خواب دیکھے۔ 1961ء میں معلوم ہوا کہ علامہ صاحب کا مشن انسانیت کو ایٹمی جہنم یعنی حطمہ سے آگاہ کرنا ہے۔ علامہ صاحب نے جو کچھ لکھا ہے صرف خوابوں پر انحصار نہیں کیا بلکہ انسانیت کے سامنے علمی دلائل پیش کئے ہیں اور آپ نے ہر بات سائنس اور قرآنِ حکیم کے حوالے سے لکھی ہے۔ سارا علم انہوں نے بغیر کسی ظاہری استاد کے حاصل کیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں علمِ لدّنی سے نواز دیا اور انہیں حضرت غوث پاکؓ نے تربیت کے مراحل سے گزارا اور علوم کے لئے انہیں حضرت خواجہ خضر علیہ السلام سے رہنمائی ملتی رہی۔ یہ عجیب بات ہے تاہم اللہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ علامہ صاحب کی پیدائش 17 فروری 1917ء بمقام موضع کھبیکی وادیٔ سون سکیسر خوشاب میں ایک اعوان خاندان میں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ انسانیت کو اس دنیا کے ایٹمی جہنم اور اگلی دنیا کے حطمہ کے دردناک عذاب سے بچائے۔ آمین۔

فصل 3۔ حضرت علامہ یوسف جبریلؒ اور حضرت واصف علی واصف رحمتہ اللہ علیہ کی ملاقاتیں:

علامہ یوسف جبریلؒ اور واصف علی واصفؒ کے درمیان کیٹس، شیلے، براؤن، سر جیمز جینز، فرانسس بیکن، برٹرینڈ رسل، سیموئیل جانسن، ڈیوڈ ہیوم، ورڈزورتھ، جاہن بنیان، شیکسپیئر، گوئٹے، چارلس ڈکنز، تھامس کارلائل کے علاوہ ہیگل اور ڈارون اور دوسرے بے شمار مشہور انگریزی عمائدین پر بھی بحث ہوتی۔ ساتھ ہی ساتھ تصّوف اور فقر پر گفتگو ہوتی۔ معاشی نظام، شاعری، مغربی دانش وروں کا تنقیدی جائزہ، فلسفہ ءاثامزم، فلسفہ ءبیکن پر

بہت زیادہ گفتگو ہوتی۔ اقبالؒ کو انسانیت کا قلندر مانا جاتا تھا۔ حضرت علامہ صاحب فرماتے تھے کہ اقبالؒ میرے روحانی استاد بھی ہیں۔ حضرت واصف علی واصفؒ سگریٹ اور چائے کا خوب اہتمام کرتے۔ علامہ صاحب بھی چائے کے بہت شوقین تھے اور سگریٹ تو ایک بجھتی اور دوسری جلتی تھی جسے Chain smoking کہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا کہ دو علم کے سمندر آپس میں گفتگو کر رہے ہیں۔ عجیب ماحول ہوتا تھا۔ وہ وقت بھولا جا نہیں سکتا۔ علامہ صاحب عام حالات میں تنگیء دوران خیال کی دنیا میں مست رہتے تھے۔ انہوں نے زندگی کا زیادہ حصہ تنگدستی میں گذارا۔ لیکن اپنے مشن سے ہٹے نہیں۔ شدید سے شدید مشکلات بھی ان کو اپنے مشن سے ہٹا نہیں سکیں۔ تنگدستی کی زندگی گزارنے والے علامہ یوسف جبریلؒ کے چہرے پر لکھی ہوئی تنگدستی کبھی بھی الفاظ کی شکل میں سامنے نہ آتی۔ واصف کی محفل میں حفیظ صاحب بھی آیا کرتے تھے۔ واصف علی واصفؒ ہر شخص کو سنتے تھے۔ اُن سے استفادہ کرتے اور ہر شخص کی عزت اور احترام کرتے۔ وہ ہر شخص سے اپنی استعداد کے مطابق استفادہ کرتے اور سامعین بھی اپنی اپنی علمی استطاعت کے مطابق واصف علی واصفؒ سے فائدہ اٹھاتے۔ انسانی مسائل کے حل کے لئے اُن کے پاس بہت اعلیٰ دماغی صلاحیت موجود تھی۔ جس کا اظہار اُن کی کتابوں میں ملتا ہے۔ وہ ہر شخص کی علمی صلاحیتوں کا اعتراف بھی کرتے تھے۔ باباجی عنایت اللہ بہت سارے واقعات کے عینی شاہد ہیں۔

حضرت واصف علی واصفؒ بھی ایک عظیم مشن کے مالک تھے۔ ان کی زندگی میں جو محبت اور خلوص علامہ صاحب نے جناب واصف علی واصفؒ کو دیا وہ کبھی نہیں بھول سکے۔ اسی وجہ سے وہ کئی مرتبہ واہ کینٹ میں علامہ صاحب کو ملنے آئے اور ان کے ساتھ دوستوں کا ایک جم غفیر ہوتا۔ علامہ صاحب وہاں بھی بولتے رہتے اور حضرت واصف علی واصفؒ سنتے رہتے۔ چوہدری صاحب فرماتے ہیں کہ میں حیران ہوں کہ اس شخص کے سامنے کوئی شخص بات نہیں کر سکتا تھا۔ وہ کتنا عرصہ حضرت علامہ صاحبؒ کی گفتگو نہایت توجہ سے سنتے رہے اور پھر جب کبھی ہم لوگ ان کے ہاں واہ کینٹ میں جاتے تو وہ زیادہ تر ایک جھونپڑے میں بیٹھے ہوتے۔ حضرت واصف علی واصفؒ کے لئے چارپائی کا اہتمام کرتے۔ تو واصفؒ ان کے ساتھ بیٹھ کر وہ خوشی محسوس کرتے جس کا اظہار ان کا چہرہ اور دل کیا کرتا تھا۔

فصل 4۔ حضرت واصف علی واصفؒ نمبر 1۔ تحریر علامہ محمد یوسف جبریلؒ:

یہ تقریباً 1962ء کا ذکر ہے۔ میں محکمہ اوقاف پاکستان لاہور میں بحیثیت ریسرچ انوسٹیگیٹر ملازم تھا۔ اس سلسلے میں روزانہ اپنی رہائش گاہ شاہدرہ سے پیدل شاہ چراغ بلڈنگ لاہور دفتر میں جاتا اور پھر پیدل چل کر واپس شاہدرہ لوٹتا۔ راستے میں لاہور انگلش کالج پڑتا تھا جس کے بانی اور پرنسپل واصف علی واصف تھے۔ مجھے یاد نہیں کہ کس طرح مگر ایک روز اپنے دفتر شاہ چراغ بلڈنگ سے واپسی پر لاہور انگلش کالج میں میری ملاقات واصف علی واصفؒ سے ہو گئی پھر تو میرا یہ معمول بن گیا کہ دفتر سے واپسی پر ضرور لاہور انگلش کالج میں واصف علی واصفؒ سے ملاقات کرتا۔ وہاں ایک چھوٹا سا ادبی حلقہ تھا جو ہر روز کسی نہ کسی موضوع پر بحث کرتا۔ میں نے کچھ شعر کہے تھے جن کی تعداد تین ہزار کے لگ بھگ ہو گی۔ میری شاعری کا موضوع اللہ کی زمین پر اللہ کی حکومت کا قیام اور بنی نوعِ انسان کو جدید مادہ پرستی کے منطقی نتیجے یعنی ایٹمی جہنم سے نجات دلانا تھا اور ان دنوں میں اپنی شاعری کے معاملے میں خاصا پُر جوش تھا اور زمین پر امن و امان اور فلاح و بہبود کے قیام اور انصاف کے حصول اور ظلم و ستم کی بیخ کنی کی آرزو اپنے دل میں پالتا تھا۔

وہاں لاہور انگلش کالج میں عموماً مجھے کچھ اپنا کلام سنانے کی فرمائش کی جاتی اور جب بھی میں اپنا کلام پڑھتا تو واصف علی واصفؒ کی حالت دیدنی ہوتی۔ شاعری کے علاوہ بھی بے شمار موضوعات پر بحث ہوتی اور واصف علی واصفؒ میرے نظریات سے کافی متاثر ہوتے۔ واصفؒ کے اندر ایک عمل برپا ہو گیا۔ واصفؒ کو ایک لائن اور ایک مقصد مل گیا اور اس کی عبقریت بھڑک اٹھی۔ میں لاہور سے چلا گیا۔ واصفؒ کے ذہن میں ذہانت کا ایک فوق الفطرت طوفان پھٹ پڑا، کچھ عرصے کے بعد مجھے واصفؒ کی ایک بہت لمبی نظم موصول ہوئی جو کتابی صورت میں چھپی ہوئی تھی۔ نظریات وہی تھے جو میرے تھے اس کے بعد یکے بعد دیگرے چار جلدیں اردو نثر میں واصفؒ نے لکھیں۔ اُس کے نظریات میرے نظریات کا عکس تھے مگر زبان اور ذہن اس کا اپنا تھا۔ اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں کہ واصف کے نظریات وہی تھے جو میرے تھے۔ میرے ذہن میں بھی علم کا ایک طوفان برپا ہوا تھا جس کے نتیجے میں میں نے متعدد جلدیں انگریزی اور اردو زبان میں لکھیں۔ واصفؒ کے پاس سکول اور کالج کی کافی تعلیم تھی مگر میں نے بغیر استاد اور بغیر کالج کے قدیم و جدید علوم حاصل کئے۔ اردو، انگریزی، فارسی، عربی زبانیں اور ان کے ادب، توریت، زبور انجیل اور قرآنِ حکیم کو مع تفسیر پڑھا اور سمجھا۔ تواریخ فلسفے پڑھے اور سمجھے۔ سائنس کی کئی شاخیں پڑھیں اور سمجھیں پھر اس ساری محنت کے نتیجے میں متعدد جلدیں انگریزی میں اور ان کے تراجم اردو میں لکھے جن کا مقصد انسانیت کو اس جہان اور اگلے جہان کے ایٹمی جہنم اور ایٹمی جنگ سے رہائی دلانا اور دنیا میں امن و امان قائم کرنا ہے۔

چالیس برس کا عرصہ میں نے اس دردناک عذاب میں گزارا اور اب بھی ایسی ہی حالت ہے۔ جس طرح ڈاکٹر جاوید اقبال نے میرے کلام کو علامہ اقبالؒ کی صدائے بازگشت کہا تھا اسی طرح واصفؒ کے نظریات میری صدائے بازگشت ہیں مگر اندازِ بیان اس کا اپنا ہے اور بہت ہی کمال کا ہے اور موضوع بھی اس کے اپنے ہیں جو بے شمار ہیں اور ذہن بھی اس کا اپنا ہے جس کا جواب نہیں۔ واصفؒ نے جو تحریریں چھوڑی ہیں وہ نہایت ہی قابلِ تعریف ہیں۔ موجودہ انسانیت کے حالات و مصائب کے لئے واصفؒ کی تحریریں ایک شافی علاج کا درجہ رکھتی ہیں۔ اُن انقلابی مصنفین کی فہرست میں جو انسانیت کو موجودہ مصائب و آلام سے نجات دلانے والے ہیں واصفؒ کا نام ایک خصوصی مقام کا حامل ہو گا۔ میرے نظریوں اور واصفؒ کے نظریوں میں ایک سلسلہ قائم نظر آتا ہے اور دو ذہنوں میں واضح ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ بے شک واصفؒ کی تحریریں قاری پر جادو کا اثر کرتی ہیں۔

اور یہ جو میں نے کہا ہے کہ واصفؒ نے میری باتوں اور میرے نظریوں کا اثر قبول کیا اور یہ انقلاب اُس کے ذہن میں پیدا ہوا اس اثر کا اعتراف واصفؒ نے اپنی دو کتابوں ''کرن کرن سورج'' اور ''دل دریا سمندر'' کے پیش لفظ میں برملا کیا ہے۔ یہ دونوں پیش لفظ پڑھے جائیں یہاں بخوفِ طوالت صرف چند اشارے کئے جائیں گے۔ ''کرن کرن سورج'' کے پیش رس میں لکھا ہے۔ ''دراصل یہ چند کلیاں ہیں نشاطِ روح کی جنہیں گلستانِ طریقت سے چنا گیا اور جن سے اصلاحِ احساس میسر آنا ممکن ہے یہ فیض ہے کسی نگاہ کا اور فیض میرا دعویٰ نہیں صرف اظہارِ عقیدت ہے۔ ان صاحبانِ حال سے جن کے تقرب سے ''حرف آرزو'' ''حرف بے نیازی'' ہو کر رہ جاتا ہے۔ صاحبِ حال کیا ہوتا ہے اس کا بیان مشکل ہے۔ (صفحہ ۷) آگے چل کر صفحہ ۹ پر لکھا ہے۔ ''صاحبِ حال کا قرب حال پیدا کر سکتا ہے جیسے آگ کا قرب لوہے کے ٹکڑے میں آگ کی صفت پیدا کر سکتا ہے''۔

آگے صفحہ ۱۰ پر لکھا ہے۔" مدعا یہ ہے کہ یہ چند باتیں آپ کی خدمت میں پیش ہیں کہ یہ میرا اندازِ فکر ہے۔ یہ عطا ہے اور عطا احساسِ تسلیم کا نام ہے۔ تسلیم میری اپنی ہے"۔ یہ پیش رس چار صفحوں پر مشتمل ہے اور تقریباً سارا بیان صاحبِ حال کے متعلق ہی ہے۔

دوسری کتاب " دل دریا سمندر" کے پیش لفظ کو آغازِ گفتگو کا نام دیا ہے۔ یہ بھی تقریباً چار صفحوں پر مشتمل ہے اس میں بیان ہے کہ صاحبِ نظر کی چشمِ بینا کو اس کائنات میں کیا کیا نظارے نظر آتے ہیں۔ لکھا ہے "رائی کے دانے میں کائنات کے جلوے موجود ہوتے ہیں"۔ بہر حال دونوں پیش لفظ واصف کی قلم کا واشگاف اعجاز ہیں۔ مرید اور شیخ کے تعلق کے متعلق "کرن کرن سورج" کے صفحہ ۹۹ پر لکھا ہے۔" مرید کی اپنی صداقت اور عقیدت ہی اس کو منزل تک پہنچاتی ہے اگر منزل نصیب ہو گئی تو شیخ کے کامل ہونے میں کیا شک؟ مرید منزل تک نہ پہنچا تو شیخ کے کامل ہونے نہ ہونے کا کیا تذکرہ؟ خوش نصیب مرید شیخ کا ہر حال میں ممنون رہتا ہے اور بد نصیب ہمیشہ اپنی کوتاہی کا شیخ کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے"۔

کئی عشروں سے میں اپنی اس علمی مہم میں ایک دردناک زندگی گزار رہا تھا۔ ایک عظیم مشن کی تکمیل کی خاطر میں دوسروں کو دو جہان کے ایٹمی جہنم کے عذاب سے بچانے کی کوشش میں میں خود آزمائش کے ایک دوزخ میں گرا ہوا تھا۔ ایک عظیم مشن کا احساس میرے اوپر پہاڑ بن کر مجھے کچل رہا تھا گو کہ حرفِ شکایت کبھی لب پر نہیں لایا۔ چالیس برس تک شکایت کے معاملے میں چٹان کی طرح خاموش رہا اب کچھ کہہ جاتا ہوں بہر حال مقصد یہ ہے کہ میں ایسے ہی حالات کی گرفت میں مبتلائے کرب تھا کہ اچانک میرے سامنے واصفؒ نمودار ہوئے وہ مجھے لاہور سے ملنے آئے تھے۔ آپ اس موقع پر میرے احساسات کا اندازہ نہیں کر سکتے خوشی حیرت اور دکھ کے ملے جلے جذبات نے ایک خاص صورت اختیار کر لی تھی البتہ واصفؒ کو دیکھ کر میرا دل خوشی اور مسرت کی انتہاؤں کو چھو رہا تھا۔ واصفؒ کے چہرے پر مجھے ایک عجیب قسم کی اداسی نظر آئی وہ اداس تھا جتنی دیر وہ میرے ساتھ رہا۔ وہ چارپائی پر لیٹا چھت کو دیکھتا رہا باتیں بہت کم ہوئیں لیکن دو روحیں ایک دوسرے سے بہت کچھ کہہ سن رہی تھیں۔ پھر واصفؒ مجھ سے وداع ہو گئے ہمیشہ کے لئے۔ واصفؒ موت سے پہلے مجھے الوداع کہنے آئے تھے۔ واصفؒ کی موت کی خبر میں نے اخبار میں پڑھی میرا دل سخت اداس ہو گیا۔ اُداسی خاص قسم کی تھی جب میرے دکھ کا کچھ افاقہ ہوا تو واصفؒ کی یادیں میرے ذہن میں نمودار ہوئیں۔ مجھے خیال آیا کہ واصفؒ جب مجھے ملنے آئے تھے تو اُنکے چہرے پر ایسی کیفیت طاری تھی گویا کہ اُن کے دل میں کوئی خواہش کوئی امید ہے لیکن اس ملاقات کے دوران میں نہ سمجھ سکا اب معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے دعا کے خواہش مند تھے جس طرح ایک شاگرد اپنا کام مکمل کرنے پر استاد کی شاباش کی توقع کرتا ہے لیکن اُنکے چہرے کی اس کیفیت میں ایک اور کیفیت بھی شامل تھی وہ اداسی کا ایک رنگ تھا جو کہہ رہا تھا کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے بلکہ اُن کی گفتگو کا انداز بھی الوداعی گفتگو کی اداسی لئے ہوئے تھا۔ افسوس صد افسوس پھر میں نے ہاتھ اٹھائے اور واصفؒ کے لئے دعا کی اے اللہ واصفؒ کی محنت قبول فرما اور اس کے کام میں برکت دے اور اسے اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین ثم آمین۔

واصفؒ اخلاقی اور صفاتی لحاظ سے ایک عظیم انسان تھے۔ وہ مخلص ملنسار تھے وہ نہایت سادہ دل تھے گو کہ اُن کی عزتِ نفس کی حس نہایت تیز تھی۔ وہ دیانتدار تھے، سچے تھے اور شان والے تھے۔ وہ شستہ مزاج، صاحبِ شرف اور اعلیٰ درجے کے انسان تھے۔ سنجیدگی کے ساتھ خوش مزاجی

بھی اُن کے مزاج کا حصہ تھی۔ عداوت، حسد، غیبت جیسے سفلی عوامل کا اُن کے دل میں شائبہ تک نہ تھا۔ وہ خالص سونا تھا اور جو مقام قدرت نے اسے دیا ہے وہ اس کا مستحق تھا۔ اس کی ظاہری شان و شوکت کو دیکھ کر یہ اندازہ لگانا انتہائی مشکل تھا کہ اس شخص کے اندر درویش بیٹھا ہے۔

انسانیت آج کرب میں مبتلا ہے مادی ترقی سے حاصل ہونے والی بے شمار سہولتوں کے باوجود دنیا میں سکون ناپید ہے۔ خود غرضی سارے ماحول پر چھائی ہوئی ہے۔ باہمی نفرت اور بے اعتباری کا دور دورہ ہے۔ خونی رشتے بے وقعت ہو کر رہ گئے ہیں۔ ایمان کمزوری کی حدوں کو چھو رہا ہے۔ اخلاقی اور روحانی قدروں کو ماضی کی چیز اور فضول تصوّر کیا جاتا ہے۔ خوف، ذہنی افسردگی، عدم تحفظ اور باہمی بے اعتنائی کا احساس نفسیاتی بیماری کی حد تک بڑھ چکا ہے۔ دولت جمع کرنے کے جنون اور دولت کی شدید حاجت نے انسان کو سکون اور قرار سے محروم کر دیا ہے۔ حرص و طمع نے انسان کو حیوان بنا دیا ہے۔ آج کا انسان زندگی کو ایک عذاب اور ایک سزا تصوّر کرتا ہے۔ ایٹمی تباہ کاریوں کا خوف اس کے علاوہ انسان کے ذہن پر مسلّط ہے اور افسوس کی بات یہ ہے کہ آج کا دانش ور یہ سمجھنے سے عاری ہے کہ آخر وہ کون سی وجوہات ہیں جو آج کی دنیا میں یہ رینگتا چنگھاڑتا جلتا جہنم پیدا کرنے کی ضامن ہیں۔ کرپشن، بددیانتی اور جھوٹ ایک عادت بن چکے ہیں۔ انصاف امن و امان کا کہیں نشان نہیں کسی کو دلجمعی میسر نہیں۔

واصفؒ کی کتابوں میں مندرجہ بالا خرابیوں کے خلاف ایک اپیل ایک نہایت ہی مؤثر اپیل موجود ہے۔ یہ تحریریں قاری کو حیرت ناک حد تک متاثر کرتی ہیں۔ آج کے اس دور کی خرابیوں کی نسبت سے واصفؒ کی یہ تحریریں نہایت ہی بر محل اور موزوں ہیں اور حدِ کمال کو پہنچی ہوئی ہیں بے شک واصفؒ کی ان کتابوں کو ماضی میں لکھی گئی تصّوف اور اصلاحِ احوال کے لئے لکھی گئی عظیم کتابوں کی فہرست میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ موجودہ دور کی خصوصی خرابیوں کے حوالے سے واصفؒ کی اصلاحی تحریروں کی موزونیت ان تحریروں کی ایک خصوصی خوبی ہے۔ جوں جوں زمانہ آگے بڑھے گا واصفؒ کی تحریروں کی ضرورت اور قدر و قیمت بڑھتی جائے گی۔ یہ تحریریں بر محل ہیں اور موزوں ہیں اور ان کی افادیت مُسلّم ہے۔ آیئے واصف کے ساتھ ماضی میں بڑا مقبول یہ پیلوں کا گیت جس کا حوالہ واصفؒ نے اپنی کتاب " دل دریا سمندر" میں صفحہ 239 پر دیا ہے اور ایک طرح سے نئے دور کے حسبِ حال بھی ہے۔ گاتے جائیں۔

آ چنوں رل یار پیلوں پکیاں نیں
آیاں پیلوں چنن دے سانگے
اوڑک تھیاں فریدن وانگے
چھوڑ آرام قرار
ہکیاں بکیاں نیں
آ چنوں رل یار پیلوں پکیاں نیں

فصل 5۔ واصف علی واصفؒ سے ملاقاتیں مضمون نمبر 2، تحریر علامہ محمد یوسف جبریلؒ:

یہ غالباً ۱۹۶۲ء یا اس کے آس پاس کی بات ہے کہ میں شاہدرہ لاہور سے جہاں میری رہائش تھی، شاہ چراغ بلڈنگ میں واقع محکمہ اوقاف کے دفتر پیدل جایا کرتا تھا۔ میں ان دنوں اس محکمے میں بطور ریسرچ انوسٹیگیٹر کام کر رہا تھا۔ میں واپسی پر بھی اسی طرح پیدل آتا۔ میرے راستے میں لاہور انگلش کالج تھا جس کے بانی پرنسپل واصف علی واصف تھے۔ یہ کیسے ہوا یہ تو مجھے یاد نہیں لیکن ایک دن ایسا ہوا کہ میں واصف علی واصف کے ساتھ تھا۔ پھر تو میرا یہ معمول بن گیا تھا کہ میں شاہ چراغ بلڈنگ سے واپسی پر لاہور انگلش کالج چلا جاتا تھا۔ وہاں مجھے مختصر سے حلقہء احباب میں بیٹھنے کا موقع ملتا جو عموماً ادبی بحث میں مصروف ہوتا تھا۔ میں ان دنوں اردو شعر و شاعری کی طرف راغب ہو گیا تھا اور میرے تقریباً تین ہزار شعر جمع ہو گئے تھے۔ اسی شاعری کے بارے میں حضرت اقبالؒ کے فرزند جسٹس جاوید اقبال نے تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا : " اس شاعری میں فکرِ اقبال کا عکس ملتا ہے اور ایک طرح سے یہ اقبالؒ کی شاعری کی بازگشت ہے۔ میں دعا گو ہوں کہ شاعر جو مقصد اس شاعری کے ذریعے حاصل کرنا چاہتا ہے اللہ اسے اس میں کامیاب کرے"۔ میری شاعری کا مقصد اس دنیا میں جنتی معاشرے کا قیام تھا تاکہ یہ دنیا درپیش خطرات سے بچ جائے اور مادہ پرست بے روح تہذیب کی بیماریوں سے مامون و محفوظ رہے۔ میں ہر طرف امن و سلامتی خوشحالی اور اطمینان کی فضا دیکھنے کا آرزو مند تھا۔ لاہور انگلش کالج میں مجھ سے اکثر اپنا کلام سنانے کی فرمائش کی جاتی تھی۔ میں جب بھی اپنا کلام سناتا واصف گہرا اثر لیتے تھے۔ میری شاعری کی ایک جھلک میرے درج ذیل اشعار میں دیکھی جا سکتی ہے:۔

دیکھ ! آزادیٔ دنیا کی ہوائیں آئیں
تیری بہبود کے پردے میں بلائیں آئیں
جھومتی مادہ پرستی کی گھٹائیں آئیں
بجلیاں کفر کی الحاد کی چھائیں آئیں
یہ چڑیلیں ہیں جنہیں تو نے پری سمجھا ہے
یہ تو ریلیں ہیں جنہیں طیرِ بریں سمجھا ہے
دہر ہے فتنۂ دجال کی جولانی پہ
دور نازاں ہے زمانے کی فراوانی پہ
برق بیتاب ہے اس گھر کو جلانے کے لئے
خرمن ہستیء آدم کو مٹانے کے لئے

☆☆☆

واصفؔ کا ذہن میری شاعری اور میری گفتگو سے متاثر ہوا اور اس نابغہء کے لئے یہ چنگاری ثابت ہوئی۔ میں لاہور چھوڑ آیا تھا لیکن واصفؔ کو میری گفتگو سے ایک راستہ، ایک مقصد ہاتھ آ گیا تھا۔ پھر آگہی کا ایک طوفان امڈا جسے مافوق الفطرت فہم و فراست اور دانائی کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ واصفؔ نے

مجھے ایک طویل اردو نظم بھیجی جو شائع ہو چکی تھی اور جس میں میرے خیالات کو مکمل طور پر اپنایا گیا تھا۔ یہ واصف ؔ کے ذہن کی ایک حیرت انگیز تخلیق تھی مگر اس کے خیالات ہو بہو میرے خیالات کی تصویر تھے جسے نقشِ ثانی کہا جاسکتا تھا۔ اسمیں دراصل کوئی حیرت کی بات نہیں اگر واصف ؔ اور میرے خیالات میں مکمل یکسانیت پائی جاتی ہو۔ وہ جو ایک طوفان میرے ذہن میں برپا ہوا تھا اور جس نے مجھ سے متعدد جلدیں انگریزی میں اور اردو میں لکھوا ڈالی تھیں اسی طوفان نے واصف ؔ کے ذہن کو آن لیا تھا۔ اس نے خوبصورت شاعری بھی کی اور نثر میں بھی اس کی چار کتابیں شائع ہو گئی تھیں۔ اس دور کے پریشان حال، دکھوں میں گھرے ہوئے لوگوں کیلئے واصف ؔ کی یہ نثری تخلیقات وقت کی ضرورت تھی۔ واصف ؔ نے باقاعدہ تعلیم حاصل کی تھی اور میں نویں جماعت کے بعد بغیر کسی استاد اور درسگاہ کے قدیم و جدید علوم، چار زبانوں پر دسترس سمیت حاصل کر چکا تھا۔ میں نے اردو، فارسی، عربی اور انگریزی ادب سارا کھنگال ڈالا تھا۔ قرآنِ حکیم، بائیبل، تواریخ، فلسفہ اور جدید سائنس کے بہت سے شعبوں تک مجھے مکمل رسائی حاصل تھی۔ پھر میری ساری جدوجہد کا ثمر میرے وہ بیشمار غیر مطبوعہ مسودات نکلے جن میں اس دنیا کو اور اس میں بسنے والے انسانوں کو جدید ایٹمی کلچر کی تباہ کاریوں سے بچانا میرے مقصدِ حیات کے طور پر سامنے آیا۔ ایٹمی جنگ سے قبل اس زمین پر اللہ کی حکومت قائم ہو گی۔ اس میں ایٹمی جنگ کے امکان کو ختم کرنا بھی شامل تھا۔ یہ سارا کٹھن سفر چالیس برس پر محیط ہے اور ان تمام برسوں میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کسی کے قبضے میں ہوں۔ یہ بڑا تکلیف دہ زمانہ تھا اور اب بھی ہے۔ واصف ؔ کی تحریروں کو بجا طور پر میرے خیالات کی بازگشت کہا جاسکتا ہے۔ جسطرح اقبالؒ کے فرزند نے میری شاعری کو اقبالؒ کی شاعری کی بازگشت کہا تھا۔ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ اگر واصف ؔ کی کتابوں کو معجزاتی تحریروں پر مشتمل کتابیں قرار دیا جائے۔ اس دنیا کے ان ادیبوں میں واصف ؔ کا نام نہایت ادب اور احترام سے لیا جائے گا جن کی تحریروں سے ایک ایسا انقلاب آئے گا جو بنی نوعِ انسان کو جدید مادیت کی آفات سے آزاد کرادے گا۔ بلاشبہ واصف ؔ کی ذہنی کیفیت ایسی تھی جسے ایک قسم کے سماوی و ملکوتی طوفان نے جنم دیا تھا۔ واصف ؔ کی تحریروں کو پڑھکر قاری یوں محسوس کرتا ہے جیسے یہ کسی مافوق الفطرت ذہن کے مالک لکھاری کی تحریریں ہیں۔ تاہم میری اور واصف ؔ کی تحریروں میں اور خیالات میں ایک ہم آہنگی پیدا ہو گئی ہے۔

واصف ؔ کی تخلیقات اور میری تخلیقات میں ایک ربط، ایک پیوستگی قائم ہو گئی ہے۔ وہ اس طرح کہ مجھ سے متاثر ہونے کے بعد واصف ؔ کے ذہن میں ایک ایسا سماوی طوفان آیا جسکے نتیجے میں اسکے قلم سے وہ شاہکار سامنے آئے جنہوں نے قارئین کو دم بخود اور مسحور کر دیا۔ واصف ؔ نے بخوشی اس اثر کو قبول کیا اور اسکا اظہار کرنے میں اسے کوئی تامل نہ تھا۔ اس نے اپنی کتاب ''کرن کرن سورج'' کو ''صاحبانِ حال'' کے نام منسوب کیا ہے۔ ''صاحبانِ حال'' ایک ایسی اصطلاح ہے جس کا مطلب ہے اولیائے کرام۔ یہ کتاب جب شائع ہوئی تو حضرت واصف علی واصفؒ مجھے ملنے اور اسی کتاب کو مجھ تک پہنچانے آئے تو میں بے حد خوش ہوا اور وہ بھی مجھ سے مل کر بیحد خوش ہوئے۔ بے تحاشا راز و نیاز کی باتیں ہوئیں۔ سامنے بھی اور کنایوں میں بھی۔ میں نے اس کتاب پر فوری تبصرہ شائع کروایا۔

اس کتاب کے بارے میں واصف لکھتے ہیں: '' دراصل یہ چند کلیاں ہیں نشاط روح کی جنہیں گلستان طریقت سے چنا گیا ہے اور جن سے اصلاحِ احساس میسر آنا ممکن ہے۔ یہ فیض ہے کسی نگاہ کا اور فیض میرا دعویٰ نہیں صرف اظہارِ عقیدت ہے ان صاحبانِ حال سے جن کے تقرب میں ''حرفِ آرزو'' '' حرفِ بے نیازی'' ہو کر رہ جاتا ہے۔ صاحبِ حال کیا ہوتا ہے؟ اس کا بیان مشکل ہے''۔ (کرن کرن سورج'' (پیش رس)''۔

پھر بھی واصف علی واصف صاحبانِ حال کی تشریح کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے اوصاف گنوانے میں تین صفحات لے لیتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ صاحبِ حال کا قرب حال پیدا کر سکتا ہے جیسے آگ کا قرب لوہے کے ٹکڑے میں آگ کی صفت پیدا کر سکتا ہے''۔ بے شک صاحبِ حال کی تشریح جو واصف پیش کرتے ہیں قابلِ تعریف ہے اور اس میں بڑی قیمتی معلومات ملتی ہے۔ صاحبِ حال میں ان کا یقین کتنا ہے اس بارے میں وہ لکھتے ہیں: '' صاحبانِ حال کے فیضِ نگاہ سے اظہارِ عقیدت کے طور پر یہ کتاب پیش کر رہا ہوں۔ خوبی ان کا فیض، خامی میری بشری کوتاہی''۔

واصف اپنی ایک اور کتاب '' دل دریا سمندر'' کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں: '' رائی کے دانے میں کائنات کے جلوے موجود ہوتے ہیں''۔ یہ پورا پیش لفظ بے حد دلچسپ اور نصیحت آمیز ہے۔ مرید اور شیخ کے بارے میں واصف '' کرن کرن سورج'' کے صفحہ ۹۹ پر لکھتے ہیں:

''مرید کی اپنی صداقت اور عقیدت ہی اس کو منزل تک پہنچاتی ہے۔ اگر منزل نصیب ہو گئی تو شیخ کے کامل ہونے میں کیا شک؟ مرید منزل تک نہ پہنچا تو شیخ کے کامل ہونے نہ ہونے کا کیا تذکرہ؟ خوش نصیب مرید شیخ کا ہر حال میں ممنون رہتا ہے اور بد نصیب ہمیشہ اپنی کوتاہی کا شیخ کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے''۔

اس دنیا کو ایٹمی جہنم کے شعلوں سے بچانے کے لئے میرا انتہائی جوش و جذبہ خود مجھے کئی عشروں سے ایک جہنم میں گرا گیا ہے اور یہ اس گھڑی ہوا جب میں نے اپنا مشن شروع کیا مگر میں نے بھی صبر و تحمل کا دامن نہ چھوڑا نہ کبھی شکوہ و شکایت اور گلہ کیا۔ اس کیفیت میں ایک روز میں نے واصف کو اپنے سامنے کھڑا ہوا دیکھا۔ وہ لاہور سے مجھے ملنے آئے تھے۔ میری اس وقت کیا حالت تھی، میں کیا محسوس کر رہا تھا اسکا آپ تصور بھی نہیں کر سکیں گے۔ خوشی و مسرت اور رنج و غم آپس میں مل گئے تھے، تاہم مجھے واصف سے ملکر بے حد خوشی ہوئی۔ اس کے چہرے پر انتہائی افسردگی کے آثار مجھے صاف نظر آرہے تھے۔ یہ افسردگی تو تھی مگر ایک خاص قسم کی منفرد افسردگی تھی۔

وہ مجھے ملنے بھی آئے تھے۔ مجھ سے باتیں بھی سننے آئے تھے۔ میں بولتا رہا وہ سنتے رہے سنتے رہے۔ ساتھ دوست احباب بھی تھے۔ وہ بھی میری باتیں سنتے رہے۔ وہی پرانی باتیں، اپنی میری شملہ والا تذکرہ، وہی مسلمانوں کی بے بسی اور بے حسی والے حالات، وہی میرا مشن انسانیت کو مادہ پرستی سے بچانے کا، وہی ذاتی حالات وہ سنتے رہے۔ چارپائی پر لیٹے چھت کی طرف مسلسل گھور رہے تھے۔ میں مسلسل انگریزی اور اردو میں ان سے گفتگو کر رہا تھا وہ انتہائی دلجمعی اور محبت سے میری باتیں سنتے رہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ جب بھی وہ مجھے ملے میری باتیں انہوں نے خلوص سے سنیں۔ حالانکہ وہ تو مجمعوں میں بولنے والے تھے۔ انہوں نے میری باتوں میں کبھی ناگواری محسوس نہیں کی۔ محفلوں میں وہ کسی کو بولنے کا موقع ہی نہیں دیتے تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ ابھی مجھے تو یہیں رہنا ہے۔ میرا کام ابھی باقی ہے اور نامکمل ہے۔ جوں ہی مکمل ہوا آپ سے جنت میں ملاقات کروں گا۔ وہیں پر آپ سے ملاقات ہو گی۔

میں نے ان کے لئے ایک طویل دعا کی جو میرے دل سے نکل رہی تھی۔ یہ مجھ سے ان کے لئے آخری تحفہ تھا جو میں ان کو دے سکتا تھا۔ کہنے لگے کہ اوپر سے بلاوا آگیا ہے اور اپنا کام بھی مکمل ہو گیا ہے۔ اب جانے کی اجازت لینے آیا ہوں اور دعا کا طلبگار بھی۔ میں نے شاید اس سے قبل اتنی خلوص والی دعا کسی کے لئے نہ کی ہو، ان کے لئے کی۔ پھر وہ لاہور چلے گئے اور میں اپنے مسائل میں کھو گیا۔

دوبارہ ہم کبھی نہ مل سکے اس لئے کہ وہ واپس جانے کے بعد اپنے خالقِ حقیقی کے پاس لوٹ گئے تھے۔ میں نے ان کے انتقال کی خبر اخبارات میں پڑھی۔ اس خبر نے مجھے بیحد رنجیدہ بنا دیا تھا۔ میں نے سوچا اپنی روانگی سے قبل واصف مجھ سے آخری ملاقات کے لئے تشریف لائے تھے۔ میں نے ان کی آنکھوں میں کسی التجا کی تحریر پڑھی تھی، یہ کوئی خواہش تھی کوئی توقع تھی جو ملاقات کے دوران تو میری سمجھ میں نہ آئی مگر جب اس کے انتقال کی خبر میں نے پڑھی تو یہ حقیقت مجھ پر آشکار ہوئی کہ وہ ایک شاگرد کے طور پر مجھ سے آشیر باد لینے آئے تھے کہ اس نے اپنا کام مکمل کر لیا تھا اور اسے اپنے شیخ سے دعاؤں کی توقع تھی اور میں نے اسے دعا دی۔ اس کے انتقال کے بعد مجھے اس کے چہرے کے نقوش یاد آئے، اس کا اندازِ گفتگو یاد آیا اور اس کی آنکھوں میں کوئی شے چھپی ہوئی یاد آئی۔ مجھے اب یہ احساس ہوا کہ موت کی آمد کے بارے میں جیسے اسے پیش آگاہی تھی اور مجھ سے بچھڑنے کا احساس اسے افسردہ و غمگیں بنا رہا تھا۔ میرے پیارے واصف! اللہ کا تم پر فضل و کرم ہو، تمہارا کام اس کی بارگاہ میں قبول ہو گیا ہو۔ اللہ تمہاری محنت و مشقت کو منظور فرمالے اور جنت کا ایک خاص مقام تجھے عطا ہو۔

واصف کو جیسا کہ میں نے دیکھا وہ مخلص، دوستانہ رویئے کے حامل، سادہ لوح تھے لیکن عزتِ نفس کا گہرا احساس رہتا تھا۔ وہ ایک سچے دیانتدار، پاکیزہ خیال اور روشناس انسان تھے۔ اللہ نے انہیں بہترین ذہن عطا فرمایا تھا اور وہ ایک صاحبِ بصیرت درویش منش انسان تھے۔ خوش پوش اور ظاہری نفاست کی ساری خوبیوں سمیت انہیں دیکھ کر کوئی بھی ملاقاتی واصف کے اندر بیٹھے ہوئے درویش کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا۔ (خصوصاً جس زمانے تک سوٹ بوٹ ٹائی کا خاص اہتمام رہا)۔ مجھے وہ انسانیت کا ایک حسین نمونہ نظر آئے۔ غیبت، حسد، کینہ، دشمنی اور تعصّب کیلئے واصف کے دل میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ ہر کھوٹ سے پاک سونا تھے اور صوفیانہ تحریروں کی دنیا میں اور انسانوں کے درمیان جو مقام اسے ملا وہ اس کا بجا طور پر مستحق تھا۔ سائنسی و مادی ترقی نے آج کے انسان کو بیشمار مادی سہولتیں دے رکھی ہیں مگر اسے اطمینانِ قلب حاصل نہیں۔ بداعتمادی کی فضاء میں خود غرضی اور نفرت نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ خونی رشتے کے لفظ کے معانی گم ہو گئے ہیں اور انسانی ذہن میں یقین کی قوت باقی نہیں رہی۔ روحانی اور اخلاقی اقدار غیر ضروری سمجھی جاتی ہیں جو کبھی ماضی کا حصہ رہی ہوں گی۔ مایوسی، ڈر، خوف، احساس عدمِ تحفظ نے ایک نفسیاتی بیماری کی شکل اختیار کر لی ہے۔ حرص نے انسان کو پاگل بنا دیا ہے اور دولت کی ہوس نے انسانوں کو جانوروں کی سطح پر لا کھڑا کر دیا ہے۔ انسان زندگی کو ایک عذاب اور سزا تصور کرنے لگا ہے اور اسے اس سے نکلنے کا اس سے نجات کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا۔ ایٹمی تباہ کاری کا خوف اس کے علاوہ ہے جس نے انسانوں کا سکون اور چین چھین لیا ہے۔ ان تمام جہنمی پریشانیوں کے باوجود آج کا انسان یہ نہیں جان سکا کہ بنی نوعِ انسان کو اپنی لپیٹ میں لینے والی یہ بھڑکتی کچلتی جہنمی آگ پیدا کیسے ہوئی۔ بَدعنوانی اور جرائم اپنی انتہاء کو پہنچ چکے ہیں اور انسان نہیں جان پایا کہ اسے روکا کیسے جائے۔ اسے یہ سمجھ نہیں آرہی کہ امن و سلامتی اور ذہنی سکون کیسے حاصل کئے جائیں۔ واصف نے نثر میں چار کتابیں لکھی ہیں: ''کرن کرن سورج''۔ ''دل دریا سمندر''۔ '' قطرہ قطرہ قلزم'' ۔اور

''حرف حرف حقیقت''۔(ان میں بعد ازاں مزید اضافہ ہوا جب ''بات سے بات'' اور ''گفتگو'' بھی منظرِ عام پر آگئی تھیں۔ ''گفتگو'' کے تواب غالباً بیس حصے شائع ہو چکے ہیں۔ تین شعری مجموعے شب چراغ، شب راز اور بھرے بھڑولے (پنجابی) ان کے علاوہ ہیں)۔ ان کتابوں میں شامل چھوٹے چھوٹے مضامین ہیں جن میں واصف علی واصفؒ نے دورِ حاضر کے انسانوں کو درپیش بیماریوں کا علاج تجویز کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ واصفؔ نے خونِ جگر میں انگلیاں ڈبو کر اور مافوق الفطرت ہنر مندی سے یہ شاہکار کتابیں لکھی ہیں جو اس جدید عہد کے انسانوں کے لئے بڑی موثر اور مفید ہیں۔ ان کتابوں کو ماضی میں صوفیائے کرام اور اولیائے کرام کی ان تصانیف میں شامل کیا جا سکتا ہے جو اسلامی تصّوف پر شائع ہوئیں۔ واصفؔ آنے والے دور میں بنی نوعِ انسان کے محسن و مربی کے طور پر بتدریج بہت بلندی پر جائے گا۔

فصل6۔ ایک درویش دانشور علامہ یوسف جبریلؒ تحریر: شاکر کنڈان:

2001ء میں علامہ یوسف جبریلؒ سے جب میری آخری ملاقات ہوئی تو جناب واصف علی واصفؒ کے چھوٹے بھائی شوکت محمود کنڈان بھی میرے ہمراہ تھے۔ کمرے میں علامہ یوسف جبریلؒ، شوکت محمود کنڈان، شوکت محمود اعوان (پسرِ علامہ یوسف جبریل) اور راقم (شاکر کنڈان) بیٹھے تھے۔ میں صوفے کی ایک سیٹ پر بیٹھا تھا کہ یکایک باتیں کرتے ہوئے علامہ صاحبؒ میری جانب متوجہ ہوئے اور فرمانے لگے۔

''شاکر! جب واصف علی واصفؒ آخری بار مجھے ملنے آئے تھے تو اسی جگہ پر بیٹھے تھے جہاں تم بیٹھے ہو اور مجھے انہوں نے کہا تھا۔ علامہ صاحبؒ! میں تو اپنا کام مکمل کر چکا ہوں اور اب واپسی کا ارادہ ہے تو میں نے انہیں جواب دیا کہ میرا کام تو ابھی تک پورا نہیں ہوا لہٰذا میرا ارادہ فی الحال واپسی کا نہیں ہے''۔

دسمبر 2005ء میں جب شوکت محمود اعوان کا راقم کو ٹیلی فون آیا تو میں نے علامہ صاحبؒ کی خیریت دریافت کی وہ کہنے لگے:۔ یوں تو اللہ تعالیٰ کا شکر ہے وہ ٹھیک ہیں لیکن کچھ دل برداشتہ ہو چکے ہیں اور مجھے بھی اپنے مشن کو آگے بڑھانے سے روک دیا ہے۔ میں نے پوچھا کیا وجہ وہ کیوں نا اُمید ہو چکے ہیں کہا ''مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ ان کی مایوسی ان کی واپسی کا اعلان نہ ہو''۔ مجھے شوکت کی یہ بات سن کر علامہ صاحبؒ سے ایک ملاقات یاد آگئی۔ ان دنوں علامہ صاحبؒ سے ملنا بہت مشکل تھا۔ آپ صبح سویرے گھر سے نکلتے اور باہر کھیتوں کی طرف چلے جاتے پھر واپسی کا پتہ نہیں ہوتا تھا۔ ہم بھی عصر کے وقت بغیر ملاقات کے واپس آرہے تھے کہ علامہ یوسف جبریلؒ آتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ہماری خوش قسمتی تھی اور پھر ان کے ساتھ ہو لئے۔ اس ملاقات میں انہوں نے قائدِ اعظمؒ کے بارے، ان سے اپنی ملاقات کے بارے میں، علامہ اقبالؒ کے بارے میں، گوئٹے کے بارے میں اور لارڈ برٹرینڈ رسل کے بارے میں بہت سی باتیں کی تھیں۔ باتوں کے دوران انہوں نے یہ بھی اشارہ دیا کہ ''رسل کی وفات کے بعد میں اکیلا رہ گیا ہوں'' دراصل علامہ صاحبؒ کے روابطہ دنیا کے بہت سے دانشوروں سے تھے اور وہ ایٹم بم کے خلاف ایک بین الاقوامی مہم کا حصہ تھے۔ 18 جنوری 2006ء کو شوکت محمود اعوان کا اسلام آباد سے ٹیلی فون آیا تو اس نے یہ جانکاہ خبر سنائی کہ ''اباجی (علامہ یوسف جبریلؒ) اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں''۔ مجھے ایک شاک سا لگا۔ میں نے ''انا للّٰہ وانا الیہ راجعون'' پڑھا اور پھر شکایت کی کہ اتنے دنوں بعد اطلاع دے رہے ہو۔ شوکت میرے شکوے کے جواب میں بھرائی ہوئی آواز میں گویا ہوا ''بد قسمتی سے میری ڈائری جس میں تمام ٹیلی فون نمبرز اور ایڈریسز لکھے تھے وہ کہیں کھو گئی اور آج ہی میں دفتر آیا ہوں تو جو نمبر یہاں میرے پاس لکھے تھے انہیں اطلاع دے رہا ہوں'' پھر میرے پوچھنے پر تفصیل بتانے لگے کہ ''اباجی نے وفات سے

تین دن پہلے سب گھر والوں کو اکٹھا کیا۔ مجھے اپنا جانشین مقرر کیا اور ہدایت کی کہ ان کے مشن کو لے کر آگے چلوں۔ سب اہلِ خانہ سے آپ نے معافی مانگی اور سب کے قصور معاف کئے پھر فرمایا کہ شاید آپ لوگوں سے میری یہ آخری ملاقات ہو۔ دوبارہ نہ مل سکوں''۔ ہم نے کہا ''ابا جی اللہ تعالیٰ کا فضل ہے آپ بالکل ٹھیک ہیں'' لیکن انہوں نے کہا کہ ''مجھے بلاوا آگیا ہے''۔ دوسرے دن وہ بے ہوش ہوئے۔ انہیں ہسپتال لے جایا گیا اور اسی نیم بے ہوشی کے عالم میں دو دن بعد بروز جمعرات اپنی جان جانِ آفرین کے سپرد کر دی۔ ''وفات سے پہلے علامہ صاحبؒ نے آنے والے واقعات سے بھی آگاہ کیا تھا کہ ''میری وفات پر بہت لوگ آئیں گے۔ حوصلہ رکھنا ہے اور بعد میں بھی لوگ آتے رہیں گے، ان سے محبت سے پیش آنا ہے اور میرے جانے کے بعد پاکستان اور مسلمانوں پر بڑا سخت وقت آنے والا ہے اور اگر اُنہوں نے پھر بھی مجھ سے استفادہ نہ کیا تو بہت افسوس کا مقام ہو گا لیکن مسلمانوں کو بالآخر یہی کرنا پڑیگا'' اور پھر ہم نے دیکھا کہ جمعرات کے دن واہ کی تاریخ کا سب سے بڑا جنازہ پڑھا گیا۔ اتنے انسان آج تک واہ میں کسی شخص کی وفات پر اکٹھے نہیں ہوئے تھے۔ ''ہم سب حیران تھے کہ ہم تو کسی کو اطلاع بھی نہیں دے سکے تو پھر اتنے زیادہ لوگ ؟ بھائی نے چونکہ کینیڈا سے آنا تھا اس لئے میت مسجد میں رکھی تھی۔ دوسرے دن بروز جمعۃ المبارک پہلا جنازہ پڑھا گیا اور اس دن بھی جنازہ گاہ میں تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ محلے کے مکینوں نے ہمارے ساتھ اتنا اچھا برتاؤ کیا کہ باہر سے آئے ہوئے مہمانوں کو دو دو، تین تین، چار چار، اپنے ساتھ لے گئے اور ہمیں محسوس تک بھی نہ ہو سکا کہ باہر سے جو لوگ آئے تھے ان کو کیسے سنبھالا گیا۔ ہفتے کو تمام سوگواروں کے درمیان سے میت کو لے کر دوسرا جنازہ بروز ہفتہ کو پڑھایا گیا اور پھر دفن کر دیا گیا۔ میں نے دوبارہ '' انا للّٰہ وانا الیہ راجعون ''پڑھا۔ علامہ مرحوم کیلئے دعا کی اور شوکت کو صبر کی تلقین کی۔ اس سے زیادہ بھلا میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ ٹیلی فون بند ہوا تو میرے لبوں پر یہ شعر آگیا۔

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لئے

اور پھر یادوں کا ایک ریلا سا بہہ نکلا جب بھی دوستوں سے علامہ یوسف جبریلؒ کے بارے میں بات ہوتی تو میں کہتا تھا کہ علامہ صاحبؒ جب انگریزی میں بات چیت کرتے ہیں تو سنتے رہنے کو جی کرتا ہے۔ اُردو اور پنجابی وہ اس روانی سے نہیں بول سکتے۔ اسی طرح ان کی انگریزی کی تحریروں میں جو ایک بہاؤ ہے وہ اُردو میں نہیں پھر یہ کہ ان کی بات چیت میں دانشوری ہوتی ہے۔ اسلام کی باتیں ہوتی ہیں۔ قرآن کی باتیں ہوتی ہیں۔ شوکت محمود اعوان سے جب بھی ٹیلی فون پر بات ہوتی یا ملاقات ہوتی تو دیر تک علامہ صاحبؒ کے بارے میں گفتگو ہوتی۔ میں جب بھی میجر امیر افضل (حضور ﷺ کا سپاہی) سے ملا تو علامہ صاحبؒ ضرور ہماری گفتگو میں موجود رہے۔ ان کے بغیر بات مکمل ہی نہیں ہوتی تھی۔ میں جن دنوں ''اُردو ادب اور عساکرِ پاکستان'' کی تیسری جلد پر کام کر رہا تھا تو پہلی بار مجھے علامہ یوسف جبریلؒ کو کھوجنا پڑا کیونکہ علامہ صاحبؒ بھی عسکری خدمات انجام دے چکے تھے۔ 1935-38ء میں آپ انڈین اور برطانوی فوج میں شامل رہے اور دوسری عالمی جنگ کے دوران جب بغداد میں مقیّم تھے تو ایک دن آپ نے صبح کی پریڈ پر گورکھا ٹوپی پہننے سے انکار کر دیا۔ ہوا یوں کہ اس رات آپ نے خواب میں دیکھا کہ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ فرما رہے ہیں ''محمد یوسف تمہاری تخلیق کا مقصد یہ تو نہیں اور نہ ہی یہ تمہارا فرض ہے۔ تمہیں تو کسی اور کام کیلئے پیدا کیا گیا ہے جسے تم چھوڑ بیٹھے ہو''۔ صبح آنکھ کھلی تو دل کی

کیفیت بدل چکی تھی۔ روح پر جو بوجھ مدتوں سے محسوس ہو رہا تھا اتر چکا تھا اور پھر سپاہی محمد یوسف نے نہ سر پر ٹوپی رکھی اور نہ ہی اپنے سینئر کو سیلوٹ کیا۔ بات کمانڈنگ آفیسر تک پہنچی۔ پیشی ہوئی اور آپ نے صاف انکار کر دیا کہ ''اب میں انگریز کی وردی پہنوں گا نہ ہی غلامی کی یہ زندگی گزاروں گا'' اور پھر بات یہاں تک پہنچی کہ جو ہاتھ انگریز کیلئے بندوق اٹھائے پھرتے تھے وہ کمانڈنگ آفیسر کے گلے تک پہنچ گئے۔ آپ کو کوارٹر گارڈ میں بند کر دیا گیا اور بغاوت کا کیس بنا۔ کہاں ایک سپاہی اور کہاں ایک ایسی حکومت کے خلاف بغاوت جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ان کی راجدھانی میں سورج نہیں ڈوبتا تھا۔ اس پابندی کا سپاہی محمد یوسف کو یہ فائدہ ہوا کہ مطالعہ کو معمول بنالیا۔ اتنا وسیع مطالعہ کہ اُردو، انگریزی، عربی اور فارسی زبانوں پر عبور حاصل کیا۔ آپ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ''میں نے اُردو میں ولی دکنی سے اقبال تک، فارسی میں رودکی عنصری تک، انگریزی میں چاسر سے شیلے اور چارلس ڈکنز تک، عربی میں عنتر شداد کے قصائد تک بلکہ توریت، زبور، انجیل (انگریزی میں) پڑھ ڈالیں اور قرآنِ مجید کا خصوصی مطالعہ کیا'' اور پھر ایک وقت آیا کہ سکول سے نہم جماعت پڑھ کر بھاگ جانے والا محمد یوسف، یوسف جبریلؒ بن گیا جسے پنجاب یونیورسٹی نے اعزازی ایم اے کی ڈگری سے نوازا۔ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی لاہور میں پی ایچ ڈی کا تھیسز بھی جمع کروایا لیکن ڈگری حاصل نہ کی یہ بھی ایک روحانی مسئلہ تھا۔ جب شوکت محمود سے علامہ صاحبؒ کی وفات کی خبر سنی تو فوری تاثر سے باہر نکلتے ہی قلم کاغذ لے کر بیٹھ گیا اور پھر کوئی یاد کہیں سے آئی اور کوئی کہیں سے ان میں تسلسل نہیں تھا ایک جمگھٹا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ علامہ یوسف جبریلؒ نے میری حمد گوئی اور نعت گوئی پر ایک مضمون روزنامہ نوائے وقت میں لکھا تھا۔ جس کا عنوان تھا ''پاک فوج کا افسر کپتان شاکر کنڈان آسمانِ نعت گوئی اور حمد گوئی کے ہجوم میں ایک درخشاں ستارہ'' میں ان دنوں راولپنڈی میں عسکری خدمات انجام دے رہا تھا اور یہ میرے لئے بہت بڑا اعزاز تھا۔ بعد ازاں یہ مضمون ان کی کتاب ''علوی اعوان قبیلہ مختصر تعارف'' میں شامل ہوا۔ تو بہر حال میں بات کر رہا تھا ان کی سزا کی تو بغاوت کے اس کیس میں انہیں موت کی سزا سنائی گئی لیکن بعد میں حکومتِ برطانیہ نے حکم نامہ جاری کیا کہ سپاہی محمد یوسف کی موت کی سزا ختم کر دی جائے''۔ دراصل لندن میں بیٹھے ہوئے برطانوی حکام کو یہ خدشہ ہوا کہ اگر اس شخص کو سزائے موت دی گئی تو فوج میں بغاوت پھیل جائے گی۔ بغداد میں قید کاٹی اور پھر واپس ہندوستان بھیج دیا گیا لیکن اس سپاہی نے تو غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کا عہد کر لیا تھا سو انہیں توڑ کر دم لیا۔ میری نظروں میں اینی میری شمل اور علامہ یوسف جبریلؒ کے درمیان ہونے والے مناظرے کی رپورٹ گھوم گئی۔ جو 1963ء میں Pakistan Times میں شائع ہوئی تھی۔ اینی میری شمل نے دعویٰ کیا تھا کہ ''قُرآنِ حکیم الہامی کتاب نہیں ہے'' اور اس سلسلے میں مصر کی یونیورسٹی کے علماء کو وہ لاجواب کرنے کے بعد پاکستان میں آئی تھی۔ یہاں بھی اس نے اپنے دلائل سے بڑے بڑے علماء اور دانشوروں کو زچ کر دیا تھا کہ علامہ علاؤالدین صدیقیؒ کی نظر علامہ جبریلؒ پر پڑی اور انہیں دعوت دی جب بات چیت شروع ہوئی تو انہوں نے قُرآنِ مجید سے ایسے دلائل پیش کئے کہ اینی میری شمل کو سچ ماننے کے علاوہ کچھ نہ سوجھ پایا اور وہ جس نے دو گھنٹے بعد لاہور سے دہلی روانہ ہونا تھا وہ چند گھنٹے بعد لاہور سے جرمنی کے لئے روانہ ہو گئی اور پھر سالہا سال کے بعد پاکستان آکر اپنی ہار کو تسلیم کیا۔

علامہ یوسف جبریلؒ کو جن لوگوں نے دیکھا ہے وہ ان کے لباس سے بھی خوب واقف ہیں۔ آپؒ عموماً سفید کھدر کا کرتہ اور لٹھے کی سفید شلوار پہنا کرتے تھے۔ سر پر پگڑی باندھتے تھے اور عام دیسی جوتا پاؤں میں ہوتا تھا۔ چونکہ ساری زندگی محنت مزدوری میں گزاری اس لئے صفائی ستھرائی کا اتنا

زیادہ اہتمام نہیں کرتے تھے پھر یہ کہ آپؒ تو کسی اور مشن کے لئے کام کر رہے تھے۔ایک درویش منش شخص تھے۔ فقر آپؒ کی روح میں گھر کر چکا تھا اور فقیر لوگ ان ثانوی چیزوں کی طرف کہاں توجہ دیتے ہیں۔

1968ء میں روٹری کلب اسلام آباد کے زیرِ اہتمام شہر زار ہوٹل میں پاکستان میں مقیم بین الاقوامی سفیروں سے خطاب کے لئے آپ کو دعوت دی گئی۔ جب آپؒ وہاں پہنچے تو انتظامیہ میں سے کسی نے کہا۔

''علامہ صاحبؒ! آپؒ اگر سوٹ پہن کر تقریر کریں تو سامعین پر اچھا اثر پڑے گا''۔ لیکن آپؒ نے جواب دیا کہ اگر تقریر سوٹ نے کرنی ہے تو آپ نے تھری پیس پہن رکھا ہے اسے کہیے کہ تقریر کرے میں جا رہا ہوں۔ بہر حال آپؒ کو راضی کیا گیا تو آپؒ نے اپنے خطاب کے لئے ''قُرآنِ حکیم اور ایٹمی سائنس'' کا موضوع منتخب کیا اور جب تقریر ختم ہوئی تو سب سے پہلے روس کے سفیر نے سٹیج پر آکر آپؒ سے مصافحہ کیا اور کہا:۔

Thank you gentleman i have heard most thought provoking lecture in my whole life.

پھر امریکی سفیر نے مصافحہ کیا اور ایسے ہی الفاظ دہرائے۔ یوں باری باری تمام سفیروں نے آپؒ سے ہاتھ ملایا اور خوشی کا اظہار کیا بلکہ کئی ایک نے تو کہا کہ ''ہم پہلی دفعہ قرآن کو اس انداز میں سمجھے ہیں''۔

مجھے یاد آرہا ہے کہ ایک دفعہ آپؒ کو پاکستان ٹیلی ویژن پر گفتگو کے لئے بلایا گیا۔ آپؒ کی خودداری کا ایک عجیب عالم تھا اور آپؒ اس پر حروف نہیں آنے دیتے تھے۔ آپؒ کو Ptv کے waiting room میں بٹھایا گیا۔ جب آدھا گھنٹہ گزر چکا اور گفتگو کا بندوبست نہ ہوا تو آپؒ واپس چلے گئے۔ علامہ یوسف جبریلؒ کو ایک لکھاری کی حیثیت سے جب دیکھتے ہیں تو ان کی شخصیت میں ایک مفسر، ایک مورخ، ایک نقاد، ایک افسانہ نگار، ایک سیرت نگار، ایک مضمون نگار اور ایک شاعر ہمیں ملتا ہے مزید یہ کہ آپؒ کے اندر ایک مبلغ، ایک مقرر، ایک عالم ایک مناظر اور وقت کا ایک بہت بڑا دانشور چھپا بیٹھا تھا۔ بد قسمتی یہ کہ ایک مزدور سے زیادہ آپؒ کو کوئی اہمیت نہ دی گئی اور اس پر طرہ یہ کہ آپؒ کی خودی نے کبھی آپؒ کو جھکنے نہ دیا۔ کئی حکمرانوں نے بھی آپؒ کو بلوایا لیکن آپؒ نے ان سے ملنا گوارا نہ کیا۔ آپؒ کی تحریریں Bulletin of the atomic scientist جیسے بین الاقوامی رسائل میں شائع ہوتی تھیں۔ آپؒ نے چودہ جلدوں میں قُرآنِ حکیم کے لفظ حطمہ کی انگریزی تفسیر لکھی اور اتنی ہی جلدیں اُردو میں لکھیں۔ Mind of the Quran بھی لکھی لیکن یہ تمام کام آپؒ کا غیر مطبوعہ ہے (اب اُن کی دو جلدیں امریکہ میں انگریزی زبان میں شائع ہو چکی ہیں جن میں اُن کی تحریر شدہ چودہ جلدیں شامل کی گئی ہیں) جبکہ مضامین اور مقالات اَن گنت ہیں۔ آپؒ کی جو کتب شائع ہو سکیں وہ بھی آپؒ کے بیٹے شوکت محمود نے ہی شائع کرائیں (البتہ اب علامہ صاحبؒ کی کتب کی اشاعت کیلئے ادارہ کی تشکیل ہو چکی ہے) جن میں سے چند ایک جو میرے پاس موجود ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

۱۔ بیکن، دجال، علامہ اقبال، امام مہدی، ابراہیم اور ایٹمی جہنم (فلسفیاتی نظریات) کا تقابلی مطالعہ۔ ۲۔ یہودیت، عیسائیت اور اسلام کا تقابلی جائزہ۔ ۳۔ قُرآنِ حکیم اللہ کی الہامی کتاب نہیں ہے؟ ۴۔ علوی اعوان قبیلہ۔ مختصر تعارف۔
۵۔ ایٹمی آگ کی تشریح۔ ۶۔ نعرۂ جبریل۔

Gabriel's Islamic Bom- Quran Predicts Atomic Hell and averts it -Quran phenomenally characterizes the atomic hell.

نعرۂ جبریلؒ آپؒ کا شعری مجموعہ ہے، جس میں ان کی چند طویل نظمیں شامل ہیں۔ان کے بارے صرف دو مشاہیری آراء کافی سمجھتا ہوں۔ ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں ''اندازِ فکر علامہ اقبالؒ کا سا ہے اور ایک لحاظ سے کلام اُنہی کی آواز کی صدائے بازگشت ہے۔ شاعر نے جس نصب العین کو پیشِ نظر رکھ کر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ خداوندِ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ اس کے حصول کے لئے امکانات پیدا ہو سکیں''۔

علامہ علاؤ الدین صدیقیؒ نے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا تھا: ''آپؒ ایک درد مند قومی مفکر ہیں جنہوں نے اُردو اور انگریزی میں اپنے خیالات کو قلمبند کیا ہے۔ مجھے آپؒ کی کتاب نعرۂ جبریل کے کچھ حصے سننے کا اتفاق ہوا۔ اشعار درد سے معمور ہیں''۔

علامہ یوسف جبریلؒ 17 فروری 1917ء کو موضع کھبیکی (وادیِ سون سکیسر) تحصیل خوشاب ضلع شاہ پور (بعد ازاں سرگودھا اور حالیہ خوشاب) میں پیدا ہوئے اور تقریباً 89 سال اس عالمِ رنگ و بو میں گزار کر دل میں ایک تڑپ، ذہن میں ایک سوچ اور روح میں ایک مقصد اور لگن لئے 5 جنوری 2006ء کو اپنے دائمی سفر پر روانہ ہو گئے۔ آپؒ کے شعری مجموعہ ''نعرۂ جبریل'' سے چند اشعار ان کے اندر کے انسان سے آگاہی کے لئے نذرِ قارئین ضروری سمجھتا ہوں۔

دہر ہے فتنہء دجال کی جولائی پہ
دور نازاں ہے زمانے کی فراوانی پہ
عصر رقصاں ہے نئے علم کی ارزانی پہ
اور ہنستا ہے فلک دور کی نادانی پہ
برق بے تاب ہے اس گھر کو جلانے کیلئے
خرمنِ ہستیِ آدم کو مٹانے کے لئے

نظم گلبانگ صدارت سے دو بند دیکھئے:

طاغیا ! تری رعونت کو کچل ڈالوں میں
پائے انصاف و عدالت میں مسل ڈالوں میں
کیوں نہ اس کیشِ تکبر میں خلل ڈالوں میں
کیوں تری گردنِ سرکش میں نہ بل ڈالوں میں
فرقِ ظالم پہ جو شمشیرِ برندہ بن جاؤں
خرمنِ ظلم پہ اک برقِ جہندہ بن جاؤں
میں فقط حسرتِ گفتار کا غازی ہی نہیں
میں فقط حکمت و تفسیر کا رازی ہی نہیں

میں فقط مسجدِ اقصیٰ کا نمازی ہی نہیں
دردِ ملت میں فقط اشک بازی ہی نہیں

وقت آنے پہ بڑے شوق سے مر سکتا ہوں
میں جو کہتا ہوں زباں سے تو وہ کر سکتا ہوں

اسی طرح نعرۂ جبریل کی دیگر نظمیں بھی ہمیں اپنے اسلامی تشخص، قومی و ملی المیے، دشمنانِ اسلام کے رویئے پر سوچنے کا موقع بھی دیتی ہیں اور جذبات واحساسات میں ایک آگ بھی بھڑکاتی ہیں جس میں زندگی کی دعوت ہوتی ہے۔

علامہ یوسف جبریلؒ جو آج فزیکلی ہم میں موجود نہیں ہیں لیکن انکی تحاریر ان کے ہونے کا احساس صدیوں تک دلاتی رہیں گی۔ وہ اپنی تحریر، فکر اور سوچ کے حوالے سے ہمارے درمیان اور آنے ولی نسلوں کے درمیان موجود رہیں گے اور جب بھی اسلامی سوچ ابھرے گی تو اس میں ایک نیا ولولہ اور جوش پیدا کرتے ہوئے دکھائی دیں گے۔

فصل7:

WASIF ALI WASIF, By ALLAMA MUHAMMAD YOUSUF GABRIEL:

It was the year 1962, or so, and I used to walk from my residence in Shahdarrah , Lahore where I resided, to the Shah Chiragh Building in Lahore where I worked in the Department of Auqaf, West Pakistan as Research Investigator, and then used to walk back to Shahdarrah daily. On my way back from Shah Chiragh Building stood the Lahore English College whose founder Principle was Wasif Ali Wasif. I do not remember how but one day I found myself with Wasif Ali Wasif. Thereafter it became my daily routine to visit Lahore English College on my return from Shah Chiragh Building. There I would find a small literary company generally engaged in some literary discussion. I had composed some poetry in Urdu comprising about three thousand verses, about which Dr. Javed Iqbal, the son of famous Allamah Iqbal expressing his critical review had said :-

"The style of thought is exactly like that of Allamah Iqbal. In a way it appears to be the echo of Allamah Iqbal. I pray to Allah that the possibilities for the achievement of the purpose which the poet has aimed at while expressing his views may appear".

The purpose, I aimed at in my poetry was the establishment of the Kingdom of Heaven in this world, and world's escape from the dreadful hazards and the consequent ills of this materialistic and unspiritual civilization. And peace, prosperity, and contentment every where. There in Lahore English College I was generally asked to recite some of my poetry, and whenever I recited my poetry, Wasif was deeply moved. The pattern of my poetry may be viewed in the following stanzas:-

دیکھ ! آزادیٔ دنیا کی ہوائیں آئیں
تیری بہبود کے پردے میں بلائیں آئیں
جھومتی مادہ پرستی کی گھٹائیں آئیں
بجلیاں کفر کی الحاد کی چھائیں آئیں
یہ چڑیلیں ہیں جنہیں تو نے پری سمجھا ہے

یہ تو ریلیں ہیں جنہیں طیرِ بریں سمجھا ہے
دہر ہے فتنۂ دجال کی جولانی پہ
دور نازاں ہے زمانے کی فراوانی پہ
برق بیتاب ہے اس گھر کو جلانے کے لئے
خرمن ہستی ء آدم کو مٹانے کے لئے

☆☆☆

Loosely rendered into English these will read as follows:-
(1) The clouds of material worship gather. See the winds of worldly freedom blow. Lightenings of atheism and shadows of heresy appear. Woes are that appear in the guise of blessings. Witches you mistake for fairies.Crows and vultures are that you take for the lovely partridge.
(2) The deception of the simulating Anti-Christ is at its height in the world. Mankind is proud of the worldly abundance of this age, and is dancing with joy at the great prevalence of knowledge. Yet the heavenly judge does scorn their folly. Lightening is restless to consume this world, in order to annihilate the existence of mankind".

The mind of Wasif was affected by my poetry and my talks, and his genius took fire. I left Lahore. Wasif had found a line and a purpose in my discussions. Soon a storm of intellect rather supernatural intellect burst upon his mind and I received a very long poem composed and published by Wasif in Urdu. Wasif had completely followed my views. Four books in Urdu prose followed in succession. A wonderful product of Wasif's mind, but the pattern of his views was the eaxt replica, a real piciture of my views. There is no wonder if the views of Wasif and mine have assumed identity. The storm which had burst upon my mind and had become the cause of the appearance of fourteen volumes in English and an equal number in Urdu had in turn burst upon the mind of Wasif and had caused this appearance of his very valuable four volumes in Urdu and some good poetry. Writings very much needed by the people of this age in distress. Wasif had enough academic education but I had without a teacher or a school learned both the ancient and the modern knowledge, that is four languages, and their literatures, Urdu, Persian, Arabic, English, to the highest standard, the books of Divine Revelation, namely, the Quran, the Books of the Old Testament, the books called Apocrypha, and the books of the New Testament, histories, philosophies and most of the branches of modern science ,and at last as the product of all that struggle appeared all the hitherto unpublished volumes that are meant to save this world from the hazards of this modern culture of atomism, to establish the kingdom of heaven on earth, before the appearance of atomic war, and to eradicate the possibility of atomic war. My ordeal lasted for forty years, and all- these years I spent in a state almost like that of a man possessed. It was a very painful ordeal and still is. The writings of Wasif may rightly be regarded as the echo of my views, just as the son of Iqbal had called my Urdu poetr y as the echo of Iqbal's voice. My Urdu poetry only. No wonder if Wasif had produced the works which may well be considered as miraculous. Among the writers in this world whose writings will cause the universal revolution to liberate the mankind from the calamities of the modern materialistic, one sided culture, surely the name of Wasif will deserve respect and reverence. No doubt in a state of mind produced by a sort of a celestial storm, Wasif produced writings which do appear as the product of some supernatural intellect. A line, however, has been established between my writing and those of Wasif, and my views and those of Wasif.

A link has been established between the works of Wasif and those of mine, namely that under my influence Wasif became inspired and consequently a celestial storm of intellect burst upon his mind and he produced the works that cast a spell on the reader. Wasif has heartily acknwoledged such influence. He has

devoted the preface of his book KIRAN KIRAN SURAJ to his acknowledgement of the favour of SAHIBAN-E-HAAL and the description of the SAHIBAN-E-HAAL.SAHIBAN-E-HAAL is a term that means loosely the persons that may be called as the Muslim saints or WALIS. About his book, writes Wasif:-

"These are a few petals of the spiritual rapture, that are picked from the garden of mysticism, and by these the achievement of the reform of the thought is possible. "It is all due to the favour of someones glance (attention)". It is not my claim but is only the expression of faith in those SAHIBAN-E-HAAL by whose nearness the word of desire (request) becomes the word of content.What is SAHIB-E-HAAL? It is very difficult to explain".

Yet Wasif tries to explain SAHIB-E-HALL. And devotes three pages to the explanation of the characteristics etc. of the SAHIB-E-HALL. He tells that the nearness of SAHIB-E-HALL produces the quality of HAAL (the state of reverie and ecstasy) just as the nearness of fire produces the quality of fire in a piece of iron. And this was exactly the case between me and Wasif. No doubt, the explanation of the SAHIB-E-HALL by Wasif is admirable and full of valuable information. Regarding his faith in the SAHIB-E-HALL he writes:-

"I am presenting this book as the expression of my faith in the Sahib-e-Hall. The virtue therein is their's, the flaw is due to my human infirmity".

The preface of his another book, DIL DARYA SAMUNDRAR Wasif has devoted to the universal scenes that are seen by the discerning eye.

"In the seed of mustard" , writes he " may be seen the scenes of the entire universe".

The preface, all of it is very interesting and very instructive. About the relation of the disciple and the master, Wasif in his book, KIRAN KIRAN SURAJ on page 99 writes:-

"It is the sincerity of the faith of the disciple that carries him to his destination. If he is fortunate to reach his destination, then what is the doubt in the perfection of his Master.If on the other hand, the disciple would not reach the destination, then what is the necessity of mentioning the Master's perfection or imperfection. The Fortunate disciple always remains grateful to his Master, but the unfortunate disciple always puts the blame on his master for his own infirmity".

In my gruesome endeavour and unabounding zeal to save this world from the dreadful end in the flames of atomic hell, I myself fell in hell since decades when I began my mission, though I never left the patience and never complained. In that state of my mind, I saw one day, Wasif himself standing before me.He had come from Lahore to see me. You cannot imagine the state of my inward feelings at that meeting. Joy and Sadness joined together, though I was much pleased to see Wasif. In Wasif's face could be seen the signs of extreme sadness but a peculiar kind of sadness. He spoke very little. All the time he remained with me, he lay on a bed gazing continually towards the roof. Then he departed never to be seen again. Soon after that he died. I read the news of his death in the News -papers. The news made me extremely sad. Alas then. Wasif had come to pay his last visit to me before his departure. There was in his eyes a tinge of some request, some desire, some expectation, which I could not understand during our meeting. But when I heard the news of his death, the fact was exposed to me. He had wanted my blessings like a disciple who has done his work, and expected the blessings of his Master. And I blessed him. And also after I heard the news of his death, and I recalled to my mind the features of his face, the mode of his talking and something clandestine in his eyes, when he met with me during his visit, I realized, that all that was due to the inward premonition about his approaching death, and the feeling of sadness for leaving me which prevailed upon his mind. May Allah bless you and your work, my dear Wasif .May Allah accept your labour and grant you a favourble place in Heaven.

Wasif as I found him was, sincere, and friendly. He was simple, though had a deep sense of self respect. He was honet, truthful, pure, shining. Nature had bestowed him with great excellence of mind and had granted him very keen intellect. It was difficult to judge from his elegant appearance that a Dervish sat within him. I saw in him a pragon of humanity. Things like rancour, enmity, jealously, slander had no place in his heart. He was pure gold, and well deserved the place he was ordained in the world of mystic writings and humanity.

Mankind today is in great distress inspite of plenty of facilities provided by the scientific material progress. There is no contentment. Selfishness prevails in an atmosphere of mutual mistrust and distrust and hatred. Blood relation has lost its meanings, and faith has lost its strength in human mind. Moral and spiritual values are regarded as the things of the past and un-necessary.Dismay, depression, fear, sense of no personal safety have reached the mark of psychological ailment. Maddening greed and the necessity of wealth have changed the men into animals. Man today considers the life as a course of torture and punishment, and finds no way out of it. The fear of the painful atomic hazards are besides. And despite all these hellish troubles man of today does not know the causes that have produced such a braying, burning hell for the mankind. Corruption and crime are reaching the highest point, and man does not know how to stop all this, and how to find peace and peace of mind.

Wasif has written four books, namely, KIRAN KIRAN SURAJ, and DIL DARYA SAMUNDER and QATRA QATRA QULZAM and HARF HARF HAQIQAT. In these books he has given writings in which may be found the remedies for the maladies of the present-day mankind as are given above. These marvellous works which Wasif has written with the blood of his heart, and with supernatural skill are specially suited to the mankid of this modern age, and are effective, and may well be included in the list of the great books of Islamic mysticism written by great Islamic sages of the past ages. Wasif will gradually rise as agreat benefactor of humanity.

And now at last let us sing a very prescient and popular song of the past age with Wasif, which Wasif has quoted, in his DiLL DARYA SAMUNDER page 239, namely:-

آ چنوں رل یار
پیلوں پکیاں نی وے
آئیاں پیلوں چنن دے سانگے
اوڑک تھئیاں فریدنؔ وانگے
چھوڑ آرام قرار
ہکیاں بکیاں نی وے
آ چنوں رل یار
پیلوں پکیاں نی وے

Fasal 8: WASIF ALI WASIFB (2) Y ALLAMA MUHAMMAD YOUSUF GABRIEL

It was in a year in sixties after 1962,1964, that by chance I met Wasif Ali Wasif. I was a research investigator in the service of West Pakistan Auqaf Department Lahore, and walked daily from Shahdarrah to my office in Shah Chiragh Building, and then walked back to Shahdarrah where I lived. A little distance from Shah Chiragh on my way was situated the Lahore English College, run by Wasif Ali Wasif. I do not remember how, but one day coming back from Shah Chiragh I found myself in the Lahore English College where I met Wasif. I found him very sweet, very sincere, endowed with remarkable excellence of a mind, and endued with strong and keen intellect, very friendly a friend in need.In short to me he appeeared something like a paragon. And thereafter it became my routine to visit Lahore English College on my return from Shah Chiragh, where in a room,that is a room in Shah Chiragh Building, still stood a writing on a blackboard written some years

ago by the hand of Allamah Allauddin Sdiddiquee, who perhaps used to deliver honorary lectures to some partciular audience there.

There in Lahore English College of Wasif, I found a small literary circle, engaged every day in some literary discussion. In those days I had composed poetry and was very zealous about that. It was a poetry about which Dr. Javed Iqbal, the son of famous Allamah Muhammad Iqbal, had given a written review which read, "The style of thought is like that of Allamah Iqbal. In a way it appeas as echo of Allamah Iqbal.The purpose for which the poet has expressed his views, it is my prayer to Allah, that the possibilities of its achievement might appear". I also was generally asked in Lahore College to read my poetry, and I complying with their wish, would read some part of my poetry. And whenever I read my poetry Wasif appeared as if he was lost in a reverie. My poetry was based on a particular purpose whose ultimate end was to save this present mankind from the dreadful materialistic end which overshadows its future.My poetry was aimed at human reform, to curtail the miseries of mankind in this world and to provide a better futur in the next world after death. And when for example I read the following passages from my poetry, the agitation of Wasif's mind could well be read in his face.

دیکھ ! آزادیٔ دنیا کی ہوائیں آئیں
تیری بہبود کے پردے میں بلائیں آئیں
جھومتی مادہ پرستی کی گھٹائیں آئیں
بجلیاں کفر کی الحاد کی چھائیں آئیں
یہ چڑیلیں ہیں جنہیں تو نے پری سمجھا ہے
یہ تو ریلیں ہیں جنہیں طیرِ بریں سمجھا ہے
دہر ہے فتنۂ دجال کی جولانی پہ
دور نازاں ہے زمانے کی فراوانی پہ
برق بیتاب ہے اس گھر کو جلانے کے لئے
خرمن ہستی ء آدم کو مٹانے کے لئے

☆☆☆

Loosely rendered in English these verses would appear as follows:-
"In the gathering clouds of materialism blow the winds of worldly freedom amidst the lightenings of atheism and the shadows of infidelity. Calamities and woes in the guise of your welfare.The witches indeed they are that you take them as a bewitching fairy. Ravens and vultures are these that appear in your sight like a lovely pheasant. The deception of the stimulant Anti-christ is at its height in the world.The mankind is proud of the worldly abundance of this age, rejoicing at the universal prevalence of knowledge in these days.But the heavenly judge scorns their folly.Lightening is restless to consume this house, in order to annihilate the existence of humanity. Would to God, I see the benediction of Islam in this age of darkness. Would to God I see the lock on the door of infidelity.And see this world illuminated by the heavenly light of Islam.And see the mantle of honour on the shoulders of Gabriel. This prayer has issued from my lips at midnight.It depends now on the Mercy of God to accept it, whenever it has been issued.

The verses quoted above have been quoted at random. There is no speciality about them. The whole of my poetry was equally appreciated by the audience.It indeed did work on the mind of Wasif.And his ready mind was ignited.He had found a line and a purpose.Soon his mind began to give production. I left Lahore. After some time I received a book containing a very long and forceful poem in Urdu composed by Wasif Ali Wasif.The book is not with me now.But Wasif's line and purpose was the same as was mine.That was the tree that I had planted.It produced excellent fruit.

Afte that I received Wasif's works one after the other at intervals. One of them contained a note of dedication written by the hand of Wasif himself. Years after that one day I found Wasif before me. He had come to see me.He also brought one of his works for me.All the time that he was with me he lay on the bed gazing continually upwards towards the roof, and talking very little.There was a sadness in his face as if he knew that he had come to say last good-bye to me.He returned to Lahore. It was his last meetng with me. After some time he died. His heart must have wept at the state of my affairs when he met me. My dear Wasif with whom I had no contact after I left Lahore.I had contact with no body all those years. I was myself engrossed in my painful intelectual, religious, scientfic, philosophical ordeal in an endeavour to save this world from the tragic end in the flames of Hotama that is the atomic hell.In my efforts to save others from the atomic hell, I found myself encompassed by the tortures of atomic hell.

The people of Lahore had recognized Wasif's merit. At times, I read about him in the Newspapers, and even therein. I do not know how Wasif met his end.How were his last days of life passed on earth. But I had seen in Lahore that last days of two famous men. One of these was Salahuddin Ahmad, the well known patron of Urdu.With a view to having some help for the publication of my urdu poetry, I went to see him.And there I saw an old man of majestic appearance sitting in a shop of books.The bundles and bundles of books lay around him.Holding a book in his hands his mind appeared to be somewhere else.His sight looked forlorn.And when standing before him I made a request of his help.Then without looking towards me or making a movement his lips moved, and I heared the word "no" that was steeped in agony. I left him and he sat in the same posture which I remember even to this day. His "no" was an eye opener to me. It was the "no" of a person who had realized the end of fame, name and zeal. Indeed he had recognized the truth.He was in a state where, this world was disappearing and the next world was appearing before the eye of his mind. I deeply felt for him, but could not forsake my own path.I was bound to move on the thorns towards my object, that was the destination of mankind and the destiny thereof.The other man was well known Dr. Sayid Abdullah also a great patron of Urdu. During my last days in Lahore, I happened to visit the Punjab University and there I passed by the room in which Dr. Sayid Abdullah sat on a chair with his back to the door.He sat there motionless in a way, that to me his head, and neck and the upper part of his chest appeared just like the back of a burst of a statue kept in the chair.So deeply engrossed was he in some point of philosophy. I stood gazing at this posture of the respectable Sayid Abduallh for a time and I silently left. I could not have dared to disturb him in his reverie.That also was the last sight of my most respected Sayid Abdullah. I left Lahore and years after I read the news of great Sayid Abdullah death in the news papers. Love and honours were bestowed on him. About my dear Wasif, I used to read in the papers, and feel a sense of gratitude towards the people of Lahore who treated Wasfi with respect, but the real situation and the actual state of the mind of such sensitive souls, paritcularly in their last days of their lives is known either to themselves or to Allah. How Wasif lived in his last days, and in what state of mind he died is known only to Allah.May Allah grant him a place in paradise. He left as a product of his mind a treasure invaluable of the wisdom of the Muslim of east in his books.Wasif lived a very pure life.He was a truthful man.His mind, soul and self were all pure and shining. He was a true friend. He was simple, innocent and had a very friendly demeanor.In short he was bestowed with abound excellence.His writings could be called as essays.This world has seen many great essayists, but the essays of Wasif have their own distinctive quality that could be easily differentiated fromthe works of other stalwarts.

Wasif had written four books in Urdu prose.Their names are DIL DARYA SAMUNDER and KIRAN KIRAN SURAJ, and QATRA QATRA QULZUM and HARF HARF HAQIQAT. All these are

wonderful works and marvellous, having a touch of mysticism, and judging from the merit of these works.It will not be a miss to say that these works could be placed in the line of great Islamic mystic writers of the past.Numerous topics are treated therein, and truths are revealed.Treasuries of knowledge and wisdom are dispersed like gems and jewels.Remedies for the ills of human mind are suggested.The writer appears to be a man inspired, and the writings cast a spell on the reader. Adage after adage, mostly coined by the writer himself, and the metaphors, allegories, and parables appear in sparkling brilliance, to illustrate the reality of ethics, religion, philosophy, and the good both of this present world and the other world.The temporal and the spiritual, the real and the illusive are discussed, all in the eastern set up in an eastern atmosphere, in eastern and islamic mode of thought, never loosing sight of the past islamic cultur.The writer has treated hard facts and cruel realities that lead to the ultimate reaity in a manner that the reader never feels the hardness or cruelty of the facts and realities.

The line of thought basically is the same as mine.Spiritual feelings, sincerity, contentment, peace, honesty, the safety and welare of humanity and indeed the preference of revealed religion comandments to the man made statues.During my meetings with Wasif, his intellect was ignited, and when I left him, a storm of intellect burst upon his mind, and he produced as the product of his mind four illustrious books.Wasif who had no malignity and no jealousy, and was sincere and truthful deserved it.I myself underwent the similar experience.After a thirty years storm in which I acquried universal knowledge, ancient and modern religionus and secular, scriptural and scientific without a teacher or aschool, the storm for ten years afterwards assumed a maddening fury during which period I wrote fourteen volumes in english and eual number in Urdu in an endeaovur to save this world from thefalmes of the atomic hell, in this present transient world and the next eternal world.

فصل 9۔ کرن کرن سورج، تحریر علامہ محمد یوسف جبریلؒ:

حضرت واصف علی واصفؒ کسی تعارف کے محتاج نہیں۔انہوں نے اپنی زندگی میں ''دیرینہ محبت کا تازہ اظہار'' کے ریمارک کے ساتھ بہ کمال مہربانی ایک نسخہ مجھے واہ کینٹ کے ایڈریس پر بھیجا۔ میں نے کتاب پر ایک نظر ڈالی تو محسوس کیا کہ ایسی کتاب پر اظہارِ خیال نہ کرنا اور اس کی اہمیت کو اجاگر نہ کرنا بے انصافی ہو گی۔ کتاب مصنف کے اقوال کا مجموعہ ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے مجھے ایسے لگا گویا کہ مصنف تلاشِ حق کا ایک ایسا مسافر ہے جس نے منزل کو پالیا ہے اور پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھا اپنے مشاہدے کی تفصیل بیان کر رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کتاب کو اگر قرابادینِ معرفت کہا جائے تو غیر موزوں نہ ہو گا۔ آج کے معاشرے کے انسان کی ذہنی اور اخلاقی بیماریوں کی تشخیص اور ان کا علاج کچھ اس محققانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ زندہ انسانوں کی زندہ خامیاں کچھ ایسے زندہ انداز میں بیان کی گئی ہیں کہ کتاب ایک زندہ کتاب دکھائی دیتی ہے۔

کتاب پڑھتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی پہنچا ہوا بزرگ اس نئے دور کی اس نئی تہذیب میں مبتلا انسانی معاشرے کی ذہنی، اخلاقی اور روحانی بیماریوں کی حقیقت اور ان کا علاج ایسے دوٹوک، فیصلہ کن، بلیغ اور موثر انداز میں بیان کر رہا ہے کہ بات ادراک کی راہوں سے سیدھی دل میں اتر جاتی ہے۔ حقائق جو کتاب میں بکھرے ہوئے ہیں اِن میں ظاہراً جواب مضمون کی قسم کا کوئی ربط نہیں۔ ایسا ربط ہو بھی نہیں سکتا، ضرورت بھی نہیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت غالب کو بھی اس وقت پیش آئی تھی جب رات کو پلنگ پر لیٹے ہوئے اس کی نگاہ آسمان پر پڑی تھی۔ اس نے ستاروں کو دیکھا اور ان میں باہمی ربط نہ ہونے کا شکوہ کیا لیکن حقیقت یہ ہے کہ آسمانی ستاروں کا آپس میں ربط موجود ہے، ربط نہ ہو تو ایک دوسرے کے ساتھ

ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں اور جس طرح ستاروں کے مابین ایک خاص قسم کا ربط موجود ہے اسی طرح ''کرن کرن سورج'' کی کرنوں میں بھی باہمی رابطہ ہے جو سب مصنف کے ذہن سے پھوٹ رہی ہیں۔

سترھویں صدی عیسوی میں دورِ جدید کے وکیلِ اوّل اور برطانیہ کے مدار المہام فرانسس بیکن (1626ء-1561ء) کے مجموعۂ مضامین (Essays of Lord Bacon) نے پورے یورپ میں بے حد شہرت پائی۔ طرۂ امتیاز ان مضمونوں کا صنعتِ ایجاز یعنی الفاظ کا سائنٹفک استعمال قرار پایا۔ ان چھوٹے چھوٹے مضمونوں میں الفاظ نگینوں کی طرح جڑے نظر آتے تھے۔ یہی صفت ''کرن کرن سورج'' میں واضح طور پر نظر آتی ہے اور بقولِ حضرت واصف علی واصفؒ'' بہترین کلام وہ ہے جس میں الفاظ کم اور معنی زیادہ ہوں''۔ تاہم حضرت واصف علی واصفؒ اور بیکن کی مشابہت یہیں ختم ہو جاتی ہے۔ دونوں کا موضوع باہمی طور پر مختلف ہی نہیں متضاد بھی ہے۔ بیکن کا موضوع یہی مادی دنیوی زندگی ہے۔ اسے اخلاق، روحانیت، یا آخرت سے کوئی غرض نہیں۔ اس کے ذہن میں میکیاولی کی روح جلوہ ریز ہے جب کہ حضرت واصف علی واصفؒ کا موضوع بنیادی طور پر اخلاقی اور روحانی ہے اور بیکن کے فلسفے کی کھوکھ سے جنم لینے والی تہذیب و ترقی سے اسے جو دلچسپی ہے وہ تو ''کرن کرن سورج'' کے انتساب سے ہی واضح ہے۔

انتساب ''آباد شہر کی اس مسجد کے نام ہے جس میں لاؤڈ سپیکر نہیں ہوتا''۔ حقیقت یہ ہے کہ جناب حضرت واصف علی واصفؒ کی کتاب بیکن کے خیالات کی ناسخ ہے۔ ہمیں ''کرن کرن سورج'' کی نظیر اگر مل سکتی ہے تو وہ شیخ سعدیؒ نے جو کچھ اپنے مشاہدے اور علم کی روشنی میں اپنے دور کے تناظر میں کیا تھا وہی کچھ حضرت واصف علی واصفؒ نے اپنے مشاہدے اور علم کی روشنی میں اس موجودہ دور کیلئے کیا ہے۔ ''کرن کرن سورج'' اقوال کا ایک مجموعہ ہے۔ اسی طرح جس طرح کہ بعض اقوال بعض مشائخ کی یادگار ہیں البتہ حضرت واصف علی واصفؒ کے اقوال موجودہ معاشرے کے ایک مبسوط تجزیئے کی صورت میں ظہور پذیر ہوئے ہیں اور ایک معرکہ آرا اور غور طلب بات یہ ہے کہ یہ سب کچھ حضرت واصف علی واصفؒ کا ذاتی مشاہدہ ہے اور اس کے ذہن کی ذاتی تخلیق ہے جسے انگریزی میں اوریجنل تھاٹ (Original Thought) کہا جاتا ہے اور یہ خصوصیت جناب حضرت واصف علی واصفؒ کو دنیا کے ماہر فلاسفہ کی صف میں کھڑا کرتی ہے۔

حضرت واصف علی واصفؒ کا مشاہدہ ہی قابلِ تحسین نہیں بلکہ اس کا اندازِ بیان بھی غور طلب ہے۔ تاثیر تو اس کے بیان میں ہے ہی البتہ وہ سخت سے سخت بات اس انداز میں کہہ جاتا ہے کہ قاری کی ابرو پر شکن تک نہیں ابھرتی گویا کہ اس کا قلم قلم نہیں جو قلم کرتا ہے بلکہ ایک استری ہے جو سلوٹوں کو ہموار کر دیتی ہے۔ شاید جناب حضرت واصف علی واصفؒ کو گراں گزرے ''کرن کرن سورج'' کی بجائے نام اگر ''کرن کرن روشنی'' ہوتا تو موزوں رہتا۔ یہ میرا خیال ہے۔ بہر حال مصنف مجھ سے بہتر سمجھتا ہے۔ مجھے تو اندازِ تحریر اور نفسِ مضمون کی آمیزش میں آبدار موتیوں میں جھلکنے والی سبزی مائل نیلگوں روشنی کی کرنیں جھلکتی نظر آئیں۔ اس مناسبت سے ''کرن کرن روشنی'' کا نام اچھا لگا۔ سورج تو زمین سے لاکھوں گنا بڑا اور کروڑوں درجے کا جہاں سوز ٹمپریچر لئے ہوئے آگ کا ایک گولا ہے اس درجہ خیرہ کن کہ انسان کی نظر اس پر جمنے سے قاصر ہے البتہ ادبی تخلیق مصنف کی معنوی اولاد ہوتی ہے جس نام سے مصنف خوش ہم بھی خوش۔

کتاب سے انتخاب مشکل ہے کہ سب انتخاب ہے۔ایک اقتباس آپ بھی پڑھیئے:۔''دولتِ غم کو بھی کم نہ سمجھو۔ غم کا سرمایہ خاص عنایت ہے۔اس شخص پر بڑا کرم ہے جس کی رات بیدار ہو جائے جسے آہِ سحر گاہی میسر ہو۔ غمزدہ دل کی دعا قوموں کی مصیبتیں ٹالتی ہے۔ پچھلے پہر شبِ تاریک کی گہرائیوں میں ٹپکنے والے آنسو ملتوں کے لئے چراغاں کرتے ہیں۔ غم ہی وہ طلسم ہے جس سے عطارؒ، رومیؒ، رازیؒ، غزالیؒ اور اقبالؒ پیدا ہوتے ہیں۔ غم ذاتی ہو تو بھی اس کی تاثیر کائناتی ہوتی ہے۔ غم کمزور انسان کو کھا جاتا ہے اور طاقت ور آدمی کو بنا جاتا ہے''۔

نیز:۔''آج کا انسان اس لئے خوفزدہ ہے کہ وہ لذتِ شوق سے محروم ہے۔ کثیر المقاصد زندگی خوف سے نہیں بچ سکتی۔ رحمتِ حق سے مایوسی ہی خوف پیدا کر رہی ہے۔لالچ ختم نہ ہو تو خوف کیسے ختم ہو۔انسان اپنے آپ کو جتنا محفوظ کرتا ہے اتنا ہی غیر محفوظ ہوتا جا رہا ہے۔ گویا زندگی اپنی حصار بندیوں اور حفاظتوں کی زد میں آگئی ہے۔ ہر طرف خوف ہی خوف ہے۔اس خوف سے بچنے کا واحد ذریعہ اپنی جبینِ شوق کو سجدوں سے سرفراز کرنے میں ہے''۔(کرن کرن سورج)اور دیکھئے حضرت واصف علی واصفؒ نے گیارہ لفظوں میں انسان کی ایک بنیادی کمزوری کو کچھ اس انداز میں واشگاف کیا ہے کہ میرے بس میں ہو تو میں اسے موتیوں میں تول دوں۔ آپ بھی غور فرمایئے۔''ہم لوگ فرعون کی زندگی چاہتے ہیں اور موسیٰؑ کی عاقبت''۔

حضرت علامہ یوسف جبریلؒ کا انٹرویو نمبر 1

ڈاکٹر یاسر امیر

مجھے علامہ محمد یوسف جبریلؒ کو دیکھ کر وہ زمانہ یاد آگیا جب بڑے بڑے بادشاہ علماء کرام کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھتے تھے اور ولی عہد علماء کے جوتے اٹھانے کے لئے دوسرے شہزادوں سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔(شریف فاروق) یہ نظر انداز شخصیت 2 دسمبر ٹھیک بارہ بجے روشن اور چمک دار آنکھوں اور عاجزی اور انکساری کے ساتھ میرے کلینک میں داخل ہوئی۔اس وقت میرے ساتھ ایک کرنل ڈاکٹر ایک میجر ڈاکٹر سمیت دو اور ڈاکٹر تشریف فرما تھے جن کا تعلق ملٹری ہسپتال راولپنڈی سے تھا۔اس بزرگ شخصیت میں ایسی بات ضرور تھی جس نے مجھ سمیت سب کو اٹھنے پر مجبور کر دیا۔'' آثار بتاتے ہیں کہ عمارت عظیم تھی''۔

صاف اور شستہ لہجے میں انہوں نے دریافت فرمایا کہ آپ ہی ڈاکٹر یاسر ہیں۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا اور کرسی پر براجمان اس عظیم شخصیت کے سامنے جھک گیا۔ پھر گفتگو کا سلسلہ کچھ یوں چلا۔

ڈاکٹر یاسر امیر: علامہ صاحب پاکستان کا کیا بنے گا؟

علامہ صاحب: پاکستان کا کیا مطلب ہے؟ لا الہ الا اللہ پاکستان نہیں ٹوٹ سکتا البتہ پاکستان کے لوگ اپنی کوہتاہیوں کی وجہ سے نقصان اٹھا سکتے ہیں۔ مصیبت میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔

ڈاکٹر یاسر: قائداعظم سے ملاقات کیسی رہی؟

علامہ صاحب: شملہ کانفرنس کے دوران قائداعظمؒ انگریزی اور کانگریسی وفد کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے پاکستان کے حصول میں ناکام ہو رہے تھے۔

قدرت مجھے دہلی لے گئی۔اور نگ زیب روڈ پر ملاقات ہوئی۔میرے منہ سے نکلا۔ قائداعظمؒ! آپ حکم کریں، انشاءاللہ آپ ہم کو فرماں بردار پائیں گے۔ قائداعظمؒ پاکستان کے مطالبے پر سخت مضبوط ہو گئے اور اللہ تعالی کے فضل و کرم سے کامیاب و کامران ہوئے۔

ڈاکٹر یاسر امیر: جرمن سکالر اینی مری شمل کا کیا قصہ ہے؟

علامہ صاحب: اس شہرہ آفاق مستشرق نے تقریر کا ایک سلسلہ 1963ء میں شروع کیا۔ کہتی تھی کہ قرآنِ حکیم اللہ تعالی کا کلام نہیں کیونکہ اس میں غلطیاں ہیں اور غلطیاں سامنے لاتی تھی۔ میں نے کہا۔ قرآن میں کوئی غلطی نہیں۔ تو غلط کہتی ہے۔ پھر میں نے اُسے قرآنِ حکیم میں قدیم و جدید فلاسفی آف اٹامزم (ایٹمی سائنس) دکھائی تو وہ لاجواب ہو گئی۔ 1986ء میں اسلام آباد میں دائرہ کی تقریب میں اس نے اسلام کا اعلان کیا، سنا ہے کہ اب اس نے اسلام آباد میں دائمی سکونت اختیار کر لی ہے۔

ڈاکٹر یاسر امیر: ایٹمی سائنس دانوں اور جدید فلسفیوں کو قرآنِ حکیم کے بارے میں کیا چیلنج دیا؟

علامہ صاحب: روئے زمین کے ایٹمی سائنس دانوں کو چیلنج دیا کہ وہ قرآنِ حکیم کی سورۃ الھمزہ پڑھ لینے کے بعد بھی سب اکھٹے ہو کر نیوکلیر فائر کی اتنی ہی مختصر ایسی ہی جامع تعریف و تخصیص پیش کریں جیسا کہ قرآنِ حکیم میں موجود ہے۔اس سائنس کے دور میں سائنس کی بنیاد پر وہ ایسا ہر گز نہیں کر سکیں گے جیسا کہ نزولِ قرآن کے دوران عرب لوگ فصاحت و بلاغت کی بنیاد پر قرآنِ حکیم کے مقابلے میں ایک سورۃ بھی پیش نہیں کر سکے تھے اور میں نے روئے زمین کے جدید فلسفیوں کو چیلنج کیا ہے کہ وہ قرآنِ حکیم کی سورۃ الھمزہ پڑھ لینے کے بعد سب اکھٹے ہو کر یہ فیصلہ دیں کہ جس طرح قرآنِ حکیم نے سورۃ الھمزۃ میں جدید و قدیم اٹامزم کے فلسفے کو دنیا میں نمودار ہونے والے ایٹمی جہنم، ایٹم بم اور ایٹمی تابکاری کی بنیاد قرار دیا ہے حالانکہ قدیم اٹامزم پچیس سو برس قدیم ہے اور جدید اٹامزم سترہ سو سال پہلے ظاہر ہوا۔ایٹمی جہنم بیسویں صدی میں نمودار ہوا۔ کیا ایسا کرنا انسانی ذہن کے لئے ممکن ہے؟ کیا اللہ تعالی کے بغیر یہ بات چودہ صدیاں قبل کسی کے علم میں تھی۔ فلسفی میری بات کے جواب میں ہر گز یہ نہیں کہہ سکتے کہ ذہنِ انسانی کے لئے ایسا کرنا ممکن تھا۔ قرآنِ حکیم میں ''حطمہ'' کی حقیقت کا انکشاف اللہ تعالی کے فضل و کرم سے میرے ذمے تھا اور قرآنِ حکیم ہی نے انسانیت کو ایٹمی جہنم سے نجات کا طریقہ بتایا ہے۔

ڈاکٹر یاسر امیر: حضرت علامہ اقبالؒ کے فرزند ڈاکٹر جاوید اقبال کے ساتھ ملاقات کا سماں کیا تھا؟

علامہ صاحب: ڈاکٹر جاوید اقبال نے میرا کلام پڑھ کر تبصرہ مجھے عطا کیا اور مجھے حضرت علامہ اقبالؒ کی کرسی پر بٹھا کر کہا کہ مجھے آپ کے کلام سے اپنے والد کی خوشبو آتی ہے اور مجھ سے کلام سنا اور رویا۔

ڈاکٹر یاسر امیر: آپ کی کتاب اسلامی بم کے اثرات کیا نمودار ہوئے؟

علامہ صاحب: میری کتاب ''جبریلز اسلامک بم Gabriel's Islamic Bomb'' کے شائع ہوتے ہی امریکہ یورپ اور تمام دوسرے مخالف ممالک کا پاکستان کے اسلامی بم کے خلاف پروپیگنڈا ایک دم ختم ہو گیا۔ یہ اللہ تعالی کے فضل و کرم اور اللہ کے کلام قرآنِ حکیم کی طاقت سے ہوا۔

ڈاکٹر یاسر امیر: صدر ضیاء کے دور میں امریکہ نے پاکستان کی ایڈ بند کر دی آپ نے کیا کیا؟

علامہ صاحب: صدر ضیاءالحق نے اس وقت کے وزیر اعظم جونیجو صاحب کو امریکہ کے دورے پر بھیجا۔ وہاں صحافیوں نے اسے کہا کہ تم ایٹم بم بنا رہے ہو؟ اس کے انکار پر پاکستانیوں کو جھوٹا کہا۔ شریف فاروق ایڈیٹر جہاد ساتھ تھے۔ واپسی پر ایک خط وزیر اعظم کے نام نوائے وقت میں لکھا۔ اس میں میرا نام لے کر کہا کہ اس ایڈ کے درد کی دوا اس کے پاس ہے۔ جونیجو صاحب خط لے کر صدر ضیاءالحق کے پاس پہنچے۔ صدر ضیاءالحق نے سعید مہدی کمشنر راولپنڈی اور پی او ایف بورڈ واہ کے چیئرمین جنرل طلعت مسعود صاحب کے ذمہ مجھ سے رابطہ لگایا۔ میں نے دعا کی اور دعا کے علاوہ کچھ عوامل جو میرے اسلامی بم میں چھپ چکے تھے کام آ گئے۔ اور پاکستان کی ایڈ جاری ہو گئی۔

ڈاکٹر یاسر امیر: دنیا کے سفیروں کے سامنے جو تقریر آپ نے کی وہ کہاں تک کامیاب رہی؟

علامہ صاحب: 1968ء میں اسلام آباد کے شہر زار ہوٹل میں میں نے دنیا بھر کے سفیروں کے سامنے قرآنِ حکیم پر تقریر کی۔ تقریر ختم ہونے پر روس کے سفیر نے میرے پاس آ کر مجھ سے مصافحہ کیا اور کہا:۔

"The Most Thought Provoking Lecture I Have Heard In My Life"

یعنی ''سب سے زیادہ فکر انگیز تقریر جو میں نے اپنی زندگی میں سنی ہے''۔ اس کے بعد امریکی سفیر میرے پاس آئے اور اس نے بھی وہی جملہ کہا جو روس کے سفیر نے کہا تھا۔ البتہ اس کا مصافحہ کچھ زوردار تھا۔

ڈاکٹر یاسر امیر: کیا آپ کی کوئی بات یورپ یا امریکہ میں چھپی ہے؟

علامہ صاحب: ہاں شگاگو امریکہ کے بلٹن آف دی اٹامک سائنٹسٹ Bulletin Of The Scientists اور اس کے علاوہ ٹائمز میگزین Time Megazine بھی چھاپتا ہے۔ دراصل میں اپنا کام مکمل کرنے کے بعد بیمار ہو گیا۔ آج تیرہ برس سے بیمار ہوں۔ کام تو چل رہا ہے مگر صحت ٹھیک ہو جائے تو یورپ امریکہ اور انسانیت کو نصیحت کا بھرپور حق ادا کیا جائے۔

ڈاکٹر یاسر امیر: وہ گرین بک سبز کتاب کا معاملہ کیا ہے؟

علامہ صاحب: غالباً 1968ء کی بات ہے کہ جنرل شیر بہادر صاحب، جی ایچ کیو نے اوقاف کو ماؤزے تنگ کی ریڈ بک کی طرح پاک فوج کو اسلامی طرز پر گرین بک سبز کتاب لکھوا کر دینے کی فرمائش کی۔ اس طرح کہ تین سو پینٹھ صفحے۔ ہر صفحے پر ایک موضوع یعنی ہر سال کے لئے ہر روز کے لئے ایک موضوع۔ یہ کتاب ہر پاکستانی فوجی کے پاس ہو۔ فاضل لوگوں نے کوشش کی مگر ایک ایک موضوع کئی کئی صفحات پر پھیل گیا۔ اوقاف کے پبلیکیشن آفیسر جناب جعفر قاسمی صاحب کے کہنے پر اپنے وقت میں میں نے لکھ دی۔ میں ان دنوں اوقاف ڈیپارٹمنٹ لاہور میں ریسرچ انوسٹیگیٹر تھا۔ پھر اوقاف چھوڑ دیا۔ کئی سال کے بعد وہ کتاب ''جہاد کے اخلاقی اصول نکات وہدایات وروایات'' کے نام سے لاہور سے چھپ گئی۔

ڈاکٹر یاسر امیر: انگریز شہرہ آفاق فلسفی لارڈ رسل کے خط میں کیا پایا؟

علامہ صاحب: 1964ء میں میرے استفسار کے جواب میں لارڈ رسل نے لکھا۔ کہ ''جب سے آدم اور حوا نے گندم کا دانہ کھایا ہے انسان نے ہر وہ حماقت کی ہے جو وہ کر سکتا تھا اور انجام ایٹمی جہنم ہے''۔ لیکن مجھے الھمزہ کے انکشاف نے ناامید نہ ہونے دیا۔ ویسے رسل کا تجزیہ موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے کچھ غلط نہ تھا مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے قرآنِ حکیم میں ایٹمی جہنم سے بچنے کی تدبیر بتا دی ہے۔

ڈاکٹر یاسر امیر: اپنی علمی جدوجہد کے متعلق کچھ کہیئے؟

علامہ صاحب: بچپن میں میٹرک کئے بغیر سکول سے بھاگ گیا۔ پچیس برس کی عمر میں 1942ء میں دوسری عالمی جنگ کے دوران بغداد کے قریب ایک مقام مصیّب میں میں نے خواب دیکھے جو ورطہء تحریر میں آچکے ہیں۔ میں انڈین آرمی میں سپاہی تھا لیکن حصولِ علم کا جنون پیدا ہو گیا۔ ایک حکم انڈین آرمی کی طرف سے آیا جس میں اسلام پر زد پڑتی تھی۔ میں نے ماننے سے انکار کر دیا۔ مجھے بہت بڑا لالچ دیا گیا۔ ہندوستانی میجر نے جی او سی مڈل ایسٹ جنرل الیگزنڈر کے خط کے ساتھ میرے سامنے جرنیلی کے سٹار پھیلا کر کہا۔ جو کہو میں یہاں سے تم کو (جرنیل) بنا کر لے جاؤں گا مگر میں نے جرنیل بننے سے انکار کر دیا۔ انگریز مڈل ایسٹ میں ڈھائی لاکھ مسلمان ہندی فوجیوں کے رد عمل سے خوف زدہ تھا۔ میرا کورٹ مارشل ہوا۔ فوج سے فارغ ہوا اور پھر چالیس برس یعنی 1982ء تک شب و روز علم کے حصول میں منہمک رہا۔ اردو، فارسی، عربی، انگریزی زبان اور ادب، قرآن، توریت، زبور اور انجیل کی تفسیر و تشریح، طب، ایلوپیتھک میڈیکل سائنس، سنیاسیت، ایٹمی فزکس، فلسفے، ڈارون اور رسل تک، تواریخ جغرافیہ اور دوسرے قدیم و جدید علوم حاصل کئے اور آخر کار انگریزی میں چودہ جلدیں اور اردو میں چودہ جلدیں تحقیقی لکھیں۔ جو سب کی سب ایٹمی جہنم کے متعلق قرآن اور سائنس کے حوالے سے لکھی ہیں۔ 1942ء میں خواب دیکھا۔ 1961ء میں پتہ چلا کہ میرا مشن انسانیت کو ایٹمی جہنم حطمہ سے آگاہ کرنا ہے۔ 1982ء میں کام مکمل ہوا۔ 1942ء وہی سن ہے جس میں انری کو فرمی نے فژن چین ری ایکشن کا کامیاب تجربہ کر کے دنیا کے لئے ایٹمی آگ کا دروازہ کھولا۔ میں نے جو خواب دیکھا اس پر انحصار نہیں کیا بلکہ انسانیت کے سامنے علمی دلائل پیش کئے ہیں اور بات قرآنِ حکیم اور سائنس کے حوالے سے کی ہے۔ سارا علم میں نے بغیر کسی استاد یا سکول کے حاصل کیا۔ یہ عجیب بات ہے۔ اللہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ میری پیدائش سترہ فروری 1917ء موضع کھبیکی سون سکیسر خوشاب میں اعوان خاندان میں ہوئی۔ سترہ فروری تورات کے مطابق طوفانِ نوح کی تاریخ ہے البتہ وہ طوفان پانی کا تھا اور اب دنیا کو آگ کا طوفان درپیش ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالی انسانیت کو اس دنیا کے ایٹمی جہنم اور اگلی دنیا کے حطمہ کے دردناک عذاب سے بچائے۔ آمین۔ میری علمی جدوجہد کے دوران انگریزی کتابیں مجھے لنڈن کی ایک فرم مہیا کرتی تھی۔ اس فرم نے مجھے امریکہ سے بھی تلاش کر کے سیکنڈ ہینڈ کتابیں بھیجیں۔ میں قیمت بھیج دیتا تھا ان کے تعاون کے بغیر میرا مشن پایہ تکمیل کو نہ پہنچتا۔ وہ میرے شکریے کے مستحق ہیں۔ یہ بے شمار نئی اور پرانی کتابیں اکٹھی کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔

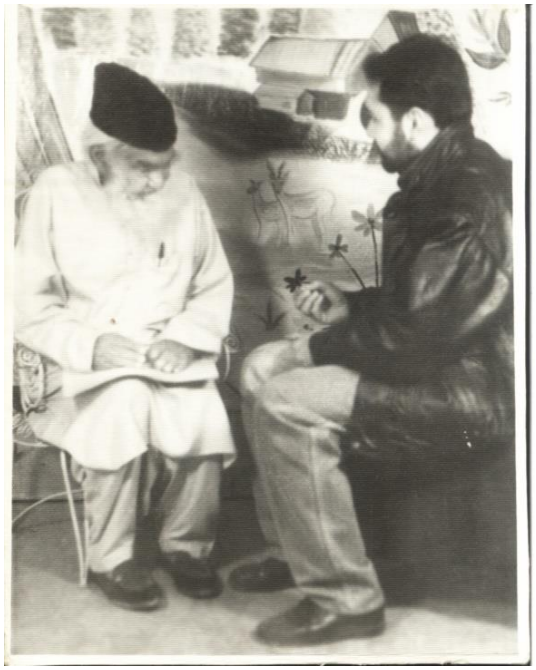

ڈاکٹر یاسر امیر: علامہ صاحب! مادام اینی مری شمل کے ساتھ مناظرہ کا احوال قارئین دلچسپی سے جاننا چاہیں گے؟

علامہ صاحب: اس مناظرے کی دو باتیں غور طلب ہیں پہلی یہ کہ جب قرآنِ حکیم کو خطرہ لاحق ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کی حفاظت اپنے ذمے لے لیتے ہیں، دوسری یہ اگر مس اینی مری شمل کی مہم کامیابی سے ہمکنار ہو جاتی تو قرآن میں شبہ پڑ جاتا اور یہ شبہ تباہ کن ثابت ہوتا۔ یہ مناظرہ ستمبر 1963ء میں پنجاب یونیورسٹی لاہور ہال میں ہوا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ میں گاؤں سے لاہور پہنچا وہاں علامہ علاءالدین صدیقی جو اس وقت پنجاب یونیورسٹی لاہور شعبہء اسلامیات کے صدر تھے اور بعد میں وائس چانسلر کے عہدے سے ریٹائیر ہوئے، سے ملنے گیا تو وہ رو پڑے فرمایا۔ برادر ایک جرمن مستشرق خاتون نے ہماری داڑھیوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ وہ کہتی ہے۔ قرآن اللہ کا کلام نہیں، تمہارے نبی ﷺ نے لکھا ہے۔ ثبوت یہ پیش کرتی ہے کہ قرآن میں غلطیاں ہیں۔ اللہ غلطی نہیں کرتا۔ الاظہر یونیورسٹی میں اس تقریر سے متاثر ہو کر بے شمار مسلمان عیسائی ہو گئے ہیں، اس لئے میں اس تقریر میں صحافیوں کو نہیں آنے دیتا اور وہی لوگ داخل ہوتے ہیں جن کو دعوت نامہ بھیجا جاتا ہے۔ مادام نے قرآنِ حکیم کا مطالعہ ایک طویل عرصے تک کیا ہے

میں نے کہا علامہ صاحب لاہور عالموں کا گڑھ ہے۔ کیا کسی عالم نے اس عورت کو جواب نہیں دیا۔ علامہ صاحب نے فرمایا۔ برادر لاہور کی کیا بات کرتے ہو میں ہر روز یونیورسٹی کے خرچے پر پورے پاکستان سے بڑے بڑے علماء کرام کو بلاتا ہوں مگر کچھ نہیں ہو سکا۔ علامہ صاحب نے فرمایا۔ برادر تم آ گئے ہو۔ ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ نے تمھیں اس مسئلے کو حل کرنے کے لئے بلایا ہو۔ یہ ہے کارڈ اس کے بغیر کسی کو ہال میں داخلے کی اجازت نہیں۔ بدھ کے روز مادام کی تین سے پانچ بجے تک آخری تقریر ہے۔ آج سوموار ہے پھر وہ دلی جا رہی ہے۔

بدھ کے روز تین بجے مس اینی مری شمل کی تقریر شروع ہوئی۔ علامہ علاؤالدین صدیقی صدارت کی کرسی پر تھے۔ بیس بائیں متشخص علماء کرام تقریر سن رہے تھے۔ چار عیسائی پادری بھی موجود تھے۔ مادام نے قرآن کی غلطیاں بتانا شروع کیں حتّٰی کہ چار بج گئے۔ ہر شخص دم بخود بیٹھا تھا۔ میں نے پہلے عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرمان اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ○ ''ہم نے ہی اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں'' کے مطابق پہلے تو مجھے اتفاقاً لاہور میں بلا لیا اور پھر علامہ صاحب نے اپنی کرسی گھسیٹی اور پہلی صف میں میرے پاس لے آئے۔ میں نے کہا علامہ صاحب! آپ نے صدارت کی کرسی چھوڑ دی۔ فرمایا۔ برادر!

بحیثیتِ صدر میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اب کچھ نہ کچھ کہوں گا۔ آپ اور دوسرے علماء کرام سب ہی خاموش بیٹھے ہیں۔ آپ پر مجھے بڑی امید تھی۔ میں نے کہا۔ علامہ صاحب! قرآن آپ کا ہے۔ فرمایا۔ نہیں۔ میں نے کہا۔ کیا میں لکھ کر لایا ہوں۔ فرمایا۔ نہیں۔ میں نے کہا قرآن جس کا ہے وہ اس کی حفاظت کر سکتا ہے۔ مادام کہہ رہی تھی۔ دیکھو اللہ تعالیٰ غلطی نہیں کرتا۔ قرآن میں غلطیاں ہیں۔ اگر قرآن اللہ کا کلام ہوتا تو غلطیوں سے پاک ہوتا لیکن جب علامہ صاحب نے صدارت چھوڑ دی تو مادام خاموش ہو گئی۔ کھڑی ہو گئی۔ علامہ صاحب نے صدارت چھوڑی۔ مادام خاموش ہو گئی۔ مجھے کھڑا ہو کر بولنے کا موقع مل گیا۔ میں کھڑا ہو گیا۔ ورنہ پانچ بجے تقریر ختم پھر ایک دو سوال اور چائے اور چھٹی۔ میں کھڑا ہوا۔ میرے ذہن کو رہنمائی مل چکی تھی۔ مجھے سمجھایا جا چکا تھا کہ کیا کہنا ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے علامہ صاحب کو صدارت کی کرسی سے ہٹا کر مجھے بولنے کا موقع بہم پہنچایا۔

میں کھڑا ہوا۔ میرا حلیہ اور میرا لباس بالکل دیہاتی تھا۔ کوئی شخص یہ تصوّر بھی نہ کر سکتا تھا کہ یہ شخص انگریزوں کے سامنے تقریر کرے تو وہ مسحور (SPELL BOUND) ہو جاتے ہیں لیکن اس سے بھی بڑی وہ بات ہے جو میں نے کہنی تھی اور جو میرے ذہن میں ڈال دی گئی تھی۔ خود مادام بھی تقریر انگریزی ہی میں کر رہی تھی اور انگریزی میں اس کو خاصا ملکہ حاصل تھا۔

مادام! میں نے کہا۔

''میں نے آپ کی پہلی تقریریں نہیں سنیں۔ میں نہیں جانتا کہ آپ نے کیا کہا اور انہوں نے کیا سنا۔ مجھے آپ کی تقریر سننے کا ایک گھنٹے کا اعزاز حاصل ہوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ قرآنِ حکیم کی الہامی حیثیت سے انکار کر رہی ہیں۔ آپ کا کہنا ہے کہ قرآن پیغمبرِ اسلام نے لکھا ہے۔ کہنے لگی۔

''ہاں میرا یہی خیال ہے آپ اس کو غلط ثابت کریں''۔ میں نے کہا۔

''مادام! قرآن پیغمبرِ اسلام نے نہیں لکھا اور یہ جو آپ کہتی ہیں قرآن میں غلطیاں ہیں تو آپ غلط کہتی ہیں۔ قرآن میں کوئی غلطی نہیں۔ آپ کی سمجھ غلط ہے لیکن اگر میں آپ کے ساتھ ان غلطیوں پر بحث کروں تو ایک غلطی کو درست ثابت کرنے پر جتنا وقت صرف ہو سکتا ہے وہ یہاں ملنا ممکن نہیں ہے۔ اس کے بجائے میں آپ کو اس قرآنِ حکیم میں ایسی چیز دکھاؤں گا جو قرآنِ حکیم کو اللہ کا کلام ثابت کرنے میں اٹل ہے۔ کہنے لگی۔

''وہ کیا ہے''؟ میں نے کہا۔

''مادام! قرآنِ حکیم کب نازل ہوا یا جیسے کہ آپ کہتی ہیں کب لکھا گیا؟

کہنے لگی۔ ''تیرہ سو اسی برس پہلے''۔

میں نے مادام کی دل ہی دل میں داد دی کیونکہ مسلمان اس معاملے میں سہل انگاری سے کام لے کر کہہ دیتے ہیں ''چودہ صدیاں'' جب کہ مادام نے چودہ صدیاں نہیں کہا بلکہ کہا تیرہ سو اسی برس پہلے۔ میں نے کہا۔ مادام! ''اور ایٹم بم اس دنیا پر کب نازل ہوا''۔ کہنے لگی۔ ''انیس سو پینتالیس 1945ء میں دو ایٹم بم امریکنوں نے ہیروشیما اور ناگاساکی (جاپان) میں پھینکے تھے''۔

میں نے پوچھا۔ ''کیا ان دو تاریخوں میں کچھ فاصلہ ہے؟

کہنے لگی۔ ''صدیاں بیچ میں پڑی ہیں''۔ تو مادام مجھے بتائیں کہ 1380ء برس پہلے بدوؤں کے ملک مکہ کے شہر میں ایک اَن پڑھ اُمّی شخص حضرت محمد ﷺ عربی میں ایک کتاب لکھتا ہے، جس کا نام قرآنِ حکیم رکھتا ہے اور اس قرآنِ حکیم میں وہ قدیم اور جدید اٹامزم کی تھیوری اور ایٹمی سائنس بیان کرتا ہے اور ایٹم بم کی تصویر بناتا ہے۔ کہنے لگی۔ کیا تم ہوش میں ہو۔ میں نے کہا۔ ہاں۔ مادام بھنگ چرس میں نہیں پیتا نہ ہی میں سمجھتا ہوں میں نے ایسی کوئی بات کی ہے جس سے میرے دماغ کی خرابی کا ثبوت سامنے آئے۔ کہنے لگی کہ اس سے بڑی اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ 1380ء برس پہلے سائنس اور یہ ایٹمی سائنس کہاں تھی۔ یونان میں نہ تھی۔ عرب کی تو بات ہی کیا ہے اور ایٹم بم کی تصویر کے کیا معنی؟ یہ کہاں ممکن تھا۔ میں نے کہا۔ مادام! یہی تو سب بات ہے۔ 1380ء برس پہلے سوائے رب کی ذات کے کوئی ان باتوں سے آگاہ نہیں تھا اگر قرآنِ حکیم میں ہے تو اس سے بڑا ثبوت اللہ کا کلام ہونے کا کیا ہو سکتا ہے۔ کہنے لگی۔ میں نے قرآنِ حکیم کافی عرصے تک پڑھا ہے۔ قرآنِ حکیم دین کی کتاب ہے۔ اس میں نماز روزے

کی باتیں ہیں۔ یہ کوئی سائنس کی ٹیکسٹ بک نہیں ہے نہ ہی تمہارے کسی عالم نے کہا ہے کہ قرآنِ حکیم میں ایٹمی سائنس ہے اور ایٹم بم کا تذکرہ ہے۔ میں نے کہا۔ ایٹمی سائنس اور ایٹم بم والی بات پچھلے ہی سال قرآنِ حکیم میں مجھے معلوم ہوئی ہے اور میں نے ابھی تک کسی سے نہیں کہی البتہ قرآنِ حکیم میں ہر بات کا بیان ہے۔ کیا آپ نے وہ آیت نہیں پڑھی جس میں کہا گیا ہے کہ ہم نے انسانوں کے لئے اس قرآنِ حکیم میں ہر مسئلہ بیان کر دیا ہے اور یہ دعویٰ دو بار کیا گیا ہے تو مادام وہ قرآنِ حکیم جو عاد و ثمود کی تباہی پر بار بار افسوس کرتا ہے اور بار بار ان واقعات کا بیان کرتا ہے حالانکہ یہ بستیاں کیا تھیں، لاہور کا ایک محلّہ چند لاکھ کی آبادی اور مادام یہ ایٹمی دیوٹو کیو سے لے کر نیویارک تک انسان اور جانور تو کیا گھاس کا تِنکا بھی زمین پر نہیں چھوڑتا بلکہ ایٹمی جنگ کے بعد اس زمین پر دس لاکھ سال کے لئے زندگی کا کوئی نشان پیدا نہیں ہو سکتا، پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ قرآنِ حکیم ایٹم بم اور ایٹمی جہنم کا تذکرہ نہ کرے، جب کہ قرآنِ حکیم نے دعویٰ کیا ہے کہ ہم نے انسان کے لئے اس قرآنِ حکیم میں ہر مسئلہ بیان کر دیا ہے۔ اس بیان پر مادام اس قدر سمجھ گئیں کہ بات سنجیدہ ہو رہی ہے۔ کہنے لگیں، پھر دکھاؤ وہ کہاں کہاں لکھا ہے۔ میں نے کہا۔ مادام! پڑھیں سورۃ الھمزۃ۔ کہنے لگیں۔ میں حافظ نہیں ہوں۔ میں نے کہا تو پھر قرآنِ حکیم منگواؤں یا خود پڑھوں۔ کہنے لگیں۔ قرآن منگوانے کی ضرورت نہیں، میں قرآنِ حکیم سمجھتی ہوں۔ تم پڑھو، اگر اپنی طرف سے پڑھو گے تو میں پکڑ لوں گی۔ میں نے پڑھنا شروع کر دیا۔

آعوذ باللہ من الشیطن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمن الرحیم وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ۝ الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ ۝ يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ ۝ كَلَّا لَيُنۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا الْحُطَمَةُ ۝ ترجمہ:۔ ''خرابی ہے ہر عیب جُو نکتہ چین کے لئے جو مال جمع کرتا ہے اور گن گن کر رکھتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس کا مال اس کو ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ ہر گز نہیں بلکہ وہ جھونکا جائے گا روندنے والی آگ یعنی حُطمہ میں''۔

یہاں پہنچ کر میں نے سوال کیا۔ مادام! حُطمہ کیا ہے۔ کہنے لگی۔ تمہارے مفسرینِ کرام کہتے ہیں کہ یہ ایک ایسی آگ ہے جس میں جو چیز ڈالو وہ اس آگ کی شدت سے ذرہ ذرہ ہو جاتی ہے۔ مادام کے اس جواب پر میں نے دل ہی دل میں بے حد داد دی کیونکہ یہ بات اس کی نہیں بلکہ یہ بات اسے قرآنِ حکیم کے چوٹی کے مفسرین مثلاً حضرت عبد اللہ بن عباس، حافظ عماد الدین ابنِ کثیر، امام فخر الدین رازی جلالین اور علامہ جریر طبری کی تفسیروں سے معلوم ہوئی اور یہ تفسیریں کیونکہ اس وقت کسی دوسری زبان میں ترجمہ نہیں ہوئی تھیں لہٰذا معلوم ہوا کہ اصلی متن میں پڑھی ہیں مگر حیرت ناک تھی وہ تیزی جس سے مادام نے یہ جملہ کہا تھا۔ میں نے کہا۔ مادام! تیرے اس ایک نکتے نے میری ساری بات ثابت کر دی ہے مگر میں آخیر تک مختصراً ساری تشریح کا بیان کروں گا تاکہ تو دیکھے کہ کس طرح قرآنِ حکیم نے صرف دس لفظوں میں ایٹمی آگ کی مکمل تشریح کر دی ہے۔ یہ تو آپ نے دیکھ لیا ہے کہ کس طرح قرآنِ حکیم کے صرف چھبیس لفظوں میں قدیم اور جدید اٹامزم کا سارا فلسفہ بیان کر دیا ہے، پھر میں نے آخیر تک سورۃ کی تشریح کی۔ آخر میں پوچھا۔ مادام! آپ نے کبھی ایٹم بم چلتے دیکھا ہے۔ اس نے کہا نہیں۔ اگر دیکھتی تو زندہ کیسے رہتی۔ میں نے پوچھا۔ ایٹم بم کے دھماکے کی کوئی تصویر تو دیکھی ہو گی۔ کہنے لگی ہاں ہیروشیما والے دھماکے کی تصویر دیکھی ہے۔ میں نے پوچھا۔ کیا کوئی ستون ہے۔ کہا ہاں چار میل اونچا ستون ہے۔ میں نے کہا۔ اب جو ایٹم بم بنایا ہے ہائیڈروجن بم اس کا ستون بیس میل اونچا اٹھتا ہے۔ تین میل کا قُطر ہوتا ہے اور قرآن نے کہا۔ ''کھچے ہوئے ستونوں میں''۔ ایسا معلوم ہوا کہ مادام کرسی پر بیٹھی نہیں بلکہ گری ہے۔ صدمہ شدید تھا مادام کا مشن فیل ہو گیا تھا۔ مادام قرآنِ حکیم کی

حقیقت کو پاچکی تھی۔ سمجھ چکی تھیں کہ قرآن اللہ کا کلام ہے۔انسان کے بس میں ایسی بات کا کہنا نہیں۔مادام چلی گئیں۔ علماء کرام نے میرے متعلق علامہ صاحب سے پوچھا۔ یہ حضرت کون ہیں۔فرمایا۔ ''یہ وہ شخص ہے جسے اللہ تعالیٰ نے محض اتفاق سے تمھاری قوم میں پیدا کر دیا ہے، وہ قرآنی نور جو اللہ تعالیٰ نے اس کے سینے میں تفویض فرمایا ہے اگر اس قوم نے اس سے حاصل نہ کیا تو اللہ تعالیٰ اس قوم کو کبھی معاف نہیں کرے گا، پھر ایسا آدمی پیدا نہ ہوگا''۔ اس روز علامہ صاحب نے پاکستان ٹائمز کا رپورٹر بلوایا تھا۔اس امید پر کہ شائید میں کوئی جواب دے سکوں۔ رپورٹر نے کہا۔ بتایئے کیا لکھوں۔ میں نے کہا پندرہ دن کے بعد تمہارے دفتر میں میں ایک مضمون لے آؤں گا۔ حسبِ وعدہ وہ مضمون جس کا عنوان تھا ''قرآنِ حکیم اور ایٹمی جہنم Quran And The Atomic Hell '' پاکستان ٹائمز میں لے گیا اور وہ شائع ہوا اور پورے یورپ اور امریکہ میں تہلکہ مچ گیا۔اس روز ان ملکوں میں جتنے ترجمے قرآنِ حکیم کے تھے وہ سب کے سب بِک گئے۔ سائنس دان جاننا چاہتے تھے کہ کیا واقعی قرآنِ حکیم میں کوئی ایسی بات موجود ہے۔مادام واپس چلی گئیں دورہ ختم پھر 1973ء میں پاکستان آئیں، پھر باقاعدگی سے حضرت علامہ اقبالؒ کی برسی پر آکر مقالہ پڑھتی رہیں۔ حضرت سلطان باہوؒ کی کافیاں اور عبداللطیف بھٹائیؒ کا کلام جرمن زبان میں ترجمہ کیا مگر قرآنِ حکیم کا نام نہیں لیا۔

ڈاکٹر یاسر امیر: علامہ صاحب! بعد میں مادام نے اسلام قبول کیا اس کے بارے میں آپ کیا جانتے ہیں؟

علامہ صاحب: 1986ء میں مجھے جناب۔ غضنفر مہدی صاحب سیکرٹری جنرل دائرہ کا کارڈ ملا کہ مس اینی مری شمل اپنے اسلام کا اعلان کرنا چاہتی ہیں۔ آپ کی شمولیت ضروری ہے۔ غضنفر مہدی کو میرے مناظرے کا علم جناب شریف فاروق ایڈیٹر جہاد کے پمفلٹ سے ہو چکا تھا میں نے معذرت کر لی۔ قرآن کی تفسیر میں الجھا ہوا تھا۔ میں نے اخبار میں خبر پڑھ لی۔مادام نے اسلام قبول کرنے کے علاوہ وصیّت کی کہ مروں تو مجھے عبد الطیف بھٹائیؒ کے روضے کے پاس دفن کیا جائے۔ سنا ہے کہ اس علاقے کے ڈپٹی کمشنر نے وہاں جا کر ایک چار دیواری بنوائی جس میں ایک تختی لگائی جس پر لکھا ہے ''سابقہ مس اینی مری شمل''۔ میں نے تو یہ بھی سنا ہے کہ مادام یورپ کی سکونت ترک کر کے اسلام آباد میں سکونت پذیر ہو گئی ہیں۔ اللہ کرے یہ درست ہو۔اب ہمیں مادام سے کوئی شکوہ کوئی گلہ نہیں۔ وہ خلوصِ دل سے مسلمان ہو چکی ہیں۔اس فاضل عورت کے اسلام لانے سے پوری دنیا میں اسلام کو عزت حاصل ہوئی ہے۔ میں خلوصِ دل سے مادام کو اسلام لانے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ بچپن میں ہمیں محلے کی مسجد کے امام پڑھاتے تھے۔ ''جو کوئی کافر مسلمان ہووے اُس نوں قتل نہ کیجے دو جاُس نوں بند نہ دیے تیجا اس دا مال نہ کھسئے چوتھا اس تے دوزخ دی بھاہ حرام اے پنجواں اس دا وچ بہشتاں دے گھر اے''۔مادام نے اسلام لانے کے بعد بے شمار کتب لکھیں:۔

- Koran. by Annemarie Schimmel. ...
- The World Treasury of Modern Religious... by Annemarie Schimmel. ...
- The Mystery of Numbers. ...
- I Am Wind, You Are Fire: The Life... ...
- Islam: An Introduction. ...
- Mystical Dimensions of Islam. ...
- Deciphering the Signs of God: A... ...
- And Muhammad Is His Messenger:...

گوشۂ شوکت محمود اعوان

نظم بہ صنعتِ توشیح۔نذرِ ملک شوکت اعوان:

ش

شعاعِ شعلہءِ قندیلِ علم و دانش ہے
وہی تو وارثِ جبریلِ علم ودانش ہے

واؤ

وہ ایک پیکرِ اخلاص ہے زمانے میں
یہی تو وصف ہے اُس سر پھرے دوانے میں

ک

کتاب و خواب سے اُس کو گلاب سے نسبت
اُسے ملی ہے رسالتِ مآب ﷺ سے نسبت

ت

تمام عمر کٹی اُس کی علم و حکمت میں
وہ بے مثال ہے اپنی اس ایک خدمت میں

الف

اُٹھایا بارِ گراں اُس نے بھی صعوبت کا
ہر ایک دیکھے گا لکھا ہوا مشیّت کا

ع

عطائے خاص ہے اُس پر، نگاہ رب کی ہے
محبت اُس کو بھی حاصل جہاں میں سب کی ہے

واؤ

وہ اپنی ذات میں اک انجمن، ادارہ ہے

وہ زندہ باد ہے، خدمت کا استعارہ ہے

الف

اُٹھا ہے وادیٔ خوشاب سے خمیر اُس کا
خدا کا شکر کہ زندہ رہا ضمیر اُس کا

ن

نگار خانہ ءِ ہستی میں معتبر ہے وہ
میں خوش نصیب کہ ہر گام ہم سفر ہے وہ

(ڈاکٹر محمد عارف)

فصل 1۔ شوکت اعوان شخصیت اور خدمات :

شوکت محمود اعوان گیارہ نومبر انیس سو ترپن 11/11/1953 میں بمقام کھبیکی وادیٔ سون سکیسر خوشاب جناب علامہ محمد یوسف جبریل کے ہاں پیدا ہوئے۔ بنیادی تعلیم مڈل تک اپنے ہی گاؤں کھبیکی سے حاصل کی۔ اساتذہ میں ماسٹر بشیر عالم صاحب، نذر الٰہی، منصب علی، علی محمد، میاں محمد اور دوست محمد شامل تھے۔ انبالہ مسلم ہائی سکول سرگودھا سے 1970ء میں فسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا۔ ایم اے او کالج لاہور سے 1972ء میں F.Sc سیکنڈ ڈویژن کے ساتھ پاس کی۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور سے 1976ء میں سیکنڈ ڈویژن میں سیاسیات میں بی اے پاس کیا۔ تعلیم کے دوران فزکس، کیمسٹری، میتھ، اسلامک سٹڈیز، انگلش، اردو، بائیولوجی، سیاسیات کا مطالعہ کیا۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور ہی سے 1982ء میں اسلامیات میں ایم اے کا امتحان پاس کیا۔ آپ کا تعلق اعوان قبیلہ کی گوت الیرال (اللہ یارال) سے ہے جو قطب شاہ کی اولاد سے ہیں اور گولڑہ اعوان ہیں۔

پاکستان اٹامک انرجی کمیشن اسلام آباد میں 34 سال خدمات سرانجام دینے کے بعد اب وہ ریٹائر ہو گئے ہیں، وہاں پر انہوں نے ڈاکٹر ثمر مبارک مند صاحب، ڈاکٹر اشفاق احمد، منیر احمد خان، جناب انور علی صاحب، ڈاکٹر مسعود احمد، پرویز بٹ، ڈاکٹر انصر پرویز جیسی عظیم سائنسی شخصیات کے ساتھ کام کیا۔ دورانِ ملازمت ایٹمی سائنس کو گہرائی تک پڑھنے کا موقع ملا۔ دورانِ ملازمت نہ صرف محکمہ کی بھرپور خدمات سرانجام دیں بلکہ فلاحی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور لوگوں کے مسائل کے حل کے لئے اپنی زندگی وقف رکھی۔ لوگوں کے ہر قسم کے مسائل کے حل میں باقاعدہ عملی طور پر انہوں نے حصہ لیا اور بے شمار لوگوں کو باروزگار بنایا۔ ذاتی رہائش قائداعظم سٹریٹ نواب آباد واہ کینٹ میں ہے۔ اب والدِ محترم علامہ محمد یوسف جبریلؒ کا مزار مبارک ملک آباد میں تعمیر ہوا ہے، وہاں پر بھی ان کو ڈیوٹی سرانجام دینا پڑتی ہے۔ ذکر و فکر اور درود شریف کی محفلوں کا انعقاد کرواتے ہیں۔ انہوں نے درود شریف کی ایک ملکی سطح کی تنظیم " بزمِ جمالِ مصطفیٰ ﷺ " قائم کر رکھی ہے اور ہفتہ میں کروڑوں مرتبہ درود شریف پڑھوا کر آقا نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں بھجواتے ہیں۔ انوار چوک میں جناب محمد اقبال حاجی صاحب اس سلسلہ میں بہت تعاون کرتے ہیں اور لوگوں کو درود شریف کی کتابیں، تسبیحات اور جملہ تمام ضروریات ان کی وساطت سے پوری کی جاتی ہیں اور اس طرح درود شریف کا یہ سلسلہ دن بدن

ترقی کرتا جارہا ہے جو حاجی یا عمرہ پر جاتے ہیں ان کو کروڑوں میں درود شریف دیا جاتا ہے تاکہ وہ لوگ آقا نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں یہ درود شریف خود بہ نفسِ نفیس پیش کریں۔ کئی دوستوں کو حج اور عمرہ کی سعادت حاصل ہوئی۔ شوکت اعوان کے دو بھائی خالد ملک اور طاہر اعوان ہیں۔ خالد ملک کینیڈا میں ملازمت کے ساتھ ساتھ علامہ صاحب کے مشن پر بھی کام کر رہے ہیں، جب کہ طاہر اعوان صاحب پی او ایف واہ کینٹ سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ خالد ملک کی محنت سے علامہ صاحب کی کتاب The Miracles of the Quran دو جلدوں میں کینیڈا سے شائع ہوئی ہے۔

شوکت اعوان صاحب کی 1982ء میں سرگودھا میں اپنے ماموں علی محمد ملک کے ہاں شادی ہوئی۔ شوکت اعوان صاحب کے دو بیٹے رضوان یوسف اور فرحان یوسف تھے۔ فرحان یوسف اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔

یہ خاندان 1972ء میں لاہور سے واہ کینٹ آیا۔ اس وقت علامہ محمد یوسف جبریل لاہور میں مصری ایمبیسی میں ملازم تھے، وہیں پر محکمہ اوقاف میں ریسرچ انویسٹی گیٹر اور بادشاہی مسجد لاہور میں تبلیغ سیکشن میں خدمات بھی سرانجام دیں۔ شوکت اعوان تنظیم الاعوان واہ کینٹ کے پبلسٹی سیکرٹری بھی رہے، تنظیم الاعوان پاکستان واہ کینٹ کے سرپرست اعلیٰ ملک عمر حیات، سرپرست ملک فتح خان آف اوچھالی، صدر ڈاکٹر ملک عبدالحفیظ اعوان، جنرل سیکرٹری ملک فضل امین اعوان اور سیکرٹری مالیات ملک فخر عالم اعوان تھے، شوکت اعوان بعد میں ادارہ تحقیق الاعوان پاکستان کے جنرل سیکرٹری بنے، وہ ملک محبت حسین اعوان کے ساتھ مل کر اعوان قبیلہ کی تاریخ پر کام کرتے رہے، جس کے نتیجے میں اعوان علوی قبیلے پر بے شمار کتب معرضِ وجود میں آئیں، جن میں اعوان قبیلہ کی تاریخ محفوظ ہوئی۔ واضح ہو کہ شوکت محمود اعوان کا کردار ہمیشہ خاموش مجاہد کا رہا ہے۔ انہوں نے علم دوستی اور تحقیق و جستجو کے جذبے سے سرشار ہو کر ملک محبت حسین اعوان کو شہر شہر اور قریہ قریہ بکھرا ہوا مواد تلاش کر کے فراہم کیا جو ان کی علم دوستی اور اعوان قبیلے سے لازوال محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

شوکت اعوان تنظیم الاعوان واہ کینٹ کے پبلسٹی سیکرٹری بھی رہے۔ وہ ادارہ تحقیق الاعوان پاکستان کے پہلے بانی جنرل سیکرٹری ہیں۔ کتب کی اشاعت کا یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ اسلامی فلاحی تنظیم وادی سون سکیسر خوشاب کے سرپرست اعلیٰ حضرت علامہ محمد یوسف جبریل مقرر ہوئے تو ملک محمد بخش اعوان صدر اور عمر حیات ضیا اعوان، جب کہ ملک شوکت محمود اعوان پبلسٹی سیکرٹری رہے۔ ZA 1812 نزد جامع مسجد حنفیہ غوثیہ حاجی بوستان پیر ودھائی راولپنڈی میں اس تنظیم کا دفتر تھا جہاں وادی سون سکیسر کے لئے ترقیاتی کاموں کے لئے باقاعدہ اجلاس ہوتے تھے اور وادی سون کے لئے ترقیاتی پروگراموں میں حکومت سے مل کر کوشش کی جاتی تھی اس طرح وادی سون کو بجلی کی سہولتیں میسر آئیں اور وہاں کے عوام کو ملازمتیں ملیں۔ تنظیم نوائے سون کے زیرِ اہتمام اشاعتی کام بھی ہوا۔ بعد میں یہی مشن لے کر ملکی سطح اور غیر ملکی سطح پر تحقیقی کام کرتے رہے اور علامہ یوسف جبریلؒ کی کتب کو امریکہ میں اشاعت کے سبب بنے۔ شوکت اعوان یوسف جبریل فاؤنڈیشن کے سرپرست اعلیٰ ہیں۔ والد محترم کے علمی کام کی اشاعت میں بھرپور مددگار ہیں۔ محبت ان کی زندگی کا مقصد ہے اور خدمت انسانیت کے شیدائی ہیں۔ ان کی کوششوں سے یوسف جبریل فاؤنڈیشن پاکستان کا قیام عمل میں لایا گیا ہے اور ملک بھر میں اس کی ممبر سازی شروع کر دی گئی ہے۔ اس تنظیم کا مقصد فلاحی اور علمی فروغ ہے۔

شوکت اعوان عوامی سماجی لیگل ایکشن کونسل ٹیکسلا واہ کینٹ کے اراکین مجلس میں بھی شامل رہے، جس کا مقصد عوامی مسائل کو حل کرانا تھا اور جدوجہد کرنا تھا اخبار اور اداروں کے تعاون سے لوگوں کے مسائل حل کروانا تھا۔اس کونسل کے چیئرمین قاضی عارف حسین ایڈوکیٹ ہائی کورٹ تھے، ممبران میں ڈاکٹرعبدالحفیظ علوی، ڈاکٹر قاضی محمد سلیم مجددی صاحب، پروفیسر اختر علی شاہ صاحب، محترم خادم حسین جعفری صاحب، امر الہیٰ پروانہ، فضل غنی ایم اے، چن زیب، محمد عامر نعیم اور ایم عزیز کوثر ایڈوکیٹ شامل تھے۔اس کونسل نے عوام کی بھرپور خدمت کی اور عوامی مسائل کو صفحہء قرطاس پر لا کر حل کرانے کی بھرپور کوشش کی۔

مجلس تصنیف وتالیف پاکستان بلال پلازہ واہ کینٹ میں قیام عمل میں لائی گئی، سرپرست اعلیٰ علامہ محمد یوسف جبریل، سرپرست محمد اقبال کوکب ایڈووکیٹ، اراکین مجلس میں امتیاز عارف، طفیل کمال زئی، ڈاکٹر عبدالرزاق خان، ایم عالم ناز، ظفراللہ خان، احمد جلیل، شاکر کنڈان، خادم حسین جعفری، پروفیسر اختر علی شاہ، شوکت محمود اعوان، فرزانہ انجم، نجمہ یاسین، عثمان انجم، نعمان عارف شامل تھے۔جناب قاضی عارف حسین اور ڈاکٹر عبدالحفیظ علوی بھی اس مجلس کے ناظمِ اعلیٰ اور ناظمِ عمومی تھے۔اس تنظیم کا قیام اس لئے عمل میں لایا گیا کہ تصنیف وتالیف کو عام کیا جائے اور شعری مجموعوں کی اشاعت کے ساتھ ساتھ نثری کتابوں کو منظرِ عام پر لانے کی کوشش کی جائے۔

پاکستان کی سیاحت و ثقافت کو اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ علمی و ادبی پروگراموں کو دیارِ غیر اور ملکِ پاکستان میں جاری رکھنے کا سلسلہ بزمِ ندرتِ فکر کے ساتھ رہا جس کے چیف آرگنائزر جاوید اقبال مغل تھے۔شوکت اعوان اس تنظیم کے ابتدائی عہدے دار تھے۔اس تنظیم کے تحت پاکستان میں بے شمار پروگرام کئے گئے جس میں انہوں نے نہایت دلچسپی سے کام کیا۔جاوید اقبال مغل انتہائی محنتی انسان تھے۔انہوں نے انسانیت اور ملک کی ترقی کے لئے بہت شدومد سے کام کیا۔شوکت اعوان ان کی ٹیم کا حصہ تھے۔جاوید اقبال مغل نے رات دن کی محنت سے بزم کے نیک مقاصد کی مدد سے عوام کی بھرپور خدمت کی۔پاکستان کا نام بلند کیا۔پاکستان کی ثقافت اور سیاست کو فروغ دیا۔علمی پروگراموں کی ایک تفصیل ہے۔واہ کینٹ میں کئی اجلاس کئے جاتے تھے جس میں شوکت اعوان اس تنظیم کے روح رواں تھے۔اب ماشااللہ بزمِ ندرتِ فکر اپنی زندگی کے اکتالیس سال مکمل کر چکی ہے اور بے شمار محنتی اور مدبر لوگ اس تنظیم میں شامل ہیں، بے شمار علمی وادبی اور سیاسی شخصیات کو سکولوں کالجوں میں مدعو کیا جاتا ہے اور علم و ثقافت کو حقیقی طور پر فروغ دیا جاتا ہے۔سکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں بے شمار پروگرام کئے جاتے ہیں۔طلبا میں نظریۂ پاکستان کو زندہ رکھنے کے لئے اس تنظیم کا بہت اہم کردار ہے۔

ادب کی تحریک و تخلیق و ترویج میں بھی ان کو بہت زیادہ دلچسپی ہے۔بچپن میں شعر لکھے اور علامہ صاحب نے جب دیکھے تو ان کی بیاض کو آگ لگادی اور کہا کہ ایک گھر میں دو شاعر نہیں رہ سکتے۔آپ سائنس پڑھیں اور اعلیٰ تعلیم حاصل کریں۔اللہ تعالیٰ نے آپ سے کچھ کام لینا ہے۔ بدنصیبی کہ ایف ایس سی تک سائنس باقاعدہ سکول کالج میں پڑھی بعد میں ناگفتہ بہ حالات ہوگئے تو آرٹس کی طرف مجبوراً آنا پڑا لیکن اٹامک انرجی میں گئے تو وہاں اپنے سائنس دان اساتذہ سے ایٹمی سائنس میں کافی مہارت حاصل کی اور اعلیٰ سائنس اور ٹیکنالوجی کا بھی مطالعہ کیا۔البتہ دورانِ ملازمت شارٹ ہینڈ، اور آفس سے متعلقہ کورس کئے۔نوکری کے دوران تمام اعلیٰ فوجی، سول، ایٹمی سائنس دانوں اور اعلیٰ مذہبی سکالروں، فقیروں، درویشوں

اور اولیائے کرام کی شفقت کے زیرِ اہتمام بہت کچھ سیکھا۔ دورانِ ملازمت اعلیٰ افسران کے لیکچرز، سپیچز، ٹاک وغیرہ لکھنے میں مہارت حاصل کی۔ اعلیٰ علمی وادبی، روحانی اور سائنسی شخصیات کے ساتھ مل کر کام کرنے کا سلیقہ اور جذبہ حاصل کیا۔ بڑی بڑی سائنسی اور علمی شخصیات کے ساتھ کام کرنے پر کافی سمجھ بوجھ حاصل ہوئی اور زندگی میں خلوص کا سبق بھی انہی لوگوں سے سیکھا اور ساتھ ساتھ تعلیم میں جو کمی رہ گئی تھی وہ بھی پوری ہو گئی۔ اس دوران کئی تحقیقی کتب شائع کروائیں اور ساتھ ساتھ ادبی کتب بھی شائع ہوئی۔ کئی ادبی تنظیموں سے وابستہ رہے اور ان کے اجلاسوں میں باقاعدہ شریک ہوتے تھے اور ادبی ماحول کو بہتر سے بہتر بنانے میں انہوں نے اہم کردار ادا کیا۔ بہت سارے ادیب دوستوں کے ساتھ ادبی کتب کی اشاعت پر ان کو مدد فراہم کی۔ ان کے والدِ محترم نے جو تصانیف لکھیں ان کی اشاعت شوکت اعوان نے کی اور اب بھی اسی میں مصروف ہیں۔ شوکت اعوان بنیادی طور پر ایک مذہبی اور فقیر صفت انسان ہیں اور انہوں نے دینِ متین کی بھرپور خدمت کی ہے۔ سادہ زندگی اور اخلاص کا ایک پیکر ہیں اور غریبوں، مسکینوں، یتیموں اور بیواؤں کی مدد میں شاملِ حال رہتے ہیں۔ لوگوں کی تعلیمی نظام میں مددگار ثابت ہوئے ہیں اور بے شمار لوگوں کو ملازمت دلوانے میں اہم کردار ادا کیا ہے جس کی وجہ سے عوام میں ان کا ایک خصوصی احترام موجود ہے۔ دنیا سے ان کی تعلق واجبی ہے۔ فقراء درویش، اور قلندرانہ مزاج رکھنے والے اشخاص سے ان کا دلی لگاؤ ہے۔ لوگوں کی فلاح وبہبود کے لئے بے پناہ جدوجہد کی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے محکمہ کے افسرانِ بالا کے ساتھ ساتھ سٹاف اور چھوٹا طبقہ بھی ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ دورانِ سروس کلاسیفائڈ ڈاکومنٹس کو محفوظ رکھنے کا بھی تجربہ حاصل کیا اور ملک اور قوم کی حفاظت کرنے میں سیکیورٹی اداروں کا بھرپور تعاون کیا۔ تحفظِ پاکستان کے لئے ہمیشہ دعائیں کی اور ملک وملت کی بھرپور خدمت سرانجام دی۔ ملکی تحفظ کے کئی کاموں میں شریک ہوئے اور ملکِ پاکستان کو محفوظ رکھنے میں اہم کردار ادا کیا۔

فاروقِ اعظم ویلفیئر سوسائٹی پاکستان ٹیکسلا کینٹ ایک غیر سیاسی فلاحی تنظیم تھی جس کا مقصد عوام کی بلاامتیاز خدمت تھا۔ ٹیکسلا کے عوام کے مسائل کے حل کے لئے اس تنظیم کی مدد سے بہت سارے مسائل حل ہوئے۔ لوگوں میں جذبہء حب الوطنی اجاگر کی گئی۔ لوگوں کے مسائل کے حل کے لئے اعلیٰ حکام اور انتظامیہ سے رابطہ کیا گیا۔ اس سوسائٹی کو فعال بنانے میں شوکت محمود اعوان، رشید مغل اور خالد شفیق خالد نے اہم کردار ادا کیا۔

علامہ محمد یوسف جبریلؒ کے صاحبزادے شوکت محمود اعوان اپنے والد گرامی سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور مسلسل محنت، لگن اور تگ ودو کے ذریعے ان کے علمی مشن کے فروغ کے سلسلے میں سرگرمِ عمل رہتے ہیں۔ ان کی مرتب کردہ شعری تصنیفات ، سوز جبریل، خواب جبریل، غزلیات جبریل کی اشاعت بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس میں علامہ محمد یوسف جبریلؒ کی شاعرانہ صلاحیت کا بھرپور اظہار ملتا ہے۔

شوکت محمود اعوان ''تحقیق الاعوان پاکستان'' کے جنرل سیکرٹری ہیں۔ ان کا مزاج محققانہ ہے اور وہ اعوان قبیلے کی تاریخ مرتب کرنے کے سلسلے میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ انہوں نے علوی اعوان قبیلہ، اعوان تاریخ کے آئینے میں، اعوان گوتیں، تحقیق الانساب، نسب العلویہ، سیادت علویہ، تاریخ سیادت اعوان، تاریخِ قطب شاہی اعوان دس جلدوں میں اِن کی ترتیب وتدوین میں مخلصانہ کاوش کے ذریعے گراں مایہ مواد کی تلاش میں اہم کردار ادا کیا۔ واضح ہو کہ وہ ایک مخلص اور بے لوث انسان ہیں۔ انہوں نے صرف علم دوستی اور اخلاص بے پایاں کے جذبے سے سرشار ہو کر مختلف

محققین کے علمی کام کے سلسلے میں ان سے بھرپور معاونت کی ہے۔ وہ نام ونمود اور شہرتِ دوام کی آرزو نہیں رکھتے۔ علامہ محمد یوسف جبریلؒ کے فرزند اور جانشین ہونے کی حیثیت سے ان کے سینے میں بھی ملتِ اسلامیہ کا درد بے پایاں ہے۔ علم وآگہی، تحقیق و جستجو اور دانش و بینش نہ صرف انہیں وراثت میں ملی ہے بلکہ ان کا اوڑھنا بچھونا بھی ہے۔ علامہ محمد یوسف جبریلؒ کی فکری کاوشوں اور ان کے علمی کام کو ترتیب دینے میں ان کی عمرِ عزیز کا اکثر حصہ صرف ہوا ہے۔ ابتداء سے لے کر اب تک علامہ محمد یوسف جبریلؒ کی کتب کی نہ صرف خود کمپوزنگ کی انہیں ترتیب دیا بلکہ ان کی اشاعت کے سلسلے میں بھی بے مثال خدمات انجام دی ہیں۔ وہ اعوان قبیلے کی تاریخ مرتب کرنے کے سلسلے میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ واہ کینٹ میں ہر سال عید میلاد النبی ﷺ کے تمام سالانہ جلوسوں کے انتظامی امور میں شرکت کر کے عشقِ رسول ﷺ کا والہانہ ثبوت فرماتے ہیں۔ وہ پاکستانی معاشرے میں ایک مثبت تبدیلی کے خواہش مند ہیں، وہ یہ چاہتے ہیں کہ پاکستان میں عدل وانصاف، مساوات، معاشی استحکام اور اسلامی جمہوریت کا نظام آئے۔ شوکت محمود اعوان کو ایک سوشل ریفارمر علم دوست اور زبردست محقق قرار دیا جاسکتا ہے۔

شوکت محمود اعوان ایک روحانی سلسلہ سے وابستہ ہونے کی وجہ سے اسلامی تاریخ اور علمِ تصّوف سے بھی گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔ لہذا قوی امید ہے کہ وہ بھی ایک دن علمی دنیا کے سامنے اپنے غیر معمولی تحقیقی مزاج کے سبب تاریخ صوفیائے علویہ اعوان اور تذکرہ ءادباء و شعرائے اعوان پر اہم علمی کام لے کر ادبی دنیا کے سامنے آجائیں گے۔ فکر جبریل کا فروغ ان کا مقصدِ حیات ہے۔ سوز جبریل کی اشاعت شوکت محمود اعوان کے ادبی ذوق ،علم دوستی اور علامہ محمد یوسف جبریل کے افکار و نظریات سے والہانہ لگاؤ کا بھرپور اظہار ہے۔ علامہ محمد یوسف جبریلؒ کی قومی شاعری میں سے انتخاب قابلِ ذکر ہے۔

اخلاص و وفا کی سراپا تصویر، مجسمہ ءایثار، علم و عمل کے راستے پر گامزن درویشی کا خرقہ اوڑھے ہوئے ملک شوکت محمود اعوان اپنی منزل کی طرف کشاں کشاں بڑھ رہے ہیں۔ وہ تحریکِ تحفظ واستحکام پاکستان کے صفِ اول کے سپہ سالاروں میں سے ہیں۔ وہ سر پر کفن باندھ کے اس تنظیم کے پلیٹ فارم سے پاکستان کی نظریاتی وجغرافیائی سرحدوں کی حفاظت کے لئے سر گرمِ عمل ہیں۔ ان کا منتہائے مقصود وطنِ عزیز سے نسلی، علاقائی اور لسانی تعصّبات کا خاتمہ ہی نہیں بلکہ مغربی استعمار کی تیزی سے بڑھتی ہوئی ریشہ دوانیوں کا قلع قمع بھی ہے۔ وہ سربکف مجاہد ہیں جو پاکستان میں اجلی اور روشن صبح جمہوریت کے طلوع ہونے کے بھی منتظر ہیں۔ شوکت محمود اعوان ایک فرد ہی نہیں بلکہ ایک پورے عہد کا نام ہے۔ انہوں نے عمر بھر علم و آگہی کی جستجو کی ہے۔ حقائق و معارف تک رسائی ان کا مقصدِ اوّلین قرار پاتا ہے۔ شوکت محمود اعوان نے اہلِ علم وادب کے سامنے ہمیشہ زانوئے تلمذ تہہ کیا ہے۔ راولپنڈی اسلام آباد کے کسی بھی ادبی حلقے کا اجلاس ہو یا کسی معروف اہلِ قلم کے ساتھ شام، وہ وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ آپ کے اپنے عہد کے مشاہیرِ علم وادب سے گہرے قلبی روابط استوار رہے ہیں۔ وہ علاقے بھر کے مذہبی راہنماؤں اور دانش وروں میں گھل مل جاتے ہیں۔ تازہ آنے والی کتابیں ہمیشہ ان تک پہنچ جاتی ہیں۔ اُنہوں نے قرطاس و قلم سے گہرا قلبی رابطہ استوار رکھا ہے جس نے ان کی شخصیت میں توازن واعتدال اور حسن و جمال پیدا کر دیا ہے۔ وہ اولیاء اللہ اور فقرا کے ساتھ ایک نسبتِ خاص رکھتے ہیں۔ درویشوں سے یہ تعلقِ خاطر، انہیں دن بدن عجز وانکساری، تواضع و خدمت اور عبادت وریاضت کے قریب تر لئے جارہا ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو کہ وہ ایک ممتاز شاعر، فلسفی، فقیر ودرویش علامہ محمد یوسف جبریلؒ کے فرزندِ

ارجمند ہیں۔ علامہ محمد یوسف جبریلؒ مسلم فقر کی جیتی جاگتی تصویر تھے۔ وہ اپنی گدڑی میں ایک ایسے لعل تھے جنکے لباسِ خاکی پر سنتِ رسول ﷺ کی پیروی میں چودہ پیوند لگے رہتے تھے۔ علامہ محمد یوسف جبریلؒ صوفیانہ مزاج کے حامل انسان تھے، ان کی زندگی کا مقصد اسلام کی نشاۃ ِ ثانیہ اور طاغوتی نظام کا خاتمہ تھا۔ اُن کی کتب میں نغمہء جبریل آشوب، سوزِ جبریل، فلسفہ تخلیقِ کائنات، اسلامی بم، اسلام کا معاشی نظام، سوئے منزل، فقرِ غیور، حطمہ، سوانح حیات، کن فیکون، چڑیا گھر کا الیکشن، گل ہائے رنگا رنگ جلد اوّل، چراغِ فکر جلد اوّل کے علاوہ کئی اور کتب بھی اُنہوں نے شائع کیں۔ خدائے بزرگ و برتر ایسی نیک اور سعادت مند اولاد ہر ایک کو نصیب کرے جو اپنا خونِ جگر دے کر بھی مرحوم باپ کے فن پاروں کو زمانے کی دسبرد سے بچانے کے لئے سرگرمِ عمل ہیں۔

عنایت اللہ صاحب ۱۴ اپریل ۱۹۳۵ء کو محلّہ فتح پورہ، ضلع گجرات میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام محمد حسین تھا جو سرکاری ملازم تھے۔ وہ فقیر منش اور علماء سے صحبت رکھنے والے انسان تھے۔ آپ کے والد صاحب نے آپ کو فنِ خطابت کی تربیت دی وہ عطااللہ شاہ بخاری سے متاثر تھے۔ عنایت اللہ صاحب نے پرائمری مشن سکول گجرات سے پاس کی۔ ساتویں میں والد کا اور آٹھویں جماعت میں والدہ کا انتقال ہو گیا۔ اسکے بعد سرگودھا چک 84 جنوبی میں سکونت اختیار کی۔ 1956ء کے آخر میں لاہور چلے گئے۔ بطورِ کلرک پنجابی فاضل، ایف اے، بی اے اور پھر ایم اے اُردو کا امتحان پنجاب یونیورسٹی سے پاس کیا، اسسٹنٹ فوڈ کنٹرولر کا امتحان پاس کیا اور دس سال تک اسسٹنٹ فوڈ کنٹرولر رہے اور پھر 1983ء میں ڈسٹرکٹ فوڈ کنٹرولر رہنے کے بعد 1997ء میں ریٹائرمنٹ لے لی۔ آپ کا شمار واصف علی واصفؒ کے انتہائی قریبی رفقاء میں سے تھا۔ 1958ء میں پہلی ملاقات کے بعد 1983ء تک اُن کی صحبت میں رہے۔ حضرت واصف صاحب کے ہمراہ آپکی ملاقاتیں بہت اہم اہم شخصیات سے ہوئیں۔ 1965ء میں واصف صاحب کے ساتھ شیخ وزیر علی صاحب کے پاس قرآن کی تشریح سننے کیلئے قصور جانا معمول تھا اور یہ سلسلہ تین سال تک جاری رہا۔ مشن کے متعلق لٹریچر کا آغاز شاعری کی صورت میں ہوا پھر پروفیسر احسان اکبر کے مشورے سے نثر لکھنی شروع کی۔ کتابوں کی ترتیب کیلئے شوکت محمود اعوان، جنرل سیکرٹری ادارہ افکار جبریلؒ، جنرل سیکرٹری ادارہ تحقیق الاعوان نے اپنی خدمات پیش کیں اور انہی کی سرپرستی میں یہ کام جاری رہا۔ آئینہِ وقت، صدائے وقت، ندائے وقت، آوازِ وقت، چراغِ وقت وقفے وقفے سے چھپ کر آتی رہیں۔ آپ نے تمام مادہ پرست مذہبی، سیاسی، فوجی سربراہوں، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کے خلاف عوامی کورٹ میں کیس اندراج کراتے ہوئے موجودہ سیاسی ڈھانچہ کو مسترد کرتے ہوئے شورائی نظام کے ساتھ تقابلی جائزہ دیتے ہوئے فیصلہ عوام اور عدلیہ پر چھوڑ دیا ہے۔

عنایت اللہ گلوبل ریسرچ سنٹر کا قیام عمل میں لایا گیا، جس کے پلیٹ فارم سے حضرت واصف علی واصفؒ کا مشن پھیلانے کا کام شروع کیا گیا۔ فیضان غنی سیکرٹری اور شوکت محمود اعوان اس کے جنرل سیکرٹری تھے۔ گولڑہ موڑ پر واقع مقدم ہاؤس میں اس سنٹر نے فکرِ واصفیات کی توسیع کے لئے اہم کردار ادا کیا، ریسرچ سنٹر سے گیارہ کتابیں جمہوریت کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے لکھی گئیں۔ چوہدری عنایت اللہ صاحب کی سرپرستی میں ایک سو چالیس کنال رقبہ پر القائم یونیورسٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ جہاں پر مختلف ملکوں کی لینگوئج پر تحقیق کی جائے گی اور پاکستانی طالب علموں کو دنیا کی تمام زبانیں پڑھائی جائیں گی شوکت اعوان فلاحی کاموں میں ہمیشہ آگے رہے۔ اتفاق کالونی، ترنول کے عوام کو بجلی کی بہت تکلیف تھی، ان کی کاوشوں سے وہاں نہ صرف سوئی گیس لگوائی گئی بلکہ وہاں کے عوام کو بجلی بھی مہیا کی گئی۔ شوکت محمود اعوان نے مختلف اخبارات میں ایڈیٹر کے نام سینکڑوں خطوط

لکھے، وہ اپنے علاقے کے مسائل کی ہمیشہ ترجمانی کرتے رہے۔ نتیجتاً واہ کینٹ میں عوام کی مشکلات پر قابو پانے میں کافی مدد ملی۔ ان کے عوامی مسائل اور شکایات پر مشتمل ہزار کے قریب خطوط روزنامہ نوائے وقت، روزنامہ جنگ، روزنامہ عوام، روزنامہ اوصاف، روزنامہ اساس، اور دیگر اخبارات میں شائع ہوئے۔ وہ مختلف انتظامی اداروں کو بھی خطوط لکھتے تاکہ لوگوں کے مسائل حل ہوں، جن میں واپڈا، ٹیلی فون اور گیس کے دفاتر سرفہرست تھے۔ اس طرح انہوں نے واہ کینٹ کی تاریخ میں اپنا نام پیدا کیا۔

شوکت محمود اعوان نے پورے پاکستان کے تمام اخبارات، رسائل، جرائد کے مکمل ایڈریسز اور رابطوں پر مشتمل ایک وقیع کام کیا ہے جس کی وجہ سے ملک بھر کے اہلِ قلم تک رسائی ممکن ہو گئی ہے۔ واضح ہو کہ ان کو اس انتہائی تکلیف دہ، جان توڑ اور دل گداز کام ہی کی بنیاد پر ایم فل کی ڈگری دی جا سکتی ہے۔ وہ ایک وسیع ذخیرہ کتب رکھتے ہیں اور علمی موضوعات پر مضامین و کتب کی تلاش ان کا مقصدِ وحید ہے۔ شوکت محمود اعوان حضرت سلطان باہوؒ، بری شاہ لطیفؒ، داتا گنج بخشؒ، میاں محمد بخش، میراں حسین زنجانیؒ، پیر مہر علی شاہؒ سے لے کر سائیں سہیلی سرکارؒ، گھمکول شریفؒ، سیالؒ شریف، چورہؒ شریف، کاکا جی سرکارؒ، میراںؒ شریف، مکان شریف، شیخ داؤد بلہوٹؒ، سائیں یوسف سرکارؒ، باباجی لعل شاہ سرکارؒ، بابا سخی خوشحالؒ بابا، بابا مقبول شاہؒ، پیر بابا محبوب عالم سرکارؒ، کہوے والاںؒ سون سکیسر خوشاب کے علاوہ بے شمار گدیوں سے بے پناہ عقیدت رکھتے ہیں اور وہاں حاضریاں دیتے ہیں۔ ان پر فقراء کی خصوصی نظر ہے، جس کی وجہ سے انہیں متعدد روحانی خلافتیں مل چکی ہیں، جن میں نوشاہی سلسلہ، سائیں سہیلی سرکارؒ، سائیں رشید سرکارؒ، سائیں غلام حسین سرکار، سیفی سلسلہ سرفہرست ہیں۔ بابا فضل شاہؒ لاہور کی طرف سے بھی ڈاکٹر وارث صاحبؒ کی معرفت انہیں وظائف واوراد کی بالخصوص اجازت ملی ہے۔

شوکت محمود اعوان نے اپنے والدِ مکرم کے علمی مشن کو آگے بڑھانے کی ذمہ داری لی ہے۔ اگر فقرا کے آستانوں، ذکر و فقر کی محفلوں، علمی مباحثوں اور فکری موضوعات پر گفتگو کے سیمناروں میں ایک ایسے شخص کو دیکھیں جس کے دائیں اور بائیں ہاتھ میں کتابوں کے تھیلے ہوں گے۔ یا کاندھے پر کتابوں کا ایک ڈبہ اٹھائے ہوں گے۔ جو وہ لوگوں میں تقسیم کر رہے ہوں تو سمجھ لیں کہ یہی شوکت محمود اعوان ہیں۔ قلم اور کتاب سے یہ رشتہ لائقِ صد تکریم ہے۔ کیونکہ کتابیں انسان کے فکر و نظر میں تغیر و تبدل پیدا کر کے معاشرے میں مثبت سوچ پیدا کرتی ہیں۔ علم کی ترسیل اور مسلم ثقافت کی آئندہ آنے والی نسلوں میں منتقلی ہم سب کا مشترکہ مشن ہے، جسے دورِ جدید میں اکیلا شوکت محمود اعون ایک سو اسی کلو میٹر فی گھنٹہ کی طوفانی رفتار سے سرانجام دے رہا ہے۔ واضح ہو کہ یہ کتابیں درود شریف سے لے کر اسلامی انقلاب کی منزل تک کے راستے کی نشان دہی کرتی ہیں۔

شوکت اعوان گندھارا ریسورس سنٹر کے ساتھ وابستہ ہوئے جس میں ٹیکسلا کی تاریخ اور ثقافت پر علمی کام میں بھی شرکت کی۔ انہوں نے گندھارا ثقافت پر کام کیا۔ اور ادارہ کے ساتھ مل کر تحقیقی کام میں مکمل دلچسپی لی۔

شوکت محمود اعوان باباجی عنایت اللہ جسے سلسلہ ءواصفیہ کے بزرگوں سے بے پناہ تعلقِ خاطر رکھتے ہیں جنہوں نے ندائے وقت، صدائے وقت، چراغ وقت، بلائے وقت، نادوقت، سادوقت، جیسی شہرہ آفاق کتب لکھی ہیں جن پر بانو قدسیہ، اشفاق احمد، جنرل گل حمید صاحب، علامہ یوسف جبریل، ڈاکٹر تصدق حسین صاحب جیسی ہستیوں کی آراء شامل ہیں۔ یہ تمام کتابیں شوکت محمود اعوان نے شائع کیں اور ان کی ترتیب کا فریضہ سرانجام

دیااور پوری دنیامیں پھیلائیں۔ باباجی عنایت اللہ، اشفاق احمد، واصف علی واصف، بانو قدسیہ کے فکری منطقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہی وہ راستہ ہے جسے شوکت محمود اعوان ہمتِ مردانہ اور جرأتِ رندانہ سے طے کرنے میں مصروف ہیں۔ یہ راستہ مخلوق کو خالق سے ملانے اور انسانیت کی خدمت کا ہے۔ یہ شمع عشقِ رسول ﷺ ہے جو دلوں کو ایمان کے نور سے روشن کرتی ہے۔ نفس اور شر کے خطرات سے بچاتی وساوس کو دور کرتی ہے اور صرط مستقیم پر چلانے میں مدد و معاون ہوتی ہے۔ میرے مرشد اور مربی حضرت قبلہ السید آصف علی زنجانیؒ قادری سے بھی انہیں شرفِ ملاقات اور نیاز حاصل ہے اور ان کی بھی ان پر خصوصی نظر ہے۔ خدا کرے کہ شعور و تہذیب کے سفر پر چلنے والا یہ مسافر ابدی حیات حاصل کرے اور اسے خداوند کریم عمرِ خضر عطا فرمائے۔ شوکت محمود اعوان جیسے لوگ معاشرے اور انسانیت کے لئے سرمایہ افتخار ہیں۔ ضلع خوشاب اور اعوان قوم کو ہی نہیں پورے پاکستانی معاشرے کو ان پر فخر ہے۔ ان کا تعارف اور علمی کارنامے تاریخ و ثقافت کا اہم حصہ ہیں جنہیں محفوظ رکھنے کی اوّلین ضرورت ہے۔ خدا کرے تم جیو ہزار برس ہر برس کے ہوں پچاس ہزار۔ اللہ تعالیٰ ان کا حامی و ناصر ہو۔ آمین ثم آمین۔

فصل 2۔ علامہ محمد یوسف جبریل کا شوکت محمود اعوان کے نام ایک خط:

از لاہور، مورخہ: 5 اکتوبر، 1968ء

بخدمت عزیزم شوکت اعوان سلامت رہو!

بعد دُعا پیار کے واضح ہو کہ خط تمہارا ملا۔ پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ آج مبلغ پچاس روپے کوارٹر کے پتے پر بھیج دیئے ہیں۔ اطلاع دینا، خوب محنت سے پڑھو اور ہو سکے تو انگریزی کی کوئی اچھی سی کتاب کسی اچھے مصنف کی لکھی ہوئی یاد کر لو۔ انگریزی میں خوب قابلیت ہو جائے گی۔ کسی بھی زبان کو یاد کرنے کا یہ بڑا اچھا طریقہ ہے۔ گھر سے طاہر محمود نے خط لکھا ہے۔ خیریت لکھی ہے۔ مبلغ ایک صد روپیہ آج ان کو ارسال کر دیا ہے۔ میں سر توڑ کر شش کر رہا ہوں ''امروز'' میں مضمون نکلنے شروع ہو گئے ہیں۔ مورخہ 68-10-4 کو پہلا مضمون نکلا ہے، امید ہے انشاءاللہ مورخہ 10 اکتوبر، 1968ء کو دوسرا مضمون چھپ جائے گا۔ مشرق کے مضمون کا بڑا انتظار ہے۔ وہ چھپ گیا تو انشاءاللہ بہت سے کام درست ہو جائیں گے۔ پیر بہاول شیر کا خط آیا ہے۔ خیریت لکھی ہے۔ 68-10-15 کو راولپنڈی میں تاریخ ہے۔ فضل الٰہی، علی محمد، عزیزم غلام علی کو فرداً فرداً سلام، غلام عباس، ظفر، نور بھری، ہمشیرہ فتح خاتوں کو خیریت کا پوچھنا۔ بچوں کو پیار۔ تعویز بیچ میں ہے۔ اسے مندھانی کے ساتھ باندھ دیں۔

فقط

علامہ یوسف جبریل

فصل 3۔ علامہ صاحب کا مفصل خط اپنے بیٹے شوکت محمود اعوان کے نام:

یہ علامہ صاحب کا ایک ایسا مفصل خط ہے جو آپ نے ۱۰ جون 1970ء کو اپنے بیٹے شوکت محمود کو لکھا تھا۔ اس میں بہت سی خانگی باتوں کا بھی ذکر ہے۔ ان مہربانوں کا بھی جنہوں نے علامہ صاحب اور ان کے خاندان کے لئے مشکلات پیدا کیں اور علامہ صاحب کی ان کتابوں کا تذکرہ بھی شامل ہے جن پر وہ ترجیحی بنیاد پر توجہ دے رہے تھے تاکہ وہ شائع ہو جائیں۔ '' مجھے یہ سیڑھی جو میری آخری سیڑھی ہے چڑھ جانے دو۔ میں نے اس کے لئے عمر بھر

بے حد محنت کی ہے"۔ یہ الفاظ علامہ صاحب کے ہیں جو اسی خط کا حصہ ہیں اور علامہ صاحب کی علمی فتوحات اور تصانیف کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ چند ایک سطور جو عدو کے بچھائے ہوئے کانٹوں کے حوالے سے تھیں، بوجوہ حذف کر دی گئی ہیں۔ علامہ صاحب کی اپنی بھی یہی خواہش تھی کہ وہ دشمنوں کو معاف کر چکے ہیں۔ اس لئے اب کسی بھی تحریر میں ان کا کھل کر تذکرہ نہ کیا جائے۔ بھلا عفو و درگذر کے اس نکتے کو حضرت علامہ صاحب سے بہتر اور کون سمجھ سکتا تھا۔ آپ نے اپنی اولاد کو بھی اسی کی تلقین کی اور شوکت محمود کے نام اس خط میں بھی اس طرف واضح اشارہ موجود ہے۔ مکمل خط پیشِ خدمت ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

ازلاہور، ۱۰ جون 1970ء

بخدمت عزیزم شوکت محمود سلامت رہو،

بعد دعا پیار کے واضح ہو۔۔۔۔ کہ خط آپ کا ملا۔ احوال معلوم ہوا۔ بات یہ ہے کہ جو کچھ کہ میں نے پچھلے خطوں میں لکھا ہے۔ وہ صحیح ہے۔ یعنی:

ا۔۔۔ کی ڈگری صرف اور صرف محمد خان کی جائیداد تک محدود ہے۔ ہمیں یا ہماری اپنی جائیداد یا مکان کو کوئی خدشہ نہیں اور یہی قانون ہے۔ نہ ہی ہم پر کوئی خرچہ پڑ سکتا ہے۔

۲۔ میں جانتا ہوں کہ آپ لوگوں کو بڑا دکھ ہوا ہے۔ دکھ مجھے بھی ہوا ہے مگر میں جانتا ہوں اور بوجھ بھی میرے کندھوں پر ہے۔

۳۔ میں جس کام میں یہاں مصروف ہوں وہ قومی کام ہے۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا کام ہے۔ یہ اس کام سے کہیں زیادہ ضروری ہے۔

۴۔ اپیل کرنے کا اگر کوئی فائدہ ہوتا تو میں ضرور کرتا مگر سوائے پیسہ برباد کرنے اور تکلیف اٹھانے کے کچھ فائدہ نہیں۔ نیز اپیل راولپنڈی میں ہوتی ہے یہاں ہائی کورٹ لاہور میں نہیں ہوتی۔ اگر راولپنڈی سے بھی خارج ہو جائے تب ہائی کورٹ میں ہوتی ہے اور ہمارے کیس میں گنجائش کوئی نہیں۔

۵۔ حالات کا مجھے علم ہے آپ لوگوں کو نہیں۔ میں جس چیز کو ترجیح دے رہا ہوں۔ وہ واقعی قابلِ ترجیح ہے۔

۶۔ اگر بچ گئے اور آپ لوگ پڑھ لکھ جائیں تو ہم ایسی سو جائیدادیں بنالیں گے اور اگر میں مقدمہ بازی میں شروع رہوں اور آپ لوگ پڑھائی سے رہ جائیں تو اس سے بڑی بدنصیبی کیا ہو سکتی ہے۔ آپ لوگ ساری عمر مجھے بددعائیں دیں گے اور اپنی بدقسمتی کو کوسیں گے۔

۷۔ نیز میں زندگی کی ایک ایسی سیڑھی پر قدم رکھ رہا ہوں جو میرے لئے فیصلہ کن ہے۔ اگر میری کتابیں اب چھپ جائیں تو میں لاکھ روپے کا آدمی بن جاتا ہوں۔ مجھے لوگ قیامت تک یاد کریں گے اور مسلمان دعا دیں گے اور اگر میں یہ کام چھوڑ کر۔۔۔۔ کوروتا رہوں تو مجھے کون عقلمند کہے گا۔ کم از کم مجھے اتنا پاگل مت بننے دو۔ میری پرانی زندگی جو کچھ تھی سو تھی میں اوکھا یا سوکھا اپنی اور تمہاری کشتی کو یہاں تک لے آیا ہوں۔ آگے بھی اللہ سے توقع ہے کہ مہربانی کرے گا۔ اگر اب بھی میں اس میدان میں کامیاب ہو جاؤں تو میری ساری زندگی کی غلطیاں دھل جاتی ہیں اور وہ ساری غلطیاں شاید قدرت نے مجھے اسی کام کے لئے کرائی تھیں مگر تمہیں پتہ نہیں کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ میں لاہور کے سب سے بڑے لوگوں پڑھے لکھے فاضل لوگوں اور سیاست دانوں سے مل رہا ہوں اور اپنی کتاب کے متعلق بات چیت کر رہا ہوں۔ پرسوں میں ایئر مارشل اصغر خان سے ملا ہوں، ان سے بات چیت ہوئی۔ میں نے انہیں اسلامی معاشی نظام سمجھایا، وہ بے حد متاثر ہوئے اور کہا کہ میں پچیس تاریخ کو ڈھاکہ بنگال سے واپس آرہا ہوں۔ وہ کتاب مجھے دکھانا، میں فیروز سنز لاہور سے چھاپنے کے متعلق بات چیت کروں گا۔ اسی طرح میں سب اخبار والوں مثلاً مشرق، امروز اور پاکستان ٹائمز سے

بھی مضامین کے چھاپنے کے متعلق بات چیت کر رہا ہوں۔ وہ اب آمادہ ہو رہے ہیں۔ آپ آخر پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ خود ہی بتائیں کہ اتنا بڑا کام جس سے میری تقدیر وابستہ ہے۔۔۔۔۔۔ کے لئے چھوڑ کر مقدمہ بازی کرتا پھروں، جس میں مجھے کوئی خاص امید نہیں اور سنئے کہ ایسی کتاب کا چھپوانا کوئی معمولی کام نہیں ہوتا، لیکن چھپ جائے تو انسان چوٹی پر آجاتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ لوگ میری بات کو سمجھ جائیں گے۔ میں یہ سب کچھ آپ لوگوں کے فائدے کے لئے ہی کر رہا ہوں۔

۸۔ آپ لوگ کہتے ہیں کہ میں نے کبھی کوئی کام مکمل نہیں کیا۔ یہ درست ہے مگر اب اگر میری کتاب اور یہ میری محنت نامکمل رہتی ہے تو پھر یہ انتہائی المناک صدمہ ہوگا۔ آپ لوگ گھبرائے ہوئے خط مت لکھیں۔ شاید میرے دل میں غصہ اور انتقام کی تلخی آپ سے کہیں زیادہ ہوگی لیکن دشمنی کرنے کا یہ طریقہ نہیں جو آپ تجویز کرتے ہیں بلکہ دشمنی کے لئے بڑے دل گردے اور صبر وہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی بات ہر وقت میرے پیشِ نظر رہتی ہے۔ وقت آرہا ہے اور ہر کام کے لئے وقت مقرر ہوتا ہے۔

۹۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ۔۔۔۔ کے حواری ہرگز ہرگز کسی بات کی جرأت نہ کر سکیں گے۔ انہیں اب اچھی طرح سے خبر ہے کہ اب وہ حالات نہیں رہے اور میرا خیال ہے کہ اگر وہ کچھ عقل رکھتے ہیں تو بڑے محتاط رہیں گے۔

۱۰۔ مجھے تم لوگوں کی روٹی کا بھی فکر ہے۔ میں یہاں ملازم ہوں۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے میری بڑی باعزت نوکری ہے مگر پھر بھی میرا اچھا خاصا ذمہ داری کا کام ہے۔ وہاں سے آتا ہوں تو کتابیں لکھتا ہوں اور اللہ تعالیٰ اگر میری محنت جو سرے لگ گئی ہے۔ ٹھکانے لگادے تو یہ کون سی بُری بات ہے۔ میں یہاں تقریریں کرتا ہوں۔ مضمون لکھتا ہوں۔ کتابیں لکھتا ہوں اور پبلک آہستہ آہستہ مجھے جاننے لگ گئی ہے تو احترام کرتے ہیں۔

۱۱۔ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ اس وقت جذباتی ہونے کی ضرورت ہرگز نہیں، نہ ہی کسی سے ڈرنے کی ضرورت ہے۔ میں آپ کو یہ بات یاد دلاتا ہوں کہ تم سب یعنی تم طاہر محمود، اور خالد محمود سب اپنی اپنی کتابوں کی طرف توجہ کرو۔ آجکل سوائے علم کے انسان انسان نہیں گدھے سے بھی بدتر ہے۔ زندگی بھر مزدوری کرنا یا ٹوکری ڈھونا کوئی اچھی بات نہیں اور مشکل بھی ہے۔ میں تمہاری تعلیم اور تمہاری آئندہ زندگی پر ایسی دس جائیدادیں قربان کر سکتا ہوں۔ انسان جائیداد بناتا ہے۔ جائیداد انسان نہیں بناتی۔ تم بھی اس بات کو سمجھو۔ یہاں میرا اچھا خاصا نام ہے۔ اچھی خاصی عزت اللہ کے فضل وکرم سے ہے۔ مجھے یہ سیڑھی جو میری آخری سیڑھی ہے چڑھ جانے دو۔ میں نے اس کے لئے عمر بھر بے حد محنت کی ہے اور بڑی قربانی دی ہے۔

۱۲۔ میں سخت کوشش کر رہا ہوں کہ کوئی موزوں اچھا سا مکان مل جائے اور انشاءاللہ جلد ہی مل جائے گا اور میں نہایت جلدی تم لوگوں کو یہاں لے آؤں گا اور پھر تمہیں معلوم ہوگا کہ مقدمہ بازی میں فائدہ ہے یا اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنی زندگی سنوارنے میں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم ایف اے کر کے فوج میں کمیشن کے لئے کوشش کرو مگر اس کے لئے اچھے دماغ اچھی قابلیت اور اچھے مضبوط جسم کی ضرورت ہے اور پھر اللہ بھی مدد کرے۔ تم ہی بتاؤ وہ اچھا ہے کہ تم فوج میں لیفٹیننٹ بن کر اپنی نسل سنوار لو یا یہ کہ تم عمر بھر مزدوری کرو یا کہیں سپاہی بن کر ہر شخص کی جھڑکیاں اور گالیاں کھاتے پھرو اور میں۔۔۔۔۔ دو بیگھے زمین کے لئے راولپنڈی میں اپیلیں کرتا پھروں اور میں ملازم آدمی ہوں۔ روز روز چھٹی کہاں سے ملتی ہے۔ میں

کب سے گھر تمہارے ملنے کے لئے نہیں آسکا، اس کی اور کیا وجہ ہے کہ مجھے ہر مہینے تو چھٹی لے کر پنڈی جانا پڑتا رہا۔ پھر گھر جانے کے لئے چھٹی کون دے۔

۱۳۔ مجھے امید ہے کہ ٹھنڈے دل سے آپ لوگ اس بات کو سوچیں گے اور میرے ساتھ اتفاق کریں گے۔

۱۴۔ برادرم سرفراز ڈھلی کے لئے کوشش کر رہا ہوں جج دورے سے واپس آگیا ہے اور کیس فہرست میں آگیا ہے۔ امید ہے کہ اگلے ہفتے کیس لگ کر فیصلہ ہو جائے گا انشاءاللہ، ماموں سرخرو خان سے کہیں کہ یہ بات اپنے گھر میں رکھیں۔ باہر نہ نکلنے دیں ورنہ بڑا نقصان ہو سکتا ہے۔ میں نے اللہ کے فضل و کرم اور بڑی مشکل سے یہ کیس لگوایا ہے۔ پھر اگر کافی عرصہ تک ہم کچہری نہ گئے تو شاید یک طرفہ کاروائی ہو جائے گی تاہم وقت لگے گا۔

آپ کسی آدمی کو میرا پتہ نہ بتائیں۔ برادرم اللہ داد برکھا سے کہو کہ پھر ایک بار جلد مجھے سب آدمیوں کے نام وغیرہ لکھ بھیجے تاکہ پھر درخواست بھیج دی جائے۔ (اللہ داد برکھا مسیر کو دعا سلام)۔

۱۵۔ گھبرانے کی بالکل ضرورت نہیں۔ گھبرانے کا کوئی فائدہ کسی کو نہیں ملا۔ اللہ مالک ہے۔ جوانمرد بن کر اور حالات سے سینہ سپر ہو کر میری مدد کرو تاکہ اللہ کے فضل و کرم سے یہ کشتی پار لگے۔ کسی کو تمہاری طرف دیکھنے کی بھی جرأت نہ ہو گی۔

عزیزان طاہر محمود اور خالد محمود کو بہت بہت پیار۔ نانکوں کو دعا سلام۔ کھتکہ والوں کو دعا سلام۔ آج پیر بہاول شیر گیلانی اور برادرم خدا بخش کو بھی خط لکھ رہا ہوں۔

فقط

علامہ یوسف جبریل

معرفت سکول فار الیکٹریشنز ۴ دیو سماج روڈ لاہور

شوکت محمود اعوان نے بابا جی عنایت اللہ کے ساتھ مل کر وطنِ عزیز میں فکرِ واصفیاتؒ کے فروغ کے لئے بے پناہ کام کیا ہے۔ انہوں نے مغربی جمہوریت کے خاتمے اور اسلامی شورائی نظام کے نفاذ کے لئے عمر بھر تگ و دو کی ہے۔ وہ سیرتِ طیبہ اور خلفائے راشدین کے سنہری ادوار کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ بابا جی عنایت اللہ کے تعلیمی، فلاحی، تصنیفی و تالیفی اور فکریاتی کام کی ترتیب و تدوین میں ان کا کلیدی کردار ہے۔

واصف علی واصفؒ رقم طراز ہیں کہ :۔

1۔ ''اگر نیک لوگ غریبوں کو اپنے مال میں شریک کریں تو آدھی سے زیادہ نیکی پیدا ہو جائے گی''۔

2۔ ''جس چیز پہ آپ کو غرور ہے یا کم از کم فخر ہے وہ اللہ کی راہ میں لگا دیں تو پھر آپ کا مسئلہ حل ہو جائے گا''۔

3 ۔ ''کاش کوئی جماعت ایسی آجائے جو یہ کہے وہ شخص مجھے ووٹ نہ دے جو جھوٹ بولنے والا ہو''۔

4۔ ''مسلمانوں کا زوال اس دن ہو گا جب ان کے دل سے عشقِ نبی ﷺ نکال دو گے''۔

5۔ ''آپ انقلاب کی بات کرتے ہیں تو کیمونزم سے زیادہ کیا انقلاب لا سکتے ہو وہ بڑا شاندار انقلاب تھا اور اس کا بڑا برا انجام ہوا، کیپیٹلزم کا اس سے برا انجام ہو گا، صرف ایک ہی نظام رہ جائے گا اور وہ ہے اسلام کا نظام''۔

6۔ ''فقہ ایسا ہونا چاہیئے کہ مسلمان ایک قوم، ایک گروہ ہوں، چشتی، قادری، نقشبندی، اہلِ حدیث، اہلِ قرآن، دیوبندی، بریلوی، سارے کے سارے ایک ہوں اور یہ اس وقت ہو سکتا ہے جب آپ سارے ایک کلمے کی بنیاد پر اکٹھے ہو جائیں''۔

7۔ ''جو شخص کسی کو آسائش تقسیم نہیں کرتا وہ ایمان کیسے تقسیم کر سکتا ہے، آپ اپنے بھائی کو جنت تو دیتے ہیں لیکن اس کو مال میں سے کچھ نہیں دیتے''۔

9۔ ''جھوٹی دنیا میں ووٹ مانگنے والا سچا آدمی ناکام ہو جائے گا اور برے آدمی کو ووٹ دینے والا بھی برائی میں برابر کا شریک ہوتا ہے''۔

10۔ ''جو چیز آپ کے پاس سب سے اچھی ہے، مثلاً علم، عمل، صحت، جوانی، یا کوئی اور چیز اس کو اللہ کی راہ میں لگا دو، اس طرح آپ کی ساری زندگی سب سے اچھی ہو جائے گی''۔

11۔ ''غریبوں میں دولت تقسیم کر دینا نیکی ہے، امیروں سے دولت چھین لینا گناہ''۔

12۔ ''اپنے ملک میں سب ہی مسلمان ہیں، چوری کون کرتا ہے؟ ڈاکہ ڈالنے والا کون ہے؟ ملاوٹ کس نے کی؟ منافع خور کون ہے؟ سب ہی مسلمان ہیں تو اسلام کے تقاضوں کے مطابق معاشرہ کہاں ہے؟ کس کی کون کیسے اصلاح کرے؟ یہی وقت کی ضرورت ہے۔ تبلیغِ اسلام سے پہلے اسلامی معاشرے کے قیام کی ضرورت ہے۔ اسلامی معاشرے میں نہ کوئی محروم ہو گا نہ کوئی مظلوم''۔

13۔ ''جو لیڈر نااہل ہو وہ اپنے رفقاء کا گلہ کرتا ہے، سورج کہلانے کا شوق ہو تو روشنی پیدا کرو''۔

14۔ ''اپنی رعایا کے حال سے بے خبر بادشاہ سے بہتر ہے وہ گڈریا جو اپنی بھیڑوں کے حال سے باخبر ہو''۔

15۔ ''اسلامی معاشرہ مسلمانوں کے طرزِ حیات کا نام ہے''۔

16۔ ''اسلام مسلمانوں کے علم کا نام نہیں ان کے عمل کا نام ہے یعنی اسلام بولنے والی بات نہیں کرنے والا کام ہے''۔

17۔ ''لوگ تو ہماری خوشی میں شریک نہیں ہوتے غم میں کون شریک ہو گا''۔

18۔ ''ہر فرد کے دل میں قوم کی خدمت کا جذبہ ہونا چاہیئے، جذبہ نیت سے ہے، نیت ایک علم ہے اور علم کے لئے ایک عمل ہے، عمل کے لئے میدانِ عمل ہے اور میدانِ عمل میں شریکِ عمل نیک نیت لوگ ہوں تو انجامِ عمل صحیح ہو گا، ہم سفر ہم خیال نہ ہوں تو کامیابی نہ ہو گی''۔

شوکت اعوان، علامہ یوسف جبریل، باباجی عنایت اللہ، تینوں شخصیات کی زندگی کا مرکز و محور یہی اصول و ضوابط ہیں۔ وہ عمر بھر انہی افکار کی ترویج و اشاعت اور توسیع کے لئے اپنے اپنے مدار میں کوشاں رہے۔

فصل نمبر4۔ علامہ محمد یوسف جبریلؒ میرے والدِ محترم شوکت محمود اعوان:

میں نے ہوش سنبھالا' تو اپنے والدِ محترم کو ہمہ وقت تحصیلِ علم' غوروفکر' عبادت و ریاضت اور زہد و ورع کی حالت میں دیکھا۔میرے والدِ محترم ایک خاموش طبع' سنجیدہ مزاج' بردبار اور سلیم فطرت شخصیت تھے۔اُن کاعمومی رویّہ خوش اخلاقی پر مبنی تھا۔انہوں نے خاندان کے سربراہ کی حیثیت سے ہم سب کا انتہائی خیال رکھا۔وہ جہاں کہیں بھی ملازمت کے سلسلے میں قیام پذیر رہتے' ہمیں اپنی تعلیم و تربیت پرتوجّہ دینے کا مشورہ دیتے۔وہ یہ چاہتے تھے کہ ہم علمی مزاج کو نشوونما دے کرمعاشرے میں ذمہ دارانہ حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیں۔یہ انہی کی توجّہ' دعااور شفقت کا نتیجہ ہے کہ میں نے ان کے علمی مشن کو سمجھا'جانچااور اس کی ترسیل کافریضہ انجام دینے کے لیے اپنی سی کوشش کی۔میرے چھوٹے بھائی خالد محمود ملک نے ایم اے انگلش کیا' الیکٹرانکس کی تعلیم حاصل کی' کمپیوٹر سائنس میں اعلیٰ تعلیم کے مراحل طے کیے۔وہ ا ن دنوں بسلسلۂ ملازمت کینیڈا میں مقیم ہیں۔انھوں نے بھی پیارے بابا کے علمی ورثے کو دل سے لگایااور ابھی حال ہی میں علامہ صاحبؒ کی انگریزی کتابوں کو معیاری سطح پر ترتیب دیااوراشاعت کی۔اُنہوں نے الھمزہ کے انگریزی ترجمہ کی چودہ میں سے نو جلدوں کا انتخاب کیاجسےامریکہ میں شائع کیا جو وقت کی اہم ضرورت تھی۔دوسرے بھائی طاہر محمود اعوان حصولِ تعلیم کے ساتھ ساتھ ان کی کتابوں کی اشاعت میں مددگار ومعاون ثابت ہوئے۔

یوں توہمارے والد محترم ہم سب بھائیوں کے ساتھ ایک شفیق باپ کا رویّہ رکھتے ہی تھے مگر مجھ پر ان کی ہمیشہ نظرِ کرم زیادہ رہی۔یہ میری خوش بختی ہے کہ انہوں نے اپنے انتقال سے تین ماہ پہلے اپنے علمی مشن کوآگے بڑھانے کافریضہ مجھے سونپا۔میں یہ دعویٰ تو نہیں کرتا کہ میں نے اپنے عظیم باپ کے حکم کا مکمل طورپر پاس رکھا مگر یہ میں یا میرا خدا ہی جانتا ہے کہ اس نے مجھ سے کیا کیا کام لیے۔میں سمجھتا ہوں کہ ایک بڑے باپ کا چھوٹا سا بیٹا ہونے کی حیثیت سے میں نے جو کچھ بھی کیا یہ میری خوش بختی اور سعادتِ دارین کا باعث ہے۔میں خداوندِ کریم سے دعا کرتا ہوں کہ وہ میری زندگی کی باقی سانسوں کو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی اس امانت کو سنبھالنے اور اسے نبی کریم ﷺ کی اُمّت کے سینوں میں منتقل کرنے کی توفیق بخشے۔اگر وہ مجھے نہ بھی کہتے تو بھی یہ میری ذمہ داری ضرور بنتی تھی کیوں کہ بقولِ علامہ اقبالؒ:۔

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو تو
پِسَر وارثِ میراثِ پدر کیوں کر ہو

افسوس کہ آج کل صورتِ حال اکبر الٰہ آبادی کے اس شعر کے مِصداق ہو گئی ہے۔

ہم ایسی کل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے بیٹے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

میں اکیلا ہی ان کا فرزند اور جانشین نہیں ہوں' وطنِ عزیز کا ہر نوجوان اور پاکستانی قوم کا ہر فردان کا روحانی فرزند اور جانشین ہے۔یہ اس کی اتنی ہی ذمہ داری بنتی ہے جتنی کہ میری۔کیوں کہ شان دار تعلیمی روایات' مذہبی و ثقافتی ورثے کی اشاعت اور قرآنی نور کی سینہ بہ سینہ منتقلی جیسے بڑے کام لمحۂ موجود کی پکار ہیں۔

میرے وا لدِ محترم تو میرے والدِ محترم ہیں۔ظاہر ہے میں ان کی تعریف ہی کروں گا کیوں کہ والد سب کو پیارے ہی ہوتے ہیں مگر یقین جانیئے کہ جیسے میرے والدِ محترم تھے ویسے خدا ہر ایک کو نصیب کرے۔وہ اخلاص اور محبت کے ایک جیتے جاگتے نمونے' خاندانی وجاہت اور شرافتِ نسبی کاشاہکار' عمومی زندگی میں صاف گو' سچے' راست معیار'وفاشعار' اصول پرست' دیانت دار'رزقِ حلال کھانے والے' وعدے کا پاس رکھنے والے' انسانیت کے دکھ درد کو دل سے محسوس کرنے کی صلاحیّت سے مالامال شخصیت تھے۔میرے والدِ محترم نے ہمیشہ خاندان کے دیگر افراد کی بے لوث معاونت کی اور انہیں اپنے پاؤں پہ کھڑا ہونے میں مدد دی۔مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میری دادی محترمہ فالج زدہ ہو گئیں تو انہوں نے ان کی دن رات تیمار داری کی۔ان کی ضروریات کا خیال رکھا۔میری دادی بھی ان سے والہانہ پیار کرتی تھیں۔جب وہ انہیں نہ پاتیں تو باربار ان کا پوچھتیں۔اُن کے لیے بے لوث دعائیں کرتیں۔میرے والدِ مکرم رفاہی اورفلاحی کاموں میں بھی پیش پیش رہتے تھے۔انہوں نے اپنے علاقے وادیِ سون سکیسرکے لوگوں کے لیے حکومت کے تعاون سے بجلی کی فراہمی' سڑکوں کی تعمیر کے سلسلہ میں ممکنہ کوششیں کیں تاکہ وہاں کے رہائشی لوگ زندگی کو آسان بنا سکیں۔انہوں نے اس علاقہ کی ترقی کے لیے ایک سیمنٹ فیکٹری' اینٹوں کا بھٹہ' اور چونے کی بھٹی بنائی' گاؤں میں آٹا پیسنے والی مشین بھی لگائی۔لوگوں کو گھر میں روزگار مہیا کیا۔ انہوں نے گاؤں کے نزدیک ٹوٹے ہوئے قبرستان کی مرمت بھی خود کروائی۔

میں جب دن بھر کی صعوبتوں' تکلیفوں اور اذیتوں سے تنگ آ کر کبھی اپنے آپ سے اور کبھی کائنات سے شاکی ہوتا ہوں کہ یہ معاشرہ کیوں رُو بہ زوال ہو رہا ہے۔اعلیٰ اخلاقی اقدار کہاں کھو گئی ہیں۔لوگوں کی آنکھیں ایک دوسرے کے دکھ درد پر کیوں نہیں بھیگتیں۔اسلامی انقلاب کی منزل دُورکیوں ہو رہی ہے۔تو میرے دوست میرے اس رویّہ پر کبھی کبھی سراپا احتجاج بن جاتے ہیں۔کیوں کہ بہ ہر حال میرا یہ رویّہ انتہا پسندانہ اور عدمِ توازن کا شکار ہے جس کی وجہ شاید میرے دل میں وہ اخلاص کی شدّت اور ملک و قوم کے لیے جذبہ و احساس ہے جوقدرت نے میرے دل میں رکھ دیا ہے۔میں اس وقت تو شاید خود بھی نہیں جانتا کہ میرا یہ رویّہ ہیجان انگیز کیوں ہے مگر جب کبھی تنہا بیٹھتا ہوں' ماضی کی یادیں ایک فلم کی طرح نگاہوں کے پردوں کے سامنے سے گزرنے لگتی ہیں اور میں دیکھتا ہوں کہ میرے والدِ مکرم تو انتہائی متحمّل مزاج اور بلا کے صابر شخص تھے۔انہیں تین سال تک غربت و افلاس کے عبرتناک دور میں سے بھی گزرناپڑا۔ ہم ایک چھوٹے سے غار میں مقیم رہے جو یقیناً شعبِ ابی طالب تو نہیں تھا لیکن یہ بیتے ہوئے مہ و سال اذیت ناکی' فاقہ کشی اور تنگ دستی کی ایک دلگداز

داستان اپنے جلو میں سمیٹے ہوئے ہیں۔میں نے انہیں ہمیشہ پرسکُون‘ قانع‘ اللہ تعالیٰ کی ذات پر بھروسا کرنے والا اور خداوند کریم کی رضا پر راضی رہنے والا پایا۔ہم نے وہ دن بھی دیکھے اور آج یہ دن بھی دیکھے کہ ایک زمانہ میرے والدِ محترم کے علمی مقام و مرتبے سے واقف ہے۔اندرون و بیرون ملک اُن کی تحریروں کے چرچے ہیں۔

میں جہاں بھی جاتا ہوں‘ مجھے اُن کی نسبت کی وجہ سے سر آنکھوں پر بٹھایا جاتا ہے۔میرے والدِ محترم یقیناً انسان تھے‘ فرشتہ نہ تھے‘ مگر یہ بھی سچ ہے کہ اُن جیسے انسان واقعی صدیوں کے بعد پیداہوتے ہیں‘ جنہوں نے ہمیں غربت و افلاس میں بھی خودی کی نگہبانی کا شعور دیا‘ نہ خود کسی کے آگے ہاتھ پھیلایا اور نہ ہی ہمیں اس کی اجازت دی۔علامہ محمداقبالؒ نے شاید اُن جیسے بزرگوں کے بارے میں کہا تھا:۔

تجھے گرِ فقر و شاہی کا بتا دوں غریبی
میں نگہبانی خودی کی

میرے والدِ محترم نے کبھی جائیدادیں اکٹھی کرنے‘ محلات بنانے‘بینک بیلنس کے لیے کوشاں رہنے اور زرعی و بارانی زمینیں یا پلاٹ خریدنے کی تگ و

دو نہیں کی۔وہ رضائے خداوندی کو زندگی کا اوّلین مقصد قرار دیتے تھے۔وہ ہمیں یہ پیغام دیتے تھے کہ یہ مادی دنیا اور اس کے خزینے تہِ خاک چلے جائیں گے۔اپنی زندگی کو خداوند کریم اور اس کے رسول ﷺ کے تابع کر لو اور قوموں کی امامت کا فریضہ سرانجام دو۔وہ ایک خاموش طبیعت شخص تھے۔وہ سمندروں سے بھی گہرے‘ پہاڑوں سے بھی بلنداور آسمان کی وسعتوں سے بھی پَرے دیکھنے والے‘ علم و حکمت کے معدن و مخزن تھے۔میں اس مختصر مضمون میں اُن کی زندگی کے کس کس گوشے کو بیان کروں‘ اس کے لیے بہت سارا وقت درکار ہے۔

میں اور میری آنے والی سب نسلیں‘ اپنی زندگی کی آخری سانس تک اپنے عظیم باپ کے علمی ورثے کو رُوئے زمین کے ہر فرد تک پہنچانے کی کوشش جاری رکھیں گے۔میرا ارادہ ہے کہ میں اپنے عظیم باپ کے مشن کو بین الاقوامی سطح پر اجاگر کرنے کے لیے کاوشوں کو سامنے لا سکوں‘ میں آپ سے ملتمس ہوں کہ میرے اس مشن کی تکمیل میں دامے‘ دِرمے‘ قدمے‘ سُخنے ساتھ چلیں کیوں کہ یہ میرا اکیلے کا نہیں بلکہ پوری انسانیت کا مشن ہے۔آپ یقین جانیے کہ آپ کو اطمینانِ قلب‘ رحمت و برکت کی وہ برکھانصیب ہو گی جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔

میں سوچتا ہوں کہ اگر میرے وا لدِ محترم نے مجھے اپنے ساتھ اپنے دوزخ میں نہ جلایا ہوتا تو شاید میں بھی پاکستان کے دیگر عوام کی طرح مادیت اورہلاکت خیزی کے عذاب میں مبتلا ہوجاتا۔میرے واالدِ محترم نے مجھ پروہ نظر ڈالی کہ میں

ذرّے سے آفتاب ہو گیا۔میراوجود ایک نور کے قالب میں ڈھل گیا۔یہ وہ نور تھا جو قرآنِ حکیم اور سنت رسول اکرمﷺ کے باطن سے پھوٹا۔

بے شمار پریشان حال لوگ دعا کے لیے دُور دراز سے اُن کے پاس آتے۔وہ اُن کے لیے ہاتھ اٹھاتے جس سے اُن کی مرادیں پوری ہو جاتیں۔وہ ایک ایسے مردِ درویش تھے جنہوں نے مخلوقِ خدا کے لیے ہمیشہ دعائیں کیں۔وہ کبھی کبھی ایک سخت گیرباپ کے روپ میں بھی نظر آتے جس کا مقصد ہماری زندگی کے بعض پہلوؤں کی اصلاح ہوتاتھا۔وہ ہمارے تحتُ الشعور میں مادی طرزِ فکر اور آسائشات کی طرف رجحان کو سختی سے اکھاڑ کر پھینک دینا چاہتے تھے۔میرے والدِ محترم کو خواب میں ایک مخصوص قسم کی گھاس والے علاقے کو دکھایاگیا۔یہ اشارہ بھی ملا کہ آپ کو وہاں رہنا ہے اور لوگوں کو فیض پہچانا ہے۔جب ہم لاہور سے نواب آباد آئے تو یہ علاقہ وہی تھا۔میرے وا لدِ محترم نے اس علاقے میں ایک مسجد اور دینی مدرسے کی بنیاد رکھی۔

مجھے یہ بھی اعتراف ہے کہ میں ان کا فرزندِ ارجمند ہونے کے ناطے علم کی جس منزل کو جا سکتا تھا نہیں جا سکا لیکن اس کے باوجود میں نے ایم اے اسلامیات تک تعلیم حاصل کی اور ایک سرکاری ادارے میں ذمہ دارانہ حیثیت سے قومی سطح کی خدمات بھی سر انجام دے چکا ہوں۔میرا یہ کام یقیناًمیرے وا لدِ محترم کی دُعا اوران کے فیضانِ نظر کا نتیجہ ہے۔

آج میں عمرِعزیز کی69 بہاریں دیکھ چکا ہوں۔زندگی کے مہ و سال قرآنِ حکیم کی عظمت کو دنیا کے سامنے اجاگر کرتے ہوئے بسر ہوئے۔میں نے کبھی یہ نہیں چاہا کہ مجھے لوگ عزت و شہرت کی مسند پر بٹھائیں اور نہ ہی میں نے دنیاوی شان وشوکت کے حصول کے لیے کبھی کوشش کی۔میں نے ہمیشہ اپنے آپ کو اپنے عظیم باپ کا وہ توتلا' معصوم اور بھولا بھالا بچہ ہی سمجھا ہے جو کبھی اپنے باپ کی انگلی پکڑ کر مسجد جاتا اور کبھی وہ اسے سکول چھوڑنے جاتے۔مجھے آج بھی وہ شوکت یاد ہے جسے وہ لاہور سے کھبیکی خط لکھتے اور نصیحت کرتے کہ شوکت! اپنی تعلیم پر توجّہ دو۔میں پردیس میں تمہارے لیے بیٹھا ہوں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ تم لوگ خاندانی جھگڑوں اور جائدادوں کے چکر سے نکل آؤ' اگر تم لوگ پڑھ لکھ گئے تو میں سمجھوں گا کہ میں کامیاب ہو گیا۔

شوکت شاید تعلیم تو نہ حاصل کر سکا لیکن اپنے باپ کی قبر پر چراغ ضرور جلاتا ہے جو اس کے لیے دنیا و آخرت کی بہت بڑی سعادت ہے۔یہ سعادت تو شاید مجھے ہی ملی ہے۔اللہ کرے کہ میں ہمیشہ اپنے باپ کی قبر پر پھولوں کی چادریں چڑھاتا رہوں اور اس کا دیا روشن کرنے کے لیے خونِ جگر بھی صَرف کرتا رہوں' شاید یہی میرے لیے اطمینانِ قلب کا ایک راستہ رہ گیا ہے۔میر ی دعا ہے کہ میری اولاد بھی میرے پیارے باپ کی علمی روایات اور اس کے روحانی ورثے کو تابہ ابد سنبھالے رکھے۔آمین ثم آمین۔

گوشۂ مصنّف

فصل نمبر 1 واہ کا ادبی منظر نامہ:

خطۂ فردوسِ بریں واہ کینٹ کی ادبی تاریخ پر نظر ڈالیں تو دنیائے علم و ادب کے بے شمار ستارے جگمگ جگمگ کرتے نظر آتے ہیں۔ شعراء و ادباء نے مختلف ادبی تنظیموں کے ذریعے محفلِ شعر و سخن کو آراستہ و پیراستہ رکھا ہے جن میں فانوسِ ادب ملک گیر شہرت کی حامل تنظیم رہی ہے۔ جس کے پلیٹ فارم سے ڈاکٹر رشید امجد، پروفیسر جلیل عالی، سید سبط علی صبا، حسن ناصر، حلیم قریشی جیسے ادیبوں نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ ''بزمِ نعت'' نے قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک مسلسل نعتیہ مشاعروں کے انعقاد کے ذریعے اردو نعت گوئی میں گراں قدر اضافہ کیا۔ انوار عثمانی، جمال لکھنوی، کمال کاسگنجوی، سید منظور الکونین، محبت اللہ خان محبت، علامہ قابل گلاٹھوی کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ واہ کینٹ سے ملحقہ مضافات نواب آباد کی بستی میں درویشِ خدامست، شاعرِ شیریں نوا، مفکر عصر نو، ایٹمی سائنس دان اور حکیم الامت حضرت علامہ محمد یوسف جبریلؒ نصف صدی سے زائد عرصہ اپنے علمی کارناموں سے دنیائے رنگ و بو کو معطّر کرتے رہے۔ آپؒ کی ایک اہم شناخت شاعر اور فلسفی کی ہے۔ ادارہء افکار جبریلؒ ان کی مختلف تصانیف کی اشاعت کا اہتمام کرتا رہتا ہے۔

واہ قدیم شہر ٹیکسلا کے سنگم پر واقع ہے۔ از منۂ قدیم میں ٹیکسلا گندھارا تہذیب کی راجدھانی رہا ہے۔ دور دراز سے تجارتی قافلے آتے، یہاں پر پڑاؤ کرتے اور اہل ہنر و صاحبان سیف و قلیم کا بھی یہاں پر اجتماع رہتا۔ ایک زمانے میں علم و ہنر کے حوالے سے ٹیکسلا کا پورے عالم میں ڈنکا بجتا تھا اور یہاں کے اربابِ دانش، فلاسفہ یونان کا مقابلہ کرتے نظر آتے۔ ارتھ شاستر کے مصنف کوٹلیہ کا تعلق بھی ٹیکسلا ہی سے تھا۔ مرورِ زمانہ سے ٹیکسلا بار بار حملوں کی زد میں رہا اور اس کی تہذیب کے آثار وقت کی گرد میں چلے گئے اور بالآخر مختصر سی آبادی پر مشتمل ایک غیر اہم قصبہ بن کر رہ گیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد وطنِ عزیز کی دفاعی ضروریات کے پیشِ نظر جب واہ کی زمین کو اسلحہ ساز فیکٹریوں کے لئے منتخب کیا گیا تو ایک دفعہ پھر اس علاقہ میں ہنر مندوں اور صاحبانِ علم کا اکٹھ ہونا شروع ہو گیا اور یوں اس علاقہ کی عظمتِ رفتہ کا احیاء ہونے لگا۔

واہ کئی اعتبار سے امتیازی اوصاف کا حامل ہے۔ صنعتی ترقی اور تعلیمی ترقی تو لائقِ تحسین ہے ہی، اس کے ساتھ ساتھ علم و ادب کے فروغ میں واہ کی خدمات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔ اس مضمون کا تعلق ان شخصیات کے مختصر سے تذکرے سے ہے جن کا واہ کی علمی و ادبی ترقی میں نمایاں حصہ ہے۔ ایسے باکمال افراد واہ کا تہذیبی ورثہ ہیں۔ کیسے کیسے نابغۂ روزگار نے واہ کو اپنا مسکن بنایا۔ کچھ یہیں پیوندِ خاک ہو گئے۔ کچھ مدتِ ملازمت پوری کرنے کے بعد بڑے شہروں میں جا آباد ہوئے۔ واہ میں ادب کے فروغ کے لئے ان حضرات کی کوششیں ناقابلِ فراموش ہیں۔ میں جب واہ کے در و دیوار پر نظر ڈالتا ہوں تو طرح طرح کی آوازیں میرا گھیراؤ کر لیتی ہیں۔ کچھ آوازیں مدھم ہیں اور کچھ اتنی اونچی کہ اب بھی ان کی بازگشت سنائی دیتی

ہے۔اتنی توانا کہ ان کے نقوش صرف واہ کی فضاؤں کے محتاج نہ تھے بلکہ ملکی سطح پر بھی ان کی پہچان بن چکی تھی۔اس سلسلے میں محترم شوکت اعوان اپنے غیر مطبوعہ مضمون "واہ کا ادبی منظر نامہ "میں رقم طراز ہیں:

"شاعری کے حوالے سے واہ سے متعلقہ شخصیات کا اگر تفصیلی مطالعہ کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب وجود میں آسکتی ہے۔ بعض شخصیات ایسی ہیں کہ فرداً فرداً تفصیلی مطالعہ کا استحقاق رکھتی ہیں۔ اگر اس مضمون میں ان تمام شخصیات کا بالتفصیل تذکرہ کیا جائے تو مضمون لیلیٰ کی زلف کی طرح دراز ہو جائے گا۔تاہم درج ذیل ناموں سے اندازہ ہو جائے گا کہ آسمانِ ادب کے کیسے کیسے نجم و کواکب نے واہ کی زمین کو منور کیا۔چند دوستوں کے نام تحریر کئے جاتے ہیں۔ جلیل عالی، جاوید ظفر خان، جمال لکھنوی، ظفری پاشا، ظفر ابن متین، حفیظ بادل، حسن ناصر، حلیم قریشی، نذیر احمد شیخ، نثار ناسک، نظیر اختر، نوشیر وان عادل، سلمان عادل، سبط علی صبا، سید اختر، سید مبارک علی، ساجد محمود ساجد، سلمان باسط، سید اختر، سید اقبال خوارزمی، رفیق نشتر، راکب راجا، رانا سعید دوشی، راز مرادآبادی، رؤف امیر، الیاس صدا، اظہار الحق، ارشد علی ارشد، امجد اقبال، امتیاز عارف، احمد جمیل، ایس اے علوی، آصف منہاس، امان اللہ خان، ابن الحسن سید، اختر شاد، ایوب اختر، اکمل ارتقائی، امجد شہزاد، بشیر حسین صمصام، کمال کاسگنجوی، کمال پاشا راز، علامہ محمد یوسف جبریل، علامہ سید قابل، عثمان خاور، عبید حبیب، محمد عارف ، علامہ محمد روز خان، عتیق عالم، مسرور قدردان، ملک سعید اختر، محمد نسیم قریشی، محمد نسیم احمد، مطیع الرحمن، مشتاق آثم، محمد توفیق، مبارک شاہ، محمود اختر عادل، جاوید ظفر، جمیل یوسف، یعقوب آسی، یامین انصاری، توصیف تبسم، تپش برنی، خالد قیوم تنولی، پروفیسر آفتاب اقبال شمیم، غلام رسول، ثناء اللہ کنجاہی، شجاعت حسین، شاہد ملک، شاہد مجید رانا، شعلہ چنگیزی، شاہد انصاری، شاہد نصیر، شوکت محمود اعوان، شہزاد عادل، وائی جے انور، وصف وارثی، وحید احمد، قاضی عارف حسین، ڈاکٹر سید صابر حسین، ڈاکٹر رفیق ملک (ہو سکتا ہے کوئی نام حافظے میں محفوظ نہ رہا ہو) ان میں نذیر احمد شیخ، سبط علی صبا، رفیق نشتر، صدام حسین فدا، عارف قادری، شعیب ہمیش، ظفر ابن متین، اور حسن ناصر نہایت اہم ہیں۔" (۱۱)

نذیر احمد شیخ کا تعلق ایکسپلوزو فیکٹری سے تھا۔آپ مزاح نگار تھے۔عام طور پر مزاحیہ شاعری کو کم تر درجہ کی شاعری سمجھا جاتا ہے مگر شیخ نذیر احمد نے مزاح میں ادبی چاشنی پیدا کر کے اسے اعلیٰ درجہ کی تخلیق بنا دیا۔نذیر صاحب کا شمار پاکستان کے صفِ اوّل کے مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کا ایک شعری مجموعہ ''حرفِ بشاش'' کے نام سے طبع ہوا۔ بزم اکبر اسلام آباد نے واہ رے شیخ نذیر کے نام سے ان کی تخلیقات کو شائع کیا۔پروفیسر عطاء اللہ عالی نے ''موازنہ ضمیر و نذیر'' ایک کتاب لکھی ہے جو شیخ نذیر کے مرتبہ کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔واہ کی زمین ممنونِ احسان رہے گی کہ اس باکمال شخص نے یہاں قیام کیا۔واہ کا کوئی پڑھا لکھا شخص ایسا نہیں ہے جو سبط علی صبا کے نام سے واقف نہ ہو کیونکہ مشرقی پاکستان پر صبا کا یہ شعر زبان زد عوام ہوا۔

دیوار کیا گری مرے کچے مکان کی
لوگوں نے میرے صحن میں رستے بنا لئے

(سبط علی صبا)

سبط علی صبا مزدور شاعر تھے۔ان کی شاعری میں معاشی مسائل اور محرومیوں کا ادراک نمایاں نظر آتا ہے۔مذکورہ بالا شعر جس غزل سے لیا گیا ہے اسی غزل کا یہ شعر ملاحظہ فرمایئے۔

اوروں کی چادروں پر بناتی رہی وہ پھول
پیوند اس نے اپنی قبا پر سجا لئے

(سبط علی صبا)

مزدور شاعروں کے ضمن میں رفیق نشتر کا نام بھی آتا ہے۔ رفیق نشتر، بشیر حسین صمصام کے شاگرد تھے۔ استاد بھی کمال کا اور شاگرد بھی بلا کا ذہن، رفیق نشتر کے اس شعر پر اہلِ ذوق بہت عرصہ تک سر دھنتے رہے۔

میں نے چاہا کہ کسی شاخ پہ تنکے دھر لوں
آئی آواز خبردار برے لگتے ہیں

(رفیق نشتر)

رفیق نشتر کی شاعری پر ترقی پسند تحریک کے اثرات محسوس ہوتے ہیں۔ پی او ایف میں مزدور کی حیثیت سے کام کیا۔ انہیں شاعرِ مزدور کا خطاب بھی ملا۔ مزدور کی شان میں ان کے یہ اشعار سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہیں۔

مجھ کو تقدیر نے میدانِ عمل بخشا ہے
یعنی ہر مسئلہ زیست کا حل بخشا ہے
میرے ہاتھوں کی کثافت پہ نہ جاؤ لوگو
میرے ہاتھوں نے تمہیں تاج محل بخشا ہے

(رفیق نشتر)

ظفر ابنِ متین جدید لہجے کے شاعر تھے۔ واہ واہی کے نام سے مزاحیہ شاعری بھی کی اور رفیق نشتر کے مابین ادبی چشمک رہی اور دونوں ایک دوسرے کے متعلق منظوم خیالات کا اظہار کرتے رہے۔ اس شاعرانہ مناقشے نے واہ کی ادبی فضا کو گرمائے رکھا۔ ظفر ابنِ متین کا واہ کے ادبی ماحول کے ارتقاء میں بڑا حصہ ہے۔ ان کا ایک مجموعہ کلام ''قلم اور روشنی'' کے نام سے چھپا۔ علامہ یوسف جبریل نہایت صاحبِ علم شخصیت تھے۔ قرآنِ حکیم اور ایٹمی سائنس ان کا خاص موضوع رہا۔ اردو اور انگلش میں کئی کتابیں منظر پر آئیں اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ شاعری کے حوالے سے ''نغمہ جبریل آشوب، خوابِ جبریل اور سوزِ جبریل'' نہایت زوردار کتابیں ہیں۔ نالۂ جبریل اشاعت کے مرحلے میں ہے۔ قرآنِ حکیم، سائنس، فلسفہ جیسے پیچیدہ مضامین پر بہت کچھ لکھا ہے اور تواتر سے لکھا۔ وہ ایک عظیم سکالر تھے۔ واہ سے ملحقہ آبادی ملک آباد میں اپنے مزار میں براجمان ہیں۔ علامہ یوسف جبریلؒ جیسی عظیم شخصیت پر اہلیانِ واہ کو ہمیشہ فخر رہے گا۔ علامہ سید قابل بھی بہت قابلِ ذکر آدمی تھے۔ مشرقی پاکستان کی کسی یونیورسٹی میں وائس چانسلر بھی رہے۔ کئی مضامین میں ایم اے کیا ہوا تھا۔ غزلیں اور نعتیں زیادہ کہیں۔ علامہ قابل کی قابلیت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے سو کے لگ بھگ ایسی غزلیں کہی ہیں جن کے الفاظ پر نقطہ نہیں ہے۔ یہ قدرتِ کلام کی انتہا ہے۔ صد افسوس کہ اس جوہرِ قابل کے آخری ایام انتہائی عسرت میں بسر ہوئے۔ سید حسن ناصر نظم اور غزل دونوں کے شاعر تھے۔ فنون میں باقاعدگی سے چھپتے رہے۔ کم لکھا مگر ہر دو اصناف میں معیار کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ جدید لہجے کے شاعر تھے۔ اچانک موت سے واہ کا یہ خوبصورت لہجے کا شاعر بھی جدا ہو گیا۔ آج واہ کے ادبی ماحول میں وہ بات نظر نہیں آتی جو ساٹھ اور ستر کی دہائیوں میں تھی۔ پھر بھی واہ کا دبستانِ ادب اپنی الگ پہچان رکھتا ہے۔ موجودہ عہد میں شاعری کے حوالے سے علی مطہر اشعر بڑا

نام ہے۔ علی مطہر اشعر نے ویپنز فیکٹری میں مزدور کی حیثیت سے کام کیا۔ بنیادی طور پر اشعر کا مزاج کلاسیکی اور رومانوی ہے مگر ان کے ہاں بھی مزدور طبقے کے مسائل کا مشاہدہ نظر آتا ہے۔ نمونے کے طور پر اشعر کا یہ شعر ملاحظہ فرمایئے۔

اک چھوٹے سے سیب کو کتنی قاشوں میں تقسیم کروں
کچھ بچوں کا باپ ہوں اشعر کچھ بچوں کا تایا ہوں

(علی مطہر اشعر)

شعبہ تعلقاتِ عامہ پی او ایف واہ نے اشعر کی ادبی خدمات کے اعتراف میں ان کا مجموعۂ کلام ''تصویر بنادی جائے'' شائع کیا۔ پروفیسر رؤف امیر اور واہ لازم و ملزوم ہیں۔ رؤف امیر آسمانِ ادب کا نہایت روشن ستارہ تھے۔ کمال درجے کا شاعر، بہترین نقاد، محقّق، جس نے بہت کم عرصے میں ملک کے ادبی حلقوں میں اپنی پہچان بنالی۔ اپنی محنت کے بل بوتے پر ترقی کے مدارج طے کئے۔ آنے والوں کے لئے رؤف امیر ایک مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ رؤف امیر کی کئی کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ مرکزی دارالمطالعہ میں گوشہ آحمد فراز، گوشہ احمد ندیم قاسمی اور گوشہ ضمیر جعفری کے قیام کے ضمن میں رؤف امیر کا کردار قابلِ تعریف ہے۔ واہ کے ادبی منظر نامے کے حوالے سے مؤرخ رؤف امیر کی خدمات کو نظر انداز نہیں کر سکے گا۔ تبسم ریحان نظم اور غزل پر دو اصناف میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ مخصوص لہجے کی وجہ سے الگ شناخت رکھتے ہیں۔ ''محمل'' کے نام سے ایک شعری مجموعہ منظرِ عام پر آچکا ہے۔ عثمان نائم نہایت قادرالکلام شاعر ہیں۔ عموماً نعت اور غزل کہتے ہیں۔ نظم کم کم کہتے ہیں کلاسیکی انداز کے علمبردار ہیں۔ رانا سعید دوشی اگرچہ ٹیکسلا کی نواحی بستی میں بستے ہیں مگر واہ کے موجودہ ادبی ماحول میں ان کا بہت اہم حصہ ہے جتنی اچھی نظم کہتے ہیں ویسی ہی اچھی غزل بھی کہتے ہیں۔ عصمت حنیف بھی نظم کے اچھے شاعر ہیں۔ مصروف آدمی ہیں پھر بھی شعری تخلیقات کے لئے وقت نکالتے ہیں۔ ان کے علاوہ اظہر نقوی، ندیم حیدر، طالب انصاری، شمشیر حیدر، بشیر آذر، شعیب ہمیش، ظفر رضوی، ناظم شاہجہانپوری، راکب راجا، علامہ روز خان، عارف قادری اور امجد شہزاد نے فکر و نظر کے چراغ جلائے ہیں۔ نئے لکھنے والوں میں مطیع الرحمان، ساجد محمود، خالد ملتانی، طلعت محمود اور عبید حبیب نمایاں ہیں۔ واہ میں مشاعروں کی روایت بھی بہت جاندار رہی ہے۔ پاکستان کا کوئی بڑا شاعر ایسا نہیں ہے جس نے واہ میں مشاعرہ نہ پڑھا ہو۔ مشاعروں کے انعقاد کے سلسلے میں شمیم صدیقی کا بڑا حصہ ہے۔ وہ خود تو شاعر نہیں تھے مگر مشاعرے بڑے جانفشانی سے منعقد کرواتے۔ ایف جی ماڈل سکول کے رئیسِ مدرسہ تھے۔ سالانہ محفل مشاعرہ ترتیب دیتے اور کسی نہ کسی معروف شخصیت کو ضرور مدعو کرتے۔ ایک مشاعرے میں تو انہوں نے حسرت موہانی جیسی معروف شخصیت کو بھی بلایا۔ راز مراد آبادی کا بھی اس سلسلے میں کردار ناقابلِ فراموش ہے۔ افسر تعلقاتِ عامہ ہونے کی وجہ سے آپ نامور شعراء سے رابطہ کرتے اور انہیں مشاعروں میں مدعو کرتے۔ مشاعرے کی روایت کو راز مراد آبادی نے نئی تازگی عطا کی۔ جمیل یوسف نے واہ میں قیام کے دوران اپنے گھر میں ادبی محافل کو جاری رکھا۔ سرکاری سرپرستی میں ایک کل پاکستان مشاعرہ کا سہرا ان کے سر ہے۔

چیئرمین پی او ایف بورڈ میجر جنرل محمد جاوید خود بھی ایک اچھے شاعر تھے۔ انہوں نے بھی واہ میں آمد کے بعد مشاعرے منعقد کروائے۔ ان میں کل پاکستان نعتیہ محفل مشاعرہ قابلِ ذکر ہے۔ نثری تخلیقات بالخصوص افسانے کے حوالے سے بھی واہ کا دامن موتیوں سے مالا مال ہے۔ ڈاکٹر

رشید امجد مشہور نقاد اور افسانہ نگار ہیں۔ ایف جی ڈگری کالج واہ میں پڑھاتے رہے ہیں۔ واہ کے ادبی ماحول پر گہرے اثرات قائم کئے۔ محمود اختر عادل نے افسانے اور نثر نگاری میں وہ گل شگفتہ کھلائے کہ واہ کا سارا ادبی ماحول مہک اٹھا۔ افسوس یہ گوہرِ آبدار جوانی ہی میں راہیٔ ملک عدم ہو گیا۔ علی مطہر اشعر نے بھی افسانے لکھے مگر خال خال۔ ان کی پہچان بہر حال شاعری ہے۔ عثمان خاور اگرچہ غزل اور نظم کے شاعر ہیں مگر ایک سفر نامہ بھی قلمبند کیا ہے۔ نثر کے حوالے سے سلمان باسط کے ذکر کے بغیر بات نہیں بنتی۔ سلمان باسط بلا کا ذہین آدمی ہے۔ خاکہ نگاری خاص میدان ہے۔ خاکی خانے کے نام سے ان کے خاکوں کی کتاب طبع ہو چکی ہے۔ مختصر افسانے کے حوالے سے طفیل کمالزئی کا نام معروف ہے۔ تین افسانوی مجموعے چھپ چکے ہیں۔ روزنامہ اوصاف میں مستقل کالم نگار کی حیثیت سے لکھتے ہیں۔ نہایت خلیق اور وضعدار آدمی ہیں۔ ایوب اختر نے بھی افسانہ نگاری کو اوڑھنا بچھونا بنایا۔ بہت عمدہ افسانے لکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں کے مجموعے ''مٹی کے خواب'' اور ''پچھلی پہر کی بارش'' منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ ان پر نمل یونیورسٹی میں آمنہ ملک ''ایوب اختر فن اور شخصیت'' پر ایم فل کر رہی ہیں۔ محمد توفیق صاحب تین سفر ناموں ''ستارے سفر کے دیکھتے ہیں''، ''مدراس براستہ بمبئی''، اور ''تری خوشبو سفر میں ہے'' کے خالق ہیں۔ محمد توفیق کے ہاں تحریر کی شیفتگی ہے۔ طبیعت بھی کشادہ پائی ہے۔ بلا کے ذہین ہیں اور گہرا مشاہدہ رکھتے ہیں۔ کثیر الجہاتی علم رکھتے ہیں۔ ان کے تینوں سفر نامے سلاست اور شگفتگی کے باعث بہت پسند کئے گئے۔ امان اللہ خان کے ذکر کے بغیر واہ میں افسانہ نگاری کا تذکرہ مکمل نہیں ہو سکتا۔ منفرد اسلوب کے حامل افسانہ نگار ہیں۔ عصری مسائل سے آگاہی رکھتے ہیں اس لئے ان کے افسانوں میں حقائق کی کڑواہٹ محسوس ہوتی ہے۔ بے پناہ مصروفیت کے باوجود تخلیقی سرگرمیوں کے لئے وقت نکالتے ہیں۔

مطیع الرحمان نوجوان افسانہ نگار کے طور پر سامنے آ رہے ہیں۔ عصمت حنیف کی تازہ کتاب ''نیلی نیند کے سپنے'' بھی شائع ہو چکی ہے۔ جن اب پروفیسر ضیاء صاحب اپنا تحقیقی کام کر رہے ہیں۔ واہ میں علم و ادب کے فروغ کے حوالے سے چند تنظیموں کا ذکر بھی ضروری ہے۔ یوں تو ادبی تنظیمیں ہر شہر میں قائم ہوتی ہیں لیکن اکثر دیکھا گیا ہے کہ یہ تنظیمیں مختلف جھگڑوں کا شکار ہو جاتی ہیں۔ واہ کی ادبی تنظیموں کے ساتھ ایسا نہیں ہے۔ ان تنظیموں نے بہت عرصہ تک اپنا رنگ جمایا۔ بعض تنظیمیں اس وجہ سے ختم نہیں ہوئیں کہ ان میں اندرونی خلفشار تھا بلکہ ان تنظیموں کے منتظمین ملکِ عدم سدھار گئے۔ بزمِ ادب جس کے روحِ رواں راز مراد آبادی تھے۔ یہ تنظیم راز صاحب نے سلیم بہادر خان ایگزیکٹو آفیسر کے ایماء پر قائم کی تھی۔ اس تنظیم کے اجلاس باقاعدگی سے کینٹ بورڈ کی عمارت میں منعقد کرتے رہے۔ ادبی تنظیم فانوسِ ادب کا واہ کے ادبی ماحول کی ترقی میں بہت نمایاں حصہ ہے۔ واہ کی بیشتر معروف ادبی شخصیات کا تعلق فانوس سے رہا۔ ان دنوں صریرِ خامہ واحد ادبی تنظیم ہے جس کے اجلاس باقاعدگی سے ورچوئل یونیورسٹی بہبود پلازہ واہ کینٹ نزد جامع مسجد میں منعقد ہو رہے ہیں۔ تنقیدی اجلاس اس تنظیم کی خاص پہچان ہیں۔ سید مبارک شاہ نے اس تنظیم میں سیکرٹری کی حیثیت سے کام کیا۔ مشتاق آثم نے بھی اس تنظیم کی فعالیّت میں بھرپور کردار ادا کیا۔ اس ضمن میں عصمت حنیف کی خدمات کا اعتراف بھی ضروری ہے۔ صریرِ خامہ کے اجلاس کی کاروائیاں باقاعدگی سے ملکی اخبارات میں شائع ہوتی ہیں۔ یہ تنظیم نئے لکھنے والوں کی راہنمائی میں پیش پیش ہے۔ بزمِ ایوانِ مدحت کا ذکر بھی اس لئے ضروری ہے کہ اس تنظیم کی وجہ سے نئے لکھنے والوں میں نعت کی محفلیں سجاتے رہتے ہیں۔ ان تمام باتوں کے علی الرغم دیکھا جائے تو ہمیں واہ کا علمی و ادبی افق نہایت روشن دکھائی دیتا ہے۔ اس افق پر کئی ستاروں نے اپنی آب و تاب دکھائی جن کی آب و

تاب واہ کی علمی وادبی تاریخ کا انمٹ حصہ ہے۔ واہ میں یوسف جبریل فاؤنڈیشن پاکستان اور مرید اقبال فاؤنڈیشن بھی علمی اور ادبی کام کر رہی ہیں۔ مرید اقبال فاؤنڈیشن نے واہ کینٹ میں سکولوں اور کالجوں کے اندر بے شمار پروگرام کئے اور یوسف جبریل فاؤنڈیشن کی طرف سے انعامات کتابوں کی صورت میں دیئے گئے۔

''صدائے واہ'' کے نام سے باقاعدہ ماہنامہ شروع کر دیا گیا ہے اور امید کی جاتی ہے کہ واہ، حسن ابدال، ٹیکسلا اور اٹک کے ساتھ ساتھ راولپنڈی سے اس رسالہ کو ایک بہترین رسالہ بنانے کی کوششیں کی جائیں گی۔ شاہد قاسمی صاحب جو مزاجاً ایک اچھے ایڈمنسٹریٹر ہیں جنہوں نے علمی، ادبی اور فکری کام شروع کر دیا ہے اور واہ کی تاریخ میں ان کا کام بہت جلد سامنے آنا شروع ہو جائے گا۔ نئے نئے جوان اب لکھ رہے ہیں اور ان کی تحریریں صدائے واہ میں شائع ہوں گی۔ واہ کی ادبی، ثقافتی اور صحافتی زندگی پر مکمل کام کی توقع جناب رؤف امیر صاحب سے وابستہ تھی لیکن قدرت نے انہیں مہلت نہ دی اور وہ یہ کام پورا نہ کر سکے۔

ارشد علی ارشد صاحب آج کل واہ کی ادبی تاریخ پر کچھ کام کر رہے ہیں ان کے ساتھ جناب محمد عارف صاحب مددگار ہیں۔ اُمید کی جاتی ہے کہ واہ کی ایک مدلّل تاریخ ضرور لکھی جائے گی جس کا سب کو بہت سختی سے انتظار ہے۔ اس مضمون کی تیاری میں جناب طالب انصاری صاحب نے بہت سی معلومات فراہم کیں۔

واہ ٹیکسلا میں مقیم ایک پولیس آفیسر، حسین امجد ایک زبردست شاعر کے طور پر سامنے آئے ہیں۔ اگرچہ وہ اٹک سے تعلق رکھتے ہیں لیکن وہ پولیس کی سروس کی وجہ سے واہ اور ٹیکسلا میں مقیم ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کو بھی واہ اور ٹیکسلا کے شعرا میں شامل کیا جائے گا۔ وہ ایک صاحبِ گداز شاعر ہیں۔

شعر دراصل ہیں وہی حسرت
سنتے ہی دل میں جو اتر جائیں

حسرت کا یہ تصوّرِ شعر آج کے تجرباتی ادبی روّیوں کی موجودگی میں بھی شاعروں کے ایک مخصوص قبیلے کی رگوں میں خون کی مانند گردش کرتا ہے جنہیں اپنے ضمیر کی آواز کی ترسیل کے لیے کسی بناوٹی سہارے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اُن کا تصوّر کسی انفرادی پیمانے اور پیرائے کا اسیر نہیں ہوتا یہی ان کا انفراد ہوتا ہے۔ حسین امجد کی نسبت شعرا کے اُسی خانوادے سے ہے جو دل کی بات دل سے کرتے ہیں اور دل والوں کے دل میں اتار دیتے ہیں۔ حسین امجد وفورِ جذبات سے لبریز پیمانۂ دل لے کر آئے لیکن ان کی ساقی گری میں کمال ہے۔ بقدرِ ظرف رند کو نوازتے ہیں، یہی ہنر اُن کے لہجے میں ٹھہراؤ لاتا ہے۔ کبھی کبھی ناصر کاظمی کی سرگوشی اُن کے مصرعوں سے اُبھرتی ہے جو رات کے پچھلے پہر دھیان کی سیڑھیاں اترتی ہوئی دروازۂ دل پہ دستک دیتی ہے۔

کوبکو چل رہی ہے پروائی
دل ہوا قرب کا تمنائی
شب کے پچھلے پہر میں آخر کار

ٹوٹ کر مجھ کو تیری یاد آئی
کس نے دیکھا ہجوم بڑھتا ہوا
کس نے دیکھی ہے صرف تنہائی
کب مرا دل کھلا کنول کی طرح
کب ہوئی جھیل سے شناسائی

خیال کے رخشِ سرمست کو اُسلوب کی مہار ڈال کر اپنی مرضی سے ہمراہ کرنا حسین امجد کا شعری نصب العین مرتب کرتا ہے۔

لفظ سو بار تولتا ہوا میں
ایسا محتاط بولتا ہوا میں

اسی محتاط لہجے میں وہ سرورِ کونین ﷺ کی بارگاہ میں جاتے ہیں، انکسار میں لپٹی بُکا اُن کے شعر میں تاثیر کی مہک اُتار دیتی ہے جو اس بُکا کو سننے والے کی آنکھوں کے ساحلوں کو نمی کی نوید دیتی ہے۔

حضور آپ کا منگتا ہوں میں حسین امجد
حضور کیا میں اٹھا لوں مدینہ شہر کی خاک؟

اُنہیں اپنے فن پر ناز نہیں یہی کسرِ نفسی اُن کے بعض شعروں کو اعجاز بنا دیتی ہے جو روح کے تار چھیڑ دیا کرتے ہیں۔ ہم صوفیانہ دُھن پر بہتے ہوئے شعر کے ساتھ سفر کرنے لگتے ہیں جو سفر کہیں مدینہ جا کر ختم ہوتا ہے، کہیں نجف اور کہیں دشتِ نینوا۔

کس طرح شاہِ شہیداں کا میں نوحہ لکھوں
کس طرح حشر کو اک شعر میں ڈھالا جائے
تین نوکوں کا تیر چھید گیا
ایک معصوم کا گلہ، گریہ !

حسین امجد ماضی کے خوش نما دیار میں اپنے رفتگاں کے ساتھ محوِ سفر رہتے ہیں۔ اُنہیں یاد کے دھندلے پردے پر کئی تصویریں نظر آتی ہیں، جو کہیں کہیں تو صرف سایہ معلوم ہوتی ہیں اور کہیں سات رنگوں میں نمایاں ہو کر حرف کے سہارے قرطاس کو گُلزار بنا دیتی ہیں۔ امجد روایت پسند ہیں۔ نئے دور میں پرانی اقدار کی شکست و ریخت اُنہیں دکھی کرتی ہے۔ وہ رگوں میں دوڑتے لہو کو سفید ہوتا دیکھ کر افسردہ حالی میں فریاد کناں ہوتے ہیں۔ اس کے لیے اُن کے لہجے کی وارفتگی تاثیر کی نوید بن جاتی ہے۔

اک قبیلہ آ کے ٹھہرا تھا یہاں
پھر قبیلے ہی قبیلے ہو گئے

امجد ہماری زیست کسی کام کی نہیں
ہم سے ہمارے دوست اگر بدگماں رہے
بعد مدت کے اُس نے خط لکھا
اور اس خط میں میرا نام نہیں

خوشبو کو قید نہیں کیا جا سکتا، خوشبو امن و سکون، محبت اور آزادی کا استعارہ ہے لیکن بدامنی کی بُو نے خوشبو کی دل آویز قبا کو داغ دار کر دیا۔

میں نے دہشت زدہ چمن دیکھا
میں نے دیکھی ہے بے اماں خوشبو
صحنِ گل اس لیے ہے افسردہ
پنکھڑی پھول سے جدا ہوئی ہے

بعض روایتی مضامین کا آج کے دور میں بھی اطلاق ہوتا ہے- چوں کہ زخم پرانے ہیں لیکن تازہ چوٹ نے آج کے دور میں بھی وہی زخم دوبارہ سلگا دیے ہیں- امجد کے دل کے داغ سلگنے لگتے ہیں۔

سارے اخبار پڑھ کے دیکھ لیے
سارے اخبار جھوٹ بولتے ہیں
ہجومِ شہر سے اکتا گیا ہوں
مرے جینے کو تنہائی بہت ہے
جسے حکم دینے کی عادت پڑی ہو
کرے کیسے منت سماجت ہماری
جس بات پہ سب لوگ بہت دیر ہنسے تھے
وہ بات ابھی میں نے بتائی تو نہیں ہے

لیکن حالات کے ساتھ سمجھوتہ کر لینا بھی شعور مندی کا اشاریہ ہوا کرتا ہے۔

بارشیں اب یہاں نہیں ہوتیں
دھوپ ہے دھوپ سے نہاتے ہیں

امجد نے نئے، پرانے کے بے معنی امتیازات سے بالاتر ہو کر شاعری کی۔ اُس کی شاعری میں خالص جذبات کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ سماعت پر بار بننے والی آواز نہیں، بلکہ کانوں میں رَس گھولنے والا الاپ ہے۔ اس میں حسین امجد کی موسیقیت کو بہت دخل ہے۔ امجد کا مزاج موسیقی سے گہرا انسلاک

رکھتا ہے۔اسی باعث امجد کا حرف حرف آسان اور میٹھی زبان بولتا ہے۔ حسین امجد کے لیے سلاست، روانی سہلِ ممتنع جیسی مشکلات کو سَر کرنا اسی موسیقیت کے سہارے ممکن ہوا۔ مومن نے کہا تھا:۔

اُس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

حسین امجد دھیمے سُروں کو چھیڑتے چھیڑتے ایسی فضا مرتب کرتے ہیں، جس کے کرہ سے نکلنا یکسر ناممکن معلوم ہوا کرتا ہے۔

رخ پہ آنچل سنوارا گیا
روح تک اک نظارا گیا
زلف جب بھی پریشاں ہوئی
اس کا صدقہ اتارا گیا
میں نے تجھ پر بھروسا کیا
میں محبت میں مارا گیا
نت نئی خواہشوں میں زندہ ہے
دل مرا موسمی پرندہ ہے
اُسے میں ورغلا سکتا ہوں امجد
مگر ایسے میں رسوائی بہت ہے

حسین امجد کو اپنی روایت پسندی کا ادراک بھی ہے لیکن صرف روایت پسند ہی نہیں بلکہ جدید خطوط پر سفر اختیار کرنے کے لیے پُرامید بھی ہیں۔

یہاں اپنا بچپن گزارا تھا ہم نے
یہی اب تلک ہے سکونت ہماری
اپنی فرسودہ روایات بدلنا ہوں گی
ورنہ فرسودہ روایات سے مر جاؤں گا
آج میں بھی خرید لاتا ہوں
پھول تازہ کہاں سے ملتے ہیں

لیکن تخلیقی عمل کی دشواریاں کبھی کبھی پاؤں سے آبلوں کی صورت لپٹ لپٹ جایا کرتی ہیں اور کہیں کہیں تخلیقی وفور کے آگے، لفظ کا تنگنا یہ شرمسار سا کر دیتا ہے۔

شرم سے اور میں سمٹ جاؤں
جیسے جیسے قریب آئے غزل
رنگے ہاتھوں نہ پکڑا جاؤں کہیں
قفل شعروں سے کھولتا ہوا میں
اک اذیت میں مبتلا ہی رہا
کب مجھے درد سے شفا ہوئی ہے

حسین امجد، شاعری کی رہ گذر پر سفر کرتے ہوئے گداز آشنا ہوئے۔ یہی گداز وہ زادِ راہ ہے جو کئی دیگر منازل کی بشارت کے نغمے سناتا ہے۔ محمد عارف قادری صاحب کی نعتیہ کتاب (دوسری) شائع ہو چکی ہے۔ شیخ صلاح الدین صاحب کی شاعری کی دوسری کتاب منظر پر آنے والی ہے۔ جس کا اہتمام شاہد قاسمی صاحب نے کیا ہے اور پروف ریڈنگ وغیرہ جناب محمد عارف ٹیکسلا نے کی ہے۔ علامہ محمد یوسف جبریلؒ کی کتاب جدید سائنس کے مغالطے اور قرآنِ حکیم اور اسلام کا معاشی نظام پر کام ہو رہا ہے۔ دعا فرمائیں کہ واہ میں علم و ادب کا کام جاری و ساری رہے۔ واہ ٹیکسلا کے ادیب حضرات سے اپیل کی جاتی ہے کہ وہ اس سلسلہ میں کچھ نہ کچھ تحریر کریں تاکہ آئندہ آنے والی ترجیحات کا علم ہو سکے۔

(''تجھے گر فقر و شاہی کا بتادوں''۔ایک نظر میں) تحریر: پروفیسر ضیاء الدین بابا

ٹیکسلا کے اُبھرتے ہوئے جواں سال شاعر، محقق اور نقاد محمد عارف 16فروری 1969 ء کو پنڈ فضل خان، تحصیل فتح جنگ، ضلع اٹک میں پیدا ہوئے۔انہوں نے گورنمنٹ ہائی سکول حسن ابدال سے میٹرک، ایف جی ڈگری کالج واہ کینٹ سے بی اے کیا۔محمد عارف نے پنجاب یونیورسٹی سے بی ایڈ اور ایم اے اردو کے امتحانات پاس کئے۔انہوں نے علامہ اقبال یونیورسٹی سے پروفیسر فتح محمد ملک کی زیر نگرانی '' ربیعہ فخری۔احوال و آثار'' کے موضوع پر ایم فل کی ڈگری حاصل کی۔محمد عارف نے کچھ عرصہ معروف نجی تعلیمی اداروں میں پڑھایا، بعد ازاں فیڈرل پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کرکے وفاقی نظامتِ تعلیمات اسلام آباد میں بطور استاد تعینات ہو کر اعلیٰ ثانوی سطح پر اردو پڑھانے لگے۔محمد عارف کی غزلیں، نظمیں، نعتیں، قطعات ملکی اخبارات و جرائد میں چھپتے رہتے ہیں۔انہیں دورانِ تعلیم گورنمنٹ کالج اٹک میں منعقدہ آل پاکستان محفل مشاعرہ میں اول انعام ملا۔وہ ایف جی ڈگری کالج واہ کینٹ کے ادبی مجلہ ''شعور'' کے ایڈیٹر بھی رہے۔انہیں دورانِ تعلیم بہترین مقرر، شاعر، ادیب اور کمپیئر ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔آپ نے مختلف علمی و ادبی شخصیات کے فکر و فن پر مضامین بھی تحریر کئے ہیں۔ وہ خاندانی پسِ منظر کے اعتبار سے بھی ایک باثروت حیثیت کے حامل ہیں کیونکہ ان کے والدِ محترم میاں محمد محکمہ تعلیم پنجاب سے وابستہ رہے۔آپ عمدہ ادبی ذوق رکھتے تھے۔سروس مکمل کرنے کے بعد بطورِ ہیڈ ماسٹر ریٹائرمنٹ ہوئے۔ننھیال کی طرف سے آپ کے ماموں پروفیسر ڈاکٹر رؤف امیر ملک بھر کے علمی و ادبی حلقوں میں بحیثیتِ شاعر، ادیب، محقق اور نقاد نمایاں ادبی

شناخت رکھتے تھے۔وہ ایف جی ڈگری کالج برائے طلباء واہ کینٹ میں ایسوسی ایٹ پروفیسر بھی رہے۔بعدمیں انٹرنیشنل قراقرم یونیورسٹی الماتے قازقستان میں پاکستان چیئر پر کام کرتے رہے ۔محمد عارف کے گھر میں منعقدہ ادبی محافل اور علمی مباحث نے ان کے ادبی ذوق کو پروان چڑھایا۔ انہوں نے علم و ادب کی خدمت کو نہ صرف اپناشعار بنایا،بلکہ پتھروں کی سرزمین ٹیکسلا میں پہلی دفعہ آل پاکستان مشاعروں کاانعقاد کیا۔ وہ اپنے علاقے کی متحرک ترین ادبی شخصیت کے طور پر ابھرے، مباحثے، مذاکرےاور سیمینار منعقد کئے۔محمد عارف کی زیرِ بحث تحقیقی کاوش''تجھے گر فقرو شاہی کابتا دوں'' کے مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آ تی ہے کہ انہوں نے اردو کے مایہ ناز محقق، ادیب، دانشور، مترجم، ڈاکٹر تصدق حسین کی شخصیت اور ادبی خدمات کو اجاگر کرنے کے سلسلے میں بے پناہ محنت و کاوش سے کام لیا ہے۔ڈاکٹر تصدق حسین کاتعلق ان اہلِ قلم سے ہے، جنہوں نے عمر بھر قرطاس و قلم کے ذریعے اسلامی اقدار وروایات کے فروغ کے لئے کام کیا۔ان کے مطالعہ کے مرکزی موضوعات اقبالؒ، عرشی امرتسری، جیلانی بی اے، سید مودودیؒ ورحضرت علامہ محمد یوسف جبریلؒ رہے ہیں۔واضح ہو کہ یہ تمام شخصیات فلسفۂ قرآن کی روشنی میں تعلیماتِ اسلامی کو عام کرنے کے سلسلے میں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہیں۔ڈاکٹر تصدق حسین نے محولہ بالا شخصیات کی سوانح اور افکار و خیالات کو پہلی دفعہ تحریر کرکے علم وادب کی بے پناہ خدمت کی ہے۔ڈاکٹر تصدق حسین نے تراجم نگاری کے شعبے میں عالمِ اسلام کے دو معروف ریسرچ سکالرز ڈاکٹر ذاکر نائیک اور ہارون یحییٰ کی کتب کے اردو میں عمدہ تراجم کئے ہیں۔یہ وہ تراجم ہیں جو مستشرقین کے اسلام پر کئے گئے اعتراضات کے جوابات بطریقِ احسن دیتے ہیں اور حکمتِ قرآن کے متنوّع گوشوں کو ورق ورق آشکار کرتے ہیں۔محمد عارف نے ڈاکٹر ذاکر نائیک اور ہارون یحییٰ کی کتب کے تراجم کوبہت خوبی سے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔میں یہ سمجھتاہوں کہ انہوں نے خصوصاً تعلیماتِ فقر کو اجاگر کرنے کے سلسلے میں غیر معمولی کاوش سے کام لیاہے اور یوں یہ کتاب تلاشِ حقیقت کے سفر پر نکلے ہوئے مسافروں کے لئے ایک انسائیکلوپیڈیا کی شکل اختیار کر گئی ہے۔اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔ پروفیسر ضیاء الدین بابا، ایم اے اردو، ایم فل، شعبہء اردو،ایف جی ڈگری کالج برائے طلباء واہ کینٹ۔

فصل نمبر2۔ (کوائف نامہ مصنف)

نام: محمدعارف ولدیت: میاں محمد

سال پیدائش 16 فروری 1969 مستقل پتہ: گاؤں پنڈ فضل خان، تحصیل فتح جنگ، ضلع اٹک

موجودہ پتہ I-R-36، نزد جنجوعہ ٹریڈرز، اعوان مارکیٹ فیصل شہید ٹیکسلا نمبر رابطہ:

03335465984

تعلیمی کوائف:

۱۔ میٹرک گورنمنٹ ہائر سیکنڈری سکول حسن ابدال

۲۔ ایف اے ایف جی ڈگری کالج واہ کینٹ

۳۔ بی اے ایف جی ڈگری کالج واہ کینٹ

۴۔ ایم ایڈ سرحد یونیورسٹی

۵۔ ایم اے اردو پنجاب یونیورسٹی

۶۔ ایم فل (اردو) علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد

7۔ پی ایچ ڈی (اردو) علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد

ملازمت:

1۔ پرنسپل، اسلام آباد بوائز ماڈل ہائی سکول بڈھانہ کلاں، اسلام آباد۔

تصانیف:

1۔ تجھے گر فقر و شاہی کا بتا دوں (ڈاکٹر تصدق حسین۔ حیات و خدمات)

2۔ کن فیکون (علامہ محمد یوسف جبریل، سوانح و افکار)

3۔ ربیعہ فخری احوال و آثار (مقالہ برائے تکمیل امتحان ایم فل)

4۔ منظر ترے غم کا (شاعری)

5۔ حرفِ سخن مدینہ ہے۔ نعتیہ مجموعہ (زیرِ ترتیب)

6۔ ورفعنالک ذکرک۔ نعتیہ مجوعہ (زیر ترتیب)

ادبی مضامین: (انتخاب)

۱۔ درنیم وا (رؤف امیر)۔ایک مطالعہ

۲۔ دشت خواب (شمشیر حیدر)۔ایک نظر میں

۳۔ زندہ رہے گا پاکستان (کرنل مقبول حسین)۔دیباچہ

۴۔ حسن ناصر کی غزل

۵۔ رانا سعید دوشی، ایک منفرد غزل گو

۶۔ نوشیروان عادل کی فکری جہتیں

۷۔ گل نازک کی شاعری میں رزمیہ عناصر

۸۔ جلیل عالی کی غزل

۹۔ پروفیسر رفعت اقبال کی غزل

۱۰۔ عارف قادری کی نعتیہ شاعری

۱۱۔ سید سفیر حسین سفیر کی رثائی شاعری

۱۲۔ گرفتار شب (کرنل مقبول حسین) ایک مطالعہ

۱۳۔ نعت محمد ﷺ (سرور انبالوی) ایک تنقیدی و تحقیقی مطالعہ

۱۴۔ سرور انبالوی کی نعتیہ شاعری

۱۵۔ آل عمران کی غزل میں تہذیبی و ثقافتی عناصر

۱۶۔ عزیز ملک۔احوال و آثار، مرتبہ پروفیسر امجداقبال۔ایک مطالعہ

۱۷۔ شعیب ہمیش کی شاعری میں تغزل کے عناصر

۱۸۔ سلمان باسط اور واہ سکول آف تھاٹ

۱۹۔ ایوب اختر کا فن افسانہ نگاری

۲۰۔ علی محمد فرشی کی نظموں میں ماورائی فضا

۱۲۔ ناصر کاظمی کی شاعری

ادبی خدمات:

۱۔ایڈیٹر کالج میگزین(شعور) ایف جی ڈگری کالج واہ کینٹ

۲۔صدر نکھار ادبی سوسائٹی رجسٹرڈ ٹیکسلا

۳۔رکن حلقہ تخلیق ادب ٹیکسلا

۴۔رکن فانوس ادب واہ کینٹ

5۔اعزازی رکن جبریل فاؤنڈیشن پاکستان

اپنے ایم فل کی تکمیل کے مراحل تک وہ ٹیکسلا میں اپنا مخصوص حلقہ ارباب قائم کر چکے تھے۔اس کے ساتھ ساتھ ان کی ادبی محافل میں ادب کے لیے خدمات کو سراہا جارہا تھا۔انہوں نے تحریر و تصنیف کا باقاعدہ آغاز اپنے تحقیقی مقالہ "ربیعہ فخری۔احوال و آثار" پروفیسر فتح محمد ملک صاحب کی نگرانی میں مکمل کیا، جس پر انہیں ایم فل کی ڈگری دی گئی۔

اس کے بعد ان کی پہلی تصنیف "تجھے گر فقر و شاہی کا سکھا دوں" (ڈاکٹر تصدق حسین حیات و خدمات) بسم اللہ سرکار کی سوانح حیات ہے۔ اس میں انہوں نے بسم اللہ سرکار کی سوانح حیات کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہاں پر یہ بات بھی اہم ہے کہ ان کا تصّوف کی طرف رجحان وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتا رہا ہے۔ یہاں تک کہ جب تخلیق و تصنیف کی باری آئی تو یہ تصّوف ہی تھا جس نے انہیں لکھنے پر مامور کیا ورنہ وہ تو ادبی محافل و مجالس کے دلدادہ تھے۔ اس کے بعد ان کی دوسری تصنیف "کن فیکون" ہے۔ یہ حضرت علامہ محمد یوسف جبریلؒ کی سوانح حیات ہے۔ اس میں مصنف نے علامہ یوسف جبریلؒ کے افکار و نظریات کا تنقیدی جائزہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

محمد عارف کی یہ ایک اہم کاوش ہے۔ اس میں انہوں نے نہ صرف خود تحقیق کے ذریعے ان کے نظریات کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ انہوں نے علامہ یوسف جبریلؒ کے شناساؤں سے بھی اس سلسلے میں مضامین لکھوائے ہیں۔ اس کے علاوہ علامہ محمد یوسف جبریلؒ کے سائنسی و فنی نظریات اور معاشی و مذہبی تصوّرات کے حوالے سے اس تصنیف میں پہلی دفعہ بعض اہلِ قلم سے نئے مضامین بھی لکھوائے گئے ہیں۔

محمد عارف "کن فیکون: ماحصل کلام" میں رقم طراز ہیں:

"علامہ محمد یوسف جبریلؒ کی شخصیت اور ان کے علمی کارناموں پر مرتّب کی گئی یہ علمی کاوش صحرا کی ریتلی زمینوں پر پڑنے والی بارش کی پہلی پھوار ہے۔ ہم نے ان کا سوانحی خاکہ، آپ بیتی، افکار و نظریات کے ذیلی عنوانات کے تحت نہ صرف اپنے قلم سے چند جواہر ریزے صفحۂ قرطاس پر منتقل کئے بلکہ علامہ محمد یوسف جبریلؒ سے محبت رکھنے والے متعدد دوست احباب سے ان کے فکر و فن پر مضمون بھی لکھوائے جو کہ انتہائی عرق ریزی، قد و کاوش اور تصریح سے پیشِ خدمت ہیں۔ میں اپنے وطن کے اہلِ علم و دانش اور تخلیقی بصیرت کے حامل دانش وروں کو ضرور دعوتِ فکر دوں گا کہ وہ میرے دردِ دل کو سمجھیں اور میری پکار پر اٹھ کھڑے ہوں تاکہ کفر و الحاد پر مبنی نظام اور طاغوتی طاقتوں کی بالادستی کو نیست و نابود کر کے اسلامی انقلاب کے لیے زمین ہموار کی جا سکے۔" (۳)

اس کے بعد ان کی توجّہ شاعری کی طرف مبذول ہو گئی۔ انہوں نے شعر گوئی میں اپنا وقت لگا دیا۔ اس لیے ایک لمبے عرصے تک خاموشی کے بعد 2013ء میں ان کی شاعری کی پہلی کتاب "منظر تیرے غم کا" منظر عام پر آئی۔ یہ کتاب ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے۔ اسے مثال پبلی کیشنز فیصل آباد نے شائع کیا ہے۔ اس کتاب کا تعارف بالعموم اور شاعر کا تعارف بالخصوص کچھ یوں کروایا جا سکتا ہے۔

"'منظر تیرے غم کا' میں قاری کو جو وصف سب سے زیادہ متاثر کرتا ہے وہ ان غزلوں کی تازگی ہے۔ یہ تازگی الفاظ کے انتخاب سے تراکیب سازی اور قوافی و ردیف کے التزام سے خیالات و تجربات کی تازگی تک پھیلی ہوئی ہے۔ تخلیقی شعری تجربے سے جڑے ہوئے شاعروں کی کرافٹنگ بھی تازہ کاری کی مظہر ہوتی ہے جو ان کے فطری تخلیقی جوہر ہی کا ایک عکس ہوتی ہے۔ یوں آرٹ اور کرافٹ کا ایک ایسا خوب صورت امتزاج سامنے آتا ہے جو تخلیقی تجربے اور فنی مہارت سے پیدا ہوتا ہے۔ عارف کی غزلوں میں شعری تجربات کی پیش کش کا قرینہ نہ صرف ان کی فنِ شعر سے گہری وابستگی کا آئینہ دار ہے، بلکہ اس سفر میں ان کے روشن مستقبل کی نشان دہی بھی کرتا ہے۔ ان کی غزلیں، مضامین کی ندرت اور اسلوب کے نئے پن کے سبب آج کی غزل میں ایک خوشگوار اضافہ ہیں۔ ان میں شاعرانہ لگن اور تخلیقی انعامات کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کی تازگی قابلِ ستائش ہے۔" (۴)

فصل نمبر3۔منظر ترے غم کا۔ایک مطالعہ تحریر:راجہ گل حسن بدرؔ(خوشاب):

طلسم خانہ ءِ حیرت سرا سے باہر آ
ذرا وجود کی اندھی گپھا سے باہر آ

تخیّل کی بلندی اور عرفان و آگہی کی وہ کون سی منزل ہے کہ یہ خیال منصۂِ شہود پر ظہور پذیر ہوا۔ڈاکٹر محمد عارف کا شعری مجموعہ ''منظر ترے غم کا'' ایک ایسی کاوش ہے جو سراہے جانے کے قابل ہے گو کہ اس دورِ جدید میں کتاب سے دوری ایک المیّہ ہے۔راقم الحروف کا ایک شعر ہے:۔

نقش مت دیکھ ان کتابوں میں
کاغذوں پر دماغ رکھے ہیں

سوڈاکٹر محمد عارف اپنے پورے وجود کے ساتھ ''منظر ترے غم کا'' میں یوں نظر آتے ہیں جیسے وہ خود مطالعہ کرنے والے کے سامنے موجود اور ہمکلام ہوں۔

راقم الحروف کا تعلق ضلع خوشاب سے ہے لیکن کبھی کبھی ٹیکسلا آنے کا شرف حاصل ہوتا ہے کیوں کہ میرے بہنوئی محمد رضا نے ائیر فورس سے ریٹائر ہونے اور واہ میں ملازمت کے مل جانے کے بعد یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی ہے۔انہی کی وساطت سے محترم قیصر عباس اور جناب ڈاکٹر محمد عارف سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔دونوں صاحبان شعبہ ءِ تعلیم سے وابستہ ہیں اور ان جیسی ادب نواز شخصیات سے ملاقات میری خوش قسمتی ہے۔

پہلے تو حیرت ہوئی کہ سنگ تراشوں کی اس نگری میں ایسے گوہرِ نایاب بھی موجود ہیں جو ادبی سطح پر (چاہے اپنے من میں ڈوب کر) گلستانِ رنگ و بو میں کانٹے اور گلاب چننے اور سجانے اگانے میں مصروف ہیں۔

یہ راہِ عشق کٹھن ہے ہزار خطرے ہیں
اگر چلے ہو تو پھر تھوڑا حوصلہ کر کے

شاعرِ موصوف وجدانی کیفیات، مظاہرِ فطرت، وطن پرستی اور ندرتِ خیال کے اظہاریئے اور عناصر سے منسلک رہ کر دھنک رنگوں کی قوسِ قزح سے جہاں روشناس کراتے ہیں وہیں تلاش میں پرت در پرت پھول کلیاں بکھیرتے نظر آتے ہیں۔

تری تلاش میں جگنو، دھنک، ستارے، پھول
کہاں چھپا ہے نگاہوں سے تو ہمارے پھول
کسی کی یاد کی کشتی میں ہوں رواں عارفؔ
کھلا ہوا ہے کوئی جھیل کے کنارے پھول

ڈاکٹر محمد عارف کے شعری مجموعہ ''منظر ترے غم کا'' میں نہ تو لفاظی، مشکل پسندی اور پیچیدگی کے عنصر موجود ہیں اور نہ ہی وہ جدت سے انکاری ہیں۔وہ سادہ پیرائے میں انتہائی گہری صوفیانہ اور سادگی کے صاف شفاف لہجہ میں گفتگو کرنے کے فن سے آشنا ہیں۔

نظر پہ کھلتے نہیں ہیں یہ راز ہست و بود

کوئی حجاب پس پردۂ تخیل ہے
کسی طرف سے کوئی راستہ دکھائی دے
نویدِ صبح درخشاں بشارتوں میں اتر

''منظر ترے غم کا'' میں شاعر تخلیق کے جس مقام پر موجود ہیں۔ یہاں تک کہ سفر میں نہ جانے تنہائیوں کے کتنے کرب سہہ کر پھول کانٹے چنتے چنتے ایسی آواز اور صدا بھی بلند کرتے ہیں جیسے:۔

بظاہر چلتا پھرتا ہوں زمیں پر
مگر دراصل زندہ نہیں ہوں
ہر اک نظر پہ ترے اسم کا طلسم کھلے
محیطِ عالمِ کل میرے سب گھروں میں اتر
اب مسیحا نفس ملے کوئی
اپنی جاں سے گزر رہا ہوں میں
اس کے دل پر مری حکومت تھی
اس قدر با اثر رہا ہوں میں

''منظر ترے غم کا'' اگر غمِ حیات کی داستان ہے تو اس میں عرفان، وجدان اور ایک صوفی منش کا لہجہ کامل ہمراہ ہے جسے یزداں کی تلاش و جستجو اور ملنے کی ایک آرزو مچل مچل جاتی ہے۔ ڈاکٹر محمد عارف کی یہ تخلیق سنگ تراشوں کی زمین پر ایک حسین اور زندہء جاوید پھول کی مانند ہے جس میں ہر رنگ پورے اعتماد کے ساتھ خوشبوؤں کی مہک لئے موجود ہے جس میں کسی سے ملنے کی بھرپور تمنّا کا اظہار یہ اور لب و لہجہ بدرجۂ اُتم موجود ہے:۔

طلسم خانہ ءِ حیرت سرا سے باہر آ
ذرا وجود کی اندھی گپھا سے باہر آ
بلا رہا ہوں تجھے زینہ ءِ بلندی سے
جہاں کہیں بھی ہے میری صدا سے باہر آ

ڈاکٹر محمد عارف ''منظر ترے غم کا'' میں لمحہء موجود کا شاعر ہی نہیں مستقبل کا ایک منفرد درویش صفت اور صوفی کا لہجہ لئے اپنی الگ شناخت کا آغاز ہے۔ وقت فیصلہ کرتا ہے۔ جدید و قدیم، تنقید و توصیف یہ سب گھڑے ہوئے پیمانے ہیں۔ تمام فیصلے وقت کے قاری کی زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ یقیناً ڈاکٹر محمد عارف ''منظر ترے غم کا'' میں اپنے پورے وجود کے ساتھ نمایاں رہنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

یہ روز و شب کے مسائل یہ میرے دکھ مرے غم
بنا گئے زمانے میں با ہنر مجھ کو

فصل نمبر 4۔ اپنی موج میں، اپنی دُھن میں، بہتا بولتا رہتا ہے، تحریر شمشیر حیدر (شہرِ سنگ):

جب ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہو تو ایسے میں اگر ایک جگنو بھی چمکتا دکھائی دے تو حوصلہ ہونے لگتا ہے، کچھ کچھ اپنے ہونے کے نشاں کھلنے لگتے ہیں اور وحشتوں کے فریب میں کمی آنے لگتی ہے۔ ہم ایسے عہدِ بے چراغ میں زندہ ہیں کہ جب ہر آدمی زندگی جبرِ مسلسل کی طرح کاٹ رہا ہے۔ ہم اپنے آپ کو، اپنی اقدار کو فراموش کر چکے ہیں۔ ایسے میں اگر کوئی سیدھا سادھا، راست گو، صلح پسند، قناعت پسند اور اپنے آپ میں رہنے والا نظر آئے تو اس کی ان خوبیوں کو ہم خامیاں سمجھنے لگتے ہیں مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ اس تیرہ شبی میں کہیں کسی طرف اگر ایک آدھ ایسا چراغ جلتا نظر آئے تو جان جاؤ کہ کم کم ہی سہی مگر زندگی کے آثار موجود ہیں۔

ڈاکٹر محمد عارف (ٹیکسلا) سے مل کر اسے سمجھ سکو، پڑھ سکو تو پھر اس نتیجے پر پہنچو گے کہ ابھی ایسے درویش صفت لوگ موجود ہیں اسی لیے قیامت نہیں آ رہی۔ ڈاکٹر محمد عارف کے حوالے سے یہ سطریں لکھنا میرے لیے اعزاز سے کم نہیں کیوں کہ بہت آغاز میں جن دو چار صاحبان سے میں نے رہنمائی لی اُن میں ڈاکٹر محمد عارف سرِ فہرست ہیں۔ جو خوبیاں اُن کی شخصیت کا حصہ ہیں وہ کم ہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ آج سے اٹھارہ سال پہلے جب ہماری ملاقات ہوئی تو ادبی فضاؤں میں عارف کے اشعار گونج رہے تھے جو آج بھی مجھے اُسی طرح یاد ہیں:۔

جب بھی آنگن میں کوئی پھول کھلا ہوتا ہے
میرے ہمسائے کو اس پر بھی گِلا ہوتا ہے
اس کے دل پر مری حکومت تھی
کس قدر با اثر رہا ہوں میں

یہ اشعار ایسے ہیں جو سنتے ہی دل پر حکومت کرنے لگتے ہیں۔ ان میں روایت سے جڑت اور جدید غزل کا مطالعہ صاف جھلکتا نظر آتا ہے۔ ایسا کیوں نہ ہو کہ عارف کو نہ صرف تمام قابلِ ذکر اساتذہ کے سینکڑوں اشعار ازبر ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ جدید شعراء ناصر کاظمی، شکیب جلالی، فیض احمد فیض، مجید امجد، منیر نیازی، احمد فراز، جمال احسانی، ثروت حسین، علی مطاہر اشعر، جلیل عالی، یوسف جبریل اور دیگر اہم شعراء بھی اُن کے حافظے کا حصہ ہیں۔ یوں کہنا مناسب ہو گا کہ ''طبع حسرت نے اُٹھایا ہے ہر استاد سے فیض'' یہی وجہ ہے کہ اُن کے ہاں روایت میں ڈوب کر تازہ شعر کہنے کی کامیاب کوشش ملتی ہے اُن کی زمینِ شعور و ادراک میں روحانیت کی فصل بوئی گئی ہے۔ روایت کا رچاؤ، گداز اور ٹھہراؤ اگر کمال پر ہے تو ساتھ ساتھ عصری ترجمانی وقت کی تمام سفاکیوں کی نشاندہی کی صورت میں ملتی ہے۔ سادگی اور روانی کے ساتھ ساتھ شعر کا پُر تاثیر ہونا اُن کی مہارت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

جب ہماری دوستی ہوئی اُس وقت عارف ماسٹرز کر رہے تھے۔ اس سے پہلے یہ ایف جی ڈگری کالج واہ کینٹ میں گریجویشن کے دوران اپنی شاعری کا لوہا منوا چکے تھے۔ گریجویشن کے بعد شہرِ سنگ (ٹیکسلا) میں یہ متحرک ترین ادبی شخصیت کے طور پر اُبھرے۔ کئی یادگار مشاعرے اور تقاریب منعقد کرائیں جو اس کے بعد یہاں دیکھنے کو نہ ملیں مگر اُس وقت بھی یہ آج کی طرح کھوئے کھوئے، اُداس اُداس سب سے الگ تھلگ، گفتگو میں بھی ایک خاص کشش، وضع قطع میں بھی سب سے مختلف '' اپنی موج میں، اپنی دھن میں'' رواں دواں تھے۔ ماسٹرز کے بعد کچھ عرصہ مختلف اداروں میں اُردو کے لیکچرر کے طور پر خدمات سرانجام دیں۔ بعدازاں فیڈرل پبلک سروس کمیشن کے ذریعے منتخب ہو کر اعلیٰ ثانوی سطح پر اُردو پڑھانے لگے مگر عارف کے مزاج میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ وہی درویشی ان کی شخصیت کا حصہ رہی، انھیں ہر لمحہ احساس رہتا ہے کہ وہ نقشِ فانی ہیں، نہ

اپنے حرف و آواز پر گھمنڈ، نہ اپنے مطالعہ و حافظہ پر ناز۔ کبھی کبھی وہ اپنے لباسِ عجز کے بارے میں فکر مند ضرور ہوتے ہیں مگر ساتھ ہی شکر بجالاتے ہیں کہ یہ خاص عطائے پروردگار ہے۔ جب وہ امیدوں کے نخلِ سایہ دار کے جھلس جانے کا شکوہ کرتے ہیں تو ساتھ ابرِ رواں کے طالب بھی ہوتے ہیں۔ اُن کی ساری کہانی، الفاظ و معانی، ہر صبح سہانی اور اشکوں کی روانی میں عشق ہی عشق بولتا ہے، انہیں خبر ہے کہ عشق کسی منصوبے کا محتاج نہیں ہوتا بلکہ یہ جنوں کے رواں دواں پانیوں پہ بہنے والا بے منزل مسافر ہے۔ اُن کے قریبی احباب جانتے ہیں کہ وہ تصّوف کے رنگ میں اتنے رنگے ہوئے ہیں کہ بعض اوقات خود سے بھی بے خبر ہو جاتے ہیں۔

جھلس گئے ہیں امیدوں کے نخلِ سایہ دار
مثالِ ابرِ رواں دھوپ آنگنوں میں اتر
کسی طرف سے کوئی راستہ دکھائی دے
نویدِ صبح درخشاں بشارتوں میں اتر
ویران جزیرے کا ہوں گم نام مسافر
اطراف میں پھیلا ہے سمندر تیرے غم کا

مجھے صرف قافیہ یا ردیف کی تعریف کرنا اچھا نہیں لگتا اور نہ ان کے پیچھے بے جا بھاگنے کا حامی ہوں بس شعر ہونا چاہیئے۔ ردیف قافیہ، بحر اور زمین کوئی بھی ہو ورنہ عارف کے پاس بھی ایک سے ایک نئی ردیف اور قافیہ کا خوبصورت استعمال ملتا ہے۔ یہ میری خواہش بھی ہے اور دعا بھی ہے کہ عارف کا اوّلین شعری مجموعہ ''منظر تیرے غم کا'' اُردو غزل میں تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہو اور یہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں اپنا سفر جاری رکھیں، اپنی شعری فضاء سے اٹھنے والی روحانیت کی لہر کو محسوس کرتے ہوئے شعری منظر نامے کو مزید نمایاں کر سکیں۔ آخر میں عصرِ حاضر کے آئینہ دار اشعار دیکھئے:۔

یہ جو اک آگ میں جلتا ہوا گھر دیکھتا ہوں
اس میں اک ہاتھ پسِ پردۂ در دیکھتا ہوں
مجھے خبر ہے کہ میں شب کی سلطنت میں ہوں
نہ جھوٹے خواب دکھاؤ بہت سحر کے مجھے

فصل نمبر 5۔ اعزازات:

وزارتِ اطلاعات و نشریات کے زیر اہتمام پی ٹی وی کے ملی نغموں کے ایک مقابلے کا انعقاد کیا گیا۔ پورے ملک سے مختلف لوگوں نے ملی نغمے لکھے اور تیار کر کے مقابلے میں شرکت کی۔ پی ٹی وی کے پروگرام "اے نگارِ وطن" میں ملک بھر سے وصول ہونے والے ملی نغموں میں سے پورے ملک میں پہلے نمبر پر آنے والے ملی نغمے کے خالق محمد عارف ٹھہرے۔ اس سلسلے میں شوکت محمود اعوان اپنے غیر مطبوعہ مضمون "محمد عارف: سوانحی کوائف" اس واقعے کو کچھ یوں رقم کرتے ہیں:

"یہ بات شاید کسی کو بھی پتہ نہ ہو اور نہ کسی کو پتہ چلتی اگر میں ذاتی کوشش سے اسے اس مضمون میں شامل نہ کرتا۔ یہ ہمارے ملک کی کتنی بڑی بد نصیبی ہے کہ لوک فنکاروں اور موسیکاروں کو تو اعزازات سے نوازا جاتا ہے مگر شاعروں اور ادیبوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ میں اس مضمون کی وساطت سے اعلیٰ سرکاری حلقوں سے اپیل کرتا ہوں کہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر پاکستان کے وقار کو سربلند کرنے والے اس شاعر کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ حیرت ہے کہ پی ٹی وی کے مشاعروں میں ایسے گوہر نایاب نظر آنے کی بجائے کچھ اور ہی دکھائی دیتے ہیں۔"(۵)

یہ ملی نغمہ پی ٹی وی لاہور اور پی ٹی وی اسلام آباد سے بار بار نشر ہو چکا ہے۔ ملک بھر کے اہلِ ذوق اس نغمے کو شوق سے سنتے ہیں۔ پاک چائنا ٹاور اسلام آباد میں سرکاری سطح پر منعقدہ قومی سطح کی تقریب میں سابق وزیر اعظم پاکستان جناب یوسف رضا گیلانی نے اس نغمے کو اول انعام سے نوازا۔ اس تقریب میں وفاقی وزراء، پارلیمنٹیرینز، ممبران قومی اسمبلی، سفارت کاروں، معزز شہریوں اور لوک فنکاروں نے کثیر تعداد میں شرکت کی۔ اس نغمے کے بول کچھ یوں ہیں:۔

ملی نغمہ

ایک دل کش نظارہ وطن ہے
میری آنکھوں کا تارا وطن ہے
دل نچھاور تو جاں اس پہ قربان
یہ شہیدوں کے خوں سے فروزاں
یہ مرا پیارا پیارا وطن ہے
میری آنکھوں کا تارا وطن ہے
میرے قائد کی محنت کا پھل ہے
اس کا کب کوئی نعم البدل ہے
یہ بھنور میں کنارا وطن ہے
میری آنکھوں کا تارا وطن ہے
اجلی روشن فضائیں کہاں ہیں
امن کی فاختائیں کہاں ہیں
اپنا سب کچھ خدارا وطن ہے
میری آنکھوں کا تارا وطن ہے

فصل نمبر6۔ محمد عارف کا شخصی خاکہ:

محمد عارف کی شخصیت کی پہچان کے بے شمار حوالے ہیں۔ وہ بیک وقت فکر انگیز حمد گو، خوش فکر نعت گو، عمدہ غزل گو، جدید نظم گو، خوش بیاں محقق خوبصورت نقاد خوش وضع انسان اور نہایت مودب شاعر ہیں۔ ان سارے حوالوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ علم و ادب ان کی زندگی کا اوڑھنا

بچھونا ہے۔ یہاں ان کی زندگی کے مذکورہ پہلوؤں کا ایک جائزہ پیش کرنے کی سعی حقیر کی جارہی ہے تاکہ ان کی شخصیت کے مختلف گوشے سامنے آ سکیں۔

محمد عارف خوش رو، خوش گفتار اور خوش آواز شخصیت کے مالک ہیں۔ان کے مزاج میں شائستگی زبان اور لہجے میں ایک خاص کھنک ہے۔ گفتگو میں ایک خاص شستگی اور فراست موجود ہے۔ زبان اور کلام پر انہیں ایک خاص ملکہ حاصل ہے۔ڈاکٹر ریاض مجید لکھتے ہیں:

''عارف ان شاعروں میں سے ہیں جن کی توجّہ شہرت کے حصول کی بجائے اظہار پر کامل دسترس کی معصومانہ خواہش کی طرف ہوتی ہے۔ایسے شاعر داد و تحسین سے بے نیاز اپنی تنہائیوں کی اجنتا میں اپنی سوچوں، فکری شباہتوں اور تجرباتی صورتوں کو دوام آشنا بخشنے کا کام سرانجام دیتے ہیں۔ یہ کام فطرت کی طرف سے ان کے تخلیقی شعور پر ایک ایسا قرض ہوتا ہے جسے وہ زندگی بھر فرض کی طرح نبھاتے ہیں۔ عارف کا فن ایک ایسے ہی قرض کا اظہار ہے جو اپنی پیش کش کے اعتبار سے مؤثر اور بلیغ ہے۔اس کی اثر آفرینی اور بلاغت کی تہہ میں جو فنکارانہ رویے وار شعری تجربے کارفرما ہیں، وہ غزل کے نئے منظر نامے میں خوب صورت رنگوں کے اضافے کا باعث ہیں۔'' (۶)

محمد عارف اخلاق و کردار کے حوالے سے ایک بڑی متعدل اور متوازن شخصیت کے حامل انسان ہیں۔ وہ احباب سے زیادہ دیر شکر رنجی کو گوارہ نہیں کر سکتے ہیں۔ ہمیشہ اپنے احباب کے ساتھ حسنِ سلوک کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ وہ اپنے کولیگز اور دوست واحباب کے ساتھ نہ صرف ایک مثالی رفیق کی حیثیت رکھتے ہیں بلکہ ہر معاملے میں ان کا دکھ سکھ بانٹنے والے بھی ہیں۔آپ کے دوست شوکت اعوان کے بقول:

''میں نے انہیں پیشہ وارانہ فرائض کی ادائیگی کے دوران سرتاپا مہرباں حوصلہ افزائی کرنے والے اور پرکشش انسان کے طور پر دیکھا ہے۔'' (۷)

محمد عارف جس ذمہ داری اور جاں فشانی سے اپنے تخلیقی سفر پر گامزن رہے اس لگن اور تن دہی سے انہوں نے جس شفقت پدری کا مظاہرہ کیا ہے۔اس کے بارے میں ان کا بیٹا کچھ یوں بیان کرتا ہے۔

''باپ کا پیار خداوند کریم کی بے شمار نعمتوں میں سے ایک ہے اور ابو جان کا شمار ان بھرپور والدین میں سے ہوتا ہے جنہوں نے اپنی اولاد کو بے پناہ محبت دی خاص طور پر بیٹوں کو انہوں نے بے پناہ پیار دیا۔''

ان کے بیٹے بتاتے ہیں:

''ابو جان نے ہم سب بھائیوں کی پرورش بڑے مشفقانہ انداز سے کی اور ہمیشہ ہماری ضروریات کو پہلی ترجیح دی۔انہوں نے تعلیم و تربیت کے لیے کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کیا۔''

محمد عارف مادہ پرستی سے کوسوں دور ہیں۔ اپنے احباب کو گھر بلانا، گھر پر مشاعرہ کرانا اور اپنے خرچ پر ان کی تواضع کرنا، دوسرا ثبوت ان کی قرابت داری، صلہ رحمی اور رشتہ داری کا پاس ولحاظ ہے۔ یہ سب ان کی لگن ان کے اخلاق اور ان کے مشفقانہ رویے کا ثمر ہے کہ وہ بڑوں چھوٹوں سب میں یکساں ہر دل عزیز ہیں۔ وہ شفقت و محبت کا پیکر ہیں۔ان کی شخصیت کا ایک بنیادی پہلو چھوٹے بچوں کے ساتھ الفت و محبت کا روّیہ ہے۔ یہ محبت ان کو اپنے بیٹے بیٹیوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ تمام ننھے منھے بچوں کے لیے خاص ہے۔بچوں کے لیے انہوں نے مختلف نظمیں بھی لکھیں۔

وہ امانت اور صداقت کا پیکر ہیں اور اپنے انٹرویوز میں اپنے اساتذہ اور احباب کا ذکر ضرور کرتے ہیں جو ان کی ادبی کاوشوں میں ان کے ساتھ ممد و معاون ہیں۔ وہ نہایت منکسر المطبع، سادہ دل، سادہ وضع، ظاہر و باطن میں یکساں، فرشتہ سیرت درویشانہ وار قلندرانہ طبیعت کے مالک ہیں۔ سلسلہ چشتیہ سے ان کا تعلق اس کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ بلاشبہ، اصل دولت تو دل کی دولت ہوتی ہے۔ وہ چاندی سونے کے بنے ہوئے ان ایوانِ تعیش سے ہزار درجہ بہتر ہے جن کے اندر روشنی نہ ہو۔

محمد عارف بلاشبہ ایک مؤدب شاگرد واقع ہوئے ہیں۔ انہیں اپنے اساتذہ اور رہنمائے فن سے حد درجہ لگاؤ ہے۔ ان کو رہنما بھی ایسے ملے جنھوں نے نہایت خلوص کے ساتھ ان کا ساتھ دیا۔

محمد عارف ایک درد مند دل رکھنے والے انسان ہیں۔ ہمیشہ ہر ایک کا بھلا کرنے کا سوچتے ہیں۔ ان کی زندگی میں 'ہمدردی' سب سے بڑی صفت ہے۔ دوسروں کے دکھ درد کا انہیں خود سے بڑھ کر احساس ہوتا ہے۔ محمد عارف کو قدرت نے بہت بڑے دل سے نوازا ہے۔ بہت سے لوگ کئی موقعوں پر ان کے ساتھ زیادتی کر جاتے لیکن وہ پھر بھی انہیں فراخدلی سے معاف کر دیتے ہیں۔ وہ ایک حساس دل رکھنے والے انسان ہیں۔

اس طرح محمد عارف کا جو نقش ہمارے ذہنوں میں اجاگر ہوتا ہے وہ ایک نفیس پر وقار اور شائستہ شخصیت ہے۔ قدیم و جدید روایات کی پاسداری کرتے ہوئے، نہ صرف ادب کے لیے بہت سارا کام کیا بلکہ اس معاشرے میں بھی ایک پر وقار، ادبی اور فنی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے عمدہ کلام کے باعث ہمیشہ زندہ رکھے جائیں گے۔

فصل نمبر 7۔ محمد عارف اور تصوّف:

محمد عارف کا تصوّف سے گہرا تعلق ہے۔ ان کی نظر میں زندگی جتنی وسیع تر ہے اتنے ہی اس کے موضوعات و سائل ہیں۔ ان موضوعات و سائل پر مختلف طریقوں سے بحث ہوتی رہی ہے۔ فلسفے کا یہ ایک مستقل موضوع ہے۔ فلسفے نے طبیعی اور مابعد الطبیعی ہر دو موضوع کو اپنا ایک مسئلہ سمجھا ہے جس میں منطقی فہم کو بالادستی حاصل ہے جبکہ شاعری بھی انہیں موضوعات کو اپنا مسئلہ بناتی ہے مگر شاعر احساسی سطح پر اشیاء سے رشتہ قائم کرتا ہے اس لیے فلسفہ جہاں منطق ہی منطق ہے شاعری احساس ہی احساس، وجدان ہی وجدان ہے۔ شاعری نے ہمیشہ داخلیت پر اصرار کیا ہے اور داخلیت کے دوسرے معنی روحانیت کے ہیں۔ نفس انسانی یا وہ قوت جو تمام چیزوں کے پس پشت کار فرما ہے اور ایک جاری حالت میں حیات و کائنات اور تمام موجوداتِ عالم میں رواں دواں ہے۔

تصوّف بھی ایک ایسا مسلک ہے جس کا مقصد عرفانِ ذات بھی ہے اور اپنے وسیع معنوں میں عرفانِ خداوندی بھی۔ یہی سبب ہے کہ تصوّف برائے شعر گفتن خوب است کے مصداق روحانی اقدار کو ترجیح دی جاتی رہی ہے بالخصوص مشرقی شاعری جس میں اردو شاعری کی عظیم روایت بھی شامل ہے ابتدا ہی سے متصوّفانہ رجحان سے وابستہ رہی ہے۔

غالب کے عہد تک قدیم شعریات اور اسالیب فکر کی ایک طاقتور روایت کارِ فرما رہی ہے۔ جب کہ غالب کے بعد مغربی تہذیب کی آمد اور سائنسی و صنعتی ترقی کی تیز رفتاری کے باعث قدیم کلاسیکی روایات کے احترام میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ ہمیں نئے موضوعات، نئے اسالیب اور نئی

اصناف سے سابقہ پڑتا ہے جو یقیناً ہماری تہذیبی روایت کے لیے ایک نئے تعارف، ایک نئے چیلنج کا حکم رکھتی ہیں۔ اسی دباؤ کی وجہ سے متصّوفانہ روایت پر بھی قدغن لگ جاتی ہے مگر اس کا مطلب قطعی یہ نہیں کہ تصّوف کی روایت یک دم ختم ہو جاتی ہے۔ دراصل تصّوف کی بہترین روحانی اقدار اور انسانی اخوت و عظیم برادری کے تصوّرات بدستور قائم رہتے ہیں جس کی ایک بہترین مثال اقبال کی شاعری ہے۔ اس حوالے سے رضا حیدر اپنی کتاب میں کچھ یوں رقم طراز ہیں:

"اقبال کے بعد ترقی پسند شاعروں نے جس وسیع المشربی انسانی وحدت و یک جہتی نیز مساوات کے نعرے بلند کیے ان میں بھی تصّوف ہی کے اثرات کا غلبہ تھا۔ اردو شعرا کے لیے یہ تصّورات نئے نہ تھے۔ ان کی ایک عظیم روایت تصّوف کے توسّط سے پہلے ہی سے برقرار تھی۔ ترقی پسندوں نے اسے مارکس کے حوالے سے نیا نام دینے کی کوشش کی تھی۔

جدید شعرا نے وجودیت (Existentialism) اور نفسیات کے ذریعے داخلیت کو ایک وسیع تر معنی دینے کی کوشش کی۔ وجودیت نے داخلی تجربے اور ذاتی تجربے پر زور دیا اور اسے ہی ایک حقیقت تسلیم کیا۔ نفسیات میں فرائڈ نے لاشعور کا تصّور دے کر انسانی سائیکی کو ایک نیا نام دینے کی کوشش کی اور یہ بتایا کہ انسانی شخصیت اس کے خارج سے نہیں بلکہ داخل سے پہچانی جاتی ہے۔ انسان جتنا مخفی ہے اتنا ظاہر میں نہیں ہے۔ یعنی اصل حقیقت اس کا باطن ہی ہے۔ اور باطن ہی پر تصّوف نے بھی اپنی اساس رکھی ہے۔"(۸)

تصّوف کسی مذہب، مسلک یا کسی انتساب کا نام نہیں بلکہ تصّوف ایک فکر ہے، ریاضت اور مجاہدہ ہے جو قلب کے پردے ہٹا دیتا اور حقائق کا انکشاف کرتا ہے۔ تصّوف کے موضوع پر اظہارِ خیال کرنے سے پہلے اسکے اشتقاق پر ایک نگاہ ڈالنا میں مناسب سمجھتا ہوں۔ 'صوفی' اور 'تصّوف' کے لغوی اشتقاق کے بارے میں محققین کے یہاں ہر زمانے میں اختلاف رہا ہے۔ عربی زبان کی قدیم لغات نیز جاہلی ادب کا وسیع ذخیرہ اس سے خالی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے تصّوف اس کی اصل کے بارے میں مختلف الرّائے ہیں۔

بعض مورخین صوفی کو یونانی لفظ ''سوف'' سے ماخوذ بتاتے ہیں۔ الغرض صوفی اور تصّوف کی معنوی تعریف میں بہت کچھ کہا گیا ہے۔ ہر صوفی نے اس کی تعریف اپنے ذوق و حال کے مطابق کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی ایک ہی صوفی کی تعریفات باہم متضاد بھی دکھائی دیتی ہیں لیکن ذوق اور حال کو پیشِ نظر رکھا جائے تو یہ تضاد خود بہ خود رفع ہو جاتا ہے کیونکہ جب ایک صوفی مختلف احوال سے گزرتا ہے تو ہر حال کے مطابق اس کی تعبیر بھی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں ایک ہی صوفی سے منسوب مختلف اقوال ملتے ہیں۔

اب ہم تصّوف پر تھوڑی سی روشنی ڈالیں گے۔ نکلسن نے لٹریری ہسٹری آف عربز (Literary History of Arabs)، میں کہا ہے کہ تصّوف کی نشو و نما کے دو ادوار ہیں۔ پہلا دور اسلام کی ابتدا سے نویں صدی عیسوی کے آغاز تک اور دوسرا نویں صدی سے بارہویں صدی تک اور اسلام کے آغاز کے بعد ہی تصّوف کی باقاعدگی سے شروعات ہوئی۔ مسلمانوں کے نزدیک مذہب کے دو پہلو ہوتے ہیں ایک ظاہری اور دوسرا باطنی اور تصّوف اسلام کا باطنی پہلو ہے۔ یہ ایک ریاضت اور مجاہدہ بالقلب ہے جس سے دل کے پردے ہٹتے ہیں اور نفس پر حقائق کا انکشاف ہوتا ہے۔ یہ تھا تصّوف کا اشتقاق۔ مختصراً تصّوف کے بارے میں یہ کہیں گے کہ یہ وہ علم ہے جس سے سعادتِ ابدی کے حصول کی خاطر تزکیۂ نفوس،

تصفیۂ اخلاق اور ظاہر و باطن کی اصلاح کے احوال جانے جاتے ہیں۔ تصّوف کے دو پہلو ہوتے ہیں ایک نظری اور دوسرا عملی۔ نظری پہلو: تصّوف میں معرفتِ حق کا راستہ اپنشدی فلسفے کی طرح روحانی تکمیل اور تہذیب نفس کا ہے۔ اس نظریہ کی بنیاد چار اصولوں پر رکھی گئی ہے۔

ا۔ عقل، حقیقت کے راز کو نہیں پاسکتی۔ صداقت کی تلاش کے لیے نظری علم بے کار ہے۔ اس لیے حضوری علم چاہیے جو منطق یا ریاضی کے اصولوں سے نہیں بلکہ حسِ باطنی یا وجدان کے ذریعے ممکن ہے۔

۲۔ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ وہ اگر باطن کی طرف رجوع کرے تو اسے احساس ہوگا کہ اس میں حقیقت کو جاننے کی تڑپ ہے۔ یہ وہ چنگاری ہے جو ابدی شعلہ میں ضم ہو جانا چاہتی ہے۔ اس کا سراغ قلب میں ملتا ہے۔ اس لئے صوفی کو قلب کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں دیدارِ محبوب سے چشم باطن روشن ہو سکتی ہے۔

۳۔ معرفت کے لیے ریاضت اور مجاہدہ ضروری ہے۔ خود غرضی، لذتیت اور عیش کوشی سے روح ملوث ہو جاتی ہے۔ مادی لذتوں کی قید و بند سے آزاد ہو کر ہی حقیقت کو بے حجاب دیکھا جاسکتا ہے۔

۴۔ خدا سے رشتہ محبت کی بنا پر ہونا چاہیے۔ محبت ایک جذبہ ہے اور معرفت ایک کیفیت ہے۔ جذبہ سے کیفیت تک ایک قدم ہے۔ محبت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ فرد محبوب کے جلوۂ حسن میں جذب ہو کر خود کو فراموش کر جاتا ہے۔ حب الٰہی صوفی کا ضابطہ ہے۔ وجدان اس کا مدعا ہے اور معرفت وصالِ محبوب ہے۔

عملی پہلو: تصّوف کے نظری پہلو کی طرح اس کا عملی پہلو بھی اہمیت رکھتا ہے۔ تصّوف کے مبتدی کے لیے جن مقامات سے گزرنا لازمی ہے، وہ ہیں توبہ، ورع، زہد، فقر، صبر، توکل اور رضا۔ ایسے ہی صوفی کے لیے مندرجہ ذیل حال ضروری بتائے گئے ہیں:

مراقبہ، قرب، محبت، خوف، رجا، شوق، انس، اطمینان، مشاہدہ اور یقین۔ توبہ سے مشاہدہ تک صوفی کے سفر کے تین حصے کیے جاسکتے ہیں۔ اتباع شریعت، مغفرت اور فنا۔ پہلی حالت کو مجاہدہ دوسری کو محاضرہ اور تیسری کو مشاہدہ کہا جاتا ہے۔

"میں خود آستانۂ عالیہ سیان شریف، ڈسکہ، سیالکوٹ سے وابستہ ہوں، جو ڈیڑھ سو سال سے تزکیۂ باطن اور روحانی ارتقاء کے فروغ میں اپنا کلیدی کردار ادا کر رہا ہے۔ محبوبِ سبحانی، غوثِ صمدانی، حضرت پیر کرم علی شاہ زنجانیؒ نے سیالکوٹ اور گردونواح کے لوگوں کو کثیر تعداد میں مشرف بہ اسلام کیا۔ اُن کی علمِ تصّوف پر فارسی میں تحریر کردہ بلند پایہ علمی تصنیف کا ایک قلمی نسخہ بے پناہ اہمیت کا حامل ہے۔"(۹)

محمد عارف اس وقت علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی سے "اردو زبان و ادب میں صوفیائے چشت کا کردار" کے موضوع پر پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کر چکے ہیں۔ ان کا مقالہ اس لحاظ سے منفرد ہے کہ گذشتہ ساڑھے سات سو برس میں برصغیر میں سلسلۂ چشتیہ کی سینکڑوں خانقاہیں قائم ہوئیں، حضرت خواجہ فخر الدین فخر جہاں دہلویؒ جو کہ سلسلۂ چشتیہ میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان سے دو بڑی خانقاہیں قائم ہوئیں۔ ایک حضرت خواجہ نور محمد مہارویؒ کی، جن سے پنجاب اور پاکستان کے دیگر علاقوں میں کئی چشتی خانقاہیں قائم ہوئیں۔ دوسری خانقاہ بریلی شریف میں حضرت شاہ بے نیازؒ کی قائم ہوئی۔ حضرت نور محمد مہارویؒ اور خواجہ شاہ بے نیاز دونوں سلاسلِ تصّوف میں اہم شخصیات ہیں۔ موجودہ دور میں بھی صوفیائے چشت اپنے دینی

خیالات کے اظہار کے لیے قرطاس و قلم کے ذریعے اپنا بھرپور کردار ادا کر رہے ہیں۔ برصغیر پاک و ہند میں صوفیائے چشت کا علمی و ادبی کردار کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔ صوفیائے چشت اور بزرگانِ دین نے ہی نہیں ان کے متوسلین اور خلفاء نے بھی ملفوظات کے ذریعے دینی تعلیم کو عام کیا۔ اعلیٰ پائے کی کتب تصنیف کیں۔ شاعری کی، رسائل و جرائد کے ذریعے روحانیت کو عام کیا مگر یہ امر ایک بدیہی حقیقت ہے کہ یہ خرقہ پوش ازل سے لے کر آج تک دنیاوی شہرت یا نام و نمود سے بے نیاز ہی رہے کیوں کہ ان کی نظر میں مال و دولت دنیا اور تشہیر ذات کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ یہ ہماری ادبی تحقیق اور تنقید کا المیّہ بھی ہے کہ مشائخِ چشت کی تصنیفی و تالیفی خدمات کو اس بھرپور اور موثر انداز میں سامنے لانے کی کوشش نہیں کی گئی جو کہ ان کا حق ہے۔

محمد عارف نے اس مقالے کے ذریعے بھرپور کوشش کی ہے کہ جہاں اُنہوں نے صوفیائے چشت کے دینی ادب کے فروغ کے سلسلے میں کارہائے نمایاں کو اجاگر کیا ہے وہاں ان شخصیات کو بھی سامنے لانے کی کوشش کی ہے جن کا علمی کام اس قدر بلند پایہ ہے کہ اسے بآسانی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ امتدادِ زمانہ اور افتادِ طبع کے ہاتھوں ان کے رشحاتِ قلم ابھی تک پردۂ اخفاء میں ہیں یا ان پر اس بھرپور انداز میں خامہ فرسائی نہیں کی گئی جو ان کا استحقاق ہے۔ یہ موضوع جہاں موجودہ دورِ پر فتن میں دینی تعلیمات سے دوری ،اخلاقی بے راہ روی، فحاشی و عریانی، الحاد و بے دینی اور انتشار و افتراق کو ختم کرنے کا باعث بنے گا وہاں وطنِ عزیز میں موجود نسلی، علاقائی، لسانی اور مذہبی فرقہ واریت کو نیست و نابود کرنے کے لئے بھی عالم گیر محبت و اخوت کا پیغام ثابت ہو گا۔

اُردو ادب کے ارتقاء پر نظر ڈالی جائے تو حضرت امیر خسروؒ، حضرت خواجہ میر درد، حضرت مظہر جان جاناں، اصغر گونڈوی، جیسے شعراء کے ہاں تصّوف کے نظری اور عملی پہلوؤں کا ادراک و شعور ملتا ہے مگر یہ روایتِ تصّوف اس تسلسل، زور و شور اور شدّ و مدّ سے جاری نہیں رہی جو کہ اس موضوع کا تقاضا تھا۔ صوفیائے چشت بہشت نے معاملات من و تو کے ساتھ ساتھ وحدت الوجودیت کے موضوع کو اپنے فکر و فن کا مرکز و محور بنایا۔ وہ اپنی تحریرات کے ذریعے عوام الناس کو رجوع الی اللہ کی تعلیم دیتے رہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ خطۂ پنجاب کی مختلف چشتیہ خانقاہوں سے وابستگان کی تصنیفی خدمات کو سامنے لایا جائے اور ان کو اردو کے دینی ادب میں ان کا وہ جائز مقام دیا جائے جو ابھی تک محققینِ ادب پر قرض ہے۔

فصل نمبر 8۔ محمد عارف اور دیباچہ نگاری:

دیباچہ نگاری کے حوالے سے محمد عارف کا ایک اور قابلِ ذکر مضمون ''حضرت واصف علی واصفؒ کی پنجابی شاعری میں صوفیانہ روایت'' کے نام سے ہے۔ یہ مضمون واصف علی واصفؒ کی کتاب ''بھرے بھڑولے'' کو زیرِ بحث لاتا ہے۔ آپ لکھتے ہیں کہ حضرت واصف علی واصفؒ لمحۂ موجود کے ان معروف و مقبول صوفی دانش وروں میں سے ہیں جنہوں نے علمی استدلال، تفکر و تدبر اور دانائی و بینائی سے آج کی بھولی بھٹکی انسانیت کے رشتۂ خالقِ کائنات سے مضبوط بنایا۔ وہ بنی نوعِ انسان کی فکری انارکی، ذہنی جمود، اور لاحاصلی کو بار بار موضوع بناتے ہیں تاکہ ہمیں اپنے مقصدِ حیات کے تعیّن میں آسانی ہو سکے۔ مصنف کے خیال میں اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے ذہن و فکر کے زنگ آلود خانوں کو سیکل کیا۔ عقل و شعور کو ممیز دی۔ تعلیم یافتہ طبقے کو شریعت، طریقت اور حقیقت کے راستے پر گامزن کیا۔

واصف علی واصفؒ کا پنجابی شعری مجموعہ ''بھرے بھڑولے'' نومبر 1994ء میں شائع ہوا جس کا سرورق محمد حنیف رامے نے بنایا ہے۔ واصف علی واصفؒ کی پنجابی شاعری کے مجموعی تاثر صوفیانہ طرزِ فکر کا ہے جس کے ذریعے انہوں نے مسلمانوں کی اجتماعی صوفیانہ روایات کے علاوہ اپنے علاقے پنجاب کے صوفیانہ اشارے بھی دیئے ہیں۔ واصف علی واصفؒ ایک روحانی شخصیت تھے جن کے روحانی تجربے محولہ بالا صوفیانہ تجربات کے ساتھ مملو ہو کر ایک جداگانہ رنگ پیش کرتے ہیں۔ واصف علی واصفؒ خواجہ میر درد کے بعد اردو پنجابی شعری روایت کے وہ واحد صوفی شاعر نظر آتے ہیں جن کی ابتداء سے لے کر آخر تک ہر دو زبانوں میں کی گئی شاعری تصّوف کے نظری پہلوؤں کی بجائے عملی تصّورات کو سامنے لاتی ہے۔ واصف علی واصفؒ خواجہ میر درد کے بعد اس صوفیانہ شاعری روایت کے موجد بھی ہیں اور خاتم بھی کیونکہ ایسے لوگ صدیوں کے بعد صفحۂ ہستی پر طلوع ہوتے ہیں جو تصّوف کے روحانی، جمالیاتی تجربات کی باریک بینی کو حق الیقین کی منزل سے نہیں بلکہ عین الیقین کے مقام سے دیکھتے ہیں۔ واصف علی واصفؒ ان خواصانِ خدا میں شمار ہوتے ہیں جن سے قدرتِ کاملہ نے یہ عظیم کام لیا کہ انہوں نے اپنی روحانی وارداتِ قلبی کو اپنی شاعری کا مرکزی جوہر بنایا ہے۔ واصف علی واصفؒ کے پنجابی شاعری کا مجموعہ '' بھرے بھڑولے'' پڑھنے سے صوفیائے کرام کی تعلیمات کے نقش ہر طرف بکھرے نظر آتے ہیں۔

محمد عارف کی نظر میں واصف علی واصفؒ خدا کے تقرب کے حصول کے لئے عشق کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ دنیا کی بے ثباتی، شیخِ کامل کی ضرورت، عشقِ رسول ﷺ جیسے موضوعات ان کے ہاں بار بار نظر آتے ہیں۔ واصف علی واصفؒ کی نظموں میں فنا کا احساس غالب ہے۔ وہ ان میلیوں، کہنہ مکرنیوں، دوہوں، اور چکی ناموں کی روایت کو آگے بڑھاتے ہوئے خوب صورت ادبی انداز اپناتے ہیں تاکہ قاری کو فکرِ آخرت کے لئے تیار کیا جا سکے۔ یہ دنیا چند روزہ ہے۔ صوفی، سادھو، مست الست فقیر، واعظ مولوی اور پنڈت، سب اپنے اپنے رنگ میں انسانوں کو حقیقی منزل کے لئے تیار کرتے ہیں۔ اُردو کے صوفی شعراء کی شاعری کو غور سے پڑھیں تو یہ موضوع ہر طرف چھایا ہوا ہے۔ خود پنجابی شعراء کے ہاں بھی یہی شعری روایت تخلیقی تجربے کی فنی مہارت سے مربوطہ ہو کر قاری کی سماعتوں کو تروتازگی عطا کرتی ہے۔ محمد عارف اس سلسلے میں مزید لکھتے ہیں:

''واصف علی واصفؒ کی شاعری میں صوفیانہ لے نظم و غزل ہر دو اصنافِ سخن میں موجود پائی جاتی ہے۔ وہ کبھی سسی کی طرح روہی کے تھل میں تڑپتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کبھی ان کے دل میں ہر طرف شور برپا ہو جاتا ہے۔ ان کی سسی کا شہر بھنبھور اجڑ جاتا ہے۔ شاید یہی وہ جذبۂ عشقِ حقیقی ہے جس میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت میں تڑپنا، کسمسانا، تلملانا، انسان کا خاصہ قرار پاتا ہے۔ بالآخر تو من شدی من تو شدم کا معاملہ پیش آجاتا ہے۔ واصف علی واصفؒ کی شاعری میں ایک اہم موضوع عشقِ رسول ﷺ ہے وہ اپنی پنجابی شاعری کے ذریعے معرفت و سلوک کے وہ پیچیدہ و دقیق علمی تفاوت سامنے لاتے ہیں کہ عقلِ انسانی ششدر اور حیران رہ جاتی ہے۔ وہ عشقِ رسول ﷺ کو حاصلِ کائنات قرار دیتے ہیں کیونکہ یہی وہ جذبہ ہے جو انسان کو عرفانِ ذات سے ہمکنار کرتا ہے اور اس کے لئے باعثِ نجات ہے۔ واصف علی واصفؒ کی شاعری میں اسرار و رموز، ہست و بود، فلسفہ تخلیقِ کائنات اور تعلیماتِ قرانی کی جھلک واضح نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری اپنے مخصوص رنگ میں علمِ حقیقت کی اتھاہ گرائیوں کو اجاگر کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ واصف علی واصفؒ آج کے انسان کو فکرِ آخرت کے لئے تیار کرتے ہیں۔ وہ عالمگیر محبت، بے مثال اخوت کے دعوے دار ہیں۔

وہ خود غرضی، حرص وہوس اور لالچ کے عفریت کو مٹانے کے درپے ہیں تاکہ صبر وشکر، توکل اور قناعت کے اوصاف کو اپنا کر انسان اپنے حقیقی منزل سے ہمکنار ہو سکے۔'' (33)، (محمد عارف کی علمی وادبی خدمات: (مقالہ برائے ایم فل۔اردو) مقالہ نگار ارشاد اختر سرگودھا یونیورسٹی)۔

فصل نمبر 9۔ماحصلِ کلام:

واصفیات کے موضوع پر متعدد کتابیں موجود ہیں جن میں سے ہر ایک اپنی موضوعاتی خوبصورتی اور فنی پختگی کے اعتبار سے انفرادیت کی حامل ہے۔ واصف علی واصفؒ کی ہمہ گیر شخصیت اور وسیع تر حلقہ اثر کی بدولت ان کے سوانحی حالات پر مزید تحقیق کی شدید ضرورت ہے۔ان کے سوانحی حالات کی از سرِ نو ترتیب وتدوین اور ان کے ذاتی کوائف کے حوالے سے بعض اُلجھے ہوئے مباحث کو سلجھانا ہر ذی شعور صاحبِ علم کی ذمہ داری ہے۔ باباجی عنایت اللہ ایک درویش منش انسان ہیں جنہوں نے لگ بھگ پچیس سال کا عرصہ واصف علی واصفؒ کی قربت، خدمت اور معیت میں گزارا۔ان سے اکتسابِ فیض کرتے ہوئے واصف علی واصفؒ کی سوانحی، علمی اور فلاحی زندگی کے متعلق بعض نئے گوشے اس کتاب کا مرکزی موضوع ہیں تاکہ قاری ان کی شخصیت کو اپنے سیاق وسباق میں سمجھ کر ان کے فکر وفن کا درست تجزیاتی مطالعہ کر سکے۔ واصف علی واصفؒ کے بعض فکری عنوانات پر بھی مضامین شامل کئے گئے ہیں لیکن اسی کتاب کی دوسری جلد میں ان کے فکر وفن کا اختصاصی مطالعہ شامل ہو گا۔ واصف علی واصفؒ کے حلقہ اثر میں جہاں اپنے وقت کے جید اساتذہ، علما، صلحا اور فقہا شامل رہے ہیں وہاں بعض ایسے گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے گوہرِ نایاب بھی ان کے رفقا میں سے ہیں جن کی سوانحی حیات اور یادوں پر مہ وسال کی تہہ در تہہ گرد جم چکی ہے۔ ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ یادوں کے ان دھندلے آئینوں میں ان روشن چہروں کو ڈھونڈا جائے جن کی تابانی آج بھی چار دانگِ عالم میں ضوفشاں ہے۔ فیضان، محمد الیاس، شوکت اعوان، علامہ محمد یوسف جبریلؒ، پروفیسر شوکت محمود کنڈان مرحوم، ڈاکٹر تصدق حسین کتنے ہی لوگ ہیں کہ جنہوں نے واصف علی واصف سے اپنی قربت کے لمحات میں متعدد علمی نکات، ادبی مسائل، متصّوفانہ امور اور معاشرتی معاملات پر مباحث کے ذریعے یادوں کے انگنت چراغ جلائے ہیں۔ بعض تاریخ کے ایسے اسلامی، تہذیبی اور تمدّنی حوالے بھی شامل کئے گئے ہیں جن کو بعض ناعاقبت اندیش اور کوتاہ نظر نقادوں نے مسخ کرنے کی گویا کوشش کی ہے۔ زاغوں کے تصّرف میں عقابوں کا نشیمن دیکھ کر بعض اصحابِ علم اور خصوصاً پروفیسر شوکت محمود کنڈان چیں بہ جبیں ہوئے اور مجھ کوتاہ قد سے یہ درخواست کی گئی کہ میں اس حوالے سے موضوع کو سچ کی کٹھالی میں کندن بنا کر آپ کے سامنے پیش کروں۔ میرے ساتھ محولا بالا شخصیات کے علمی تعاون، ہمہ وقت قربت اور دیرینہ رفاقت نے مجھے جہاں واصفیات کے حوالے سے مرتبہ شدہ تاریخ کے بعض گم شدہ اوراق تلاش کرنے میں مدد ملی وہاں اس حوالے سے ایک نئی تاریخ رقم کرنے کا موقع بھی ملا ہے۔امید ہے کہ مستقبل کا قاری اور واصفیات کا محقق اس شذرے سے ضرور استفادہ کرے گا۔

واصف علی واصفؒ کے خاندان کے انتہائی اہم فرد پروفیسر شوکت محمود کنڈان محولہ بالا کتاب ''فرمائش مرتبہ محترم اعجاز الحق'' کے مندرجات اور مشمولات پر سب سے پہلے انگشتِ بدنداں ہو گئے۔ انہوں نے این بی ایف کو ایک طویل خط لکھا جس میں اس کتاب کی اشاعت کو روکنے کی سفارش کی گئی۔ انہی کی اوّلین تحریک اور ان کے خاندان کی خواہش کے مطابق یہ کتاب انتہائی ایمان داری، توجّہ، تندہی اور غور وفکر سے قلمبند کی گئی ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میری دیگر علمی گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے میں اس منصوبے کو بروقت پایۂ تکمیل تک نہ پہنچا سکا۔ پروفیسر

شوکت کنڈان اس کتاب کو زیورِ اشاعت سے آراستہ و پیراستہ نہ دیکھ سکے اور ملکِ عدم کو سدھارے۔ واصف علی واصفؒ ایک ہمہ جہت اور ہمہ گیر دانش ور، شاعر، ادیب، محقق تھے۔ان کی تحریریں پاکستانی معاشرے کے ہر فرد کا ورثہ ہیں اور ان کی سوانح حیات ہم سب کی قیمتی متاع ہے۔ واصف علی واصفؒ کی سوانح حیات کے مختلف گوشوں، روحانی ارتقااور فنی جہات کے متعلق معلومات کم و بیش ہر پاکستانی کے تحت الشعور میں موجود ہیں کیوں کہ وہ بلاشک وشبہ اپنے عہد کے ایک مقبول ترین اہلِ قلم ہیں۔ان کی نثری تحریریں اور حکمت آموز مضامین بالخصوص نئی نسل کے لئے دلچسپی کا بھرپور سامان ہیں۔ پاکستان کی نظریاتی شناخت قومی تشخص اور ادبِ عالیہ کی روایت کے عظیم علمبردار واصف علی واصفؒ ایک صوفی منش دانش ور تھے۔انہوں نے اپنی گفتگو کے ذریعے متصّوفانہ مباحث بنی نوعِ انسان کی فکری ژولیدگی اور اُمتِ مُسلمہ کے اجتماعی مسائل پر خوب صورت رشحاتِ قلم یادگار چھوڑے ہیں۔ مختار مسعود کی آوازِ دوست، خلیل جبران کی شاعری اور نسیم حجازی کے ناولوں کے بعد واصف علی واصفؒ کو اپنے عہد کا ایک نابغہ عصر اور لیجنڈ قرار دیا جاسکتا ہے۔واصف علی واصفؒ کے حوالے سے ڈاکٹر اظہر وحید واصفیات کے نام سے ایک رسالہ شائع کرتے ہیں جس میں ان کے فکر و فن پر عمدہ مضامین شائع ہوتے ہیں لیکن واصفیات ایک ایسا متنوع اور رنگارنگ موضوع ہے کہ جس کا دائرہ کار ہفت افلاک تک پھیلا ہوا ہے۔ واصفیات کے مطالعہ کے دوران ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس وقت تک ان کی سوانح حیات پر کیا گیا کام بارش کے پہلے قطرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر دور میں ان کی فکر کے احیا کی ضرورت کو محسوس کیا جاتا رہے گا۔ ہر آنے والا محقق تحقیق کے کنوئیں میں اپنا ڈول ڈال کر بعض ایسے انوکھے مباحث منظرِ عام پر لے آئے گا جو واصفیات کو اپنے تاریخی پسِ منظرات میں جاننے کے لئے ایک خشتِ اوّل کا کام دیں گے۔ ہمیں واصفیات کے حوالے اپنے عہد کی ایک اہم ترین ادبی، روحانی، متصّوفانہ، قلندرانہ اور مجذوبانہ شخصیت کے انٹرویوز کے ذریعے تاریخِ ادب کو ایک نیا رخ دینے کی کوشش کی ہے۔ باباجی عنایت اللہ واصفیات کی ثقافتی اقدار اور مذہبی ورثے کے روحانی امین ہیں۔ جنہوں نے پاکستانیات اور جمہوریت کے حوالے سے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ وہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کی نظریاتی بنیادوں کے محافظ اور اسلامی جمہوری نظام کے علمبردار ہیں۔انہوں نے واصف علی واصفؒ کے ساتھ اپنے مہ و سال بسر کئے۔ان کے سینے میں چھپی ہوئی عہدِ گذشتہ کی تاریخ کے ورق ورق کو صفحہ قرطاس پر منتقل کرنے کی یہ کاوش برس ہا برس کی ریاضت کا نچوڑ ہے۔اُمید ہے کہ واصف علی واصفؒ کی زندگی کے یہ گوشے اور تاریخِ ادب کے نئے افق اردو دنیا کے لئے مطلعِ انوار ثابت ہوں گے۔ مشائخِ چشت کی علمی وادبی خدمات کے حوالے سے اپنے ڈاکٹریٹ کے مقالے کی تحقیق کے دوران جہاں مجھے مشائخ چشت بہشت کی تعلیمات کو جاننے کا موقع ملا وہاں میرا اس امر پر بھی یقین پختہ ہو گیا کہ ابھی ان کی مستند علمی، تہذیبی، روحانی اور ادبی تاریخ کو احاطہ تحریر میں نہیں لایا گیا۔ میری یہ طالب علمانہ تحقیق و جستجو اسی مقصد کے حصول کی ایک کڑی ہے۔اُمید ہے کہ آئندہ آنے والے محققین اس کوششِ ناتمام سے حتی المقدور استفادہ کریں گے۔

☆حوالہ جات☆

باباجی عنایت اللہ صاحب اور فیضان صاحب کے ساتھ گفتگو۔

کتاب فرمائش پر تبصرہ مرتبہ اعجاز الحق۔

پروفیسر شوکت محمود کنڈان کا ایک غیر مطبوعہ خط۔

فیضان کی گفتگو سے اخذ کردہ مواد۔

محمد عارف کی علمی وادبی خدمات، مقالہ نگار ارشاد اختر۔

واصف علی واصف کی اپنی اور اُن پر لکھی ہوئی تنقیدی کتب۔

اختتام بالخیر

واصف علی واصفؒ سلسلۂ چشتیہ کے وہ روشن چراغ ہیں کہ جن کی تعلیمات اُن کے ادبی ظہور کا پیش خیمہ ہے۔ انہوں نے آج کے مضطرب انسان کی ذہنی پیچیدگی کو دُور کرنے کیلئے گفتگو اور مضامین کا سلسلہ شروع کیا جس نے ایک پورے عہد کو متاثر کیا۔ اُن کے مضامین سے اظہار کی بوقلمونی، اسلوب کی جامعیت اور علم و ادب سے گہری وابستگی کا پتہ چلتا ہے۔ اُن کے مختصر فقرے پڑھتے ہوئے خلیل جبران کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ انہوں نے مشائخِ چشت کی مستند علمی و دینی روایت کو اپنے سینے سے لگایا۔ وہ ایک صوفی درویش اور صاحبِ حال بزرگ تھے۔ ان کی تحریروں کی طرح ان کی زندگی بھی اپنے دامن میں بے پناہ وسعت رکھتی ہے۔ جس کے بعض گوشوں کو زیر بحث کتاب کا موضوع بنایا گیا ہے۔ واصف علی واصفؒ کی زندگی شاعری اور تعلیمات ہر دور میں صاحبانِ ذوق کی گفتگو کا موضوع رہے ہیں۔ واصف علی واصفؒ ہم سب کیلئے ہدایت کا ایک روشن چراغ ہیں جن کی ادبی زندگی کے گوشے اس کتاب کا موضوع ہیں۔ اُمید ہے آپ کو پسند آئیں گے۔

ڈاکٹر محمد عارف (ٹیکسلا)

اوکاسا پبلیکیشنز